سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
اکتوبر 2011
معراج رسول

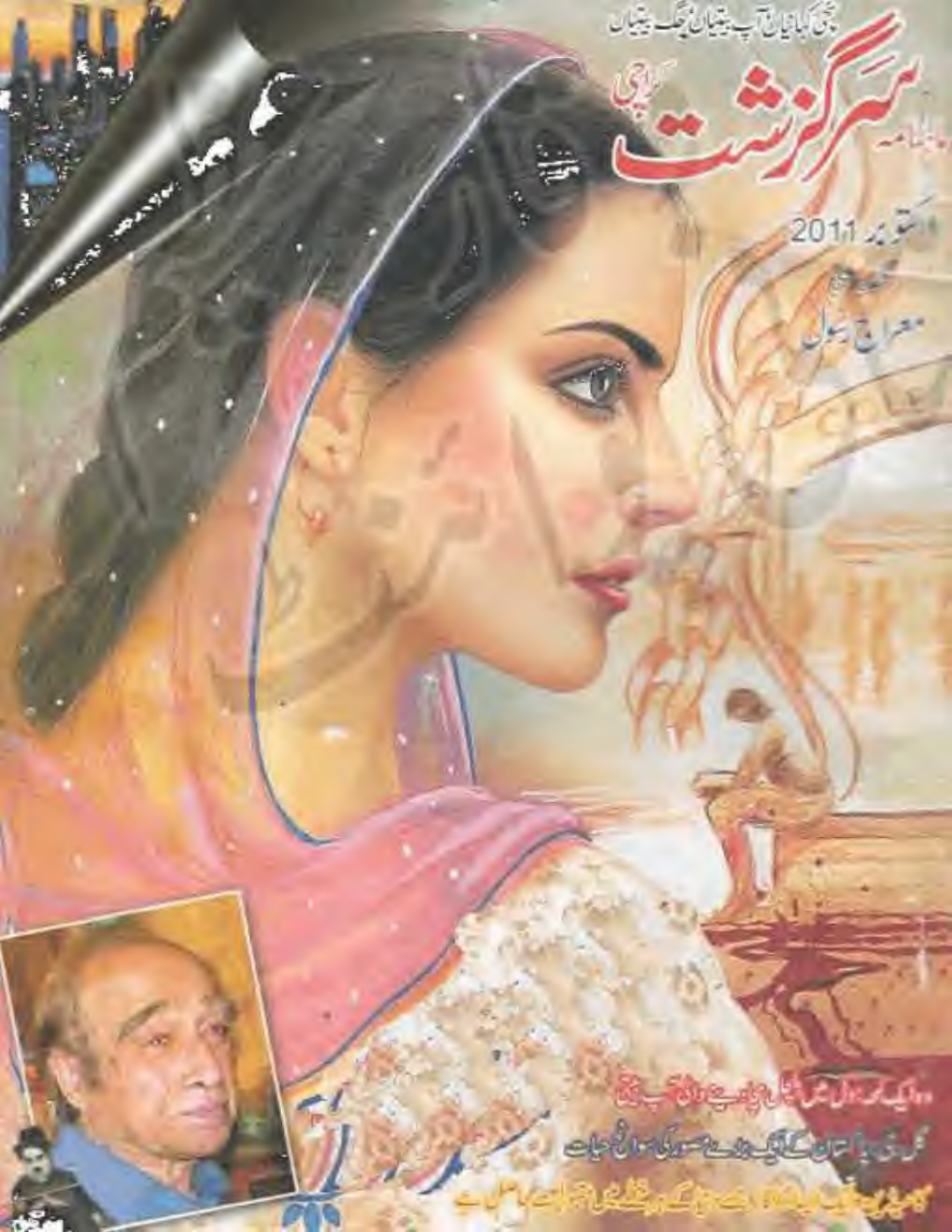

سرگزشت 15
پہلا سائنس داں — ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک نامور سائنس داں کا تعارف خاص

گفت و شنید 16
شہرِ خیال — مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت 24
کامیڈین — ڈاکٹر ساجد امجد
دنیا کے سب سے مشہور اداکار کی سوانح حیات

خراجِ تحسین 23
گل جی — شکیل صدیقی
پاکستان کے مایہ ناز مصور کی زندگی کا عکس

سیرِ پاکستان 69
کراچی ٹرام وے — زلفی شاہ
شہر قائد کی ایک بھولی بسری سواری کا ذکر خاص

سمندری شکار 80?
لقمۂ تر — مریم کے خان
کبھی کبھی شکاری خود بھی شکار کا شکار ہو جاتا ہے

فلم و صحافت 89
فلمی الف لیلہ — علی سفیان آفاقی
فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں فلم نگری کی باتیں، یادیں

دہشت گردی 148?
آبی رن وے — مختار آزاد
دہشت گردی کا شکار ایک بدنصیب طیارے کی روداد

سفر کہانی 135
امریکا او امریکا — الطاف شیخ
ایک الگ انداز کی سفر کہانی مختلف انداز سے امریکا درشن

فرار کتھا 151
ہوانا سے فرار — شکیل ادریس
ظلم و جبر بھرے ملک سے فرار کا انوکھا انداز

معاشرت 158
سراب — کاشف زبیر
بے حس لوگوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان، ایک دلچسپ تحریر

شعر و ادب 197
بیت بازی — قارئین
شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

انعامی مقابلہ 200
علمی آزمائش — ادارہ
ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

پہلی سچ بیانی 202
وہ ایک لمحہ — سعید الرحمن
اس ایک لمحے نے اس کی زندگی کو تہ و بالا کر دیا تھا

دوسری سچ بیانی 223?
آئینہ — ضمیر بٹ
اس نے ماضی میں ایک غلطی کی تھی قسمت اسے سزا دے رہی ہے

تیسری سچ بیانی 235
سچا راستہ — مظفر امام
ایک جداگانہ طبیعت کی مالک لڑکی کا قصہ

چوتھی سچ بیانی 240?
فرشتہ — نیز اعلیٰ
ایسے لوگ خود میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں

پانچویں سچ بیانی 249
تعلیم نسواں — ڈاکٹر ماہ نور
عورت کو تعلیم صرف اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ

چھٹی سچ بیانی 262?
جڑواں — ارسلان
ایک ہنستی مسکراتی کھلکھلاتی تحریر ذائقہ بدلنے کے لیے

ساتویں سچ بیانی 263?
حیران کرنے والا — جمیل اختر
جب وہ مرا تو بھی لوگ حیران رہ گئے

آٹھویں سچ بیانی 269
دیدۂ عبرت — ڈاکٹر مبشر حسن ملک
نشہ کس طرح زندگی و اخلاق کو بگاڑتا ہے

نویں سچ بیانی 282?
برق رفتار — ثنا
اس نے بڑی تیزی سے ترقی کرنا چاہی تھی مگر...

جلد 21 ✿ شمارہ 12 ✿ اکتوبر 2011ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول
مصورہ : شاہ نسرین

شعبۂ اشتہارات
0333-2256789 محمد شاہد خان
0333-2168381 محمد سلمان خان
0323-2895528 ناہید
0300-4214400 قمر جلال

قیمت فی پرچہ 50 روپے ✿ زرسالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر : عذرا رسول
مقام اشاعت : C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر : جمیل حسن
مطبوعہ : ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

بھارت کی ریاست گجرات کے ضلع بلسار کے گاؤں سنجان میں ولی محمد کا باغ ہے۔ اس باغ میں آم کا ایک پیڑ ہے جسے حکومتِ ہند نے ثقافتی ورثہ قرار دے دیا ہے۔ اس پیڑ کو عجوبہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ پیڑ دو سو سال سے چل رہا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ پیڑ کی کوئی ایک شاخ زمین پر جھک جاتی ہے پھر اس میں جڑیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور تنا سوکھ جاتا ہے۔ اس طرح پیڑ کئی قدم آگے کھسک آتا ہے۔ گویا وہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ 64 سال سے ایک ہی جگہ جمے کھڑے ہیں۔ بدانتظامی، عدم منصوبہ بندی، زیادتی اور ناانصافی کا مسلسل شکار ہو رہے ہیں۔ بجلی، گیس اور پیٹرول کی قلت نے صنعتوں اور کاروبار کو کھالیا۔ گویا آزادی کے وقت ہم ترقی کے جس زینے پر تھے، اب بھی وہیں جمے کھڑے ہیں۔ ایک قدم آگے بڑھتے ہیں تو اگلے کچھ برسوں میں پھر واپس اسی مقام پر آجاتے ہیں۔ یعنی ہم اس پیڑ سے بھی گئے گزرے ہیں۔ لیکن ہمیں اس ”چکرویو“ میں پھنسایا کس نے؟ ہمارے رہنما ہمیں بتائیں گے کہ وطن کی ترقی جامد اور ان کی زندگی رواں کیوں ہے؟ حکومت کے خزانے کم سے کم اور ان کی تجوریاں بھرتی کیوں جارہی ہیں۔ بقول کیفی اعظمی ؎

بے گناہوں کے خوں کی بارش میں
بزمِ عشرت سجاکے بیٹھے ہو
اٹھ بھی سکتی ہیں دفعتاً لاشیں
جن پہ مسند سجاکے بیٹھے ہو

معراج رسول

پہلا سائنس دان

سرگزشت

انسانی معلومات نے اس کے سر پر سب سے قدیم سائنس داں ہونے کا تاج سجادیا۔

اس سے پہلے بھی کوئی ایسا ضرور گزرا ہوگا جس کی سوچ فلسفی کی نہیں، سائنس داں کی ہوگی لیکن اس سے پہلے کسی کا نام تاریخ میں محفوظ نہیں۔

بعض کے نزدیک وہ فونیشیا کا رہنے والا تھا۔ فونیشیا قدیم زمانے میں موجودہ شام اور لبنان کے اس حصے کو کہتے تھے جو بحیرۂ روم کے ایشیائی ساحل کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔ یہ لوگ خوش نصیب تھے کہ ان کے پاس دولت بھی تھی اور علم بھی۔

بعض لوگ اسے یونانی الاصل کہتے ہیں لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ یونان میں بسر کیا۔

یونانی سلطنت ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس علاقے کا ایک شہر ملطوس تھا جہاں وہ پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام ”ڈامیس“ اور ماں کا نام ”کلوبولین“ تھا۔

ڈامیس کا پیشہ سوداگری تھا۔ اس کا بیٹا ابھی پوری طرح جوان بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے اس بیٹے کو ایک تجارتی قافلے کے ہمراہ مصر بھیجا تاکہ اس کی تربیت ہو۔

وہ اس قافلے کے ہمراہ مصر آیا ضرور لیکن یہاں کی علمی ترقی دیکھ کر ایسا متاثر ہوا کہ ان اساتذہ کے سامنے اکتسابِ علم کرنے بیٹھ گیا۔ یہاں اس نے فلسفے اور ریاضی کے سبق سیکھے۔ واپس آیا تو سوداگری سے نفرت ہو چکی تھی۔ ذاتی مشاہدے اور غور و فکر کا فرش بچھا کر بیٹھ گیا۔ علمی تحقیق کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

سورج گرہن اس دور کے انسانوں کے لیے ایک پُراسرار حالت تھی۔ توہم پرست انسان اسے ٹالنے کے لیے دعائیں مانگتے تھے، خیرات کرتے تھے، ڈھول پیٹتے اور تیر چلاتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کوئی دیوتا ہے جو ناراض ہو گیا۔ اس کی کوئی سائنسی توجیہ تھی ہی نہیں۔ اس نے سورج گہن کی اصل وجہ جان لی لیکن دنیا نے اس کا مذاق اڑایا۔ اس نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے حساب لگا کر بتایا کہ 585 ق م میں فلاں تاریخ کو کامل سورج گرہن ہوگا جب دن میں رات کی تاریکی پھیل جائے گی۔ لوگوں نے اس تاریخ کا بے صبری سے انتظار کیا اور جب اس تاریخ کو عین دن کے وقت رات کا سماں ہو گیا تو لوگوں نے اس کی عظمت کو مان لیا۔

اسی شخص نے پہلی مرتبہ یہ انکشاف کیا کہ سورج لاکھوں میل چوڑا ہے ورنہ اس وقت لوگ اسے اتنا ہی بڑا سمجھتے تھے جتنا وہ نظر آتا تھا۔ آج ہم سب یہ جانتے ہیں کہ سورج کا قطر آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار میل ہے۔

کسی سال 360 دن کا سمجھا جاتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے دنیا کو بتایا کہ سال 365 دن کا ہوتا ہے۔ اس کا یہ اندازہ آج تک صحیح ثابت چلا آرہا ہے۔

مصر کے فلک بوس مینار جو اہرامِ مصر کہلاتے ہیں اس وقت بھی موجود تھے لیکن ان کی پیمائش سے کوئی واقف نہیں تھا۔ نہ کوئی ایسا آلہ دریافت ہوا تھا جو انہیں ناپنے کے لیے کارآمد ثابت ہوتا۔ وہ غور و فکر کرتا رہا کہ انہیں کیسے ناپا جائے اور پھر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس نے دن کا ایک ایسا وقت منتخب کیا جب اس کا اپنا سایہ بھی اس کے قد کے برابر نکلتا تھا اور اسی وقت سائے کی مدد سے ان فلک بوس میناروں کی بلندی کو ناپ لیا۔

اس نے جیومیٹری کے ایسے مسئلے بھی دریافت کیے جو اس وقت دنیا کے لیے نئے تھے لیکن آج جیومیٹری کا علم انہی دریافتوں پر کھڑا ہے۔ مثلاً دائرے کے مرکز میں سے گزرنے والا ہر سیدھا خط جس کی لمبائی دائرے کے محیط کی ایک طرف سے مقابل کی دوسری طرف تک لی جائے اس دائرے کو ایسے دو حصوں میں تقسیم کردیتا ہے جو سب تہے میں بالکل برابر ہوتے ہیں یا اگر کسی مثلث کے دو ضلعے آپس میں برابر ہوں تو ان ضلعوں کے مقابل کے زاویے بھی برابر ہوتے ہیں یا پھر جو زاویہ نصف دائرے کے اندر بنتا ہے، قائمہ ہوتا ہے۔

ان مسائل کو ثابت کرنا آج بھی نصاب کا حصہ ہے۔ ان مسائل کو پہلے کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ اس عظیم انسان نے انہیں دریافت بھی کیا اور ان کے ثبوت بھی فراہم کیے۔

اس عظیم سائنس داں کا نام تھالیس (Thales) تھا جو حضرت عیسیٰؑ سے چھ صدی پہلے پیدا ہوا اور ایک سو برس کے لگ بھگ عمر پاکر اس دنیا کو چھوڑ گیا۔

اس کے نام سے دنیا بے خبر ہی رہتی لیکن مشہور یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس جو تھالیس سے دو صدی بعد گزرا ہے اپنی شہرۂ آفاق تاریخ میں اسے دریافت کرکے زندۂ جاوید کردیا۔

تھالیس خوش نصیب تھا کہ اسے ایسا مورخ مل گیا۔

اعجاز حسین سہنار، لورپور تھل سے۔ آپ فرماتے ہیں "اس بار ادارہ کا انتظار طویل ہو گیا اور پرچہ عید کا چاند بنتا گیا۔ 11 تاریخ کو ملا۔ ہم چاہتے تھے کہ سرگزشت کے سنگ آخری پندرہ روزے مصروفیت میں کٹ جائیں گے لیکن شاید یہ ادارے سے ملاقاتوں میں خوشیاں انتظار ... 30 اگست کو ... [illegible]

[illegible]

اسے یہ دکھاوے اور جھوٹی محبت جتانے والی وہ خود ہے جب اسے حق نہ ملا تو خاندانی دشمنی سے کام لیا جس میں وہ حق بجانب تھا۔ یہ سب اس کی فطرت میں شامل تھا۔"

منظر علی خان، ماڈل ٹاؤن لاہور سے "ماہنامہ سرگزشت کا ستمبر کا شمارہ پیش نظر ہے۔ شہر خیال میں حاضر ہو رہا ہوں مختصر تبصرہ کے ساتھ۔ کراچی کے بارے میں آپ کا سخن نظر سے گزرا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارا وطن بین الاقوامی سازشوں کا مرکز بن چکا ہے۔ یہ دہشت گردی ... [illegible] ... ستمبر 2001ء ... [illegible]

[illegible]

سدرہ بانو غوری، کراچی سے لکھا ہے ... [illegible]

[illegible]

عزیز جی آئی آمد، چکوال سے ... [illegible]

[illegible]

محمد سلیم اختر ... [illegible]

افتخار احمد گھمن ... [illegible]

محمد ایاز راہی ... [illegible]

[illegible]

عبداللہ ... [illegible]

راجا ثاقب نواز ... [illegible]

ناصر حسین رند ... [illegible]

[illegible]

... سعید احمد چاند کا کراچی سے پیغام ... [illegible]

[illegible]

... ملک جاوید محمد خان سرگانی وردانی کا مراسلہ ... [illegible]

[illegible]

... محمد سجاد ... [illegible]

اور اپنی افرادیت کو مستحکم کرتے جا رہے ہیں ... انقلابی قزاق پڑھ کر تو لگتا ہے ... [illegible]

[illegible]

علی مغل، بھوال، ضلع ... سے لکھتے ہیں "میں آپ کا بہت مشکور و ممنون ہوں کہ آپ نے میرے ... [illegible]

[illegible]

ایم اے خالق ... سے لکھتے ہیں "ستمبر کا شمارہ ... [illegible]

[illegible]

سلطان مسعود نے بہاولپور سے لکھا ہے "السلام علیکم، امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ کافی عرصے سے سرگزشت کا قاری ہوں۔ ... 340 روپے ... 17 تاریخ ... 26، 27 ... Grand Canyon ... [illegible]

دنیا کے لوگ Aliens مردہ حالت میں ملے تھے۔ یہ واقعہ 28 جون 1947ء کو امریکی ریاست نیو میکسیکو کے شہر روزویل Roswell کے قریب پیش آیا تھا۔ ... [illegible] ... Haunted ... [illegible]

[illegible]

عدنان ... سے لکھتے ہیں "اکتوبر 98ء سے سرگزشت کا باقاعدہ قاری ہوں ... 1993ء ... [illegible]

[illegible]

جویریہ ... کا خط ... Exceptional ... [illegible]

[illegible]

شیخ خانم ... [illegible]

[illegible]

کامیڈین

ڈاکٹر — حسن جمیل

اس کی زندگی عسرت و تنگدستی، فاقہ کشی و بدحالی پر مبنی تھی۔ ماں پاگل خانے میں اور وہ لوگوں کے رحم و کرم پر زندہ تھا مگر اس کے اندر کا اداکار اسے ہنسنے ہنسانے پر مجبور کیے ہوئے تھا۔ اس نے نہایت کم سنی میں اسٹیج پر پہلا پروگرام کیا، وہ بھی اس لیے کہ لوگ اس کی ماں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ پھر جب فاقوں سے تنگ آکر اس نے اداکاری شروع کی تو لوگ اس کے دیوانے بن گئے۔ یورپ ہو کہ ایشیا، افریقا ہو کہ آسٹریلیا، ہر علاقے میں لوگ اس کی فلمیں دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑتے۔ وہ اداکاری کا ساحر اعظم سب کو بس مسحور کرتا جا رہا تھا کہ حکومت امریکا اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئی مگر کیوں؟

دنیا بھر میں سب سے زیادہ مقبول اداکار کی سوانح حیات

نیلی آنکھوں اور گھنے بھورے بالوں والی اسٹیج ڈانسر اور گلوکارہ "للی" چھوٹوں سے اپنی آواز کی طرف سے فکرمند ہو گئی تھی۔ ہلکی سی سردی بھی اس کی آواز کو یوں جکڑ لیتی تھی کہ بعض اوقات اس کی اونچی تان بھی ہلکی سرگوشی معلوم ہوتی تھی اور اسے تماشائیوں کے مذاق کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ لندن کی سردی میں یہ مواقع اکثر آتے تھے اور یہ کیفیت کئی کئی ہفتے قائم رہتی تھی۔ جس تھیٹر کمپنی سے وہ وابستہ تھی، اس کے مرض کے باوجود اس کی دل جوئی میں لگی ہوئی تھی اور اسے موقع دے رہی تھی کہ وہ اپنا علاج کرا لے لیکن کب تک؟

کوئی عام سی عورت ہوتی تو یہ کمزوری اس کی ذات تک محدود رہتی لیکن اس کی تو آمدنی ہی اس کی صحت مندی سے منسوب تھی اور اس کی آمدنی کے حق دار اس کے دو معصوم بچے تھے، سڈنی اور چارلی اور دونوں ایسے کہ باپ کی محبت اور آمدنی دونوں سے محروم۔

وہ سولہ سال کی تھی جو اپنے غیر معمولی حسن اور دلکشی کو لے کر اس پیشے میں آ گئی تھی اور ہاتھوں ہاتھ پذیرائی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یہ عمر ہی ایسی تھی کہ تھیٹر کی دنیا میں اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس پر مستزاد اس کا حسن تھا کہ ہر آنکھ اس کے طواف میں مشغول تھی۔ ہر ساتھی اداکار اس کے قریب ہونے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ انہی دنوں اس کمپنی نے ایک آئرش میلوڈراما کھیلنے کا بندوبست کیا۔ اس ڈرامے کے لیے "للی" کو ایک نمایاں کردار کے لیے منتخب کر لیا گیا۔

اس ڈرامے کی ریہرسل کے دوران ایک اداکار "چیلین" اس سے بہت نزدیک آ گیا۔ جب یہ ڈراما کھیلا گیا تو اس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے اور ساتھ ہی "للی" "چیلین" کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ دونوں ہر جگہ ساتھ دیکھے جانے لگے۔ چیلین کی کثرت سے شراب نوشی کے باوجود وہ اس پر فریفتہ تھی۔ ساتھی اداکاروں کے درمیان یہ بات گردش کر رہی تھی کہ دونوں بہت جلد شادی کر لیں گے لیکن ایک روز یہ حیران کن خبر ہر زبان پر تھی کہ وہ کسی لارڈ کے ساتھ افریقا بھاگ گئی۔ کمپنی کا نقصان ہو گیا اور سننے والوں کو باتیں مل گئیں۔

"وہ تو چیلین کی محبت میں گرفتار تھی نا؟"

"چیلین بھی اس کا دیوانہ ہو رہا تھا۔"

"پھر وہ کسی اور کے ساتھ کیوں بھاگ گئی؟"

"چیلین اسے کیا دے سکتا تھا۔ لارڈ کے ساتھ وہ پُرآسائش زندگی گزارے گی۔"

''چپلن کی محبت؟''
''شراب کے نشے اور سگریٹ کے دھوئیں میں گم ہو جائے گی۔''
''بے چارہ چپلن!''
یہ باتیں کچھ دنوں چلیں پھر موسم کی طرح بدل گئیں۔ تھیٹر کی چکا چوند ایک منظر کو زیادہ دن تک نہیں دیکھنے دیتی۔ لوگوں نے اس قصے کو بھی بھلا دیا۔ بظاہر چپلن نے بھی دل پر پتھر رکھ لیا تھا البتہ اس کی شراب نوشی پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔ کوئی تھیٹر کمپنی ایسے تھیڑ تے وار شخص کو اپنے ساتھ رکھنے پر تیار نہیں تھی۔ اب وہ شراب خانوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ شاید اسے اب بھی اپنی محبوبہ کا انتظار ہو۔
لندن کی کہر آلود شامیں ایک ایک کر کے گزرتی رہیں۔ پھر ایک دن وہ اداکارہ لندن کے علاقے ایسٹ لین وال ورتھ میں دیکھی گئی جہاں اس کا باپ چارلس ہل مقیم تھا۔ پھر کسی نے اسے اس تھیٹر کمپنی کے منیجر کے دفتر میں دیکھا جہاں وہ دو سال پہلے کام کرتی تھی اور افریقا جانے سے پہلے اچھا خاصا نام پیدا کر چکی تھی۔
''تم اور لندن میں؟ کیا مستقل آ گئیں؟''
''ہاں اور اب میں یہیں رہوں گی۔''
''کیا لارڈ صاحب نے اجازت دے دی کہ تم لندن میں رہ سکتی ہو اور تھیٹر میں کام بھی کر سکتی ہو؟''
''میں اس سے طلاق لے کر آ گئی ہوں اور اب لندن میں اپنے والدین کے ساتھ ہوں اور چاہتی ہوں کہ کچھ کما سکوں تاکہ ان کا ہاتھ بٹاؤں۔''
لندن میں اشتہار چھپ گئے۔ ماضی کی ''للی'' کو ابھی لوگ بھولے نہیں تھے۔ اس رات تھیٹر کی عمارت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ وہ اسٹیج پر نمودار ہوئی تو ہال تالیوں اور سیٹیوں سے گونج اٹھا۔
چپلن کی بے خبری کو بھی خبر ہو گئی۔ اس کی شراب نوشی نے اس کی مستقل مزاجی کو تو بہا دیا تھا۔ بھوکے مرنے کے ڈر سے کچھ پیسے کما لیتا تھا۔ اب پیسے ختم ہو جاتے تھے تو پھر کسی تھیٹر کا رخ کرتا تھا۔ وہ اس وقت بھی کسی شراب خانے میں بیٹھا تھا کہ اس نے ''للی'' کی واپسی کی خبر سنی۔ اس کی سوئی ہوئی محبت بیدار ہو گئی۔ وہ دوسرے دن اس سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا اور پھر یہ ملاقاتیں روز ہونے لگیں۔ چپلن ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا تھا۔ اس نے اپنی محبت جیتنے کی کوشش کی اور ''للی'' سے شادی کر لی۔

''للی'' نے اپنے نئے شوہر سے کوئی بات چھپائی نہیں تھی۔ اس نے پہلے دن ہی بتا دیا تھا کہ جس لارڈ سے اس نے شادی کی تھی اس سے ایک بیٹا بھی ہے، جس کا نام سڈنی ہے۔ بچہ اس وقت صرف ایک سال کا تھا۔ چپلن نے اس بچے کو بھی قبول کر لیا تھا۔
''للی'' ایک ایسی اداکارہ تھی جو 25 ڈالر ہفتہ کماتی تھی۔ چپلن بھی کچھ نہ کچھ کما ہی لیتا تھا۔ یہ سب آمدنی مل کر اتنی ہو جاتی تھی جس سے تمام ضروریات بہ آسانی پوری ہو سکتی تھیں۔ انہوں نے تین کمروں کا سجا سجایا مکان کرائے پر لے لیا تھا اور ایک خادمہ بھی رکھ لی تھی جو زیادہ تر سڈنی کو سنبھالے رہتی تھی۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ چپلن کی آوارگی پھر شروع ہو گئی تھی۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ رات کو وہ کس وقت گھر آئے، آئے بھی یا نہ آئے۔
ہر رات دو گھوڑوں والی بگھی للی کو تھیٹر لے جانے کے لیے آیا کرتی تھی اور یہی بگھی شو ختم ہو جانے کے بعد اسے گھر چھوڑ جاتی تھی۔
یہ ایک قابلِ رشک زندگی تھی جو وہ گزار رہی تھی۔ چپلن بھی کم و بیش اس کی دولت پر ہی گزارہ کر رہا تھا۔ اسے شراب کے لیے پیسے چاہیے ہوتے تھے جو بہ آسانی مل رہے تھے۔ وہ للی جیسی گلوکارہ کا شوہر تھا لہٰذا اسے پلانے یا قرض دینے والے بھی بہت تھے۔
چپلن سے شادی کو تین سال ہو گئے تھے کہ 16 اپریل 1889ء کی شب للی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کا نام اس نے باپ کے نام پر چارلی چپلن رکھا۔ سڈنی جو اس کے پہلے شوہر کا بیٹا تھا اب چار سال کا ہو گیا تھا۔ چارلی کے پیدا ہونے کی سب سے زیادہ خوشی اس کو ہوئی تھی کہ اس کے ساتھ کھیلنے والا ایک بھائی اس کے گھر میں آ گیا۔
چارلی کے پیدا ہونے کے بعد وہ یہ توقع کرنے لگی تھی کہ اب اس کا شوہر ایک ذمے دارانہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گا لیکن اس کی آوارگی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ اب تو وہ تشدد پر اتر آیا تھا۔ وہ چاہتی تو پولیس کی مدد لے سکتی تھی لیکن وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ آس پڑوس کی کوئی عورت پوچھتی بھی تو وہ چپلن کے حق میں بولتی۔ اس کے لہجے میں کوئی تلخی نہیں بلکہ ہمدردی اور نرمی ہوتی لیکن جب چپلن نے کئی کئی دن گھر سے غائب رہنا شروع کر دیا تو اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ پھر اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ کسی اور عورت کے ساتھ رہنے لگا ہے۔ للی سب کچھ برداشت کر سکتی تھی، اپنی توہین

اسے برداشت نہیں تھی اور یہ اس کی توہین تھی کہ اس کا شوہر اس کے ہوتے ہوئے کسی اور سے تعلق رکھے۔ اس نے اس مرتبہ چپلن کو معاف نہیں کیا اور اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس وقت اس کے بیٹے چارلی چپلن کی عمر ایک سال تھی اور اس کا بڑا بیٹا سڈنی پانچ سال کا تھا۔ اس نے چپلن سے کسی نان نفقے کا مطالبہ بھی نہیں کیا اور چپلن اسے چھوڑ کر اپنی دنیا میں چلا گیا۔
اسے شوہر کے چلے جانے کا افسوس ضرور ہوا ہو گا لیکن وہ تھیٹر کی دنیا میں اچھے دن گزار رہی تھی۔ وہ اتنا کما لیتی تھی کہ اپنے بچوں کو ایک اچھی زندگی دے سکتی تھی۔ ان کی ضروریات نہایت اچھی طرح پوری کر سکتی تھی۔ اس کے بچے شاندار کپڑے پہن رہے تھے۔ بہترین غذا کھا رہے تھے۔ ان کی نگرانی کے لیے ایک ملازمہ اب بھی موجود تھی۔ گھوڑا گاڑی اسی طرح آتی تھی اور وہ اسٹیج پر نغمے بکھیرنے تھیٹر کی طرف روانہ ہو جاتی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بدبختی اس کے تعاقب میں ہو گی۔
وہ اپنی آواز کی طرف سے پریشان رہنے لگی تھی۔ سردیوں کا موسم اس کے لیے قیامت بن کر آتا تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اس کمزوری کو چھپا رہی تھی۔ وہ مسلسل اعصابی دباؤ کا شکار رہنے لگی تھی اور تنہائی سے بچنے کے لیے چارلی کو اپنے ساتھ تھیٹر لے جانے لگی تھی۔
موسم نے اس سے تبدیلی کی چادر اوڑھی اور سرما کی آمد ہوئی۔
وہ ایک ایسی ہی سرد رات تھی کہ تھیٹر سے آتی ہوئی گھوڑا گاڑی دروازے کے باہر آ کر رکی۔ وہ تیار بیٹھی تھی۔ اس نے ایک لمبا کوٹ پہن لیا تھا۔ گلے میں مفلر لپیٹ لیا تھا کہ سردی سے محفوظ رہے۔ گھر سے نکلتے وقت ہیٹ بھی سر پر رکھ لیا تھا۔ شام تک اس کی آواز ٹھیک تھی اس لیے کچھ اطمینان بھی حاصل تھا۔ اس نے پانچ سالہ چارلی کا ہاتھ پکڑا اور بگھی میں سوار ہو گئی۔
سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس کے نام کی اناؤنس منٹ ہوئی اور وہ تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر پہنچ گئی۔ آرکسٹرا نے دھن چھیڑی اور اس کی سریلی آواز نے تماشائیوں کے دل موہ لیے لیکن اچانک سردی نے اپنا کام دکھا دیا۔ اس کی آواز اس کے گلے میں ہی کہیں ڈوب کر رہ گئی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن تماشائی اس کی آواز سننے سے محروم تھے۔ وہی شائقین جو اس کی پرفارمنس پر تالیاں پیٹ رہے تھے، اب اس کا مذاق اڑانے اور آوازے کسنے لگے۔ وہ کچھ دیر اس بے عزتی کا مقابلہ

کرتی رہی اور پھر روتی ہوئی اسٹیج سے نیچے اتر آئی۔
چارلی اسٹیج منیجر کے ساتھ بیٹھا تھا اور اس تمام منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔
اس کی ماں منیجر کے پاس آ گئی۔ اس کے آنسو اس کے رخساروں پر نظر آ رہے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ منیجر اس کی پرفارمنس سے خوش نہیں ہے۔ اس نے اچانک چارلی کا ہاتھ پکڑا اور اس کی ماں سے مخاطب ہوا۔
''تمہارا یہ بیٹا اچھا پرفارمر ہے، اتنا چھوٹا ہے لیکن کئی اداکاروں کی کامیاب پیروڈی کر لیتا ہے۔ میں کئی مرتبہ اسے دوستوں کے سامنے پیروڈی کرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ تمہاری جگہ میں اسے اسٹیج پر لے جاتا ہوں۔''
اس نے اجازت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور چارلی کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج پر لے گیا۔ اس کا تعارف کرایا اور تنہا چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔
چارلی کو اس وقت کا ایک مشہور نغمہ زبانی یاد تھا۔ وہ سڈنی کے ساتھ مل کر اکثر گایا کرتا تھا۔ اس نے وہی نغمہ چھیڑ دیا۔ آرکسٹرا نے اس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔
ابھی اس نے آدھا نغمہ گایا تھا کہ چاروں طرف سے پیسوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ تماشائی تالیاں بجا رہے تھے اور اس کی طرف سکے اچھال رہے تھے۔ وہ بچہ تو تھا ہی اسٹیج پر اتنے سکے دیکھے تو گانا چھوڑ کر سکے جمع کرنے میں لگ گیا۔ منیجر بار بار اسے اشارہ کر رہا تھا کہ وہ گانا شروع کرے لیکن اس نے اعلان کیا کہ پہلے وہ یہ سب سکے جمع کر کے اپنی ماں کو دے گا اس کے بعد گانا گائے گا۔ اس کی مدد کے لیے منیجر بھی ایک رومال لے کر آ گیا اور پیسے جمع کرنے لگا۔ تماشائیوں کے لیے یہ تماشا بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ہنسی کا ایک طوفان تھا جو ہال میں جاری تھا۔ اس نے سب سکے اکٹھے کیے اور بھاگتا ہوا ماں کے پاس آیا۔ رومال ماں کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور بھاگتا ہوا اسٹیج پر پہنچ گیا اور گلوکاری کا دوبارہ آغاز کر دیا۔ اس کے بعد اس نے وہ حرکت کی کہ تماشائی بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو گئے۔ اس نے اپنی ماں کے اس لمحے کی پیروڈی کی جب اس کی آواز گاتے گاتے اچانک بیٹھ گئی تھی اور ایک سرگوشی محسوس ہوئی تھی۔
تماشائی بے انتہا تالیاں بجا رہے تھے۔ تالیوں کی اس گونج میں اس کی ماں اسے لینے اسٹیج پر آ گئی اور جب وہ اسے لے کر اسٹیج سے نیچے اتر رہی تھی، ایک مرتبہ پھر پورا ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔

یہ رات اسٹیج پر لل کی پرفارمنس کی آخری رات ثابت ہوئی۔ دوسرے دن کی رات آئی تو اس کے دروازے پر کوئی بگھی نہیں تھی جو اسے تھیٹر تک لے کر جاتی۔ اس کے برعکس منیجر کا یہ پیغام موصول ہوا کہ جب تک اس کی آواز ٹھیک نہیں ہو جاتی وہ خود کو اسٹیج سے دور سمجھے۔ اسے امید تھی کہ جلد ہی اس کی آواز ٹھیک ہو جائے گی۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ اب وہ کبھی اپنی اصل آواز کو نہیں پا سکے گی۔

اسے اپنے فن اور اس سے ہونے والی آمدنی پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے شوہر کے خلاف بھی قانونی چارہ جوئی نہیں کی تھی لیکن اب اس کا وہی ہنر اس کے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔

اس نے کچھ رقم پس انداز کی ہوئی تھی جو اس کے برے دنوں کو بچا سکتی تھی لیکن یہ رقم اتنی قلیل تھی کہ چند دنوں میں ساتھ چھوڑ گئی۔ اس نے ایک ایک کر کے اپنے زیورات بیچنے شروع کر دیے کہ جب اس کی آواز بحال ہو جائے گی تو وہ ایسے بہت سے زیور دوبارہ بنا لے گی۔

وہ بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ اگر یہ زیورات اس طرح فروخت ہوتے رہے تو اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ اسے اپنے اخراجات میں کمی کرنی چاہیے اور آمدنی کا کوئی ذریعہ ڈھونڈنا چاہیے۔ اس نے تین کمروں کی رہائش ترک کی اور دو کمروں کا مکان لے کر رہنے لگی۔ پھر یہ مکان بھی مہنگا لگنے لگا۔ ہم تو ایک کمرے میں بھی گزارہ کر سکتے ہیں یہ سوچ کر اس نے ایک کمرا انتہائی معمولی کرائے پر لے لیا۔ یہ کمرا ایک تہ خانے میں واقع تھا۔

اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنی آواز کی خوبصورتی ہمیشہ کے لیے کھو چکی ہے۔ ایک بھدی آواز تھی جو اس کے لیے بات چیت کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ مایوسی کے ان دنوں میں وہ مذہب کی طرف راغب ہوئی اور باقاعدگی سے چرچ جانے لگی۔ اس دوران اسے یہ خیال بھی آیا کہ اگر وہ اجرت پر سلائی کرے تو کچھ نہ کچھ کما سکتی ہے۔ چرچ کے اراکین نے اس کی غربت کو دیکھتے ہوئے اپنے لباس کی تیاری اسے سونپ دی۔ وہ خوش تھی لیکن چند شلنگ سے زیادہ کمانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ یہ معمولی آمدنی اس کے اور اس کے بچوں کے لیے ناکافی تھی۔

ان پیہم صدمات نے اس کی ذہنی حالت ایسی بنا دی تھی کہ گھنٹوں تنہا بیٹھی سوچتی رہتی تھی۔ یقیناً اچھے دنوں کے بارے میں سوچتی ہوگی زیادہ تر چپ رہتی تھی۔

ایک روز چارلی بہت دیر بچوں کے ساتھ کھیلنے کے بعد گھر میں آیا تو اس نے دیکھا اس کی ماں اس صندوق کو کھولے بیٹھی ہے جس میں تھیٹر کے ملبوسات اور مختلف قسم کی وگیں وغیرہ رکھی تھیں۔ وہ ایک ایک چیز کو اٹھا کر دیکھ رہی تھی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔ چارلی چپکے چپکے آیا اور اس کی پشت کی جانب کھڑا ہو گیا۔

وہ خود سے کہہ رہی تھی "میں ان سب کپڑوں کو سنبھال کر رکھوں گی۔ جب میری آواز ٹھیک ہو جائے گی اور میں تھیٹر کی دنیا دوبارہ آباد کروں گی تو یہ سب لباس میرے کام آئیں گے۔"

اسی وقت چارلی اس کے سامنے آ گیا اور اس کی مجبوری کو سمجھے بغیر اس سے کہنے لگا "ماں تم دوبارہ تھیٹر میں کیوں کام نہیں کرتیں۔ یاد ہے جب تم تھیٹر جاتی تھیں تو ہمارے کھانے کے لیے کتنی اچھی اچھی چیزیں لاتی تھیں۔ اب تو گھر میں کچھ کھانے کو ہوتا ہی نہیں۔"

اس کی ماں نے اس معصوم بچے کو غور سے دیکھا "تھیٹر کی زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ ناقص، مصنوعی اور گندی ایسی دنیا کہ جس میں رہ کر کوئی بھی فرد بہ آسانی خدا کو فراموش کر سکتا ہے۔ تم اپنے باپ ہی کو دیکھ لو۔"

"پہلے تو آپ جاتی تھیں اور مجھے بھی لے کر جاتی تھیں۔"

"اس وقت مجھے عقل نہیں تھی۔ میں بہت نادان تھی میرے بچے۔"

وہ سمجھ چکی تھی کہ اب کبھی تھیٹر نہیں جا سکے گی اس لیے وہ اس دنیا کو برا کہہ کر خود کو تسلی دے رہی تھی ورنہ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی غربت کی وجہ کیا ہے۔

وہ مفلسی کی اس حد کو چھو رہی تھی کہ سردیاں آنے والی تھیں اور سڈنی کے پاس کوئی ایسا گرم لباس نہیں تھا جسے پہن کر وہ اسکول جا سکے۔ جب وہ گرم کوٹ کی فرمائش کر کے رونے لگا تو لل بھی روئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ دونوں کو روتا دیکھ کر ننھا چارلی بھی منہ بسورنے لگا۔ عجیب منظر تھا، گھر میں جتنے فرد تھے سب رو رہے تھے۔ پھر وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھی اور اپنی پرانی ویلوٹ کی جیکٹ اٹھا کر لے آئی۔

"میں تمہارے لیے ایک ایسا کوٹ تیار کروں گی جسے دیکھ کر تمہارے دوست کہیں گے واہ کیا کوٹ ہے۔"

اس خوش خبری کو سن کر سڈنی خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس کی خوشی پر وہ ایک مرتبہ پھر رو پڑی۔ اسے وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ بچوں کی ہر فرمائش پوری کرنے کے لائق

تھی۔

اس نے اپنی پرانی جیکٹ سے کوٹ تیار کرنے کی کوشش کی۔ کوٹ تیار بھی ہو گیا لیکن اسے کوئی بہ مشکل ہی کوٹ کہہ سکتا تھا۔ سڈنی نے دیکھا تو رو پڑا۔

"کیا میں یہ عجیب و غریب کوٹ پہنوں گا۔ لڑکے کیا سوچیں گے۔"

"کوئی کچھ نہیں سوچتا، تمہیں تو سردی سے بچنا ہے اور پھر ایسا کوٹ کسی دوسرے بچے کے پاس نہیں ہوگا۔ منفرد اور آرام دہ۔"

"اچھا پہن لوں گا مگر اس کے ساتھ جوتے؟"

"میں نے وہ بھی تیار کر لیے ہیں۔"

اس نے وہ جوتے بھی اسے لا کر دے دیے جو اس نے اپنے اونچی ایڑی والے جوتوں کی ایڑیاں کاٹ کر اس کے لیے بنائے تھے۔

وہ جب یہ کوٹ اور عجیب و غریب جوتے پہن کر اسکول گیا تو جاتے ہی لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بن گیا۔ لڑکوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا، کوئی مداری کہہ رہا تھا، کوئی بھکاری۔

وہ جب تک اسکول میں رہا طنزیہ فقروں کا نشانہ بنتا رہا۔ کئی لڑکوں کی اس نے ٹھکائی کی، کئی لڑکوں سے پٹائی کھائی اور [illegible] گھر آ گیا۔

"کل سے میں اسکول نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں میرے بیٹے؟"

"جب انسان کے پاس پہننے کو کپڑے ہی نہ ہوں تو اسکول جانے کا کیا فائدہ۔ یہ لباس تو اخبار بیچنے والے کسی لڑکے کے لیے موزوں ہے۔ میں کل سے اخبار بیچوں گا۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ اب تم اخبار بیچا کرو گے؟"

"ہم اتنے غریب ہیں کہ لوگ ہمیں خیرات دیتے ہیں، کہیں سے کھانا آتا ہے تو ہم کھاتے ہیں پھر میں اسکول کیوں جاؤں؟"

اس نے جو کہا تھا وہی کیا۔ اس نے بسوں میں اخبار بیچنے شروع کر دیے۔ وہ سمجھ رہا تھا اس کی یہ کاوش گھر کی مفلسی دور کر دے گی لیکن اس کے لائے ہوئے چند سکے پانی میں ایک قطرہ ٹپکانے کے برابر ثابت ہوئے۔ انہی دنوں لل بیمار پڑ گئی۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکی تھی کہ اس کے بیٹے نے اسکول جانا چھوڑ دیا ہے۔ وہ نصف سر کے درد کے مرض میں گرفتار ہو گئی۔ سلائی کا جو کام کر لیا کرتی تھی، اس سے بھی گئی۔ تہ خانے کے تاریک کمرے میں چپ چاپ پڑی رہتی تھی۔ ننھا چارلی اس کے سرہانے بیٹھا روتا رہتا تھا یا بھوک سے بے حال ہو کر اس کے قریب ہی فرش پر سو جاتا تھا۔

ایک روز لل اپنے اچھے دنوں کے خوابوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ سڈنی بھاگتا ہوا اس تاریک کمرے میں داخل ہوا اور اخباروں کا بنڈل ایک طرف پھینکتے ہوئے بڑی طرح چلایا "ماں دیکھو، مجھے ایک پرس ملا ہے۔"

"کیسا پرس۔ لاؤ مجھے دو۔"

"دیکھو تو اس میں ڈھیر سارے سکے ہیں۔" اس نے کہا اور پرس ماں کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اس کی ماں نے پرس کھول کر دیکھا۔ اس میں تانبے اور چاندی کے بہت سارے سکے تھے۔ اس نے گھبرا کر پرس کو بند کر دیا جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

"کس کا پرس چھین کر لے آئے ہو؟"

"چھین کر نہیں لایا ہوں۔ مجھے یہ پرس ایک بس سے ملا ہے۔"

"تمہیں یہ پرس اس کے مالک کو لوٹا دینا چاہیے تھا۔"

سڈنی کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چپ کھڑا تھا اور اس کی ماں پرس کا جائزہ لے رہی تھی لیکن اسے ایسی کوئی نشانی نہیں ملی جس کے ذریعے پرس کے مالک تک پہنچا جا سکتا۔

"ماں تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ ہماری مفلسی کو دیکھتے ہوئے خدا نے بطور خاص یہ پرس ہمارے لیے بھیجا ہے۔"

اس وقت تک شاید وہ بھی اس نظریے کی قائل ہو چکی تھی۔ اس نے پرس کو بستر پر الٹ دیا۔ تانبے اور چاندی کے لاتعداد سکوں کے علاوہ سونے کے سات سکے نکل کر بستر پر پھیل گئے۔ یہ اتنی تعداد میں تھے کہ بچے خوشی سے چیخنے چلانے لگے۔

دولت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ لل جو بیمار تھی تیزی سے صحت یاب ہونے لگی۔ اس کے سر کا درد غائب ہو گیا اور دو چار دن ہی میں وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"آؤ بچو... خدا کی بھیجی ہوئی رقم سے تمہارے لیے کپڑے خرید لے جائیں۔"

اگلے دن وہ انہیں پکنک منانے کے لیے سمندر پر لے گئی۔

اس رقم نے کچھ دنوں تک خوب ساتھ دیا اور پھر جیب خالی ہوگیا۔ جب تمام رقم خرچ ہوگئی تو فاقے پھر سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ لل نوکری ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ نوکری تو کیا ملتی رہی سہی رقم بھی خرچ ہوگئی۔ سلائی مشین جو اس نے قسطوں پر خریدی تھی ضبط کرلی گئی کیونکہ وہ اس کی قسطیں ادا کرنے کے لائق نہیں رہی تھی۔ دس شلنگ فی ہفتہ کی آمدنی بھی ماری گئی۔

اب کوئی ایسا دروازہ نہیں تھا جسے وہ کھٹکھٹا سکتی۔ فاقے منہ کھولے کھڑے تھے۔ گھر کی ہر قابل ذکر چیز فروخت ہوچکی تھی۔ مکان کا کرایہ کئی مہینے سے چڑھا ہوا تھا۔ ایسے میں کسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ بچوں کو لے کر محتاج خانے چلی جائے۔ اس کی صحت جواب دے چکی تھی۔ وہ حالات سے مزید نہیں لڑسکتی تھی۔ اس مشورے کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

چارلی تو خیر چھوٹا تھا لیکن سڈنی اتنا بڑا ہوگیا تھا کہ اسے محتاج خانے جاتے ہوئے شرم محسوس ہورہی تھی لیکن جب ماں نے اسے بتایا کہ مجبوری کیا ہوتی ہے تو وہ تیار ہوگیا۔

محتاج خانے کے دروازے میں داخل ہوتے ہی انہیں معلوم ہوگیا کہ محتاج خانہ کیا ہوتا ہے۔ انتظامیہ نے ان کی ماں کو خواتین کے وارڈ کی طرف بھیج دیا۔ سڈنی کو بڑے بچوں کی طرف دھکیل دیا اور چارلی سات سال سے کم عمر کے بچوں کے وارڈ میں اکیلا رہ گیا۔ وہ کبھی ماں سے الگ نہیں رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنا وہ کمرا یاد آرہا تھا جس میں وہ ماں کے ساتھ رہتا تھا لیکن یہ سوچ کر خوش بھی ہورہا تھا کہ اب اس کی ماں کا علاج ہوسکے گا۔

تین ہفتوں تک چارلی اور سڈنی کو یہ اطمینان رہا کہ وہ ماں سے الگ سہی مگر ایک عمارت میں تو ہیں۔ ملاقاتوں کے کمرے میں ملاقات بھی ہوجاتی تھی لیکن اب انہیں ہین ول اسکول لے جایا جارہا تھا۔ یہ اسکول یتیم اور مفلس بچوں کے لیے مخصوص تھا اور لندن سے تقریباً بارہ میل کی دوری پر واقع تھا۔

یہاں پہنچنے کے بعد وہ اور اس کا بھائی ایک مرتبہ پھر جدا ہوگئے۔ سڈنی کو بڑے لڑکوں کے ساتھ رکھا گیا تھا جبکہ چارلی چھوٹے لڑکوں کے بلاک میں تھا۔

چارلی اس اسکول کے ہاسٹل میں سونے کے لیے لیٹا تو اسے اپنی ماں یاد آگئی۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ بند کرلیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے رونے کی آواز دوسرے بچوں تک پہنچے اور وہ مذاق کا نشانہ بنے۔ اس کی عمر چھ سال سے کچھ ہی زیادہ ہوئی تھی اور وہ ماں سے جدا کردیا گیا تھا۔ خوشی سے نہیں مجبوری سے۔ بھائی کا سہارا ہوسکتا تھا مگر وہ بھی بڑے لڑکوں کے وارڈ میں تھا اور کبھی کبھی ہی ملاقات ہوتی تھی۔

چارلی یہاں آکر کچھ دنوں گم صم رہا اور پھر اس ماحول کا عادی ہوتا چلا گیا۔ اس اسکول میں آنے کے بعد اسے پہلی خوشی یہ ملی کہ اس نے اپنا نام لکھنا سیکھ لیا۔ وہی نام جو بہت جلد آٹوگراف کے طور پر لکھا جانے والا تھا یعنی "چارلی چپلن۔"

ایک سال بعد اس کی ماں اس سے ملاقات کے لیے اسکول آئی تو خوش خبری اس کی زبان پر تھی۔ "چالی اب تم زیادہ دن مجھ سے دور نہیں رہوگے۔"

"کیا تم بھی اس اسکول میں آرہی ہو؟"

"نہیں میں تمہیں اسکول سے لے جاؤں گی۔"

"محتاج خانے والے ہمیں رکھ لیں گے؟"

"ہم اب محتاج خانے میں نہیں رہیں گے۔ میں تمہارے لیے ایک گھر کا بندوبست کررہی ہوں، جیسے ہی گھر ملتا ہے میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گی۔ پھر ہم ایک ساتھ رہیں گے جیسے پہلے رہتے تھے۔"

اس کی ماں کو سلائی کی ایک دکان پر نوکری مل گئی تھی۔ اب وہ دوبارہ خود زندگی کی تشکیل کے قابل ہوگئی تھی۔ لہٰذا چاہتی تھی محتاج خانے کی شرمناک زندگی سے نجات مل جائے۔ اس نے بھاگ دوڑ کرکے کننگٹن پارک کے عقب میں ایک کمرا کرائے پر لے لیا اور بچوں کے ساتھ اس کمرے میں منتقل ہوگئی لیکن بدقسمتی اس خاندان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ بہت جلد اس کی یہ ملازمت چھوٹ گئی۔ یہ حادثہ اتنی جلدی ہوگیا تھا کہ وہ کوئی معقول رقم پس انداز بھی نہیں کرپائی تھی۔ ایک مرتبہ پھر وہ ملازمت کے حصول کی جدوجہد میں مشغول ہوگئی۔ حالات اسی منزل پر آکر کھڑے ہوگئے تھے جہاں محتاج خانے جانے سے پہلے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر مجبور ہوگئی کہ بچوں کو لے کر محتاج خانے چلی جائے۔ مستقبل کا عظیم مزاحیہ اداکار سات سالہ چارلی چپلن ایک مرتبہ پھر محتاج خانے میں تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اپنی ماں سے دور کردیا گیا۔ اسے اسکول بھیج دیا گیا۔

"لل" ایک فنکارہ ہونے کے ناتے بے حد حساس تھی۔ اس نے بچوں کے لیے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے لیکن ہر خواب ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ پھر ایک دن وہ خود ٹوٹ گئی۔ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھی اور پاگل خانے بھیج دی گئی۔ چارلی اسکول میں تھا کہ اسے بتایا گیا اس کی ماں پاگل ہوگئی ہے۔ اسے

پھوٹ پھوٹ کر رو دینا چاہیے تھا لیکن یہ خبر سن کر وہ سکتے میں آگیا۔ نرس نے اسے آغوش میں لے لیا۔ "میرے بچے! تمہاری ماں بہت جلد ٹھیک ہوکر آجائے گی۔"

اس شفقت نے اس پر ایسا اثر کیا کہ وہ زاروقطار رونے لگا۔

دو ہفتے بعد سرکاری طور پر اسے اطلاع دی گئی کہ عدالت کے حکم کے مطابق دونوں بھائیوں کو باپ کے پاس بھیجا جارہا ہے۔ اب وہی ان کی نگرانی کا ذمے دار ہوگا۔

چارلی یہ خبر سن کر خوش ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو صرف دو مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ اسٹیج پر اور ایک مرتبہ وہ اسے سر راہ مل گیا تھا۔ اس نے اس کا نام پوچھا تھا اور اس نے بڑے فخر سے کہا تھا۔ "چارلی چپلن" اور اب وہ اس کے ساتھ رہنے جارہا تھا۔ یہ تصور ہی اس کے لیے دل خوش کن تھا۔ سڈنی البتہ خوش نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ جس کے پاس رہنے جارہا تھا وہ اس کا سگا باپ نہیں تھا اور یہ بات اسے معلوم تھی۔ عدالت کے اہلکار جب انہیں لینے آئے تو وہ غصے میں تھا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اہلکاروں کی ویگن کننگٹن روڈ پر واقع ایک مکان کے سامنے جاکر رکی۔ دروازے کی گھنٹی بجائی گئی۔ جواب میں ایک خاتون جس کی عمر تیس سال ہوگی باہر نکلی اور اہلکاروں کو دیکھ کر مخاطب ہوئی۔

"مسٹر چپلن گھر پر موجود ہیں؟"

"وہ تو کہیں گئے ہیں اور یہ معلوم بھی نہیں کہ کب تک آئیں گے۔"

"آپ ان کی کون ہیں؟"

"میرا نام لوئی ہے اور میں ان کی بیوی ہوں۔ آپ بتائیں آپ کو کیا کام ہے؟"

"ہم عدالت کی طرف سے آئے ہیں۔ عدالت نے حکم جاری کیا ہے کہ مسٹر چپلن کے یہ دونوں بچے اب ان کی تحویل میں رہیں گے کیونکہ ان کی ماں یعنی مسٹر چپلن کی سابقہ بیوی پاگل ہوچکی ہے اور ان کی دیکھ بھال کرنے سے قاصر ہے۔"

"یہ کیا مصیبت ہے۔ ان میں سے ایک تو چپلن کا بیٹا بھی نہیں ہے۔"

"مسز چپلن یہ عدالت کا حکم ہے کاغذات ہمارے پاس ہیں۔ ان پر دستخط کیجیے۔"

"یہ تو چپلن ہی کرسکتا ہے۔"

"آپ چپلن کو بتادیجیے گا۔ اگر اسے اعتراض ہوگا تو وہ عدالت سے رجوع کرے گا۔"

لوئی مجبور ہوگئی۔ کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد وہ ان دونوں بچوں کو گھر میں لے آئی۔ اس کا گھر جو دو کمروں پر مشتمل تھا بالائی منزل پر تھا اور لینڈ لیڈی نیچے والے حصے میں رہتی تھی۔

لوئی کے رویے سے ہرگز یہ ظاہر نہیں ہورہا تھا کہ اسے کوئی خوشی ہوئی ہے، اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ دونوں بچے زبردستی اس کے سر تھوپ دیے گئے تھے۔ شاید غیر ہوتے تو بھی اسے برداشت ہوجاتے مگر وہ تو اس کی سوکن کے بچے تھے اور وہ فطرتاً نرم دل بھی نہیں تھی اور نہ ہی چپلن سے اس کے تعلقات خوش گوار تھے۔ چپلن کمانے کا بھی چور تھا۔ اس کی محدود آمدنی میں دو کھانے والے اور آگئے تھے۔

چارلی سہما ہوا بیٹھا تھا۔ سڈنی بھی خاموش تھا لیکن اس کی خاموشی غصے والی خاموشی تھی۔ اسے اس عورت پر سخت غصہ آرہا تھا جس نے ابھی تک اس کا نام بھی نہیں پوچھا تھا۔

"چارلی تم کیا سوچ رہے ہو؟" سڈنی نے پوچھا۔

"میں سوچ رہا ہوں اس سے اچھے تو ہم اسکول میں تھے۔ یہ عورت تو مجھے خطرناک معلوم ہوتی ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ اس کا دماغ درست کرنے کے لیے میں جو ہوں۔"

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ چپلن ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ لوئی کو یہ فکر ہورہی ہوگی کہ یہ دونوں سوئیں گے کہاں؟ اگر چپلن زیادہ دیر نہیں آیا تو اس سے لے بغیر ہی بچوں کو سونا پڑے گا۔ لوئی نے پچھلے کمرے میں ایک فاضل بیڈ لگادیا اور پھر وہ بچوں کے پاس آگئی۔

"اسے تمہارے لیے بیڈ لگادیا ہے، تم دونوں اس بیڈ پر سوؤ گے۔"

"بیڈ بہت چھوٹا ہے۔ ہم دونوں اس پر پاؤں نہیں پھیلا سکتے۔" سڈنی نے کہا۔ "دوسرے کمرے میں جو صوفہ پڑا ہے میں اس پر سوجاؤں گا۔"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے" لوئی نے چیخ کر کہا۔ "تم اسی جگہ پر رات گزارو گے جہاں تمہیں رات گزارنے کی ہدایت کی گئی ہے۔"

سڈنی ایک لفظ بھی نہیں بول سکا۔ لوئی پاؤں پٹختے ہوئے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ پھر آئی اور سڈنی کو اپنے ساتھ لے کر کچن میں چلی گئی۔ سڈنی اس کے حکم کے مطابق برتن دھونے پر مجبور تھا۔ چارلی کو اس نے کچھ منگانے کے لیے گھر سے باہر بھیج

دیا۔ گویا وہ پہلے دن ہی ان دونوں کو بتا دینا چاہتی تھی کہ یہاں رہنے کے لیے گھر کے کام کاج کرنے ہوں گے۔

رات کو وہ کھانا کھا چکے تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ چیلین گھر آیا۔ دونوں کو دیکھ کر حیران ضرور ہوا لیکن جب لوسی نے بتایا تو ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے چارلی کے گھنگریالے بالوں میں انگلیاں پھنسا کیں اور پیار سے جھٹکا دیا۔ ”میرے شیر کیا حال ہے؟“ پھر اس نے بیوی کو مخاطب کیا۔ ”ان کے سونے کا بندوبست کیا؟“

”میں نے بیڈ لگا دیا ہے مگر اس بڑے والے کے بہت نخرے ہیں کہتا ہے ہم پاؤں نہیں پھیلا سکیں گے۔“

”کوئی بات نہیں اس سے کہو رہائشی کمرے میں صوفے پر سو جایا کرے۔“

جب چیلین نے بھی وہی بات کی جو سڈنی کہہ چکا تھا تو لوسی جل بھن کر رہ گئی۔ یہی وہ دن تھا جب لوسی اور سڈنی کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس نے بھی سوچ لیا کہ وہ سڈنی کا ناطقہ بند کر دے گی اور سڈنی نے بھی سوچ لیا کہ لوسی کو ہمیشہ اشتعال دلاتا رہے گا۔ اس نے جلد ہی اپنے منصوبے پر عمل درآمد شروع بھی کر دیا تھا۔ وہ رات کو دیر سے آنے لگا تھا اور جب آتا تھا تو سیڑھیوں پر اتنی زور زور سے پاؤں مارتا تھا کہ لوسی کی نیند خراب ہو جاتی تھی۔ ایک روز وہ غصے میں بھری ہوئی سڈنی کے پاس آئی۔

”مفت خورو مجھے ستانے کے لیے آ گئے ہو، نکل جاؤ میرے گھر سے۔“

”ہمیں تو عدالت نے یہاں بھیجا ہے۔ اب عدالت سے کہو، وہی ہمیں نکال سکتی ہے۔“

”عدالت سے پہلے میں تمہیں نکال دوں گی۔“ وہ اس کی طرف بڑھی۔

”اگر ایک قدم بھی بڑھایا تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔“

”تم؟ تم میرے ٹکڑوں پر پل رہے ہو اور تم مجھے مارو گے؟“

”ہاں میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔“

”آنے دو چیلین کو۔ وہی تمہیں نکال باہر کرے گا۔“

لوسی اتنا ڈر گئی تھی کہ اس نے خود کوئی جواب دینے کے بجائے بات اپنے شوہر پر ڈال دی حالانکہ اسے معلوم تھا کہ چیلین کئی کئی دن گھر نہیں آتا اور آتا بھی ہے تو اس قدر نشے میں ہوتا ہے کہ اس سے کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔

اس گھر کے قریب ہی ایک اسکول تھا۔ لوسی نے ان دونوں کو وہاں داخل کرا دیا۔ اس داخلے میں بھی بھلائی سے زیادہ یہ جذبہ کارفرما تھا کہ دونوں بلائیں کچھ دیر تو گھر سے باہر رہیں گی۔ چارلی سے تو خیر وہ خوش تھی لیکن سڈنی اس کے لیے واقعی بلا تھی۔

وہ ہفتے کا دن تھا۔ اسکول سے جلد چھٹی ہو گئی تھی۔ چیلین گھر پہنچا تو لوسی گھر پر نہیں تھی۔ سڈنی تو خیر آتا ہی رات گئے تھا۔ چیلین کو اس تنہائی سے خوشی ہوئی تھی کہ کچھ گھنٹے لوسی کی ڈانٹ ڈپٹ کے بغیر گزار نے کو مل جائیں گے۔ لیکن جب تیسرا پہر بھی گزر گیا اور شام ہونے لگی تو اسے اس تنہائی سے خوف آنے لگا۔ کہیں سب لوگ مجھے چھوڑ کر تو نہیں چلے گئے۔ کہیں لوسی نے گھر تو تبدیل نہیں کر لیا۔ وہ گھبرا کر نیچے آیا۔ مکان کی مالکہ گھر پر تھی۔ اس نے کہا لوسی صبح ہی سے کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ بس آتی ہی ہوگی۔ چیلین نے سوچا کچھ دیر اور آزادی کی فضا میں سانس لے لے۔ وہ گھر سے باہر نکل گیا اور بازار میں گھوم پھر کر دل بہلاتا رہا۔ وہ بھوکا بھی تھا اور اکیلا بھی۔

رات ہوئی تو وہ گھر کی طرف لوٹ آیا۔ دروازے پر دستک دی مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ اب لوسی ہی نہیں گھر کی مالکہ بھی کہیں جا چکی تھی۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ چیلین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے بے اختیار اپنی ماں یاد آ گئی۔ دوا سے اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ اب وہ کیا کرے۔ وہ گھر سے کچھ دور سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہ چل چل کر تھک بھی چکا تھا اور بھوک بھی تیز ہو گئی تھی۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ انتظار کرتے کرتے آدھی رات ہو گئی۔ اب سڑک بھی گھر کی طرح ویران ہو گئی تھی۔ دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ اب بھوک اور تھکن میں خوف کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ اچانک اس کی توجہ ایک جانب سے آنے والی موسیقی کی طرف مبذول ہوئی۔ یہ آواز سڑک کے اس پار واقع ایک شراب خانے سے آ رہی تھی۔ وہ موسیقی کے تعاقب میں چل دیا اور شراب خانے تک پہنچ گیا۔ اسے یہ بھی خیال آیا تھا کہ شاید اس کا باپ یہاں ہو۔ وہاں کا پُراسرار ماحول، روشنیاں اور موسیقی کے نغمے اسے بہت دیر تک مبہوت کیے رہے تھے۔ پھر موسیقی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ اسے پھر گھر یاد آنے لگا۔ اسے شدت سے اپنا بستر یاد آ رہا تھا۔ سڑک پار کی اور گھر کی طرف چل دیا۔ رات کے اندھیرے میں اس نے لوسی کو دیکھا جو اسی وقت پہنچی تھی اور گھر کی طرف بڑھ رہی تھی لیکن بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ

[illegible] ہے۔ اس کے قدم اس کے اختیار میں نہیں تھے۔ چارلی ایک طرف چھپ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نشے کی حالت میں وہ اس کے سامنے پہنچے۔ اس نے اسے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ جب دروازہ بند ہو گیا تو اس نے دستک دی۔ لوسی لیڈی نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ چپکے سے اندر جائے اور اپنے بستر پر دراز ہو جائے۔ لوسی کو معلوم ہی نہیں ہو سکے گا کہ میں باہر تھا لیکن لوسی کو تو معلوم کیسے معلوم ہو گیا۔ وہ اس وقت اس کے سامنے آ گئی جب وہ بستر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”تم منہ اٹھائے کدھر چلے آ رہے ہو۔ چلو نکلو اس گھر سے۔“

”یہ میرے باپ کا گھر ہے۔“

”جہنم میں گیا تمہارا باپ بھی اور تم بھی۔ میں تمہیں ایک منٹ بھی یہاں برداشت نہیں کر سکتی۔ دفع ہو جاؤ۔“

”اس وقت میں کہاں جاؤں گا۔ صبح چلا جاؤں گا۔“

”میں نے کہا نا میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ، نکلو یہاں سے۔“

لوسی نے اس کا کان پکڑ کر زور سے موڑ دیا۔ ”اب تمہارا باپ ہی تمہاری دیکھ بھال کرے گا۔ میں تو تنگ آ گئی، آوارہ کہیں کا۔“

”سڈنی کو تو آنے دو۔“

”میں اس کا بھی یہی حشر کر دوں گی، پہلے تم تو نکلو۔“

چارلی نے حسرت سے اپنے بستر کی طرف دیکھا اور سیڑھیاں اتر کر گھر سے باہر نکل آیا۔ دور اسے آگ کا الاؤ جلتا ہوا نظر آیا۔ وہ آگ کی طرف چل دیا۔ یہ چوکیدار تھا جس نے آگ کا الاؤ روشن کیا ہوا تھا۔ وہ اس الاؤ سے ذرا ہٹ کر سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ پھر لیٹ گیا اور پھر اس نے دیکھا کوئی اور بھی اس کی طرف آ رہا ہے۔ یہ سڈنی تھا۔ لوسی نے اسے بھی گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”تمہیں بھی نکال دیا۔“

”ہاں میں اسے مار سکتا تھا لیکن میں تجھے ڈھونڈنے یہاں آ گیا۔“

”سڈنی کیا اچھے دن تھے جب ہم اپنے گھر میں تھے۔“

”کیا کریں ماں تو پاگل خانے میں ہے۔ ہم کہیں اور جا بھی تو نہیں سکتے۔“

”اگر ہمیں سڑکوں پر ہی سونا ہے تو ہم اس عورت کا احسان کیوں اٹھائیں۔“

”صبح ہونے دو ہم خود ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔“

سڈنی باتیں کر رہا تھا لیکن اس نے دیکھا کہ چیلین کب کا سو چکا ہے۔ وہ بھی اس کے قریب ہی لیٹ گیا۔ وہ بھی تھکا ہوا تھا، اسے بھی نیند آ گئی۔

گشت کرنے والی پولیس سڑک سے گزری تو اس نے دیکھا سڑک پر دو بچے سو رہے ہیں۔ وہ ان دونوں کے قریب آئے اور انہیں جھنجوڑ کر جگایا۔

”تم لوگ کون ہو اور یہاں کیوں سو رہے ہو؟“

”ہماری ماں ہمیں گھر میں نہیں گھسنے دے رہی۔ اس نے ہمیں نکال دیا ہے۔“

”تم نے ضرور چوری کی ہوگی یا کوئی اور جرم۔“

”ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ عورت ہماری ماں نہیں بلکہ ہمارے باپ کی دوسری بیوی ہے۔“

”اوہ، آئی سی۔“ ایک پولیس والے نے کہا۔ ”کیسی نامعقول عورت ہے، بچوں پر تشدد کرتی ہے۔“

پولیس والوں نے ان دونوں کو ساتھ لیا اور چیلین کے گھر لے آئے۔ لوسی نرم گرم بستر پر لیٹ چکی تھی لیکن اسے اٹھ کر دروازے پر آنا پڑا۔ پہلے تو وہ ان دونوں کو دیکھ کر بھڑک اٹھی لیکن پھر پولیس کو دیکھ کر اس کا نشہ اتر گیا۔

”میڈم! اس مرتبہ تو ہم چلے جاتے ہیں لیکن آئندہ تم نے بچوں پر تشدد کیا تو تم پر جرمانہ ہوگا۔ سزا بھی ہو سکتی ہے۔“

پولیس والوں سے ڈر کر اس نے دونوں بچوں کو اندر گھسیٹ لیا اور ہدایت کی کہ اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے، میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“ چیلین نے لوسی سے کہا۔

”اس وقت گھر میں کچھ نہیں ہے، جو کھانا ہے صبح ناشتے میں کھا لینا۔ اس وقت تک ممکن ہے تمہارا منحوس باپ بھی گھر آ جائے۔“

وہ بستر پر لیٹا تو اسے معلوم ہوا اس کی تھکن اس کی بھوک سے زیادہ تھی۔ وہ لیٹتے ہی سو گیا۔

اس دن کے بعد سے لوسی کتنا بدل گئی تھی۔ اس نے چیلین یا اس کے بھائی کو گھر سے نکالنے کی غلطی نہیں کی لیکن گھر میں رہ کر جتنے ظلم کر سکتی تھی کرتی رہی۔

چیلین اس صورت حال سے بے حد پریشان تھا اور گھر سے بھاگ جانے کی سوچ رہا تھا کہ ایک روز مکان کی مالکہ

نے اطلاع دی کہ کوئی عورت دروازے پر کھڑی ہے۔ سڈنی اور چارلی کو پکار رہی ہے۔

”وہ تمہاری ماں ہوگی کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ پاگل خانے سے آگئی ہے۔“

دونوں بھائی بھاگم بھاگ دروازے پر گئے۔ وہاں واقعی لِل کھڑی تھی اور اپنے بچوں کو پکار رہی تھی۔ اس نے بانہیں پھیلا دیں۔ دونوں بچے اس کی آغوش میں سما گئے۔

”اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“ لوسی ہم پر ظلم کرتی ہے۔

”میں تمہیں لینے آئی ہوں، جاؤ اپنا سامان لے آؤ۔“

لِل نے یہاں آنے سے پہلے ایک کمرے کا بندوبست کرلیا تھا۔ وہ اپنے دونوں بچوں کو لے کر اس کمرے میں منتقل ہوگئی۔ یہ کمرا ایک اچار فیکٹری کے نزدیک تھا اور ہر وقت ایسڈ کی ناگوار بو آتی رہتی تھی لیکن کیا یہ کم نہیں تھا کہ اس کمرے کے ذریعے سب اکٹھے ہوگئے تھے۔

عدالت نے چپلن کے باپ کو ہدایت کی تھی کہ وہ دس شلنگ فی ہفتہ چپلن کی ماں کو پہنچاتا رہے اور وہ پہنچا رہا تھا۔ اس کے علاوہ لِل نے سلائی کا کام دوبارہ سنبھال لیا تھا۔

کیننگٹن روڈ پر کئی شراب خانے تعمیر ہوئے تھے جو اس کے گھر سے ذرا فاصلے پر تھے۔ یہاں پر اتوار کو تھیٹر سے تعلق رکھنے والے اکثر اداکار آیا کرتے تھے۔ چپلن کو شغل ہاتھ لگ گیا تھا۔ وہ اپنے تاریک کمرے کی تنہائی سے گھبرا کر کسی بھی شراب خانے کے سامنے کھڑا ہوجاتا تھا اور ان اداکاروں کا دیدار کیا کرتا تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا کاش وہ بھی اداکار بن جائے اور ان لوگوں کی طرح نفیس لباس پہنے اور اچھے شراب خانوں میں شراب پیے۔

ایک روز اس نے دیکھا کہ پھول بیچنے والا ایک لڑکا شراب خانے میں داخل ہورہا ہے۔ اس کا مطلب ہے اگر میں بھی پھول بیچنے والا بن جاؤں تو اس عمارت میں جاسکتا ہوں اور اپنے پسندیدہ اداکاروں کو نہایت قریب سے دیکھ سکتا ہوں۔ اس نے سوچا اور بھاگتا ہوا گھر آگیا۔ اس نے اپنی ماں سے ایک شلنگ ادھار لیا اور مارکیٹ جاکر پھول خرید لیے۔

دوسرے دن وہ اسکول سے چھٹی کے بعد ایک شراب خانے میں چلا گیا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا لیکن یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ اس وقت بھی وہاں اکثر اداکار موجود تھے۔

وہ جب سارے پھول فروخت کرکے گھر پہنچا تو اس کے ہاتھ میں پانچ سے زیادہ شلنگ موجود تھے۔ ایک دن میں اتنی کمائی کم نہیں تھی۔ اس کی ماں نے اسے گلے سے لگایا اور نصیحت کی کہ وہ روز اسی طرح اسکول کے بعد پھول بیچنے چلا جایا کرے۔

یہ سلسلہ چند ہی روز چل سکا تھا کہ اس کی ماں نے اسے ایک شراب خانے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ چارلی پھول بیچتا ہے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ شراب خانوں میں جاکر پھول بیچتا ہے۔ یہ اس کے عیسائی عقیدے کے خلاف تھا۔ وہ گھر آیا تو وہ اس پر پھٹ پڑی۔

”انہی شراب خانوں نے تمہارے باپ کے ساتھ جو کیا تمہیں معلوم ہے۔ اب انہی شراب خانوں کی کمائی تم مجھے کھلا رہے ہو۔ خبردار جو اب پھول بیچنے گئے۔“

”مجھے وہاں بیٹھنے والے اداکار اچھے لگتے ہیں۔“

”پھر ان جیسا بننے کی کوشش کرو۔ کب تک پھول بیچتے رہوگے۔“

اس کی ماں نے یہ کہہ ضرور دیا تھا لیکن اسے اس وقت کسی ملازمت کی ضرورت تھی تاکہ وہ گھر کی تنگ دستی دور کرسکے۔ اس عرصے میں اس کا باپ بھی مرچکا تھا اس کی طرف سے ملنے والی امداد بھی رک گئی تھی۔ وہ نوکری کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی وہ اتنا چھوٹا تھا کہ کوئی بھی ڈھنگ کا کام اسے نہیں مل سکتا تھا۔ وہ دکانوں کے چکر کاٹتا رہا۔ کئی دکان والوں نے مٹھائی وغیرہ کے لیے اسے رکھ بھی لیا لیکن ہر ملازمت عارضی ثابت ہوتی رہی۔ پھر اسے ایک رئیس آدمی کے گھر ملازمت مل گئی۔ انہوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اسکول بھی جاسکتا ہے اور ان کے گھر کام بھی کرسکتا ہے۔ گھریلو ملازمت اور وہ بھی کسی رئیس آدمی کے شاندار گھر میں وہ خوش ہوگیا۔ اپنے گھر کے ایک تاریک کمرے میں رہنے سے تو بہتر تھا وہ اس شاندار گھر میں رہتا رہے۔

وہ یہاں ملازمت کررہا تھا لیکن اس کے کانوں میں ماں کے یہ الفاظ گونجتے رہتے تھے کہ تم میں صلاحیت ہے تم چاہو تو اداکار بن سکتے ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اداکار کیسے بن سکتا ہے۔

ابھی کرسمس میں چند ہفتے باقی تھے۔ اسکول میں ایک ڈرامے کی تیاری کا کام عروج پر تھا۔ اس نے سوچا، اداکاری اسکول کے ڈرامے سے شروع کی جائے۔ اس نے پانچ سال کی عمر میں اسٹیج پر نہایت شاندار پرفارمنس دی تھی۔ یہی اعتماد اس کے ساتھ تھا۔ اس نے اسکول کی انتظامیہ پر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ بھی بتایا کہ اس کی ماں تھیٹر میں کام کرتی رہی ہے

اور وہ خود پانچ سال کی عمر میں اسٹیج پر آچکا ہے لیکن کسی وجہ سے اسے منتخب نہیں کیا گیا حالانکہ وہ سمجھتا تھا جن لڑکوں کو منتخب کیا گیا ہے وہ ان سے کہیں بہتر ہے۔

وہ بہت دن تک اس ہونے والے ڈرامے پر تنقید کرتا رہا اور لڑکوں سے کہتا پھرا کہ اگر مجھے منتخب کرلیا گیا ہوتا تو میں بتاتا کہ اداکاری کیا ہوتی ہے۔ میں نے اپنی ماں سے اس میدان میں وہ کچھ سیکھا ہے جس کے مظاہرے کا مجھے موقع ہی نہیں دیا گیا۔

یہی صدمہ کیا کم تھا کہ جس گھر میں وہ کام کرتا تھا اس کی لیڈی کسی بات پر ناراض ہوگئی اور اسے کام سے الگ کردیا گیا۔ وہ روتا ہوا گھر آیا اور پرانے کپڑے اکٹھے کرنے لگا۔

یہ نہایت تعجب کی بات تھی لہٰذا ماں نے پوچھا ”یہ کیا کررہے ہو۔ ہمارے پاس لانڈری کے پیسے کہاں ہیں جو تم انہیں لے جارہے ہو۔“

”میں انہیں لانڈری نہیں لے جارہا ہوں، میں تو انہیں مارکیٹ لے جاکر بیچنے کی کوشش کروں گا۔“

”یہ اتنے بے وقعت اور پرانے ہیں، انہیں کون خریدے گا؟“

”قسمت آزمائی میں کیا حرج ہے۔ میری اداکاری ایسی ہوگی کہ سب خریدنے پر مجبور ہوجائیں گے۔“

اس نے کپڑوں کے ڈھیر کو ایک چادر میں لپیٹا اور مارکیٹ لے گیا۔ اس ڈھیر کو ایک فٹ پاتھ پر پھیلا دیا اور اپنا مشہور نغمہ جو اس نے پانچ سال کی عمر میں اسٹیج پر گایا تھا فٹ پاتھ پر کھڑے ہوکر گانے لگا۔ پھر سولو ڈانس شروع کردیا۔ لوگ اس کے اردگرد کھڑے ہوگئے۔ انہیں مفت میں تھیٹر کا لطف مل رہا تھا۔

جب چارلی نے دیکھا کہ لوگ جمع ہوگئے ہیں تو اس نے پرانے کپڑوں میں سے ایک شرٹ اور ایک پتلون اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔

”آپ اس کا مجھے کیا دیں گے۔ ایک شلنگ، چھ پنس، تین پنس، دو پنس؟“

لوگوں نے اس عجیب و غریب دکاندار کو دیکھا اور آگے بڑھ گئے اور پھر وہ اکیلا کھڑا رہ گیا۔ اردگرد کے دکاندار اسے گھور رہے تھے۔

اس کی اداکاری یہاں بھی کام نہیں آئی اور جب ایک [illegible] نے آکر اس سے پوچھا کہ وہ کب تک اپنا کاروبار [illegible] گا تو اس نے کہا بس ختم ہوگیا۔ کپڑوں کا ڈھیر سمیٹا اور گھر چلا آیا۔

چارلی کے بھائی سڈنی کو بحری جہاز میں ملازمت مل گئی تھی۔ یہ جہاز افریقا روانہ ہونے والا تھا۔ سڈنی کو اس جہاز پر جانا تھا۔ اور وہ چلا گیا۔

یہ خوشی کی بات تھی کیونکہ اس نے 35 شلنگ ایڈوانس لے لیے تھے اور دو پاؤنڈ دس شلنگ تنخواہ ملتی تھی۔ جو اس غربت میں اس خاندان کے لیے بہت تھی۔

چھ ہفتے گزر گئے تھے اور وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا جبکہ اسے آجانا چاہیے تھا۔ ایک ہفتہ اور گزر گیا تو لِل نے جہاز کی کمپنی کے دفتر خط لکھا اور اس کی خیریت دریافت کی۔ جواب میں کمپنی کی طرف سے مطلع کیا گیا کہ اسے کیپ ٹاؤن کے ساحل پر اتار دیا گیا تھا کیونکہ وہ جوڑوں کے درد میں مبتلا تھا۔ یہ خبر ایسی تھی جس نے لِل کو بے حواس کردیا۔ اس کی صحت پہلے ہی خراب تھی۔ اس خبر نے اسے بے حال کردیا۔ وہ اس قابل بھی نہ رہی کہ سلائی کا کام انجام دے سکے جو اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھا۔

ہفتوں پر ہفتے گزر گئے۔ سڈنی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اس نے کتنی غربت میں بچوں کو پالا تھا اور اب ان میں سے ایک غائب ہوگیا تھا۔ اس صدمے نے اسے بے حال کردیا تھا۔ کچھ دنوں سے کھڑکی میں چپ چاپ بیٹھی باہر دیکھتی رہتی تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسے کس کا انتظار تھا۔

گھر کا ماحول اتنا عجیب سا ہوگیا تھا کہ چپلن زیادہ تر باہر ہی رہنے لگا تھا۔ ایک روز وہ گھوم پھر کر گھر کی طرف آرہا تھا تو بچوں نے اسے گھیر لیا۔

”چپلن، تمہاری ماں پاگل ہوگئی ہے۔“

”تمہاری ماں پاگل ہوگئی ہوگی۔“

”ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں، وہ ابھی کچھ دیر پہلے سب کے دروازوں پر پتھر مار رہی تھی اور کہہ رہی تھی ’یہ اس کی طرف سے تحفے ہیں‘۔ اسے لوگوں نے گھر بھیج دیا ہے مگر وہ پھر نکل آئے گی۔“

وہ گھر کی طرف بھاگا۔ اس نے دیکھا اس کی ماں کھڑکی میں بیٹھی ہے اور آنے جانے والوں کو برا بھلا کہہ رہی ہے۔

”تم سب نے میرے سڈنی کو مجھ سے دور کردیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے وہ کہاں ہے مگر تم بتاتے نہیں ہو۔“

اس نے چپلن کی طرف دیکھا۔ وہ اسے پہچان تو گئی لیکن اس سے بھی یہی مطالبہ کررہی تھی کہ اس نے اگر سڈنی کو چھپا دیا ہے تو بتادے وہ کہاں ہے۔

چپلن کو اب یقین آگیا تھا کہ بچے ٹھیک کہہ رہے ہیں،

ماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ مکان مالک کے پاس گیا تاکہ ان کے ذریعے ڈاکٹر کو بلایا جاسکے۔ وہ پہلے ہی ڈاکٹر کو فون کرچکی تھی۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آگیا۔ لِلی کا معائنہ کیا اور اسے پاگل قرار دے دیا۔

''یہ خاتون غذائی قلت کا بھی شکار ہے۔ اسے شفا خانے جانا ہوگا۔ وہاں اس کا علاج بھی بہتر طریقے سے ہوگا اور غذا بھی میسر آسکے گی۔''

اس کے سوا کچھ کیا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ اسے اسپتال پہنچادیا جائے۔ ڈاکٹر اور لینڈ لیڈی کی مدد سے اسے اسپتال پہنچادیا گیا۔ چیپلن بھی ساتھ تھا۔ اسپتال میں اس کا ایک مرتبہ پھر معائنہ کیا گیا اور اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ وہ نرسیں اسے سہارا دے کر لے گئیں اور چیپلن آنسو بہاتا ہوا لوٹ آیا۔

وہ گھر جانا چاہتا تھا لیکن اسے گھر کی تنہائی یاد آگئی۔ گھر میں سڈنی بھی نہیں تھا اور اب ماں بھی چلی گئی تھی۔ وہ مارکیٹوں میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ جب تھک کر گرنے کے قریب ہوا تو گھر لوٹ آیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ بھوکا ہے۔ اس نے گھر کی تلاشی لینی شروع کردی لیکن کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ گھر کے ایک کونے میں بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دوسرا دن طلوع ہوا تو شاید یہ اور زیادہ رونے کا دن تھا۔ مکان مالک نے اسے بتایا کہ اس کی والدہ کو ''کین ہِل'' کے پاگل خانے بھیج دیا گیا ہے۔ یہ پاگل خانہ اس کے گھر سے بیس میل کی دوری پر تھا۔ وہاں تک پہنچنا اور ماں سے ملنا اس کی استطاعت سے باہر تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اب وہ کبھی اپنی ماں سے نہیں مل سکے گا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ لینڈ لیڈی اس کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لینڈ لیڈی یہ سمجھی کہ وہ مکان کے کرائے کی طرف سے پریشان ہے۔

''تم فکر مت کرو، جب تک یہ کمرا دوبارہ کرائے پر نہیں اٹھ جاتا تم اس میں رہ سکتے ہو اور ہاں کچھ کھانا پینا چاہو تو بلا تکلف کہہ سکتے ہو۔''

''سڈنی واپس آکر تمام کرایہ ادا کردے گا۔'' چیپلن نے کہا لیکن شرم کی وجہ سے یہ نہ کہہ سکا کہ اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔

وہ گھر سے نکل کر ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں لہٰذا وہ دوست گھر پر ہی تھا اور اتفاق سے ناشتا کررہا تھا۔ اس نے چیپلن کو مدعو کیا اور وہ اس کے ساتھ ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔

اس دن کے بعد سے چارلی نے وتیرہ بنالیا تھا کہ صبح ہوتے ہی گھر چھوڑ دیتا تھا اور رات کو کسی وقت آتا تھا۔ در اصل لینڈ لیڈی سے نظریں چرا رہا تھا کہ کہیں وہ کرائے کا بہانہ کرکے اسے یتیم خانے نہ بھجوا دے۔

ایک رات جب وہ بستر پر دراز ہونے کو تھا کہ لینڈ لیڈی آگئی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اس نے ایک کاغذ ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

''مبارک ہو! تمہارا بھائی کل واٹر لو اسٹیشن پہنچ رہا ہے۔ یہ دیکھو اس نے ٹیلی گرام بھیجا ہے۔''

اگلی صبح وہ اسٹیشن پر پہنچ گیا اس حالت میں کہ اس کے کپڑے نہایت میلے تھے اور جوتے پھٹ چکے تھے۔ بھوک کی وجہ سے نڈھال بھی ہوگا۔

''یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔'' سڈنی نے ٹرین سے اترتے ہی پوچھا ''خیریت تو ہے۔ سب ٹھیک ہے نا اور اکیلے کیوں آئے ہو۔ ماں کو بھی لے آتے۔'' وہ پوچھ رہا تھا اور چارلی اسے کوئی جواب دینے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

''کیا بات ہے، تم بولتے کیوں نہیں؟''

''ماں...... پاگل ہوگئی ہیں اور پاگل خانے میں ہیں۔''

''اور تم! تم یہاں اور ... ہے ہو؟''

''اس پرانے گھر میں، لینڈ لیڈی کا کرایہ تمہیں دینا ہے ورنہ وہ مجھے یتیم خانے بھیج دے گی۔''

''اب کسی کی مجال نہیں ہے جو تمہیں یتیم خانے بھیجے اب میری عمر سترہ سال ہوگئی ہے اور میں بیس پونڈ کما کر لایا ہوں جو کم از کم بیس ہفتوں تک ہمارا ساتھ دے گی۔ آؤ چلیں۔'' اس نے اپنا سامان اٹھایا اور ٹیکسی میں رکھ دیا۔ ٹیکسی گھر کے سامنے رکی تو لینڈ لیڈی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اب اسے اپنا کرایہ ملنے کی امید ہوگئی تھی۔

اسی روز سڈنی شاپنگ کے لیے گیا۔ چارلی کو بھی اس نے نئے کپڑے دلوائے اور رات کو وہ دونوں نئے کپڑے پہن کر لندن کے ایک میوزک ہال میں براجمان تھے۔

''ذرا سوچو، اس وقت ماں بھی ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا'' چارلی نے کہا۔

''فکر مت کرو۔ کل ہم ان سے ملنے کین ہل جائیں گے اور اگر ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو انہیں ساتھ لے آئیں گے۔''

دوسرے دن دونوں بھائی والدہ سے ملنے پاگل خانے گئے اور اس کی حالت پر افسردہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس

کا رنگ زرد تھا اور ہونٹ نیلے۔ وہ انہیں پہچان رہی تھی لیکن خاموش تھی۔

''اگر مجھے ایک کپ چائے مل جاتی تو میں یہاں نہ آتی۔'' مسز چیپلن نے بہت دیر بعد یہ جملہ کہا اور اسے بار بار دہراتی رہی۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی دبی ہوئی حسرت تھی جو بول رہی تھی۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اسے ساتھ لے آتے۔

چارلی چیپلن اب تک کئی چھوٹے موٹے کام کرکے دیکھ چکا تھا لیکن اس خواہش سے کبھی دست بردار نہیں ہوا تھا کہ اسے اداکار بننا ہے چنانچہ ایک روز وہ بلیک مور تھیٹریکل ایجنسی پہنچ گیا۔

''تم کیا چاہتے ہو۔''

''کیا آپ کے پاس میری عمر کی مناسبت سے کوئی کردار ہے؟''

''تمہاری عمر کتنی ہے؟''

''چودہ برس۔'' چارلی نے جان بوجھ کر اپنی عمر ایک سال زیادہ بتائی۔

''اگر تمہارے لائق کوئی کام نکلا تو ہم تمہیں ضرور یاد کریں گے۔''

وہ خوش تو تھا لیکن اسے امید نہیں تھی کہ اس کے پاس جواب آئے گا۔ ایسے انٹرویو اکثر ہوتے ہیں اور جب کسی کو ٹالنا ہوتا ہے تو یہی کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ کو مطلع کردیا جائے گا۔ یہ صاف انکار کا ایک مہذب طریقہ ہے۔

ایک مہینا گزر گیا اور وہ بھول بھی گیا کہ کبھی بلیک مور ایجنسی گیا تھا کہ ایک روز اسے ایک پوسٹ کارڈ ملا جس کے ذریعے اسے ایجنسی آنے اور ایجنسی کے مالک مسٹر بلیک مور سے ملاقات کے لیے کہا گیا تھا۔

وہ بلیک مور سے ملا تو اس کی عمر اتنی کم تھی کہ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس نے اپنی عمر چودہ سال لکھوائی تھی اور وہ بارہ کا لگ رہا تھا۔ مسٹر مور اسے مایوس کرسکتے تھے لیکن انہوں نے اس کے اندر چھپے ہوئے فنکار کو پہچان لیا تھا۔

انہوں نے اس سے چند سوالات کیے اور مطمئن ہونے کے بعد اسے خوش خبری سنادی۔

''ہم ایک ڈراما کررہے ہیں جس میں تمہیں کم عمر ملازم کا کردار ادا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ڈراما ''جم'' میں کھیلا جائے گا۔ اس میں بھی ایک لڑکے کا کردار ہے۔ دو ہفتوں کا ٹور ہے۔ اس کا مطلب ہے تمہیں اپنے گھر سے دور تھیٹر کمپنی کے ساتھ رہنا ہوگا۔''

بے خبر نے غالب سے پہلے اردو میں خطوط لکھے

خواجہ غلام غوث بے خبر کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ انہوں نے اردو میں غالب سے پہلے خطوط نویسی کا آغاز 1846ء میں کیا، جب کہ غالب 1850ء سے پہلے فارسی میں خطوط لکھا کرتے تھے۔ اس لیے اردو خطوط نویسی میں بے خبر کو غالب پر فوقیت حاصل ہے۔ ''فغانِ بے خبر'' بے خبر کی فارسی خطوط اور نظموں کا مجموعہ ہے، جب کہ ''فغانِ بے خبر'' اردو رقعات و نثر کا مجموعہ ہے، جو 1891ء میں شائع ہوا۔ بے خبر کی وفات 1905ء میں ہوئی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ خواجہ غلام غوث بے خبر نے ''عودِ ہندی'' کو سب سے پہلے 1866ء میں مرتب کیا۔ غالب کا انتقال 1869ء میں ہوا۔ ''عودِ ہندی'' غالب کی زندگی میں 1868ء میں شائع ہوا۔ ''عودِ ہندی'' سے پہلے غالب کے ایک شاگرد، چودھری عبدالغفور سرور نے غالب کے خطوط کا ایک مجموعہ ''مہرِ غالب'' مرتب کیا تھا۔ ''مہرِ غالب'' تاریخی نام ہے، لیکن وہ چھپ نہ سکا، اس کو ''عودِ ہندی'' میں شامل کرلیا گیا۔ ''عودِ ہندی'' کو ممتاز علی میرٹھی نے شائع کیا۔

خواجہ غلام غوث بے خبر آگرے میں 1840ء کو پیدا ہوئے۔ لیفٹیننٹ گورنر یوپی کے میر منشی (چیف سیکریٹری) تھے۔ خان بہادر اور ذوالقدار خطابات ملے۔ ان کی شادی مفتی انعام اللہ شہابی کی لڑکی سے ہوئی تھی، جو گوپامئو کے رہنے والے تھے۔ اس لیے گوپاموی کہلاتے تھے۔ بے خبر ذاتی وجاہت، صاحب اقتدار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ غالب کے محسن الملک نواب مہدی علی خان اور غلام امام شہید سے تعلقات تھے۔ غلام امام شہید مفتی شہابی کے نواسے تھے۔ بے خبر شہید کے مداح تھے۔ غلام امام شہید، قتیل فرید آبادی کے شاگرد تھے۔ غالب کی قتیل سے چلتی تھی۔ اس معاملے میں غالب، متشدد تھے۔ بے خبر سرکار انگریزی میں میر منشی تھے۔ اردو کے حقدارِ مکتوب نویسی میں رجب علی بیگ سرور، غالب اور بے خبر کے نام آتے ہیں۔ ''رشکِ لعل و گہر'' بے خبر کے بقیہ رقعات و نثر و نظم کا مجموعہ ہے۔ جسے ان کے ایک عزیز مولوی خواجہ حسین الدین تحصیل دار نے 1908ء میں شائع کیا۔

اقتباس: ڈاکٹر وقار احمد رضوی — مرسلہ: اصغر علی، کراچی

"جی بہتر۔"

"تمہاری تنخواہ دو پونڈ، دس شلنگ فی ہفتہ ہوگی، کیا تم تیار ہو؟"

"یہ پیسوں کا معاملہ ہے اس لیے میں اپنے بڑے بھائی سے پوچھ کر بتاؤں گا۔"

"مگر یاد رکھنا اس سے زیادہ میں تمہیں نہیں دلا سکوں گا۔"

"جی بہتر۔"

"میں تمہیں تمہارا اسکرپٹ دیے دے رہا ہوں۔ ایک ہفتے بعد ریہرسل ہوگی۔ جب تک اسے خوب اچھی طرح پڑھ لو پھر زبانی یاد بھی کرنا ہوگا۔"

وہ وہاں سے نکلا اور گھر کی طرف چلا تو چل نہیں رہا تھا خوشی سے دوڑ رہا تھا۔ برسوں کا خواب پورا ہوا تھا۔ وہ پونڈ دس شلنگ فی ہفتہ بھی مل رہے تھے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ سڈنی کو یہ رقم کم بھی لگے گی تو بھی وہ اسی تنخواہ پر کام کرے گا۔

اس نے سڈنی کو بتایا تو اس کا بھی وہی حال ہوا جو کچھ دیر پہلے چارلی کا ہو چکا تھا۔ وہ خوشی کے عالم میں بار بار اپنے سر کو جھٹک رہا تھا۔

"چارلی، یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے، کاش! اس وقت ماں بھی ہمارے ساتھ ہوتی۔"

"سڈنی! اراسموچو، چالیس ہفتے اور دو پونڈ دس شلنگ فی ہفتہ تنخواہ، ہم اس برس 60 پونڈ کی بچت کر سکتے ہیں۔"

اس نے سڈنی کی مدد سے اسکرپٹ یاد کیا اور دو دن بعد لین تھیٹر میں ریہرسل کے لیے پہنچ گیا۔ ریہرسل کے دوران اس نے کچھ ایسے سین سرانجام دیے جنہیں دیکھ کر ڈائریکٹر از حد حیران ہوا اور اس سے پوچھنے لگا کہ کیا تم نے پہلے بھی اداکاری کی ہے۔ اب اسے وہ کیا بتاتا کہ اداکاری تو اس کے خون میں ہے۔ اس کا باپ بھی اداکار تھا اور اس کی ماں بھی۔ وہ چپ رہا لیکن پورے اسٹاف نے یہ پیش گوئی کر دی کہ اس کی اداکاری ہمارے ڈرامے کی مقبولیت کا باعث بنے گی۔

جب ریہرسل مکمل ہوگئی تو وہ تھیٹر کمپنی کے ساتھ ٹور پر نکل گیا۔

چالیس ہفتوں تک مختلف قصبوں میں اپنے کھیل کی نمائش کے بعد وہ لندن آیا تو اس کی شہرت لندن کے اداکاروں تک پہنچ چکی تھی اور اس کی جیب میں اتنی رقم تھی کہ وہ اپنے اور سڈنی کے لیے کسی باعزت اقامت گاہ کا بندوبست کر سکے۔ اسی دوران یہ خبر ملی کہ للی صحت یاب ہو چکی ہے اور فلاں دن فلاں ٹرین سے واپس آ رہی ہے۔ یہ اطلاع کسی بڑی خوش خبری سے کم نہیں تھی۔ اب غربت کے دن قصۂ پارینہ بن چکے تھے۔ چارلی کی سفارش سے سڈنی کو بھی تھیٹر کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ اب 35 شلنگ فی ہفتہ کما رہا تھا۔ دونوں کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ اپنی والدہ کا..... خیال سرخروئی سے کر سکتے تھے۔ انہوں نے فوری طور پر ایک اچھا سا اپارٹمنٹ کرائے پر حاصل کیا جو دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس میں پیانو بھی موجود تھا۔ ایک کمرے کو پھولوں سے سجا دیا۔

وہ اسٹیشن پہنچے اور مطلوبہ گاڑی آ گئی تو والدہ کو تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ مسافروں کے ہجوم سے برآمد ہوئی اور مسکراتی ہوئی ان کی طرف بڑھنے لگی۔

وہ ہرگز جذباتی نہیں تھی جیسا کہ اس موقعے پر اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس سے لگتا تھا وہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی ہے یا کسی خواب سے ابھی ابھی بیدار ہوئی ہے۔

وہ جب فلیٹ میں داخل ہوئی تو یہ وہ گھر نہیں تھا جس میں گندے برتن ادھر اُدھر پڑے رہتے تھے۔ افلاس کی سیلن دیواروں سے جھانکتی تھی۔ اس کے بچے شاندار لباس پہنے ہوئے تھے۔ کمرا پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ ان تینوں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ شاید وہ تینوں ماضی میں پہنچ چکے تھے۔

"ہاں دیکھو اب ہمارے دن بدل چکے ہیں۔" چارلی نے کہا اور للی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہم نے کیسے کیسے بھیانک دن گزارے ہیں چارلی! ابھی تمہاری عمر کمانے کی نہیں تھی لیکن تم نے میرے لیے کیا کچھ کر دیا ہے۔"

"ماں ہم نے ماضی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب تم بھی خوش ہو جاؤ۔" سڈنی نے کہا اور وہ روتے روتے ہنسنے لگی۔ اپنے دونوں بچوں کو آغوش میں سمیٹ لیا۔

ان دونوں کو ایک مرتبہ پھر "ٹور" پر جانا تھا لیکن اب انہیں یہ فکر نہیں تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کی ماں کس طرح دن گزارے گی۔

چارلی کی مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ ایک کمپنی سے دوسری کمپنی کا رخ کر رہا تھا۔ سڈنی بھی اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ ان کی ماں گھر میں اکیلی ہی رہ گئی تھی، وہ دونوں لندن کے مضافات میں مصروف تھے۔ کبھی کبھی والدہ سے ملنے آ جاتے تھے ورنہ خط و کتابت ہی ملاقات کا ذریعہ تھی۔

وہ اپنے ٹور میں مصروف تھا کہ ایک تکلیف دہ خبر اس تک

پہنچی۔ سرکاری طور پر اطلاع دی گئی تھی کہ مسز چیپلن دوبارہ دماغی مریضہ بن گئی ہے۔ اسے گلیوں میں آوارہ پھرتے ہوئے پایا گیا تھا لہٰذا کین ہل کے پاگل خانے بھیج دیا گیا ہے۔

سڈنی اور چارلی اب ایک نئی کمپنی کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے اور فی الحال لندن نہیں آ سکتے تھے۔ رو دھو کر صبر کر لیا کہ جب بھی واپس ہوگی والدہ سے ملاقات کریں گے۔

☆☆☆

چارلی کی قسمت ایک اور چھلانگ مارنے والی تھی۔ اسے کارنو کمپنی کے مالک مسٹر کارنو نے ملاقات کے لیے بلایا تھا۔

اس کمپنی کے تھیٹر میں عظیم ترین اداکار ہی کام کر سکتے تھے۔ اس خیال سے ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ وہ مسٹر کارنو سے ملنے جا رہا ہے اور وہ بھی خود نہیں، ملاقات کی خواہش کارنو کی تھی۔ چارلی کی عمر اس وقت صرف 17 سال تھی۔

"کہیے مسٹر کارنو، آپ نے مجھے کیسے یاد کیا؟"

"میں ایک کھیل "دی فٹ بال میچ" شروع کرنے والا ہوں اس میں ہیری ویلڈن بھی کام کر رہا ہے۔ مجھے ایک ایسے مزاحیہ اداکار کا انتخاب کرنا ہے جو ویلڈن کے بالمقابل جم کر کام کر سکے۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو۔"

"موقع شرط ہے پھر آپ جیسا چاہتے ہیں وہ کر دکھاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں دو ہفتوں کے لیے آزمائشی طور پر رکھتا ہوں۔ تمہاری تنخواہ تین پونڈ دس شلنگ فی ہفتہ ہوگی۔ اگر تمہاری کارکردگی تسلی بخش ہوئی تو میں تم سے ایک برس کا کنٹریکٹ کر لوں گا۔"

چارلی کو تیاری کے لیے ایک ہفتہ ملا تھا۔ اس کے بعد یہ کھیل لندن میں پیش ہونا تھا۔ اسے ہیری ویلڈن کے ساتھ مزاحیہ اداکار کا رول کرنا تھا اور یہ مذاق کی بات نہیں تھی۔ ہیری ویلڈن عظیم مزاحیہ اداکار تھا۔ اتنا عظیم کہ اس کی تنخواہ 35 پونڈ فی ہفتہ تھی۔

چارلی نے اس صورتِ حال کو اپنے لیے چیلنج سمجھا، وہ اپنے فلیٹ میں بند ہو گیا اور اپنے مکالموں کو نت نئے طریقوں سے ادا کرنے کی مشق کرتا رہا۔

پہلی رات جب یہ کھیل اسٹیج پر پیش کیا گیا اور چارلی تماشائیوں کے سامنے نمودار ہوا تو اس نے اپنے کردار کو کچھ اس طرح ادا کیا کہ تماشائی اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکے۔ یہ اتفاقی کامیابی نہیں تھی۔ تماشائیوں کا یہی طرزِ عمل

"پیرس تو پھر پیرس ہے"

ایفل ٹاور لوہے کا ڈھانچہ ہے اور اس کی بلندی 98465 فٹ ہے۔ یہ عظیم ٹاور 1889ء میں ایک نمائش کے سلسلے میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس کا ڈیزائن فرانس کے ایک نامور انجینئر نے تیار کیا تھا۔ ایفل اس انجینئر کے نام کا حصہ ہے۔ یہ ایفل وہی آدمی ہے جس نے نیویارک کے مجسمہ آزادی کی تکمیل میں فریڈرک آگسٹ بارتھولڈی کی مدد کی تھی...... اس کی بنیادوں میں چالیس فٹ تک پتھر اور لوہا بھرا گیا اور لوہے کے بارہ ہزار شہتیر کام میں لائے گئے۔ یہ چار شہتیروں پر کھڑا ہے جن میں سے ہر ایک 279 مربع فٹ رقبہ گھیرے ہوئے ہے۔ یہ بھی تحریر ہے کہ اس کی تعمیر میں ڈھائی ملین ڈولو کی کیل استعمال ہوئی تھی..... اس کے چاروں طرف ستونوں کے درمیان ایک محراب کی سی شکل بنی ہوئی ہے اور اس کے تین پلیٹ فارم ہیں۔ پہلا پلیٹ فارم 189 فٹ پر، دوسرا 380 فٹ پر اور تیسرا سطح زمین سے 906 فٹ پر ہے۔ اس مقام پر ایک ریستوران بھی ہے جہاں ہر وقت سیاحوں کا ہجوم اس طرح دیکھنے میں آتا ہے کہ جیسے اس کے علاوہ پیرس میں کہیں کوئی کھانے کی چیز نہیں ملتی۔ گاہک یوں ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے کہ وہ ٹاور دیکھنے نہیں آتے بلکہ کھانے پینے کے لیے اس پر چڑھتے ہیں۔ اس کی چوٹی پر موسمیاتی رصدگاہ اور ریڈیو ٹیلی ویژن کے اینٹینے ہیں۔ اس کی بلندی کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اگر آپ ٹوپی یا پگڑی پہن کر نیچے کھڑے ہوں اور اوپر دیکھیں تو نہ ٹوپی سلامت رہے گی اور نہ پگڑی۔ ایسے بھی پیرس میں یہ دونوں چیزیں سلامت نہیں رہتیں، کہیں نہ کہیں ان سے ہاتھ دھونا ہی پڑتے ہیں۔

اقتباس: شفیق عقیل کا سفرنامہ

مرسلہ: فرحانہ سعید قاسمی: ڈلوال، چکوال

دوسری رات ہوا۔ تیسری رات جب مسٹر کارنو بھی موجود تھے۔

جب وہ اسٹیج پر آیا تو تماشائیوں نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور جب تک وہ اسٹیج پر رہا مسلسل ہنسنے اور تالیاں پیٹنے کی آوازیں آتی رہیں۔

مسٹر کارنو تو حیران تھے۔ یہ سب تو ویلڈن کے لیے ہوا کرتا تھا۔ ان کا انتخاب بالکل درست تھا۔

کھیل کے خاتمے کے بعد مسٹر کارنو نے نوید سنائی کہ وہ صبح اس کے دفتر میں حاضر ہو اور کنٹریکٹ سائن کر دے۔ اب تین پونڈ نہیں، سال بھر کے لیے اس کی تنخواہ چار پونڈ فی ہفتہ ہوگی۔

یہ کھیل چودہ ہفتوں تک لندن میں چلتا رہا۔ اس کے بعد اسے ٹور پر روانہ کر دیا گیا۔ چارلی چپلن ہر جگہ اپنی مقبولیت کے نشان چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ بلفاسٹ میں تھے کہ نقادوں نے ہیری ویلڈن کو تنقید کا نشانہ بنایا اور چارلی کی کارکردگی کو قابل تعریف ٹھہرایا۔

اسے کارنو کمپنی میں کام کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ اس کی عمر اب انیس سال تھی اور نہایت پُرتعیش زندگی گزار رہا تھا۔ اس کامیابی کے باوجود اسے اپنی زندگی میں کچھ کمی محسوس ہوتی تھی۔ تنہائی کا احساس ہوتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی ماں ابھی تک پاگل خانے میں تھی۔

وہ اس وقت سٹرتھم امپائر میں موجود تھا جہاں انہیں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ وہ وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ ابھی اس کے دیگر ساتھی نہیں آئے تھے۔ ان سے پہلے ایک اور طائفے کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ یہ مظاہرہ رقص اور گلوکاری پر مبنی تھا۔

وہ بیٹھا وقت گزاری میں مشغول تھا کہ ایک لڑکی ادھر ادھر کچھ تلاش کرتی ہوئی اس کے پاس آ کر رک گئی۔ یہ اسی طائفے کی لڑکی تھی جسے چارلی کے طائفے سے قبل اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا آئینہ تھا۔

"پلیز آپ یہ آئینہ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیں تاکہ میں بال سنوار لوں۔"

چارلی نے آئینہ پکڑ لیا اور وہ بال سنوارنے لگی۔ چارلی کے لیے یہ عجب رومانک سین تھا۔ اس نے بچپن غربت میں گزارا تھا اور جوانی جدوجہد میں۔ اسے کسی لڑکی کے قریب ہونے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا اور اب وہ آئینہ پکڑے ہوئے تھا اور وہ لڑکی بال سنوار رہی تھی۔

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" جب وہ لڑکی بال سنوار چکی تو چارلی نے اس سے پوچھا۔

"ہیٹی، ہیٹی کیلی" اس لڑکی نے کہا "اور آپ کا نام تو مجھے معلوم ہے آپ چارلی چپلن ہیں۔"

"جب تعارف ہو ہی گیا ہے تو کیوں نہ ہم اس اتوار کہیں ملیں۔"

"ضروری تو نہیں۔" وہ ہنسنے لگی۔

"آپ کے لیے نہیں مگر میرے لیے آپ سے ملنا ضروری ہو گیا ہے۔"

"آپ کہتے ہیں تو میں سہ پہر چار بجے آپ کو کننگٹن گیٹ پر مل جاؤں گی۔" اس نے کہا اور ہال کی طرف بھاگ گئی جہاں اس کا طائفہ موجود تھا۔

چارلی نے بہترین سوٹ زیب تن کیا اور کننگٹن گیٹ پر پہنچ گیا۔ اس نے گھڑی دیکھی چار بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتا رہا اور ٹرام سے اترنے والی لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ اس وقت اچانک ایک اندیشے نے سر ابھارا، وہ سوچ رہا تھا، میں نے اسے میک اپ میں دیکھا تھا۔ میک اپ کے بغیر وہ نہ جانے کیسی نظر آتی ہو، کہیں وہ عام سی لڑکی نہ ہو؟ کہیں مجھے مایوسی نہ ہو۔

"ہیلو چارلی!" اس نے آواز سنی اور مڑ کر دیکھا "میں حسب وعدہ پہنچ گئی ہوں، صرف ایک منٹ لیٹ ہوئی ہوں، اس کے لیے معذرت!"

چارلی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ میک اپ کے بغیر بھی اتنی ہی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ "خدا کا شکر ہے۔" بے اختیار چارلی کے منہ سے نکلا۔

دونوں خاموش کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ "کیا ہم کچھ دیر چہل قدمی کر سکتے ہیں پھر کہیں چل کر بیٹھیں گے اور دیر تک باتیں کریں گے۔"

وہ تیار ہو گئی۔ چارلی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ایک طرف کو چل دیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ اس مقام پر تھا جہاں اس نے بچپن میں گھر کے کپڑے لا کر فروخت کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے وہاں رک گیا۔ اس کی نظریں فٹ پاتھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے چارلی، یہاں کیا تلاش کر رہے ہو؟"

"اپنا بچپن۔"

"کیا مطلب؟" وہ ہنس پڑی۔

"جانتی ہو، یہاں کیا ہو چکا ہے؟"

"مجھے کیا خبر۔"

"بچپن میں ہم بہت غریب ہوتے تھے۔ اتنے غریب

کہ ایک مرتبہ میں نے گھر کے پرانے کپڑے لا کر یہاں فروخت کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا تم یقین کرو گی؟"

"آپ کے ماضی سے مجھے کیا سروکار؟"

وہ اسی طرح گھومتے پھرتے رہے۔ پھر چارلی نے ایک ٹیکسی روک لی "کہاں چلا جائے؟"

"کہیں بھی۔" ہیٹی نے کندھے اچکائے۔

"ہمیں ڈنر کے لیے چلنا چاہیے۔"

"میں ڈنر کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"ٹیکسی میں بیٹھو، میں تمہیں قائل کر لوں گا۔"

وہ اسے ایک ایسے ریسٹورنٹ میں لے گیا جہاں موسیقی سے آراستہ ماحول میں ڈنر کرنے کا لطف ہی کچھ اور تھا لیکن وہ ٹیکسی میں اسے ڈنر کے لیے رضامند نہیں کر سکا تھا۔ ریسٹورنٹ کے پُرلطف ماحول میں بھی وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے محض ایک سینڈوچ لینے پر تیار ہو گئی جبکہ چارلی کو زبردستی ڈنر کرنا پڑا کیونکہ وہ پوری محفل پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے اور اب یہ برا لگتا تھا کہ ڈنر نہ کیا جائے۔

"کیا ہم کل پھر مل سکتے ہیں؟" چارلی نے کھانے کے دوران پوچھا۔

"کل آٹھ بجے صبح میری ریہرسل ہے، میں تم سے سات سے آٹھ کے درمیان مل سکتی ہوں اور اس وقت تم سو کر بھی نہیں اٹھتے ہو گے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں نا۔"

"تم سچ کہہ رہی ہو، میں رات دیر سے سوتا ہوں اور دوپہر 2 بجے تک سوتا رہتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔ آؤ اب چلیں۔"

وہ باہر نکلے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ چارلی چاہتا تھا اسے ٹیکسی پر اس کے گھر چھوڑ کر آئے لیکن وہ پیدل جانا چاہتی تھی۔ وہ پیدل اس کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کا گھر قریب ہی تھا۔ وہ اسے گھر تک چھوڑ کر پلٹ آیا۔

دوسرے دن سات بجے وہ اس سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ اس طرح وہ اس سے ملاقات کے لیے روزانہ صبح سات بجے پہنچتا رہا۔ ان تین چار ملاقاتوں نے انہیں بے تکلف کر دیا تھا۔ ہیٹی کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی اسے پسند کرنے لگی ہے لیکن جب ایک روز وہ ملی تو اس کا انداز پہلے کی طرح نہیں تھا اس کے رویے میں ایسی سرد مہری تھی جسے محسوس کرنے میں چارلی کو ذرا بھی دیر نہیں لگی۔

"کیا بات ہے ہیٹی، بہت چپ نظر آ رہی ہو، کیا تم مجھ سے اکتا گئی ہو؟"

"بات یہ ہے چارلی کہ تم نے مجھ سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ میں پندرہ برس کی ہوں اور تم مجھ سے چار برس بڑے ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے، دیکھنا تو یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو یا نہیں۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"تم اپنے دل سے پوچھو۔"

"میں اتنی چھوٹی ہوں کہ میرا دل کوئی واضح جواب نہیں دے سکتا۔"

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

"میں ابھی صرف پندرہ کی ہوں۔"

"شادی کی عمر کو پہنچ کر تو شادی کر لو گی مجھ سے؟"

"میں کہہ نہیں سکتی۔"

"یہ کیا ہے، ہر بات میں کہہ رہی ہو، معلوم نہیں، کہہ نہیں سکتی، اس سے تو بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں کبھی نہ ملنے کے لیے۔"

چارلی نے تو یہ بات محض اس کا ردعمل جاننے کے لیے کہہ دی تھی مگر اس نے جواب دیا "خدا حافظ، مجھے افسوس ہے تم بہت اچھے ہو...... مگر خدا حافظ۔"

وہ اس وقت سڑک کے کنارے ایک داخلی راستے کے پاس کھڑے تھے۔ ہیٹی نے اسے ایک مرتبہ پھر خدا حافظ کہا اور داخلی راستے میں غائب ہو گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد چارلی کو احساس ہوا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے۔ اسے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ اس نے تو صرف اس لیے یہ بات کہی تھی کہ وہ جواب میں کہے گی، ہم جدا ہونے کے لیے نہیں ملے ہیں لیکن وہ تو سچ مچ چلی گئی۔ اس نے سوچا، وہ ابھی اس کے گھر جائے اور اس سے معذرت کرے لیکن پھر اس نے سوچا وہ ابھی غصے میں ہوگی۔ وہ بعد میں کسی وقت اس سے ملے گا۔

وہ اس روز مسٹر کارنو سے ملا تو ایک ایسی خبر نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا کہ تھوڑی دیر کے لیے ہیٹی کو بھی بھول گیا۔ مسٹر کارنو پیرس میں ایک کھیل پیش کرنا چاہتے تھے۔ وہ کچھ دنوں بعد عظیم فرانس میں ہوگا۔ یہ تصور ہی اسے مدہوش کرنے کے لیے بہت تھا۔ اس کے آباؤ اجداد بھی فرانس سے تعلق رکھتے تھے۔ چپلن فیملی فرانس سے ہجرت کر کے آئی تھی اور انگلستان کو وطن بنا لیا تھا۔

جب وہ بحری سفر کے اختتام پر فرانس پہنچا اس وقت وہاں بارش ہو رہی تھی۔ دھند میں ڈوبے ہوئے فرانس پر نظر پڑتے ہی وہ بے اختیار پکار اٹھا ”یہ انگلستان نہیں ہے“ یہ ملک ہے فرانس۔“

وہ پیرس کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ پیرس کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ اسے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا لیکن وہ تھکن اتارے بغیر پیرس کی سیر کو نکل گیا تھا۔ وہ اس شہر کے کونے کونے کی سیر کا متمنی تھا۔

پیرس آنے کے بعد ایک دن اس نے سنا کہ ہنی کا طائفہ بھی پیرس آیا ہوا ہے اور فولیس برگری میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ فرانس کا عظیم شہر آرٹ اور فن کا قدر دان اور ہنی کی موجودگی! وہ اسی وقت فولیس برگری پہنچ گیا۔ وہاں شو ہو رہا تھا لیکن اسے پیش کرنے والے کچھ اور لوگ تھے۔ ہنی کا طائفہ اپنا کام ختم کر کے جا چکا تھا۔

پیرس شہر کی روشنیاں اسے بجھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس کے بعد بقیہ دن اس نے اداسی اور بے کسی میں گزارے حالانکہ وہ یہاں دلچسپی کے بہت سے مراحل سے گزرتا بھی رہا۔

☆☆☆

اسے انگلستان واپس آئے ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں اس نے ہنی سے ملنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ملنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ وہ وہ روتی رہی تھی۔

ان بے کلی کے دنوں میں اسے یہ خبر موصول ہوئی کہ کھیل ”وی فٹ بال میچ“ کے دوسرے سیزن میں ہیری ویلڈن کا کردار وہ ادا کرے گا۔ یہ اس کی فنی زندگی کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے اس عظیم اداکار ویلڈن کا ہم پلہ سمجھ لیا گیا تھا۔ اب وہ اس پوزیشن میں تھا کہ اس کردار کی کامیابی کے بعد ایک بڑی تنخواہ کا مطالبہ کر سکتا تھا۔

اس کھیل کے لیے ایک ہفتے کی ریہرسل ہوتی تھی۔ ریہرسل کی پہلی رات تو خیریت سے گزر گئی لیکن دوسری رات ریہرسل کے دوران اچانک اس کی آواز بیٹھ گئی۔ اس نے فوراً ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اپنی آواز بچانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن آواز گم ہوتی چلی گئی۔ کھیل کی پہلی رات اس کا گلا بالکل ہی جواب دے گیا۔ اسے وہ رات یاد آ گئی جب اس کی ماں کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ تماشائیوں کے مذاق کا نشانہ بنی تھی۔ پھر وہ کبھی اسٹیج پر نہیں آ سکی تھی۔ کیا میں بھی..؟ اسی وقت مسٹر کارنو بھاگتے ہوئے آئے۔

”تمہاری آواز کسی کو بھی سنائی نہیں دے رہی ہے۔“

”بس آج برداشت کر لیجیے۔ اگلی رات میری آواز ٹھیک ہو جائے گی۔“

وہ اپنے کردار کو مختصر کر کے پیچھے اتر آیا۔

دوسری رات اس کی آواز کی صورت حال مزید بگڑ چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ اپنی آواز سے بالکل ہی محروم ہو جائے گا۔

وہ اگر اس کھیل میں کامیاب ہو جاتا تو مسٹر کارنو سے اپنی تنخواہ میں اضافے کا بھی اہل ہو جاتا لیکن اس کی آواز نے عین وقت سارا کھیل بگاڑ دیا۔ وہ اس قدر مایوسی کا شکار ہوا کہ بیمار پڑ گیا اور ایک مہینے تک بستر سے اٹھ نہ سکا۔

اس دوران مسٹر کارنو سے اس کا کنٹریکٹ بھی ختم ہو گیا تھا اور وہ اس سے نیا کنٹریکٹ چاہتے تھے جبکہ وہ تنخواہ میں اضافہ چاہتا تھا۔ اس نے چھ پونڈ فی ہفتہ معاوضے کا مطالبہ کیا۔ حیرت کی بات یہ ہوئی کہ کارنو نے اس کا یہ مطالبہ مان لیا۔

ان دنوں کارنو ایک کھیل ”اسکیٹنگ“ کرنا چاہتا تھا اس میں چارلی کو اس نے ایک نمایاں مزاحیہ کردار دیا تھا۔

یہ کھیل برمنگھم میں پیش کیا جا رہا تھا۔ چارلی کا فن اس کھیل میں اپنے عروج پر تھا۔ برمنگھم کی گلیوں میں اس مزاحیہ اداکاری کے چرچے ہو رہے تھے۔

کارنو امریکن کمپنی کا منیجر الف ریوس انگلستان آیا ہوا تھا اور یہ افواہ گردش کر رہی تھی کہ وہ ایک ایسے مزاحیہ اداکار کی تلاش میں ہے جسے وہ اپنے ساتھ امریکا لے جا سکے۔ الف ریوس کی نظریں چارلی پر جم کر رہ گئیں۔ یہی وہ اداکار ہے جو امریکا میں کارنو کمپنی کے لیے سودمند ثابت ہوگا۔ اس نے سوچا اور مسٹر کارنو سے بات کی۔

کارنو اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن جب الف ریوس نے اسے یہ بتایا کہ وہ کھیل (The Wow-Wows) پیش کرنا چاہتا ہے تو کارنو کو بھی قائل ہونا پڑا کہ اس کھیل میں چارلی کا ہونا ضروری ہے۔

چارلی اب انگلستان اور اس کے تماشائیوں سے اکتا گیا تھا۔ اس نے اس پیش کش کو فوراً قبول کر لیا اور نیویارک پہنچ گیا۔

امریکا کا پروگرام محض چھ ہفتوں پر مشتمل تھا اور اس کا انحصار بھی کھیل کے نتائج پر تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس سے پہلے ہی واپسی ہو جاتی۔

امریکی اداکار بھی اس کھیل کی نمائش میں دلچسپی لے رہے تھے چنانچہ کھیل کی پہلی رات امریکی اداکار بھی کافی تعداد میں اسے دیکھنے کے لیے موجود تھے۔

یہ کھیل بری طرح فلاپ ہو گیا۔ امریکی اداکار وقت سے پہلے ہی اٹھ کر چلے گئے۔ چارلی کے مزاح پر بھی کوئی ہنسنے کو تیار نہیں تھا۔ پھر یہ ناکامی ہر رات کا مقدر بن گئی۔ وہی نیویارک جس کی تلاش میں وہ آیا تھا اسے کانٹوں بھرا جنگل نظر آنے لگا۔ اب یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ جونہی چھ ہفتے مکمل ہوں گے انگلستان کے لیے سامان سفر باندھ لیا جائے گا لیکن تیسرے ہفتے ایک عجیب واقعہ وقوع پذیر ہو گیا۔ وہ اپنا کھیل ففتھ ایونیو تھیٹرز میں پیش کر رہے تھے کہ تماشائیوں نے اچانک ہنسنا شروع کر دیا۔ قہقہے تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ یہ تماشائی زیادہ تر انگریزوں پر مشتمل تھے جو وہاں پر خانساماں اور بٹلر وغیرہ تھے۔

دوسرے دن کے اخباروں میں جو تبصرے شائع ہوئے ان میں چارلی چیپلن پر خصوصی تبصرے شائع ہوئے تھے۔

”طائفے میں کم از کم ایک مزاحیہ اداکار ایسا ہے جو امریکا کے لیے ایک سرمایہ ثابت ہو سکتا ہے۔“

ان تبصروں کے بعد چارلی کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ کمپنی کو اتنا فائدہ ہوا کہ مدت قیام کو مزید بیس ہفتوں کے لیے بڑھا دیا گیا۔

کارنو کمپنی امریکا کے مختلف شہروں میں کھیل دکھاتی پھر رہی تھی۔ وہ سان فرانسسکو میں تھے کہ روانگی سے قبل وہ بازار کی سیر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ایک دکان پر بورڈ آویزاں تھا۔

”ہاتھ کی لکیروں اور تاش کے پتوں کے ذریعے قسمت کا حال دریافت کریں۔ فیس ایک ڈالر۔“

وہ اس دکان کے اندر چلا گیا۔ وہاں ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس نے ایک ڈالر فیس ادا کی اور اس عورت نے تاش کے پتے اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔

”ان کو پھینٹو اور ان میں سے کچھ پتے میرے حوالے کر دو اور اپنی ہتھیلیاں میز پر پھیلا دو۔“

اس عورت نے ہاتھ کی لکیروں کو غور سے دیکھا اور کچھ باتیں بتائیں۔

”تم امریکا چھوڑ کر جا رہے ہو لیکن جلدی ہی واپس آؤ گے۔ تم اس دھندے سے مختلف کام کرو گے جو اب کر رہے ہو۔ ایک غیر معمولی کیریئر تمہارا منتظر ہے۔ تم تین شادیاں کرو گے۔ تمہارا ہاتھ ایک دولت مند کا ہاتھ ہے۔ تم 82 برس کی عمر میں موت سے ہم کنار ہو گے۔“

وہ دکان سے نکلا اور ان باتوں پر غور کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ان باتوں نے اس پر اتنا اثر ضرور کیا کہ اس نے اسی وقت یہ طے کر لیا کہ وہ دوبارہ امریکا آئے گا۔

وہ اس عزم کے ساتھ انگلستان آیا کہ بہت جلد اسے امریکا جانا ہے۔ کس طرح جائے گا وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ لندن آتے ہی اسے لندن کے اردگرد کے ہالوں میں کھیل پیش کرنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ اس کو یہاں پہلے کی طرح پذیرائی مل رہی تھی لیکن اس کے حواس پر امریکا چھایا ہوا تھا۔

اس کی ماں ابھی تک ذہنی اسپتال میں تھی۔ وہ اسے دیکھنے گیا تو اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے برف کے پانی کے چھینٹے مارے جا رہے تھے اور اس کا چہرہ نیلا پڑ چکا تھا۔ اب اس کی استطاعت اتنی تھی کہ اس کا پرائیویٹ علاج کرا سکے۔ اس نے اپنی والدہ کو پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرا دیا۔

اسپتال کا خرچ برداشت کرنے کے لیے اسے اپنی آمدنی کو مزید بڑھانا تھا۔ اس کے لیے اسے پامسٹ کی پیش گوئی کے مطابق دوبارہ امریکا جانا تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کو غور سے دیکھا۔ میرا ہاتھ ایک دولت مند کا ہاتھ ہے۔ مجھے امریکا جانا ہوگا۔

اسے لندن کے مضافات میں گھومتے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے کہ اسے یہ خبر موصول ہوئی کہ اسے امریکا کے لیے بک کر لیا گیا ہے۔ کارنو کمپنی کا ایک طائفہ دوبارہ امریکا جا رہا تھا جس میں چارلی چیپلن بھی شامل تھا۔

شکاگو اور فلاڈیلفیا میں اپنی کمپنی کے ساتھ مصروف عمل رہتے ہوئے اسے پانچ ماہ ہو گئے تھے اور وہ یکسانیت کا شکار تھا۔ اسے ایک ٹیلی گرام موصول ہوا۔ یہ ٹیلی گرام اسے منیجر ریوس نے دیا تھا کیونکہ کمپنی کے نام آیا تھا اور ریوس نے وصول کیا تھا۔

ٹیلی گرام کا مضمون کچھ یوں تھا۔

”کیا آپ کی کمپنی میں کوئی چپلن نامی یا اس سے ملتے جلتے نام کا کوئی اداکار موجود ہے۔ اگر ہے تو اسے ہدایت کریں کہ وہ کیسل اینڈ بومین 24 لانگ ایکر بلڈنگ [illegible] سے رابطہ کرے۔“

کمپنی میں اس نام کا کوئی اداکار نہیں تھا۔ ریوس نے توجہ دلائی کہ ممکن ہے یہ نام چیپلن نہیں چپلن ہو جو کہ تم ہو۔ چیپلن یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ جو ایڈریس دیا گیا تھا وہاں تو وکیلوں کے دفاتر تھے۔ پھر ایک خیال نے اسے

نہال کر دیا۔ میری ایک امیر آنٹی امریکا میں کہیں مقیم تھی۔ ممکن ہے کہ وہ موت سے ہمکنار ہوگئی ہو اور میرے لیے وراثت چھوڑ گئی ہو۔ وہ صبح ہوتے ہی نیویارک جانے والی ٹرین میں بیٹھ گیا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اپنی آنٹی کی وصیت کا حقدار بننے والا ہوں۔ اس کے خیال میں کیسل اور بومین دو وکیل تھے جن سے وہ ملنے والا تھا لیکن نیویارک پہنچ کر جب وہ ان سے ملا تو اسے سخت مایوسی ہوئی کیونکہ کیسل اور بومین وکلا نہ تھے بلکہ خاموش فلموں کے پروڈیوسر تھے۔ اس کا جی چاہا اسی وقت اٹھ کر چلا جائے لیکن جب ان کی طرف سے پیش کش ہوئی تو وہ وہاں رکنے پر مجبور ہوگیا۔

انہوں نے پیش کش کی کہ وہ ایک سال کا کنٹریکٹ کریں گے۔ پہلے تین ماہ تک 150 ڈالر فی ہفتہ تنخواہ ادا کریں گے اور بقیہ نو ماہ تک 175 ڈالر فی ہفتہ تنخواہ ادا کریں گے۔

یہ تنخواہ اتنی زیادہ تھی کہ اس سے قبل کسی نے اس قدر تنخواہ کی پیش کش نہیں کی تھی اور پھر تھیٹر کی یکسانیت سے نکلنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔ فلموں کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ خاموش فلمیں تھیں لیکن نئی چیز تھی لہٰذا تماش بینوں کا رجحان اس طرف تھا۔ شہرت کے مواقع بہت تھے۔ چارلی چپلن نے مسٹر کارنو کا معاہدہ ختم ہوتے ہی کیسل سے معاہدہ کر لیا۔ کارنو کمپنی اپنا کام ختم کر کے انگلستان روانہ ہوگئی اور وہ لاس اینجلس چلا گیا جہاں اسے نئی کمپنی جوائن کرنی تھی۔

اس کا اسٹوڈیو لاس اینجلس کے ایک مضافاتی قصبے میں "کی اسٹون" کے نام سے تھا۔ یہاں اس نے لگاتار پانچ فلمیں کیں اور امریکی تماشائیوں میں اپنی جگہ بنالی۔ وہ اتنا بڑا مزاحیہ اداکار ثابت ہوا کہ لوگ صرف اس کا نام سن کر ہنسنے لگتے تھے۔ اب وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ اپنی تجاویز منوا سکے۔ اس کی پہلی تجویز یہ تھی کہ وہ اپنے اسکرپٹ خود لکھا کرے گا۔ ہدایت کار اور پروڈیوسر کے لیے اس تجویز پر عمل کرنا مشکل تھا لیکن جب اس نے کمپنی چھوڑنے کی دھمکی دے دی تو اس کی تجویز ماننی پڑی اور بعد میں ثابت ہوگیا کہ وہ ٹھیک تھا۔ اس کے آئیڈیاز پبلک میں متعارف ہوئے تو اس کی اچھل کود نے کچھ اور ہی رنگ قائم کیا۔

1914 میں اس کی عمر 25 برس تھی۔ وہ جوانی کے نشے میں چور اپنے کام میں مگن اور آگے بڑھنے کا متمنی تھا۔ کی اسٹون کمپنی سے اس کا کنٹریکٹ ختم ہونے والا تھا۔ وہ اپنی مقبولیت سے واقف ہوچکا تھا۔ اس نے نئے کنٹریکٹ کے لیے ایک ہزار ڈالر فی ہفتہ تنخواہ کا مطالبہ کر دیا۔ یہ اتنا بڑا مطالبہ تھا کہ کمپنی اس کے لیے تیار نہیں ہو سکتی تھی لیکن اسے چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی بالآخر وہ پانچ سو ڈالر پر تیار ہو گئے؟ چارلی ایک ہزار پر اڑا ہوا تھا۔

معاہدے کے ختم ہونے میں ایک ماہ رہ گیا تھا لیکن دوسری کمپنی سے کوئی بات نہیں بن پا رہی تھی۔ ایک ہزار ڈالر کوئی بھی دینے کو تیار نہیں تھا اور وہ اپنے مطالبے سے ہٹنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ وہ انگلینڈ واپس لوٹ جائے۔

کی اسٹون کمپنی کا معاہدہ ختم ہونے میں دو ہفتے باقی رہ گئے تھے کہ "ایسانے کمپنی" کا ایک نمائندہ اس کے پاس آیا اور ایک پُرتکلف ڈنر میں اس نے بتایا کہ وہ براہ راست جی ایم اینڈرسن کی جانب سے آیا ہے جو اس کمپنی کے شراکت دار ہیں۔ انہوں نے 1250 ڈالر فی ہفتہ کی پیش کش کی ہے۔ دس ہزار ڈالر بونس الگ ہوگا۔ اگر تمہیں قبول ہو۔

بونس کا مطالبہ اس نے کبھی کیا بھی نہیں تھا مزید یہ تنخواہ اس کی خواہش سے زیادہ تھی۔ اس نے تصور ہی تصور میں خود کو کروڑ پتی بنتے دیکھ لیا اور فوراً معاہدے پر تیار ہو گیا البتہ اس نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ بہت بے تاب تھا۔

مسٹر اینڈرسن خود اسے لینے آئے اور اسے لے کر فرانسسکو چلے گئے۔ پھر وہ ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر واقع "نیلس" لے گئے جہاں ان کا اسٹوڈیو تھا۔ یہاں رہ کر اس نے چار کامیاب فلمیں بنائیں۔ معاہدے کے مطابق اس کے اسکرپٹس اس نے خود لکھے تھے۔ پھر اس نے اینڈرسن کو مشورہ دیا کہ وہ لاس اینجلس میں کوئی اسٹوڈیو تیار کرے جہاں زیادہ سہولت سے کامیڈی فلمیں بن سکتی ہیں۔ اینڈرسن نے لاس اینجلس میں ایک اسٹوڈیو کرائے پر لے لیا۔

وہ لاس اینجلس میں تھا کہ اسے ایک ارجنٹ کال موصول ہوئی۔

"ہم آپ کو دو ہفتوں کے 25000 ڈالر معاوضہ ادا کریں گے بشرطیکہ آپ ہر شام محض پندرہ منٹ کے لیے نیویارک کے سرکس میدان میں اپنی پرفارمنس دیں۔"

صرف پندرہ منٹ کی پرفارمنس۔ دو ہفتے اور پچیس ہزار ڈالر معاوضہ! اس نے فوراً اینڈرسن کو فون کیا اور دو ہفتے کی چھٹی طلب کی تاکہ وہ پچیس ہزار ڈالرز کمانے نیویارک چلا جائے۔ اینڈرسن اسے کسی اور کے لیے کام کرنے کے حق میں نہیں تھا اس نے یہ اضافی رقم خود دینے کا فیصلہ کیا۔

"اگر تم دو ریل لمبائی پر مبنی کامیڈی فلم بنا دو تو یہ میں دینے کو تیار ہوں۔"

وہ اگلے ہی دن لاس اینجلس آگیا اور پچیس ہزار ڈالرز کا چیک چارلی کے حوالے کر دیا۔ وہ حیران تھا کہ دولت اس پر کس طرح قربان ہو رہی ہے۔ حیران کن مستقبل اسے کہاں لے جا رہا ہے۔ اس پر گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی کامیابیوں کی داستان سنانے اپنے بھائی سڈنی کے پاس نیویارک روانہ ہو گیا۔

اس کی گاڑی راستے میں ایک اسٹیشن پر رکی تو اس نے دیکھا ایک ہجوم جمع تھا۔ لوگ رنگ برنگی جھنڈیاں لہرا رہے تھے۔ بڑی بڑی میزیں لگی تھیں جن پر ریفریشمنٹ کا سامان لگا تھا۔

وہ حیران ہو رہا تھا کہ یہ کس کے استقبال کی تیاریاں ہیں۔ اسی وقت ایک آدمی اندر آیا "کیا یہاں مسٹر چارلی چپلن موجود ہیں۔" اس نے کہا۔

"کیا بات ہے، میں ہوں چپلن۔"

"امارلیو، ٹیکساس کے میئر کی جانب سے اور آپ کے پرستاروں کی جانب سے ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ چائے پئیں۔"

اسے باہر نکلنا پڑا۔ وہ جونہی ریل کے ڈبے سے باہر آیا تالیوں سے پلیٹ فارم گونج اٹھا۔ میئر نے استقبالیہ خطاب پیش کیا۔ اس نے بھی چند کلمات کہے مگر ہجوم اتنا تھا کہ پولیس کے جوانوں کو ہجوم پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا اور اسے واپس ڈبے میں جانا پڑا۔ گاڑی کی روانگی سے قبل اسے کئی ٹیلی گرام موصول ہوئے۔

"خوش آمدید چارلی، ہم کینساس میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"جب تم شکاگو پہنچو گے تب ہم تمہارا استقبال کریں گے۔"

"کیا تم ایک رات قیام کرو گے اور بلیک اسٹون ہوٹل کے مہمان بننا پسند کرو گے۔"

وہ حیران ہو رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ اتنا مقبول ہو چکا ہے۔ لاس اینجلس میں بیٹھ کر اسے اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا۔ ایسے استقبال تو بادشاہوں کے ہوتے ہیں۔

اس کی ٹرین کینساس کے قریب پہنچی تو اسے اندازہ ہو گیا کہ ریلوے اسٹیشن پر کیا حال ہوگا۔ راستے میں لوگ ریل کی پٹری کے ساتھ کھڑے تھے اور اپنے ہیٹ ہلا رہے تھے۔ کینساس سٹی کا بڑا سا ریلوے اسٹیشن لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پولیس لوگوں کو پیچھے دھکیل رہی تھی لیکن لگتا تھا پولیس انہیں کنٹرول کرنے میں ناکام رہے گی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ڈبے سے باہر آتا۔ لمحہ بہ لمحہ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ بالآخر ایک سیڑھی کا انتظام کیا گیا جس کے ذریعے اسے ٹرین کی چھت پر چڑھایا گیا تاکہ لوگ اس کے دیدار سے مستفید ہو سکیں۔ اس نے اپنے پرستاروں سے خطاب کیا۔

کسی اداکار کی ایسی پذیرائی اس سے پہلے نہیں دیکھی گئی تھی۔

گاڑی کینساس سے روانہ ہوئی تو شکاگو تک اس نے لوگوں کو ریل کی پٹری کے ساتھ کھڑے اور ہیٹ ہلاتے دیکھا۔ ایسا لگتا تھا پورا امریکا اس کے لیے دیوانہ ہو چکا ہے۔

شکاگو میں گاڑی کا بدلنا ضروری تھا۔ اس کے دیوانے اسے کاندھوں پر اٹھا کر جلوس کی شکل میں بلیک اسٹون ہوٹل لے کر گئے۔

وہ ہوٹل میں تھا کہ پولیس چیف کا ٹیلی گرام موصول ہوا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ مسٹر چارلی آپ مقررہ روٹ سے ریلوے اسٹیشن روانہ ہونے کے بجائے دوسرے روٹ سے روانہ ہوں کیونکہ مقررہ روٹ پر بے تحاشا لوگ جمع ہو چکے ہیں۔ وہ نیویارک پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ڈپارٹمنٹل اسٹورز پر اس کے مجسمے اور اس کی شکل کے کھلونے فروخت ہو رہے ہیں۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ کمپنیاں اسے زیادہ سے زیادہ معاوضے پر اپنی جانب کیوں کھینچ رہی ہیں۔

اسی نیویارک میں بیٹھ کر اس کا معاہدہ میوچل فلم کمپنی سے ہوا۔ معاہدے کے مطابق 10000 ڈالر ہفتہ تنخواہ مقرر ہوئی اور 150,000 ڈالر کا چیک بطور بونس دیا گیا۔

میوچل فلم کمپنی کے لیے اس نے سولہ ماہ میں بارہ فلمیں مکمل کیں۔

اب وہ کروڑ پتی بن چکا تھا لیکن سال بھر کے باون ہفتوں کے دوران لکھنا، اداکاری کرنا اور ہدایت کاری کرنا ایک مشقت طلب کام تھا۔

اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ تنہائی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ تھک جاتا تو حلیہ بدل کر بازاروں میں نکل جاتا۔ بے مقصد دکانوں میں جھانکتا پھرتا تھا۔ اسی زمانے میں اس کی ملاقات ملڈریڈ ہیرس نامی ایک لڑکی سے ہوئی اور چند روزہ معاشقے کے بعد اس نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔

میوچل فلم کمپنی سے اس کا معاہدہ ختم ہونے کو تھا کہ اس کا معاہدہ فرسٹ نیشنل سے ہو گیا۔ اس نے 12,00000 (بارہ لاکھ) ڈالر وصول کیے۔ اس کے عوض اسے آٹھ، دو ریل کامیڈی فلمیں تیار کرنی تھیں۔

یہ شادی اس کی تخلیقی صلاحیتوں پر بری طرح اثر انداز ہو رہی تھی کیونکہ مِلڈرڈ اچھی بیوی ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہر کام چارلی کی خواہش کے برعکس کرنے کی عادی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ماہ بعد ہی علیحدگی ہو گئی اور چارلی نے 25000 ڈالرز ادا کر کے اس سے پیچھا چھڑایا۔

اس طلاق کے بعد ممکن ہے وہ کچھ دنوں کے لیے ذہنی مفلوج ہو جاتا لیکن ایک اطلاع نے اسے پھر سے زندہ کر دیا۔ اس کی ماں صحت یاب ہو چکی تھی اور اس کے پاس آنا چاہتی تھی۔ چارلی نے اسے پچھلے دس برس سے نہیں دیکھا تھا۔ دس برس بعد اپنی عظیم ماں سے ملاقات اس کے لیے شادیِ مرگ سے کم نہ تھی۔ وہ ان دنوں کیلی فورنیا میں مقیم تھا۔ اس نے اپنے سیکریٹری کو فوراً انگلستان روانہ کیا تاکہ وہ بہ حفاظت اس کی ماں کو اپنے ہمراہ لے آئے۔

وہ دس برس بعد ماں کو دیکھ رہا تھا اس وقت اسے شدید دھچکا لگا جب ایک بوڑھی خاتون اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے چارلی کو فوراً پہچان لیا اور پھر سے چارلی کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔

اب اس کا بیٹا چارلی اتنا دولت مند تھا کہ اپنی ماں کو شہزادیوں کی طرح رکھ سکتا تھا۔ وہ اس کے آنے سے پہلے ہی سمندر کے نزدیک اس کے لیے ایک بنگلے کا بندوبست کر چکا تھا۔ ایک گاڑی اس کے لیے مخصوص تھی جس میں وہ گھوم پھر سکتی تھی۔ ایک تربیت یافتہ نرس ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ اور سڈنی جب فرصت ملتی تھی اس سے ملنے چلے جاتے تھے۔ وہ اسٹوڈیو بھی چلی آتی تھی جہاں چارلی اسے اپنی کامیڈی فلمیں دکھاتا تھا۔

اس کی ماں کو اس کے پاس آئے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں اس کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے بیٹوں چارلی اور سڈنی کی ترقی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اس دوران چارلی اپنے بچپن کے شہر لندن گیا لیکن اب وہ محض چارلی نہیں تھا عظیم اداکار چارلی چیپلن تھا۔ وہ لندن پہنچا تو اس کی آمد سے قبل ہی اخبار سرخیاں لگا چکے تھے۔

"چیپلن ایک فاتح کے انداز میں واپس آ رہا ہے۔"

جہاز پر اس نے اخباروں کی سرخیاں دیکھیں۔

"کامیڈین کی گھر واپسی۔"

"لندن میں چیپلن کا شاندار استقبال کیا جائے گا۔"

"چیپلن ہماری سرزمین کا بیٹا ہے۔"

وہی ہوا۔ وہ لندن پہنچا اور جونہی اس نے ٹرین سے باہر قدم نکالا۔ لوگوں کا ہجوم منتظر تھا جن کو رستا باندھ کر منتظم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر اس طرح چل رہا تھا جیسے زیرِ حراست ہو۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اسے ہوٹل پہنچایا گیا۔

وہ اس قسم کے استقبال کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ تو بچپن کے پرانے مقامات دیکھنا چاہتا تھا۔ خاموشی کے ساتھ لندن گھومنا چاہتا تھا۔ ان تمام گھروں کو دیکھنا چاہتا تھا جہاں اس نے غربت کے دن گزارے تھے۔ اس نے یہ سب کچھ دیکھا بھی لیکن پولیس کے سخت پہرے میں اور پھر تقریبوں اور ملاقاتوں میں کھو گیا۔

کئی ہفتوں کے اس دور کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اگر کچھ دن اور یہاں رہا تو سست اور کاہل ہو جائے گا۔ اسے کیلی فورنیا پہنچ کر بہت سارا کام کرنا تھا اور وہ امریکا واپس لوٹ آیا۔

کچھ دن نیویارک میں گزارنے کے بعد وہ ہالی ووڈ واپس آیا تو ماں سے ملنے گیا۔ وہ دورۂ لندن کے بارے میں سن چکی تھی اور اس کی کامیابی پر بے حد خوش تھی۔

"اخباروں نے تمہاری بڑی تعریفیں لکھی ہیں۔"

"اخباروں کو چھوڑیے آپ بتائیے آپ اپنے بیٹے کی حماقتوں کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟"

"یہ سب کچھ ناقابلِ یقین ہے لیکن اب بہت اداکاری ہو چکی۔ کب تک خود کو تھیٹرز اور فلموں تک محدود رکھو گے۔"

"اس کی ذمے دار بھی تو آپ ہی ہیں۔ میں ایک اداکارہ کا بیٹا ہوں۔ یاد ہے جب آپ کی آواز بیٹھ گئی تھی آپ ہی نے مجھے اسٹیج پر بھیجا تھا اور آپ ہی کہتی تھیں کہ مجھ میں اداکاری کے جراثیم ہیں۔"

"للی" کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی جیسے کہہ رہی ہو چارلی کیا للہ کہہ رہا ہے پھر اس نے شفقت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم اپنے آپ کو خدا کی خدمت کے لیے وقف نہیں کر سکتے۔ ہزاروں روحوں کے بارے میں سوچو جن کو بچا سکتے ہو۔"

چارلی نے ہنستے ہوئے کہا "میں نے روحوں کو بچایا نہ دولت کو نہیں۔"

"تم شادی کر لو یہ بھی ایک خدمت ہے۔"

اب وہ ماں کو کیا بتاتا کہ وہ خود تنہائی کا شکار ہے۔ اس پر کئی مرتبہ اعصابی حملے ہو چکے ہیں۔ وہ خود کسی دلکش خاتون کی

تلاش میں ہے جو اس کے معیار پر پوری اتر سکے۔

اس نے بات کو ہنسی مذاق میں ٹال دیا اور والدہ کے پاس سے اٹھ کر چلا آیا۔

☆☆☆

فرسٹ نیشنل کے ساتھ اس کا معاہدہ آخری حد میں داخل ہو چکا تھا اور اب وہ اس کے خاتمے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آخری تین فلموں کی تیاری کا کام ہونا باقی تھا۔ وہ دن رات اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ جلد از جلد اپنے معاہدے کے مطابق یہ فلمیں مکمل کرے تاکہ کوئی اور آشیانہ تلاش کرے۔

ان فلموں کی تیاری کے بعد وہ آزاد تھا اور اس نے "یونائیٹڈ آرٹسٹ" کو جوائن کر لیا۔

اب وہ اس کمپنی کے لیے اپنی پہلی کامیڈی فلم بنانے کے لیے آزاد تھا لیکن کوئی آئیڈیا اس وقت اس کے پاس نہیں تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کا ذہن اس طرح خالی رہا ہو۔ وہ کمرے میں بند ہو گیا اور پھر ایک اسٹوری کا عکس اس کے ذہن میں ابھرا۔ اس فلم کا نام اس نے The Golden Rush رکھا اور اسے بنانے کا آغاز کر دیا۔

اس فلم بندی کے دوران اس نے دوسری شادی بھی کی۔ اس نے اس شادی کو کامیاب بنانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اسے دو برس سے زیادہ قائم نہ رکھ سکا اور کئی کا شکار ہو کر اپنے انجام کو جا پہنچی۔

فلم مکمل ہو گئی۔ نمائش کے لیے پیش بھی کر دی گئی۔ باکس آفس پر کامیاب بھی ہوئی۔ اس فلم نے ایسے تعجب خیز بزنس کیے کہ جن کا نام نہیں لیتے تھے۔ چھ ملین ڈالر کا کامیاب بزنس کیا لیکن وہ خود بیمار پڑ گیا۔ اس پر اعصابی حملہ ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے مشورہ دیا کہ "نیویارک سے باہر نکلو، ساحلِ سمندر پر چلے جاؤ اور سمندری ہوا کھاؤ۔"

اس نے سامان پیک کیا اور سمندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ یونائیٹڈ آرٹسٹ فلمز کے لیے اپنی فلم "دی سرکس" کی تکمیل میں مصروف تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کی ماں بیمار ہے اور گلینڈیل اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔

وہ اس سے ملنے اسپتال پہنچا تو وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ وہ اس کے قریب گیا اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور سرگوشی میں کہا۔

"ماں۔ چارلی آیا ہے۔" اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی ماں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی روشنی بیدار ہوئی اور پھر وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"میں تیرے مسائل سے بے خبر نہیں ہوں۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا "تو میرا بہادر بیٹا ہے۔ سڈنی بھی یہاں ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ مجھے مرتے ہوئے تو دیکھ لیتا۔"

"تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گی۔"

"شاید۔" اس نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اب وہ دوبارہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ باہر نکل آیا۔ ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ بیماری کا شدید حملہ ہوا ہے۔ ویسے ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔

اگلے روز وہ کام میں مصروف تھا کہ اس کے اندیشوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ اسپتال سے "للی" کی موت کی اطلاع آ گئی۔ اس نے میک اپ اتارا اور اپنے سیکریٹری کے ہمراہ اسپتال کے لیے روانہ ہو گیا۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ ایک بیڈ پر "للی" بے حس و حرکت ابدی نیند سو رہی تھی۔ چارلی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے معلوم تھا اب وہ اس سے کبھی بات نہیں کرے گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے سو چکی ہے۔ اسے وہ تمام مصائب یاد آ گئے جو اس کی ماں نے بچوں کی پرورش کے لیے جھیلے تھے۔ اب آرام کے دن آئے تھے تو موت نے اس پر قبضہ جما لیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور رونے لگا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک ماں کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ باہر اس کا سیکریٹری بیٹھا تھا۔ چارلی نے اسے بتایا کہ وہ اپنی ماں کو ہالی ووڈ کے قبرستان میں دفن کرنا چاہتا ہے۔

سیکریٹری نے تمام انتظامات سنبھال لیے اور "للی" ہالی ووڈ کے قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ اس کا بڑا بیٹا سڈنی یورپ میں تھا اور بیمار تھا لہٰذا تجہیز و تدفین میں شامل ہونے سے محروم رہا۔

ماں کی موت نے اسے بہت دن تک اعصابی تناؤ کا شکار بنائے رکھا مگر پھر اسے کام کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یونائیٹڈ آرٹسٹ کے لیے اس نے کم از کم آٹھ فلمیں بنائیں جو سب کی سب منافع بخش ثابت ہوئیں۔ اس دوران کئی خوبصورت لڑکیاں اس کے قریب آئیں لیکن وہ بدستور تنہائی کا شکار تھا وہ کسی سے شادی نہ کر سکا۔

☆☆☆

فلمی دنیا میں انقلاب عظیم برپا ہونے والا تھا۔ ہر طرف سے نوید سنائی دے رہی تھی کہ بولنے والی فلمیں متعارف ہونے کو ہیں۔

یہ پیش گوئی اس وقت پوری ہوگئی جب وارنر برادرز نے اپنی پہلی بولنے والی فلم پیش کردی۔ ہر طرف حیرت اور خوشی کے ہنگامے برپا ہوگئے۔ لوگوں کے لیے یہ کارنامہ جادو سے کم نہیں تھا کہ جو اداکار پردے پر آرہے ہیں وہ بول بھی رہے ہیں۔ فلم کیسی ہے یہ کوئی غور ہی نہیں کررہا تھا، حیرت کی بات تو یہی کہ آواز سنائی دے رہی تھی۔

ایک مہینا نہیں گزرا تھا کہ ایم جی ایم نے ''دی براڈوے میلوڈی'' پیش کردی۔ یہ مکمل لسانی کی حامل ساؤنڈ میوزیکل فلم تھی اور انتہائی کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔

اس فلم کی کامیابی کے ساتھ ہی خاموش فلموں سے متعلق افراد میں ہلچل مچ گئی۔ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر وغیرہ جہاں بھی بیٹھتے ان فلموں کا تذکرہ نکل آتا۔ روز نئی نئی باتیں سامنے آرہی تھیں۔ جو فلم کمپنیاں خاموش فلمیں بنارہی تھیں اب وہ ظاہر ہے ساؤنڈ فلمز کی طرف متوجہ ہونے لگی تھیں۔ یہ طے ہوچکا تھا کہ خاموش فلمیں اپنی موت آپ مرجائیں گی۔

وہی پروڈیوسر جو چارلی کے آگے پیچھے پھرتے تھے اب اسے نظرانداز کررہے تھے۔ بولنے والی فلموں کا مستقبل روشن نظر آرہا تھا لہٰذا اب اسی طرف راغب تھے۔

چارلی تنہا تھا اب مزید تنہا ہوگیا۔ وہ تو اب یہ سوچنے لگا تھا کہ شاید اس کا دور اختتام کو پہنچ گیا۔ وہ تو اب اگر کوئی خاموش فلم بنائے تو کاسٹ اکٹھی کرنا بھی مشکل ہوجائے گا۔ بولتی فلمیں اب ایک حقیقت تھیں جن میں نت نئے اضافے ہوتے جارہے تھے۔

اب کوئی کمپنی ایسی نہیں تھی جو چارلی کو تنخواہ پر ملازم رکھتی اور کسی خاموش فلم کی فرمائش کرتی۔ اس نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ وہ خاموش فلم بنائے گا اور خود بنائے گا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی لوگوں پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ چارلی ایک خاموش فلم ''سٹی لائٹ'' بنارہا ہے۔ اس کے اس اقدام پر ملی جلی آرا سامنے آرہی تھیں۔

''وہ رسک لے رہا ہے۔''

''اس کا سرمایہ ڈوب جائے گا۔''

''چارلی ایسا کرسکتا ہے۔ وہ فلم بنائے گا بھی اور کامیاب بھی کرائے گا۔''

''اس جیسا مزاحیہ اداکار ابھی بولتی فلموں کو میسر نہیں لہٰذا وہ کامیاب رہے گا۔''

''اس کی مقبولیت کا نشہ اتنی آسانی سے نہیں اترے گا۔ اس کے پرستار اسے دیکھنے پہنچیں گے چاہے وہ کہیں بھی ہو۔''

خود چارلی کا کہنا یہ تھا کہ لوگوں کو تفریح چاہیے چاہے کسی صورت میں ہو۔

چارلی کو کوئی مخالفت اس فلم کی تیاری سے باز نہ رکھ سکی اور اس نے یہ فلم بنائی۔

بولتی فلموں کو آئے تین سال ہوچکے تھے اور ان فلموں کے قدم جم چکے تھے لیکن اس کے باوجود جب چارلی کی فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی تو کسی بھی ٹاکی فلم سے زیادہ منافع بخش ثابت ہوئی۔ اس کی نمائش بارہ ہفتوں تک جاری رہی اور اس سے چارلی کو چار لاکھ ڈالر کا خالص منافع ہوا۔

اب وہ اس فلم کو لندن لے جانا چاہتا تھا تاکہ وہاں نمائش کے لیے پیش کرسکے۔ وہ ''اولمپک'' نامی بحری جہاز میں سوار ہوا اور لندن روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

وہ آٹھ ماہ یورپ کے مختلف شہروں میں گزارنے کے بعد واپس اپنے گھر ''بیورلی ہلز'' پہنچا تو اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ بے چین بھی تھا اور تنہا بھی۔ وہ اس امید پر یورپ کے دورے پر گیا تھا کہ شاید اس کو ایسی عورت مل جائے جو اس کی زندگی میں رنگ بکھیر سکے لیکن وہ تنہا لوٹ آیا۔

اب ہالی وڈ میں مزید قیام کرنے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ خاموش فلموں کا دور گزر چکا تھا اور ٹاکی فلموں سے رغبت نہیں تھی۔ کبھی کبھی خیال آتا تھا اپنا تمام اثاثہ فروخت کرکے کسی طرف نکل جائے۔

پریشانی کے اسی دور میں اس کی ملاقات پولٹ گوڈرڈ سے ہوئی۔ یہ ایک دلکش خاتون تھی۔ وہ فلمی دنیا میں سرمایہ کاری کرنے کی خواہاں تھی اور اسی مشورے کے لیے اس سے ملی تھی۔ چارلی نے اسے پُرخلوص مشورہ دیا۔

''فلموں میں پیسے لگانا رسکی کام ہے۔ تمہیں معلوم ہے میں اپنی ذاتی فلموں کے سوا کسی بھی فلم کمپنی میں ایک پائی بھی سرمایہ کاری نہیں کرتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ رسی ڈھیلی کا میں چھنستی ہے بھی نہیں چھنستی۔''

''اگر میں یہ رقم آپ کی کسی فلم میں لگاؤں؟''

''خوب صورت خاتون اب میرا دور گزر گیا۔ اب ٹاکی فلموں کا دور ہے جو مجھے پسند نہیں۔''

پولٹ گوڈرڈ اس کی اس صاف گوئی سے متاثر ہوئی اس کا اکثر وقت چارلی کے ساتھ گزرنے لگا۔ دونوں پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا لہٰذا ڈرائیو پر نکل جاتے۔ بند ساحل کرتے اور کشتیوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتے۔

ایک روز انہوں نے بندرگاہ پر دیکھا ایک کشتی پر برائے فروخت لکھا ہوا تھا۔ یہ 55 فٹ لمبی کشتی تھی جو موٹر سے چلتی تھی۔ اس میں تین کمرے تھے۔ ایک گیلری تھی۔

''اگر تمہارے پاس بھی اس قسم کی کشتی ہوتی تو ہم ہر اتوار اس کی سیر سے لطف اندوز ہوا کرتے۔'' پولٹ نے کہا۔

اگلے اتوار کو اس نے پولٹ کو ساتھ لیا اور بندرگاہ پہنچ گیا۔

''تم پھر مجھے اس تکلیف دہ جگہ لے آئے۔ کشتی کو دیکھ کر جی چاہتا ہے یہ تمہاری ہوتی۔''

''اس کشتی کے کپتان نے ہمیں ناشتے کی دعوت دی ہے یعنی مجھے اور تمہیں۔''

''کشتی تو پانی میں اچھی لگتی ہے۔''

''چلو بیچ سمندر میں ناشتا کریں گے۔''

پولٹ نے گیلری میں جھانک کر دیکھا اور چارلی کے باورچی کو پہچان لیا۔ ''یہ تمہارا باورچی یہاں کیسے آگیا۔''

''اس لیے کہ یہ کشتی میری ہے۔ تم نے کہا تھا نا کہ کاش یہ کشتی تمہاری یعنی میری ہوتی۔''

''تو کیا تم نے خرید لی۔''

''ہاں تمہارے اور صرف تمہارے لیے۔'' چارلی نے کہا اور وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی۔

''تم مجھے اتنا چاہتے ہو؟''

''ہاں، اس سے بھی کہیں زیادہ۔ اب ہم ناشتے کے بعد کاتالینا جائیں گے اور وہاں تیراکی سے لطف اندوز ہوں گے۔''

باورچی نے ناشتا لگا دیا تھا۔ ناشتے کے بعد کپتان نے انجن کو گرم کیا اور کشتی کاتالینا کی جانب روانہ ہوگئی جو 22 میل کی دوری پر واقع تھا۔

☆☆☆

تفریح اور سیر سپاٹے میں دن گزر رہے تھے لیکن وہ بھی کبھی سوچتا تھا کہ وہ کیا کررہا ہے؟ کیوں کچھ نہیں کررہا؟ اس کے پاس فوری کام کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ پھر اچانک ایک دن ایک خیال نے ذہن پر دستک دی۔ ایک اسٹوری ذہن میں آئی۔

وہ ایک مرتبہ پھر خاموش فلم بنانے کے لیے پُرعزم ہوگیا۔ اس کی یہ فلم ''ماڈرن ٹائمز'' تھی۔ اس فلم میں پولٹ نے بھی کردار ادا کیا تھا اور اس کی شہرت نے کئی فلم سازوں کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔

اسے یہ یقین نہیں تھا کہ فلم کامیاب ہوگی چنانچہ فلم کی نمائش سے قبل اس نے سوچا کہ کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں فلم کی خبریں اس تک نہ پہنچیں۔ اس نے ہونولولو جانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پولٹ اور اس کی والدہ کو بھی ساتھ لے لیا اور دفتر والوں کو یہ ہدایات جاری کیں کہ وہ کسی قسم کا کوئی پیغام اسے ارسال نہ کریں۔

یہ ایک قسم کا فرار تھا جو اس نے اختیار کیا تھا لیکن جب وہ ہونولولو پہنچا تو اس کے خوف و ہراس کی انتہا نہ رہی۔ وہ جس مصیبت سے بھاگا تھا، اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اپنی فلم ''ماڈرن ٹائمز'' کے اشتہار لگے دیکھے اور ''پریس'' کو اپنا منتظر پایا۔

اس فلم کے لیے یہ افواہ اڑی ہوئی تھی کہ یہ ایک کمیونسٹ فلم ہے۔ یہ صحافی اسی خیال سے متعلق سوالات کررہے تھے۔ وہ اس تنازع میں پڑے بغیر گزرنا چاہتا تھا لیکن اسے سوالوں کا سامنا کرنا پڑا اور اس نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا۔

''یہ فلم کمیونسٹ فلم نہیں ہے لیکن کمیونزم کے خلاف بھی نہیں ہے۔''

ٹوکیو میں اسے یہ صورت حال نہیں ملی لیکن جاپانی حکام اس کی آمد پر سخت تشویش میں مبتلا ہوئے تھے کیونکہ حال ہی میں ایک فوجی بغاوت ہوئی تھی اور اس پر بھی شک کیا جارہا تھا چنانچہ وہ جب تک وہاں رہا سرکاری اہل کار اس کی نگرانی کرتے رہے۔

اس سفر کے دوران ہی کسی وقت اس نے پولٹ گوڈرڈ سے شادی کرلی۔

پانچ ماہ کی دوری کے بعد وہ پھر ہالی وڈ میں تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ اس کی فلم نے عظیم الشان کامیابی حاصل کی جس سے اسے کافی منافع حاصل ہوا۔

اس فلم کی کامیابی نے اس کے ذہن میں پھر سوال اٹھایا۔ ''کیا مجھے ایک اور خاموش فلم بنانی چاہیے؟'' وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو ایک عظیم چانس سے استفادہ کرے گا۔ ہالی وڈ کی خاموش فلمیں خاموش پڑی تھیں۔ صرف وہی ایک تھا جو اس طرف راغب تھا اس کی لوگ قدر کریں گے۔

اس دوران دوسری جنگ عظیم کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ نازی پرپرزے نکال رہے تھے۔ اور پیش قدمی بھی کررہے تھے۔ ابھی پہلی جنگ عظیم کے داغ دھلے نہیں تھے کہ دوسری جنگ دستک دینے لگی تھی۔

اس موقع پر اسے ہٹلر یاد آگیا یا ہاتھ آگیا اور فلم The Great Dictator کی داغ بیل ڈالی اور تیزی سے کام

شروع کر دیا لیکن اس فلم کے نصف مکمل ہونے کے بعد حوصلہ شکن پیغام آنے لگے۔ اس کے دوست ہر طرف سے پیغام بھیج رہے تھے کہ اس فلم کی بڑے پیمانے پر مخالفت ہوگی اور برطانیہ میں تو اس کی نمائش قطعاً ممکن نہ ہوگی۔ پھر حالات بدلنے لگے۔ جرمن فتوحات سے ہم کنار ہوئے۔ انہوں نے فرانس کو روند ڈالا۔ انگلستان بھی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا اب یہ تقاضے ہونے لگے۔

''اپنی فلم جلد مکمل کرو۔ سب لوگ اس فلم کے انتظار میں ہیں۔''

دوسری طرف دھمکی آمیز خطوط بھی مل رہے تھے۔ یہ ایک نازی مخالف فلم تھی اور دھمکی نازیوں کی طرف سے مل رہی تھی۔ یہ اس کے لیے پریشانی کا دور تھا۔ اس نے اس فلم پر بیس لاکھ ڈالر کی خطیر رقم خرچ کی تھی اور اب اس رقم کی واپسی کے لالے پڑ رہے تھے۔

یہ فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی تو سب اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ یہ مسلسل 15 ہفتوں تک نیویارک کے دو تھیٹروں میں چلتی رہی اور مالی لحاظ سے اس کی تمام فلموں سے بڑھ کر ثابت ہوئی۔

اس کی ذاتی زندگی مصائب کے بھنور میں مستقل چکر لے کھا رہی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی اس کی بیوی پولٹ اور اس کے درمیان اختلافات رہنے لگے تھے اور اس فلم کی تکمیل کے بعد تو یہ ناگزیر ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لیں اور اس پر عمل درآمد ہو بھی گیا۔ پولٹ نے اس سے طلاق لے لی۔ اس کا گھر ایک مرتبہ پھر اداسیوں سے بھر گیا۔

☆☆☆

1942ء کے آس پاس وہ ایک فلم Shadow And Substance پر کام کر رہا تھا کہ اس کی ملاقات ایک لڑکی اونا اونیل سے ہوئی اور اسے لگا کہ اس فلم کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی دوسری لڑکی نہیں ہو سکتی۔ اس کی عمر بمشکل اٹھارہ سال ہوگی۔ اداکاری کا بھی تجربہ نہیں تھا لیکن چارلی نے اسے رضامند کر لیا اور معاہدہ ہو گیا۔

چارلی اتنی جلد اس سے اتنا متاثر ہو گیا کہ عمروں کے فرق کے باوجود اس نے شادی کی پیش کش کر دی اور یہ طے ہوا کہ فلم کی تکمیل کے بعد وہ دونوں شادی کر لیں گے۔

ابھی ان وعدوں نے قد نہیں نکالا تھا کہ پاؤں کٹ گئے۔

اس کی ایک دوست جون بیری نے مقدمہ کر دیا کہ اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کا باپ چارلی چیپلن ہے۔ اخبارات سرخیاں لگا رہے تھے۔

''چیپلن، اس بچے کا باپ جس نے ابھی جنم نہیں لیا''

یہ تکلیف دہ صورت حال تھی کیونکہ اونیل اگر پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر شادی سے انکار کر دیتی تو دہرا نقصان ہوتا لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم رہی۔ بہر حال وہ پریس سے بچنے کے لیے ایک چھوٹے سے قصبے چلے گئے اور خاموشی سے شادی کر لی۔

وہ اس قصبے میں دو مہینے تک چھپا رہا۔ یوں معلوم تھا جیسے اب اس کا فلمی کیریئر ختم ہو گیا ہو۔ اخبارات اس کے خلاف اتنا کچھ لکھ رہے تھے کہ لوگوں کا اس کی طرف سے بدظن ہو جانا لازمی تھا۔

وہ اس مقدمے کا سامنا کرتا رہا۔ اونا اونیل اس کی حوصلہ افزائی برابر کر رہی تھی۔ کیا مصائب تھے کہ کرتے ہی وہ مصائب کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے بے چاری پر رحم آتا تھا جو مقدمے کی سماعتوں کی وجہ سے کہیں گھومنے پھرنے بھی نہیں جا سکی تھی۔

تقریباً سال بھر پریس کی بدنامی کے بعد اس مقدمے کا فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا۔ بلڈ ٹیسٹ نے یہ کر دیا کہ بچہ اس کا نہیں۔

''چارلی چیپلن کیس نمبر 337068 فوجداری، وارنٹس پایا گیا۔''

اب وہ چاہتا تھا کچھ دنوں کے لیے کیلی فورنیا سے بھاگ جائے اور صرف آرام کرے۔ وہ اونیل کے نیویارک گیا اور وہاں سے ''نیاک'' روانہ ہوتے جہاں مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ وہاں اپنی اس فلم کو مکمل کرے گا جو الدیت کے مقدمے کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی لیکن اسے اندازہ ہوا کہ نیاک رہ کر وہ اس کام کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا لہٰذا وہ پانچ ہفتے بعد کیلی فورنیا واپس آ گیا۔

دو برس کی محنت کے بعد اس نے فلم nsieur Verdoux مکمل کر لی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ فلم بہترین ہوگی۔ وہ اس کی نمائش کے لیے نیویارک روانہ ہوا نیویارک پہنچتے ہی اسے پریس نے آڑے ہاتھوں لے لیا۔

''کیا تم کمیونسٹ ہو؟''

''نہیں۔''

''تم نے اب تک امریکا کی شہریت کیوں نہیں لی؟''

''میں خود کو دنیا کا شہری تصور کرتا ہوں۔''

''کیا تمہارا اٹھنا بیٹھنا کمیونسٹوں کے ساتھ نہیں؟''

''میری دوستی سیاسی خطوط پر استوار نہیں۔''

''تم نے اپنی فلم کا اسکرپٹ ہٹلن کے فیشن کے تحت لکھا؟''

''ایک تخلیق کار کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔''

''تم کمیونسٹوں کو پسند کرتے رہے ہو۔''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔''

جس تھیٹر میں یہ فلم دکھائی جا رہی تھی اس کے باہر لوگ بینر اٹھائے ہوئے تھے۔

''غیر ملکی کو ملک سے باہر نکالو۔''

''چیپلن عرصہ دراز سے بطور پے انگ گیسٹ موجود ہے۔''

''چیپلن کمیونسٹوں کا خیر خواہ اور ہمدرد۔''

''چیپلن کو روس روانہ کیا جائے۔''

دراصل ایک لابی اس کے خلاف تھی اور بعض لوگ اسے دولت ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ نفرت کا ایک سیلاب تھا جو اس کے خلاف امڈ آیا تھا۔ مختلف پریشر گروپ ڈسٹری بیوٹرز کو دھمکیاں دے رہے تھے کہ چارلی کی کوئی فلم حالی جائے کیونکہ وہ امریکا کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہے اور اس کے روابط کمیونسٹوں سے ہیں۔ سینیٹ کے ایوانوں میں بھی اس کی مذمت کی گئی تھی۔

ان اقدامات سے نمائش کنندگان ہراساں ہو گئے اور ان کی فلم گھاٹے کا سودا بن گئی۔ بمشکل لاگت کی رقم پوری ہوئی۔ منافع پھر بھی نہ مل سکا۔

اسے اب بھی یقین نہیں تھا کہ امریکی عوام اس کے خلاف دھوکے میں ہوں گے۔ اس کی فلم کو سیاست کی نذر کر دیا گیا تھا لیکن وہ حوصلہ نہیں ہارا تھا اس نے ایک اور فلم بنانے کی ٹھان لی۔

''دنیا کتنی ہی مختلف ہو جائے۔ محبت کی داستان ہمیشہ دل بھاتی ہے۔'' اس نے اپنے ایک دوست سے کہا ''میں اس فلم میں محبت کی ایسی ہی انوکھی داستان پیش کروں گا۔''

اس نے کام شروع کر دیا اور نئی فلم Limelight کے 18 ماہ میں مکمل کر لی۔

فلم کی تکمیل کے بعد اونا نے اپنا پرانا مطالبہ دہرایا۔ ''ہم بچوں کو ہالی وڈ کے ماحول سے دور اسکول میں داخل کریں گے۔''

وہ خود بھی کچھ دنوں کے لیے اس ماحول سے دور چلا جانا چاہتا تھا جہاں اسے نفرت کا نشانہ بنا دیا گیا تھا۔ اس نے چھٹیاں گزارنے کے لیے یورپی سیر و سیاحت کی غرض سے امریکا چھوڑنے کی درخواست دے دی۔ درخواست منظور ہونے تک اس نے اپنے بینک لاکرز سے نقد رقم نکلوا لی تھی۔

وہ انگلستان کے دورے کے لیے روانہ ہوا تھا اور ''کوئن الزبتھ'' نامی جہاز پر سوار تھا۔

وہ ابھی جہاز پر ہی تھا کہ اسے ایک ٹیلی گرام ملا جس میں درج تھا۔

''مسٹر چارلی چیپلن تمہیں یاد کرایا جاتا ہے کہ تمہارے امریکا دوبارہ داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اور اگر تم داخل ہوئے تو پھر تمہیں بورڈ آف امیگریشن کے سامنے پیش ہو کر سیاسی نوعیت کے الزامات کے علاوہ اخلاقی الزامات کی جواب دہی بھی کرنا ہوگی۔''

وہ اس ٹیلی گرام کو جیب میں رکھ رہا تھا کہ پیغام رساں نے اسے روک دیا۔ ''وہ بذریعہ وائرلیس جواب کے منتظر ہیں۔ یونائٹڈ پریس یہ دریافت کرنا چاہتا ہے کہ آپ کا تبصرہ کیا ہے۔''

اس کے اعصاب تن گئے تھے وہ کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ جو ملک مجھ سے نفرت کرتا ہے میں وہاں کیوں آؤں گا لیکن یہ مصلحت کے خلاف ہوتا۔ اس کی تمام جمع پونجی اور اثاثے امریکا میں تھے۔ اس کا سب کچھ ضبط ہو سکتا تھا لہٰذا اس نے جواب دیا۔

''میں امریکا واپس آؤں گا اور لگائے گئے الزامات کا جواب دوں گا۔ امریکا آنے کا اجازت نامہ میرے پاس ہے۔''

اس نے یہ پیغام بھیج دیا تھا لیکن وہ سخت پریشان تھا۔ ہر بندرگاہ پر صحافی اسے پریشان کرنے آ جاتے تھے اور اس کا ذہن برابر اس سوچ میں تھا کہ اسے اب کیا کرنا ہے۔

لندن پہنچ کر بھی وہ اس گتھی کو سلجھاتا رہا۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کس طرح اپنی دولت امریکا سے نکالنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ کئی خیال آئے اور چلے گئے۔

اس نے اپنی بیوی اونا کو اعتماد میں لیا۔ ''تم خاموشی سے کیلی فورنیا روانہ ہو جاؤ (وہ چونکہ امریکی شہریت رکھتی تھی اس لیے اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا)''

وہ اس کی ہدایت کے مطابق کیلی فورنیا روانہ ہو گئی۔ وہ واپس آئی تو سب کچھ نکال لائی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور اطلاعات بھی اس کے پاس تھیں۔

''میں اپنے گھر بھی گئی تھی وہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔

ایف بی آئی کے لوگ ملازموں کو ہراساں کر رہے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ چارلی کس قماش کا آدمی تھا۔ کیا اس گھر میں ایسی پارٹیاں ہوتی تھیں جن میں برہنہ لڑکیاں حصہ لیتی تھیں؟ اور جب ملازموں نے انکار کیا تو وہ ان کے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ وہ تمہارا پاسپورٹ بھی طلب کر رہے تھے۔''

چارلی یہ سب باتیں سن رہا تھا اور امریکا سے جو رہی سہی وابستگی اس کے ذہن میں تھی وہ ماند پڑ گئی۔ اگر وہ امریکا گیا تو سیاسی جرائم کے ساتھ ساتھ اس پر اخلاقی جرائم بھی لگائے جائیں گے اور وہ برسوں ان مقدمات کا سامنا کرتا رہے گا۔

سادہ لوح اوونا نے پوچھا ''چارلی آخر تمہارا جرم کیا ہے۔ یہ لوگ کیوں تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔''

''میرا گناہ یہ ہے کہ اگرچہ میں کیمونسٹ نہیں ہوں مگر میں کیمونسٹوں سے نفرت بھی نہیں کرتا۔''

اس کی نئی فلم ''لائم لائٹ'' کے پرنٹ اس کے پاس تھے۔ اس نے انگلستان میں اسے نمائش کے لیے پیش کر دیا۔

اس فلم کا امریکا میں بائیکاٹ تھا لیکن انگلستان میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اس فلم نے اتنی زیادہ رقم اکٹھی کی جتنی اس کی کسی دوسری فلم نے نہیں کی تھی۔ شہزادی مارگریٹ بھی اس فلم کو دیکھنے آئی تھی۔

اس کے بعد وہ اپنی فلم کو پیرس اور روم لے گیا۔ وہاں چارلی کا استقبال فاتح ہیرو کے مانند کیا گیا اور اسے اعزازات سے نوازا گیا۔

روم میں صدر اور وزرا نے اس کا استقبال کیا۔

وہ امریکا سے ناتا توڑنے کے بعد لندن میں رہنا چاہتا تھا لیکن اسے ڈر تھا کہ لندن کی آب و ہوا اس کے بچوں کو راس نہیں آئے گی۔ اس کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ اسے سوئزرلینڈ میں گھر خریدنا چاہیے۔ اس نے سامان سمیٹا اور چار بچوں کے ساتھ سوئزرلینڈ کے ایک ہوٹل میں جا اترا۔

اوونا اپنے پانچویں بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ بچے کی ولادت کے بعد وہ اسپتال سے اپنے گھر میں جائے۔

چارلی کی تین شادیوں کے بعد چوتھی شادی تھی جو کامیاب ہوئی تھی۔ وہ اوونا کی کسی بھی خواہش کو ٹال نہیں سکتا تھا۔

بالآخر اس نے مکان کا بندوبست کر لیا۔ یہ مکان ''کورسیئر'' کے ایک دیہات میں تھا اور 137 ایکڑ رقبے کا حامل تھا۔ اسی دیہات کے ایک اسکول میں اس نے بچوں کو داخل کرا دیا۔ اس کے پانچویں بچے نے اسی مکان میں آنکھ کھولی۔

ان ضروری کاموں سے نمٹنے کے بعد وہ امریکی قونصل کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے امریکی قونصل کو یہ بتانا تھا کہ وہ امریکا میں اپنا قیام ختم کر چکا ہے۔

''کیا تم امریکا واپس نہیں جا رہے ہو؟'' اہلکار نے دریافت کیا۔

''نہیں، میں قدرے بوڑھا ہو چکا ہوں اور حماقتوں کا نشانہ نہیں بن سکتا۔''

اب اوونا کی امریکی شہریت ختم کرنے کا معاملہ رہ گیا تھا۔ لندن کے دورے کے دوران وہ دونوں امریکی سفارت خانے گئے اور شہریت کی دست برداری کی درخواست کر دی۔

اب ان کی زندگی پرسکون تھی۔ اب وہ ہدایت کار اور فلم ساز نہیں تھا بلکہ ذمے دار شوہر اور شفیق باپ تھا جو بچوں کو زیادہ سے زیادہ راحت پہنچانے کا خواہاں تھا۔ وہ ہنگامہ پرور زندگی اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا لیکن اس کی ناموری اب بھی اس کے ساتھ تھی۔ چرچل اس سے ملا کرتا تھا۔ خروشیف نے اس سے ملاقات کی تھی۔ چواین لائی نے اسے جنیوا میں ملاقات کے لیے بلایا تھا اور اس کی فلم ''لائم لائٹ'' فرمائش کر کے دیکھی تھی۔ وہ لندن، پیرس، روم، ہر جگہ بچوں کے ساتھ گھومتا پھر رہا تھا اور ہر جگہ اس کا استقبال کسی ریاست کے حکمراں کی طرح ہو رہا تھا۔

اس کی تخلیقی صلاحیتیں بھی کم نہیں ہوئی تھیں۔ اب بوڑھا ہو رہا تھا اس وقت بھی اس کا دل امنگوں سے بھرا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کوئی کھیل کھیلوں اور اسے تھیٹر پر پیش کروں۔ کبھی موقع ملا تو میں ایسا ضرور کروں گا۔''

آخر 1967ء میں اس نے ایک فلم بنا ہی ڈالی۔ یہ اس کی آخری فلم تھی۔ ''دی کاؤنٹس آف ہانگ کانگ''

اسے یہ احساس تھا کہ اب اس کا زمانہ گزر گیا ہے۔ خاموش فلموں کو پسند کرنے والے اس کے پرانے پرستار سے اٹھ گئے ہیں۔ یہ ادا کم نہیں تھی لیکن وہ اداس تھا۔ سب کو ہنسانے والا اب خود پر ہنس رہا تھا۔ اس فلم کے بعد وہ دس سال زندہ رہا۔ 1975ء میں اسے نے بی ای ایوارڈ دیا گیا۔ 1977ء میں کرسمس کے دن اس کا انتقال ہو گیا۔ تین شادیوں کے بعد اس کی آخری بیوی نے اسے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں دی تھیں۔

گل جی

شکیل صدیقی

اس نے رنگ و روغن اور برش کی مدد سے وطنِ عزیز کا نام اونچا کرنے کی سعی کی۔ دنیا بھر کی معروف شخصیتوں کے پورٹریٹ و مجسمے ایسے ایسے نادر انداز میں تخلیق کیے کہ ناقدین دنگ رہ گئے۔ لوگ اس کا کام دیکھ کر مبہوت رہ جاتے، ایک دوسرے سے پوچھتے، ایسا کیسے ممکن ہوا؟ وہ کبھی کوئلے کو تراش کر تو کبھی جواہرات سے ایسے شہکار تخلیق کرتا کہ عالمی پیمانے پر دھوم مچ جاتی۔ یہی مصور اگر یورپ میں پیدا ہوتا تو پوجا جاتا مگر وطنِ عزیز میں ... کتنی سال گزر جانے کے باوجود اب تک اس کے اصل قاتل کی تلاش جاری ہے

لازوال فن پارے تخلیق کرنے والے باکمال مصور کو خراجِ تحسین

گل جی ایک انتہائی کامیاب مصور تھا جس کے کام میں بہت ندرت اور تنوع ہے۔ اس کی شہرت نہ صرف پاکستان میں تھی بلکہ تمام بڑے ملکوں میں اس کے فن کا طوطی بولتا تھا۔ اسے بچپن ہی سے مصوری سے لگاؤ تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں اس کے بارے میں لکھا ہے۔

''پینٹ، رنگ اور برش تصویر کشی کے بنیادی اجزا ہیں لیکن گل جی نے اس بنیادی طریقے سے بالکل الگ اپنی دنیا آپ پیدا کی۔ وہ پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے استعمال کرتا تھا اور جب یہ حقیر پتھر خونِ جگر سے زندگی پا کر معجزۂ فن کی نمو کرتے تو ایک نادر فن پارہ وجود میں آ جاتا جسے دیکھ کر بمشکل یقین آتا کہ یہ پتھر کی کھردری، بے ترتیب کرچیوں سے وجود میں آیا ہے۔''

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس نے آرٹ کی تعلیم کہیں سے حاصل نہیں کی۔ اس میں یہ صلاحیت خداداد تھی۔ اس کی

کہانی خود اس کی زبانی سنیں۔

☆☆☆

میرا نام احمد اسماعیل ہے مگر گھر والے مجھے گل جی کہنا پسند کرتے تھے جس کا مطلب پھول ہوتا ہے۔ میری زندگی رنگوں سے عبارت رہی اور میں اپنے چاہنے والوں کے دل میں خوشبو کی طرح بسا رہا۔

میں 25 اکتوبر 1926ء کو حضرو، پشاور میں پیدا ہوا۔ جہاں مہمند قبیلے کے رئیس بابا، شاعر خوش حال خان خٹک اور رومانی شاعر احمد فراز بھی پیدا ہوئے تھے۔ میں نسلاً پٹھان ہوں۔ میرے دادا اٹک سے تشریف لائے تھے جبکہ والدہ کا تعلق ہزارہ سے تھا۔ میرے والد کا نام شیر علی اسماعیلی تھا۔ انہوں نے مسلم کالج پشاور میں تعلیم حاصل کی تھی۔ جب وہ انجینئر ہو گئے تو انہیں پی ڈبلیو ڈی میں سرکاری ملازمت مل گئی۔ ان کا تبادلہ جس علاقے میں ہوتا تھا وہ اپنے خاندان کے ساتھ اس علاقے میں منتقل ہو جاتے تھے۔ اس طرح سے مجھے ان کے ساتھ گھومنے پھرنے کا خوب موقع ملا۔ میں نے سب جگہیں دیکھیں خضدار، بنوں، کوہاٹ وغیرہ۔

میرے والد بہت بڑے مقرر بھی تھے۔ انہیں تقریر پر اتنی قدرت حاصل تھی کہ وہ ہزار بارہ سو کے مجمع کو جب چاہے ہنسا اور رُلا سکتے تھے۔ وہ فلگت اور پشتو سب جگہ تقریریں کرتے تھے۔ وہ اردو کے ساتھ فارسی میں بھی تقریر کر سکتے تھے۔ جب ایران جاتے تھے تو فارسی میں تقریریں کرتے تھے۔ ان کی تقریروں کی وجہ سے لوگ ان کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ مثلاً کوئی بچہ لیے چلا آرہا ہے تو کوئی دودھ پہنچا رہا ہے۔ وہ بہت اچھے دن تھے۔

ایک بار سرکاری طور پر کہا گیا کہ آپ تقریریں کرنا چھوڑ دیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں سرکاری طور پر ایسا کرتا نہیں ہوں، یہ کام تو پرائیویٹ ہے، اس کا ملازمت سے کیا تعلق؟

ان کے محکمے کے لوگوں نے انہیں بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانے۔ بالآخر انہیں ملازمت سے نکال دیا گیا۔ انہیں کسی جگہ پھر اس کی ملازمت بھی نہیں ملی۔ ایک وہ وقت تھا کہ جب میں پڑھنے جاتا تھا تو ہمارے پاس دو گھوڑے تھے اور رہنے کے لیے بہت اچھی جگہ تھی۔ ہر قسم کی آسائش تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ست میں ہونے کا بچہ نے کر پیدا ہوا تھا لیکن اب خراب دن دیکھنا پڑے۔ مجھ سے کہا گیا کہ تم اپنی پڑھائی چھوڑ دو۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ گزارہ اسی صورت میں ممکن ہے تم اسکول نہ جاؤ۔ میں بہت دل آزردہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ پینٹنگ وغیرہ سے تو یہ کر لینا چاہیے۔ اس لیے اسے کون پوچھے گا؟

ویسے آرٹسٹ تو میں بچپن ہی سے تھا۔ اگر میں یہ کہوں میں نے ماں کے پیٹ ہی سے پینٹنگ شروع کر دی تھی تو بجا نہ ہوگا۔ جب میں نے قد بڑھالیا اور میں بچے سے لڑکا ہوا تو میرے والدین نے میرا شوق دیکھتے ہوئے وعدہ کر دیا کہ مجھے آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے پیرس بھجوائیں گے۔ لیکن جب ان کی ملازمت جاتی رہی تو انہوں نے منصوبہ بدل دیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ریاضی یا انجینئرنگ لے لو اور اسے محنت سے پڑھو تو ہو سکتا ہے کہ وظیفہ جائے۔ میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔

میں آپ کو کیا بتاؤں کہ مجھے آرٹ سے کتنی محبت ہے؟ عورتوں اور مردوں کی محبت کی کہانیاں آپ نے پڑھی اور فلموں میں بھی دیکھی ہوں گی۔ بس اسی طرح کا پیار اور آرٹ کا معاملہ ہے۔ مجھے اس سے دیوانگی کی حد تک ہے۔ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ مجھے یہ شوق اپنے حکیم ابو علی سے ملا تھا۔ وہ شوقیہ پینٹنگ کیا کرتے تھے اور کہنا مناسب ہوگا کہ اتواری آرٹسٹ تھے یعنی ہفتے میں صرف ایک روز پینٹنگ کیا کرتے تھے۔ وہ پیشہ ور وقتی پینٹر تھے۔ جب بھی فرصت ملتے رنگ اور برش نکال لیتے تھے۔ مجھے شوق ان سے منتقل ہو گیا۔

میں نے باقاعدہ کسی آرٹ اسکول میں جا کر آرٹ کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ ہاں البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ میں آرٹ کے سارے بڑے میوزیم دیکھے ہیں۔ سارے اساتذہ کا کام دیکھا ہے۔ میں بلاشبہ ریمبراں سے متاثر ہوں۔ میری پینٹنگ میں آپ کو اس کے کام کی جھلک نظر آئے گی۔

مجھے عام بچوں کی طرح گلی کوچوں میں کھیلنے کا شوق تھا حالانکہ میں اپنے تین بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے بڑا تھا اور مجھے اودھم مچانے کے وافر مواقع میسر تھے۔ کے بجائے میں گھر میں رہتا اور اپنے دادا کے برشوں رنگوں سے کھیلتا رہتا تھا۔ اسی عمر میں، میں رنگوں سے ہوا۔ میں کاغذ پر جو لکیریں کھینچتا تھا اپنے اہلِ خانہ دوستوں کو فخر سے دکھاتا تھا۔ ابتدائی زندگی میں یہ میری قاعدہ نمائشیں کہی جا سکتی ہیں۔

ہاں تو بات تعلیم کی ہو رہی تھی مگر گھوم پھر کر بات مصوری کی طرف آجاتی ہے۔ میں نے ابتدائی تعلیم پشاور کا ہائی اسکول میں حاصل کی اور اس کے بعد مجھے ہائی اسکول

بے لارنس کالج گھوڑا گلی، مری بھیج دیا گیا۔ میں نے توجہ سے تعلیم حاصل کی اور ان دو مضامین میں نمایاں کامیابی حاصل کی اس بنا پر مجھے وظیفہ مل گیا اور میں علی گڑھ پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ اسی اثنا میں والدین بھی ہجرت کر کے انڈیا چلے آئے۔ میں نے 1945ء میں علی گڑھ کالج سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد میں نے بی ایس سی کی ڈگری فرسٹ کلاس کے ساتھ حاصل کی۔ میں نے 86.6 فی صد نمبر حاصل کیے تھے۔ وہ طالب علم جو 200 نمبر لے کر دوسرے نمبر پر رہا تھا، انجینئر بن گیا اور اقوام متحدہ کے ادارے سے منسلک ہو گیا۔

چونکہ میں ڈگری لے چکا تھا، چنانچہ اسی کالج میں بطور لیکچرار پڑھانے لگا۔ کالج میں ملازمت حاصل کرنے کا بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ اس وقت وائس چانسلر ضیاء الدین تھے۔ ان سے ہر کوئی مل سکتا تھا۔ آج کل تو ڈپٹی کمشنر سے مجھ جیسا آدمی بھی نہیں مل سکتا۔ بہرحال وائس چانسلر نے کہا کہ آپ نے بی اے آنرز کر لیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ کچھ بلوغی کر لیا ہے۔ یہ میرا قصور ہے۔ میں نوعمر ہوں اس لیے مجھے کوئی ملازمت نہیں مل رہی ہے۔ اس پر وائس چانسلر بہت خوش ہوئے اور مجھے ملازمت دے دی۔

میں ایک نوعمر لیکچرار تھا اور کلاس کے طالب علم عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ میری عمر بیس برس تھی۔ چنانچہ کلاس میں بے تکلفی کا ماحول پیدا ہو جاتا تھا اور میں دوستی کی فضا میں درس دیا کرتا تھا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ بعض اوقات میں پتلون پہن کر بھی کلاس میں چلا جاتا تھا۔ میں نے تعلیم جاری رکھی اور علی گڑھ میں سائنٹیفکس پڑھی۔ اچھے نمبر لیے، لہٰذا ایک سال کے بعد حکومت ہند نے مجھے وظیفے پر ہارورڈ یونیورسٹی بھیج دیا تاکہ سوائل مکینیکس میں ایم ایس کر سکوں۔ کھانا پینا، رہنا سہنا اور کتابوں کے اخراجات تک حکومت کے ذمے تھے۔

اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد میں نے بیورو آف ری کلیمیشن امریکا میں انجینئر کی حیثیت سے ذمے داری سنبھال لی۔ میں نے اپنی افتادِ طبع کی بنا پر یہ کام زیادہ دنوں تک نہیں کیا اور 1960ء میں اسٹاک ہوم میں ڈیزائن انجینئر کی حیثیت سے ایک سوئڈش فرم میں کام کرنے لگا، جس کا نام والٹن بائی جناڈس بائی رووان (Vallen by gnads by roan) تھا۔

اسٹاک ہوم کے کھلے ماحول نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ہنستے مسکراتے لوگ، پن چکیاں اور الھڑ حسینائیں۔

گل جی کی بیوی زرینہ بمبئی میں پیدا ہوئی تھیں اور انہوں نے الفنسٹن کالج میں تعلیم پائی تھی۔ انہوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی سے بی ایس سی میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کیا۔ وہ بمبئی اور اس کے علاوہ کراچی سے بھی بہت مانوس تھیں۔ انہیں اس کے علاوہ کہیں اور رہنا پسند نہیں تھا۔ ایک بار جب کراچی میں بہت ہنگامے ہونے لگے تھے تو وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اسلام آباد چلی گئی تھیں لیکن ایک برس رہنے کے باوجود وہاں ان کا دل نہ لگا اور وہ کراچی واپس آگئیں اور اس کے بعد کراچی کے بجائے کہیں اور رہنا انہوں نے گوارا نہیں کیا۔ وہ پاکستان ویمنز ویلفیئر ایسوسی ایشن کی صدر تھیں اور محمود آباد میں واقع ویلفیئر گوشہ میں ایک سلائی ٹریننگ سینٹر چلاتی تھیں۔ وہ اپنے شوہر کی تصویریں فروخت کرتی تھیں فن کے قدردانوں وہ اس سلسلے میں ان سے ہی بات کرنا پڑتی تھی۔ وہ ایک اچھی پی آر او تھیں۔

وہاں 1950ء میں، میں نے اپنی تصویروں کی پہلی نمائش کی جس میں زیادہ تر پورٹریٹس تھیں۔ آئندہ والے برسوں تک میں نے اسی پر توجہ دی اور لوگوں کے ماڈل بنا کر رنگوں سے چہرے ابھارتا رہا۔

1950ء میں، میں نے فوٹو گرافی بھی کی۔ اس زمانے میں میری کھینچی ہوئی تصویریں ملک کے ہر اخبار میں شائع ہوتی تھیں۔ میں نے اپنے دوستوں میں تقریباً سب کی تصاویر کھینچی تھیں۔ مجھے نہ صرف اچھی فوٹو گرافی کا دلدادہ تھا، بلکہ میں روشنی اور تاریکی کے امتزاج کے بارے میں بھی سمجھ رکھتا تھا۔ اسی لیے جب کوئی دوست میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یہ فرمائش کرتا کہ میں اس کی تصویر کھینچوں تو میں روشنی کا اندازہ کر کے کچھ کھڑکیاں کھول دیتا اور کچھ بند کر دیتا۔ دوست اس پر میرا خوب مذاق اڑاتے مگر جب رزلٹ دیکھتے تو انگلیاں دانتوں تلے دبا لیتے۔

اس زمانے میں جب امریکا کی خاتونِ اول مسز روز ویلٹ پاکستان آنے والی تھیں تو امریکی سفیر نے مجھ سے کہا کہ ہمیں فوٹو گرافر کی حیثیت سے تمہاری خدمات درکار ہیں۔ میں حکومت میں ملازم تھا۔ میں نے وہاں سے چھٹی لی اور مسز روز ویلٹ کے ساتھ مغربی اور مشرقی پاکستان کے دورے پر گیا۔ ہر موقع کی تصویریں کھینچیں۔ حد یہ ہے کہ ایک

بار تو میں درخت پر بھی چڑھ گیا اور میں نے وہاں سے تصویریں اتاریں۔ مادام روزویلٹ کو آرٹ کی بہت سمجھ تھی۔ انہوں نے میری کھینچی ہوئی تصاویر کی تعریف کی اور اپنے ساتھ ساری تصاویر لے گئیں۔ مجھے بہت اچھا معاوضہ دیا گیا۔ جتنی ایک ماہ کی تنخواہ بھی دو سو روپے نہیں تھی۔

میں نے ان تصویروں کا ایک سیٹ امریکا کے مشہور میگزین ٹائمز کو بھی بھیجا تھا۔ وہ تصاویر انہوں نے اپنے میگزین میں شائع تو کر دیں لیکن میرا نام کہیں نہیں دیا۔ میں نے انہیں خط لکھا اور اس بات کی شکایت کی۔ اس کا جواب انہوں نے یہ لکھا کہ میری کھینچی ہوئی کسی فوٹو کی پشت پر میرا نام نہیں لکھا تھا۔ ابتدا میں اناڑی پن میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

انہی دنوں کینس میں مجھے آغا خان (سلطان محمد شاہ) نے بلایا۔ جب میں ان سے ملاقات کرنے گیا تو ان کے لیے دو درجن گلاب کے پھول لے گیا۔ دوسری ملاقات پر بھی میں نے یہی اہتمام کیا تو کمیونٹی کے اس معمر اور ممتاز لیڈر نے ہدایت کی کہ میں فضولیات پر خرچ نہ کروں ۔۔۔ انہوں نے کہا۔ ''گل جی! میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم مجھ سے روز ملنے آسکتے ہو لیکن گلاب لانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ گلاب بہت مہنگا ہوتا ہے۔ اس رقم کو بچا کر رکھو، یہ تمہارے اور تمہارے وطن کے کام آئے گی۔''

اس کے علاوہ انہوں نے ہدایت کی کہ میں آرٹسٹ بننے کے بجائے انجینئر بنوں۔ ''آرٹسٹ بننے سے ذاتی تسکین ہوتی ہے مگر ملک کو اس وقت اچھے انجینئروں کی ضرورت ہے۔ تم اس کمی کو پورا کر سکتے ہو۔''

1951ء میں، میں پاکستان آگیا اور ایگزیکٹیو انجینئر کی حیثیت سے یونائیٹڈ نیشنز ٹیکنیکل ڈیولپمنٹ ٹیم میں شامل ہو گیا۔ 1953ء میں مجھے حکومت پاکستان نے سینٹرل انجینئرنگ اتھارٹی میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز کر دیا۔

میں اپنے روحانی پیشوا کی ہدایت پر ملک و قوم کے لیے تعمیری کام کر رہا تھا لیکن دل و دماغ میں بیٹھا ہوا آرٹسٹ مجھے پریشان کر رہا تھا۔ فالتو اوقات میں کینوس پر برش بھی چلانے لگا۔

اس دوران میں، میں کراچی میں کافی دوست بنا چکا تھا اس لیے میں نے دوستوں کے ساتھ مل کر آرٹس کونسل کی بنیاد ڈال دی۔ یہ طے پایا کہ ہر آرٹسٹ اپنی ایک یا دو پینٹنگز نیلامی میں دے گا تاکہ رقم اکٹھا کر کے کونسل کی عمارت تعمیر کی جا سکے۔ اس نیلامی کی تقریب کے موقعے پر وزیر پاکستان جناب محمد علی بوگرا، آغا خان، بیگم آغا خان اور شہر کے قائدین نے اس میں شریک ہو کر اسے چار چاند لگا دیے۔ بولی خود وزیراعظم نے لگائی اور سب سے زیادہ پینسل تصویر کی بولی آئی جو آغا خان کی تھی، جسے میں نے بنایا تھا اور ہدیتاً دیا تھا۔

اس واقعے کی پریس میں اچھی رپورٹنگ ہوئی۔ اس طرح سے مجھے میرے ملک کے لوگ ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے جاننے لگے۔

☆☆☆

اپنی ڈیوٹی کے دوران مجھے وارسک ڈیم پر بھیجا گیا۔ میرے آبائی وطن پشاور سے بہت نزدیک تھا۔ یہاں اپنے فن کی آبیاری کا کافی وقت مل گیا اور میں نے متعدد کام کر لیا تو اس کی ایک چھوٹی سی نمائش کرا ڈالی جس کا نام میں نے 'وارسک' رکھا۔ یہ نمائش وارسک کلب میں ہوئی تھی۔ نمائش سے حاصل ہونے والی رقم سے میں ان محنت کشوں کی مدد کرنا چاہتا تھا جو ساری دنیا سے وہاں آئے ہوئے تھے۔ نمائش بھی بہت کامیاب رہی اور ۔۔۔ میرا نام اخبارات کی زینت بنا۔

میں نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا۔ ''وارسک میں نے ایڈاپٹ کیا ہے اور اسے اپنی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ اس زمانے میں ایک کینیڈین ایکسپرٹ ملک میں خوب فر فر انگریزی بول رہا تھا۔ تم میں نے زیادہ دو تین نہیں اور خاموش ہی رہا۔ یہ تو میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ڈیم ہوتی کیا چیز ہے اور یہ کیا ہے؟ وہ تھا تو انجینئر مگر عقل اس میں نام کو نہیں تھی۔ جب پوچھا وہ کتنا پڑھا ہوا ہے تو پتا چلا کہ بس گریجویشن ہے، اس نے ایک دو کورس کر رکھے ہیں۔ اس سے زیادہ تو میں پڑھا تھا۔ بہرحال قصہ مختصر میں نے جو ڈیزائن بنایا وہ سب آیا اور چیف انجینئر نے اسے پاس کر دیا۔''

1955ء سے 1957ء تک میں وارسک پر ڈیویژن آفیسر کی حیثیت سے رہا پھر کینیڈا چلا گیا۔ وہاں عہدہ پاکستان سفارت خانے کے فرسٹ سیکریٹری کا تھا۔ سفارت خانہ اس وقت اوٹاوا میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں پھر اتنا وقت مل گیا کہ میں آرٹسٹ کی حیثیت سے خود کو منوا سکوں۔ میری بنائی ہوئی تصاویر کی تعداد جب کافی

ہو گئی تو اوٹاوا اور پھر نیاگرا فال میں دو نمائشیں کیں۔

1957ء میں افغانستان کے حکمراں ظاہر شاہ پاکستان آئے تو مجھے اپنی فنکارانہ صلاحیتیں دکھانے کا موقع مل گیا۔ میں اس زمانے میں پاکستان میں تھا۔ اس وقت کے وزیراعظم فیروز خان نون نے مجھ سے کہا کہ میں ظاہر شاہ کا پورٹریٹ بناؤں تاکہ حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں پیش کیا جا سکے۔

میں نے شاہ کے پورٹریٹ پر خود اعتمادی سے کام کیا اور ایک ہفتے میں وہ پورٹریٹ وزیراعظم پاکستان کی طرف سے شاہ کو پیش کیا گیا۔ وہ اس پورٹریٹ کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے مجھے افغانستان آنے اور شاہی خاندان کے پورٹریٹس بنانے کی دعوت دی۔ یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔ میں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ دراصل ظاہر شاہ خود بھی پینٹر تھے اور اس فن کو جانتے تھے۔

1958ء کے آخر میں، میں افغانستان گیا اور میں نے نو ماہ کی مدت میں شاہی خاندان کے پورٹریٹس اور بہت سی تصاویر بنا ڈالیں۔ تصاویر اتنی تھیں کہ میں نے ان کی نمائش کر ڈالی۔ یہ نمائش امریکی آڈیٹوریم میں ہوئی جسے پاکستان اور امریکی سفارت خانے کا تعاون حاصل تھا۔ اس نمائش کا افتتاح پاکستانی سفیر عزت مآب اے کے خٹک نے کیا۔ اس نمائش میں 17 ممالک کے ڈپلومیٹ نے شرکت کی اور امریکی سفیر عزت مآب ہنری اے۔ بائیرروڈ (Henry A.Byroade) نے بھی مہمانوں سے خطاب کیا۔

انہوں نے کہا۔ ''تخلیق کار جن میں مصور، ادیب اور شاعر شامل ہیں اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہ ملکوں کے درمیان پل کا کام دیتے ہیں۔ پاکستان اور افغانستان کے درمیان یہ کام گل جی نے انجام دیا ہے۔ بلاشبہ وہ اس کے لیے مبارک باد کا مستحق ہے۔''

یہ نمائش 4 جون 1959ء کو منعقد ہوئی اور اس میں میری 151 تصاویر رکھی گئیں۔ یہ پہلی سولو نمائش تھی جس میں چاروں طرف میرے ہی فن پارے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں پینٹنگز کے علاوہ پین اسکیچز بھی تھے۔

شاہ کی پینٹنگ میں نے گہرے رنگوں سے بنائی تھی لیکن رتی الحی خانہ اور خاص طور پر شہزادی کی پینٹنگ میں نے ہلکے رنگوں سے بنائی جس میں لائٹ اینڈ شیڈ کا اچھا استعمال کیا گیا تھا۔ یہ سارا کام ریکنوم تھا۔ شاہ کے علاوہ میں نے ان کے داماد ولی خان اور ان کے چچا سر محمود خان غزالی کی تصاویر بھی بنائیں۔

اس عرصے میں، میں نے کابل میں گھوم پھر کر وہاں کی عام زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا اور عام لوگوں کو اسکیچ کیا۔ گھڑ سواری، شتر سواری، مرغوں کی لڑائی، فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھے ہوئے لوگ ان اسکیچز کا موضوع تھے۔ تصاویر میں نے اپنے خاص اسٹائل سے بنائی تھیں جن میں پس منظر نہیں تھا بلکہ صرف اور صرف چہرے تھے۔ میں نے اسکیچز میں بے پناہ لکیریں کھینچ کر تفصیل نہیں دکھائی تھی بلکہ یہ تصاویر انتہائی سادہ تھیں، حقیقت سے بے حد قریب!

اس نمائش نے مجھے بہت شہرت بخشی۔ تاہم میرے اہل وطن یہ نہیں جانتے تھے کہ میں نے آرٹ کی دنیا میں کیا تجربے کیے ہیں۔ انہوں نے میرے بارے میں صرف اخبارات میں ہی پڑھا تھا۔

ایک پورٹریٹ کو مکمل کرنے میں تین تین گھنٹے کی کئی نشستیں درکار ہوتی تھیں۔ اس طرح سے تقریباً دس سے پندرہ روز میں ایک پورٹریٹ مکمل ہو جاتا تھا۔

ہر بڑے آرٹسٹ کی طرح میں بھی چاہتا تھا کہ میرے فن پارے لازوال ہوں اور رہتی دنیا تک میرا نام روشن رہے۔ اس لیے مجھے ایسے میڈیم کی تلاش تھی جو ایک طویل عرصے تک اپنی حیثیت برقرار رکھ سکے۔ اسی اثنا میں مجھے وزیر تجارت افغانستان شہزادہ شیرزادہ کے ساتھ ایک اونکس کی فیکٹری میں جانے کا اتفاق ہوا۔

افغانستان قیمتی پتھروں سے مالامال ہے اور وہاں یاقوت کی کئی کانیں ہیں۔ لوگ تزئین و آرائش میں بھی پتھروں کا استعمال کرتے ہیں، مثال کے طور پر میزوں کی ٹاپ اور لیمپ اسٹینڈ وغیرہ۔

مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اس میڈیم کو اپنی تصویروں میں استعمال کروں۔ اس طرح سے تصویریں بہت عرصے تک خراب نہیں ہوں گی اور بے رحم وقت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں نے نہ صرف سوچا بلکہ اسے عملی جامہ بھی پہنایا۔ میرا خیال ہے، پتھر صدیوں سے زمین میں دبا پڑا ہے۔ اس کے ان گنت رنگ ہیں۔ اسے جب تراشا جاتا ہے اور کوئی شکل دی جاتی ہے تو پھر اس کی آب و تاب بڑھ جاتی ہے اور اس کے بعد وہ صدیوں تک اپنی شکل قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس میڈیم کا انتخاب کیا ہے تاکہ میرے مرنے کے بعد میری مصوری اور خطاطی زندہ رہے۔

میں نے شاہ سے کہا کہ میں اونکس سے ان کا ایک

پورٹریٹ بنانا چاہتا ہوں۔ شاہ نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور فیکٹری سے بہت سا موزیک اور کاری گر مہیا کر دیے۔ میں نے پہلے تو کینوس پر ڈرائنگ کی اور اس کے بعد اس پر موزیک کے ٹکڑے جوڑنا شروع کر دیے۔ یہ کام قطعی آسان نہیں تھا۔ اس لیے کہ مطلوبہ شیڈ کے موزیک فوراً ہی نہیں مل جاتے تھے۔ انہیں تلاش کرنے میں بعض اوقات کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ اس کے بعد میں ان ٹکڑوں کو کاری گروں سے کٹواتا اور فائبر گلاس پر چپکا دیتا تاکہ موزیک کے ٹکڑے بیچ میں فٹ ہو سکیں۔

جب یہ پورٹریٹ مکمل ہو گیا تو میں نے موزیک کے پاؤڈر سے اسے گھس کر صاف کیا جس سے پورٹریٹ چمک اٹھا۔ اسے دیکھتے ہی پہلا تاثر یہ ابھرتا تھا جیسے بہت سے چیستانی ٹکڑوں (Jigsaw Puzzle) کو آپس میں جوڑ دیا گیا ہو۔ جب یہ شاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انہیں یہ میڈیم بہت پسند آیا۔ میں نے اس کے بعد آغا خان اور اس کے بعد ایک اونٹ کی تصویر اسی میڈیم میں بنائی۔

اونٹ کی یہ تصویر ظاہر شاہ نے آئزن ہاور کو 1959ء میں اس وقت پیش کی جب وہ کابل آئے۔ یوں میں نے افغانستان میں تین برس گزارے اور فن کارانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھا دیے۔ میں نے خود کو آرٹسٹ کی حیثیت سے منوا لیا۔

☆☆☆

اس وقت جب میں کابل میں اپنے فن کے جوہر دکھا رہا تھا، پاکستان میں 1958ء کا فوجی انقلاب آچکا تھا اور جنرل محمد ایوب خان مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ملک کی باگ ڈور سنبھال چکے تھے۔ آئین کو منسوخ کیا جا چکا تھا اور سیاست پر پابندی لگ چکی تھی۔

میں جب پاکستان آیا تو میں نے ملازمت چھوڑ کر آرٹسٹ بننے کا فیصلہ کر لیا۔ والدین کا خیال تھا کہ میں اپنی قسمت خراب کر رہا ہوں اور مجھے آرٹ میں کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن میرے سر پر تخلیق کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ میں نے انجینئرنگ کو خیرباد کر دیا۔

1960ء سے 1970ء کے دوران میں نے تصاویر کے لیے موزائیک گلاس اور لاجورد کا انتخاب کیا اور بہت سی لازوال تصاویر بنائیں۔

انہی دنوں امریکا سے ایک خاتون آرٹسٹ میری لینڈ پاکستان آئی اور اس نے دس بارہ بڑی بڑی تجریدی (ایبسٹرکٹ) پینٹنگز بنائیں اور ان کی نمائش کی۔ میں جو ان دنوں آرٹ کے تنقید نگار کی حیثیت سے بھی کام کر رہا تھا۔ میں نے "آرٹ لینڈ" کے شمارہ جون 1960ء میں آرٹسٹ میری لینڈ کے فن پر اچھے لفظوں میں تبصرہ کرتے ہوئے پاکستانی آرٹسٹوں کو مشورہ دیا کہ وہ بھی تجریدی آرٹ پر کام کریں۔

دو آرٹسٹ ان دنوں تجریدی آرٹ پر کام کر رہے تھے جن میں محمد امین اور معین الاسلام تھے۔ ان کے سوا کسی نے میرا مشورہ قبول نہیں کیا کہ لوگ اس کام سے آشنا نہیں۔ متوسط طبقہ ان پینٹنگز کو کیسے خریدے گا؟ اس لیے کہ ان رنگوں کا استعمال بہت ہوتا ہے اور یہ کہ وہ کسی کی سمجھ میں آتیں۔

میں نے خود تجریدی آرٹ پر کام کیا اور میرا کام کلب، بزنس ڈسٹ بلڈنگ، ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل اور کامرس کی زینت بنا۔ اسی دوران میں نے میورل بھی بنانا شروع کر دیے۔

1960ء ہی میں، میں نے اس وقت کے وزیر ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی اہلیہ کا پورٹریٹ بنایا جسے بہت پسند کیا گیا۔ یہ پورٹریٹ میں نے نہایت توجہ سے بنایا تھا اس لیے کہ بھٹو میری پسندیدہ شخصیت تھے۔ وزیر خارجہ کی حیثیت سے وہ بین الاقوامی سطح پر نام پیدا کر چکے تھے۔ ان کا بولنے اور کپڑے پہننے کا ایک خاص اسٹائل تھا۔

میں حیرت انگیز طور پر تجریدی آرٹ اور روایتی آرٹ پر بیک وقت کام کر رہا تھا۔ آرٹ کی ان صنفوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک منفی ہے تو دوسری مثبت۔ مگر میں نہایت خوش اسلوبی سے دونوں کشتیوں میں سوار تھا اور لوگوں سے خراجِ تحسین وصول کر رہا تھا۔

وصی حیدر کہتے ہیں۔ "1960ء میں گل جی کے کام میں ایک نمایاں تبدیلی آئی اور اس نے ایکشن پینٹرز پر پینٹنگز بنانا شروع کر دیں۔ ایکشن پینٹنگز کے دوران جیکسن پولاک کے طرز پر اس نے اپنی تخلیقات میں استعمال نہایت خوب صورتی سے کیا لیکن اس میں نمایاں تبدیلیاں بھی کیں اور نئی جہتوں کو شامل کیا۔ جس نے اسے ہم عصر مصوروں میں نمایاں کر دیا۔

پولاک اپنا کینوس ایزل پر رکھنے کے بجائے فرش پر رکھتا تھا۔ پھر اس پر رنگ گرا دیتا اور برش چلا کر کسی آئیڈیا کو ڈیولپ کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے قدیم ریڈ انڈینز سے سیکھا ہے جو ریت پر انگلی سے تصویریں بنایا کرتے تھے۔ گل جی کے اسٹروکس نہایت طاقت ور ہوتے۔

تجریدی ایکسپریشن ازم سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسا مصور ہے جسے ہم دنیا کے بڑے مصوروں کی صف میں شمار کر سکتے ہیں۔ وہ میورل بنانے والے مصوروں کی صفِ اول میں شامل ہے۔ اس کے پورٹریٹ، ڈرائنگ اور تجریدی روغنی اسٹروکس میں بجلی کی سی توانائی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے برش یا اسٹروکس کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔

وہ نہایت تکلف سے رہتا ہے۔ غیر ملکی کپڑے پہنتا ہے اور اس کے پاؤں میں سانپ کی کھال کی چپلیں ہوتی ہیں۔ مگر جب وہ اپنے اسٹوڈیو میں داخل ہوتا اور کوئی پینٹنگ بنانے چلتا ہے تو ایف ایم حسین کی طرح چپلیں اتار دیتا ہے اور دونوں ہاتھوں میں برش لے کر کینوس پر رنگ بکھیرتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ کام کرتے وقت اس پر جنون ... بلکہ وجد سا طاری ہو جاتا ہے۔"

☆☆☆

لوگ کہتے ہیں کہ مجھے پیسا بنانا آتا ہے۔ میری بیگم زرد (زرینہ) میری پی آر کرتی تھیں۔ 1985ء میں دیے گئے ایک انٹرویو میں، میں نے کہا۔ "غریب ہونے میں کوئی وقار نہیں اور امیر ہونا عظمت کی نشانی نہیں ہے۔"

میں نے ساری زندگی شاہانہ انداز سے گزاری۔ میں احمد پرویز اور قادر گاف کی طرح سے مفلوک الحال نہیں تھا۔ میں بڑے بڑے منصوبوں پر کام کرتا تھا۔ جیسے تیمور، فورڈ، انٹی، مانیکلی اور روز ٹیجی کیا کرتے تھے۔

انور عنایت اللہ لکھتے ہیں۔ "رقص کرتے ہوئے گھوڑے، ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہوئے مرغ اور مفلوک الحال انسانوں کو اس کی پینٹنگ میں دیکھ کر آرٹ کا ہر نقاد یہ کہہ اٹھتا ہے کہ وہ پاکستان کا سب سے عظیم الشان مصور ہے۔ اس نے خطاطی میں بھی نت نئے تجربات کیے ہیں۔"

☆☆☆

1964ء میں چین کے وزیراعظم چو این لائی سرکاری دورے پر پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد تشریف لائے تو میں نے ان کی دو پینسل ڈرائنگز راولپنڈی میں بنائیں۔ جب تو وہ اپنے ساتھ لے گئے اور دوسری پر دستخط کر کے انہوں نے مجھے واپس کر دی۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ چو این لائی میرے سامنے اس وقت تک بیٹھے مگر جب انہوں نے ڈرائنگ پر دستخط کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ چینی برش اور سیاہی سے ہی دستخط کریں گے تو ان کے ایک کارندے کو سیاہی اور برش مہیا کرنے میں چودہ

منٹ لگ گئے۔ بہرحال اتنی دیر انہوں نے صبر کیا اور مجھ سے آرٹ پر گفتگو کرتے رہے۔ چلتے وقت انہوں نے مجھے چین آنے کی دعوت دی۔ کہا کہ انقلاب چین کی سالگرہ کے موقع پر ضرور آؤں۔

انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں مصوری کیسے کرتا ہوں؟ اس کا خیال میرے دماغ میں کیسے آتا ہے اور میں اپنے رنگوں کا انتخاب کیسے کرتا ہوں؟

میں نے جواب دیا کہ دیکھتا ہوں، کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لیے۔ میرے ذہن میں جو اچانک خیال پیدا ہوتا ہے میں اسے جلد تصویر پر منتقل کر دیتا ہوں۔ مجھے پہلے سے علم نہیں ہوتا کہ میں تصویر میں کیا پیش کروں گا اور نہ خبر ہوتی ہے کہ کون سے رنگ برتوں گا۔ جب میں تصویر کشی کرتا ہوں تو یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ تصویر کیا بنے گی۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں گویا ایک خلا میں چھلانگ لگا رہا ہوں۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ میں دوبارہ زمین پر پاؤں کے بل کھڑا ہو سکوں گا یا نہیں۔ میں بہت دیر بعد اندازہ لگا پاتا ہوں کہ میرے کام کا کیا انجام ہوگا۔

☆☆☆

میری خواہش ہے کہ میرے ملک کے لوگوں کو آرٹ کی سمجھ آجائے اور وہ آرٹسٹوں کا احترام کریں۔ میرے بارے میں ان کا خیال ہے کہ میں پیسا بناتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں روزی کمانا بے حد دشوار ہے۔ اگر لوگ صرف ہمارا احترام ہی کریں تو کافی ہے۔ اب دیکھیں کہ مہدی حسن بہت بڑے گلوکار ہیں لیکن ان کی اتنی عزت نہیں ہے۔ یقین کیجیے کہ اگر وہ میرے گھر آئیں تو میں ہاتھ جوڑ کر مودبانہ ان کے آگے کھڑا ہو جاؤں۔ ان کے علاوہ مجھے نصرت فتح علی خان اور نور جہاں بھی پسند ہیں مگر حکومتی سطح پر ان لوگوں کی وقعت ہے؟

ہماری زوال پذیری کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ابھی تک گورے حکومت کر رہے ہیں۔ میں نے جب اقبال پر کام کیا تو انہیں بہت توجہ سے پڑھا۔ جو خواب انہوں نے پاکستان کے لیے دیکھا تھا اس پر تو ہم عمل ہی نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں پینٹ کیا ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اسی طرح میں نے اس شعر پر بھی پینٹنگ کی ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

☆☆☆

1963ء جب میں پرنس کریم آغا خان کا پورٹریٹ بنانے کے لیے ان کے ساتھ ساتھ دورے پر تھا۔ کراچی، لاہور، پشاور، چٹاگانگ اور پھر پیرس۔ میری ملاقات ڈھاکا، مشرقی پاکستان میں زرینہ سے ایک تقریب میں ہوئی۔ وہ مجھے اچھی لگی اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر میں شادی کروں گا تو اس سے۔ پرنس کریم کے ساتھ میں پیرس پہنچ گیا اور وہاں جب کام ختم ہوگیا تو میں نے زرینہ کو پیرس آنے کی دعوت دی۔ جب زرینہ وہاں پہنچی تو میں نے اس سے شادی کر لی۔ پرنس کریم آغا خان اس شادی میں شریک ہوئے تھے۔

☆☆☆

1965ء میں شاہ ایران اور ملکہ فرح دیبا پاکستان کے دورے پر آئے تو صدر پاکستان نے مجھے ہدایت دی کہ میں خوب صورت اور دل کش ملکہ کی پینٹنگ بناؤں۔

ملکہ دیکھنے میں نوخیز لڑکی لگتی تھیں۔ میں نے انہیں اسی انداز میں پینٹ کیا۔ ترشیدہ بال، غزالی آنکھیں، چہرے پر ایک ملکوتی مسکراہٹ۔ وہ ایک سادہ سا فراک پہنے تھیں اور ان کے جسم پر کوئی زیور نہیں تھا۔ ان کی پینٹنگ کا پس منظر نیلا ہرا تھا اور چہرے پر روشنی اور سادگی کا بہترین امتزاج تھا۔

شاہ ایران اس پینٹنگ کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے مجھے ایران آنے کی دعوت دی اور کہا کہ میں شہزادہ رضا اور شہزادی کا پورٹریٹ بھی بناؤں۔ میں تہران گیا اور میں نے یہ دو پینٹنگز بنانے کے علاوہ اور بھی بہت سا کام کیا۔ میرے اس کام کی نمائش آر سی ڈی (تعاون برائے علاقائی ترقی) کے تحت تہران میں ہوئی۔

☆☆☆

ستمبر 1965ء میں انڈیا نے پاکستان پر حملہ کر دیا اور ایک بڑے حصے پر قبضہ کرلیا۔ پاکستان نے اپنا دفاع کیا اور اپنے سے کئی گنا طاقتور ملک کو شکست سے دوچار کیا۔ ساری دنیا کی ہمدردیاں سمیٹ لیں۔ صدر ایوب قومی ہیرو بن گئے۔ انہیں فیلڈ مارشل کا خطاب دیا گیا۔ اس موقعے پر میں نے ان کا ایک عظیم الشان پورٹریٹ بنایا۔

یہ میرے چند ان شاہکاروں میں سے ایک ہے اور اس وقت کی یادگار ہے جب میں تجریدی آرٹ، موزائیک اور قرآنی مجسمہ سازی کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ میری تمام تر توجہ پورٹریٹس کی طرف تھی۔ اسی زمانے میں جب صدر ایوب کے دورے پر گئے تو میں سرکاری آرٹسٹ کے طور ان کے ہمراہ تھا۔

صدر جن جن ملکوں میں جاتے تھے، میں فائدین ساتھ ان کے اسکیچز بناتا تھا۔ ان میں فرانس کے صدر ڈیگال، رومانیہ کے صدر، اسٹونیا، ترکی کے صدر شامل ہیں۔ یہ ایک طرح سے صدر ایوب کے دورے کی تصویری رپورٹ تھی۔

مجھے یہ بھی اعزاز حاصل رہا کہ میں نے صدر ڈیگال ان کی کابینہ کے اراکین کی تصاویر ان کے صدارتی محل میں پیش کیں۔

یورپی دورے کے دوران میں نے ترکی کے وزیر سلمان دیمرل اور عصمت انونو کی صدر ایوب سے ملاقات بھی تصاویر بنائیں۔ یہ سب پین اسکیچز تھے۔ جن میں لائنیں نہیں تھیں بلکہ چہروں کے تاثرات پر زور تھا۔ ان تصاویر میں نہ پس منظر تھا اور نہ بے پناہ لائنیں سب سادہ اسکیچز ہیں لیکن انہیں دیکھ کر یہ تاثر ابھرتا ہے۔ انہیں کسی بڑے مصور نے بنایا ہے۔

☆☆☆

1969ء میں صدر نکسن پاکستان آئے تو اس موقع پر میں نے ان کے اسکیچز بنائے جنہیں امریکی سفارت خانے نے کتابی صورت میں شائع کیا اور اس کا نام رکھا گیا سوئز کھا۔ گھرے لائٹ اینڈ شیڈ میں بنی ہوئی یہ تصاویر صدر نکسن کو بہت پسند آئیں اور انہوں نے سفارت خانے کی کتاب میں میرے لیے ستائشی الفاظ لکھے۔

1970ء تک میں نے پورٹریٹس اور پین اسکیچز بنائے۔ یہ اسکیچز صرف نامی گرامی ہستیوں کے ہی نہیں بلکہ میں نے عام لوگوں کی زندگیوں کا گہرا مشاہدہ کر کے انہیں بھی کاغذ پر منتقل کیا تھا۔ ان میں لڑکوں، لڑکیوں اور بوڑھوں کی زندگی سے قریب تصاویر شامل ہیں۔ ان میں ایک تصویر افغانستان کے کسانوں کی بھی ہے جو میری توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اس میں ایک کسان کا خاندان دھوپ میں ہے اور ان کا کتا نزدیک کھڑا ہے۔ بے بسی، لاچارگی، مفلسی ان کے چہروں سے عیاں ہے۔ اس اسکیچ کے پس منظر میں کچھ نہیں ہے اور کسانوں کے چہروں پر بھی کام نہیں ہے۔

یہ سارے اسکیچز میں نے سفید کاغذ پر یا پھر رنگین کاغذ پر بنائے۔

والے بنائے ہیں۔ جن کے لیے میں نے مختلف میڈیم استعمال کیے ہیں۔ کسی میں کریون، کسی میں چارکول اور کسی میں انک اور پینسل کا استعمال کیا ہے۔ بہرحال میڈیم کوئی بھی ہو اس کی تکنیک یہی تھی کہ میں گہرے شیڈز پر توجہ دیتا تھا اور باقی سب تمام چھوڑ دیتا تھا تاکہ دیکھنے والا اسے اپنے تصور سے مکمل کرے اور عام آدمی کا آرٹسٹک شعور بیدار ہو۔

1965ء میں جب نیویارک میں عالمی نمائش منعقد ہوئی تو میں نے اس کے لیے بہت سی تصاویر بھیجیں۔ ان میں سے ایک تصویر میں رقص کرتی دوشیزہ شامل تھی۔ یہ تصویر میں نے موزائیک سے بنائی تھی۔

اس کے علاوہ 1969ء میں جب کراچی میں وزارت خارجہ کانفرنس ہونے لگی تو میں نے اس کے لیے کانسی کا ایک اسکلپچر بنایا۔

میرا کام اس قدر پسند کیا گیا کہ حکومت پاکستان نے مجھے تمغۂ حسن کارکردگی (Pride of performance) سے نوازا۔

1970ء میں جب جاپان میں ایکسپو 70ء منعقد ہوئی تو میں نے ایکسپورٹ پروموشن بیورو کے لیے ایک اسکلپچر تیار کیا۔ یہ ہشت پہلو مجسمہ تجریدی آرٹ کا نمونہ تھا۔ اس تصویر کے چاروں طرف چھ فٹ کی ایک شیلڈ پر میں نے قرآنی آیات لکھی تھیں اور اس کے اوپر بنائے جانے والے ایک دائرے پر میں نے پاکستان سے برآمد کی جانے والی چالیس چیزوں کے ڈیزائن بنائے تھے۔ اس دیو قامت شیلڈ کی تیاری میں، میں نے سونا، چاندی، کانسی اور سنگ لاجورد کو استعمال کیا تھا۔ میں نے اسے اپنے بھائی صدر اسماعیل کی مدد سے ایک ماہ کے قلیل وقفے میں تیار کیا تھا۔

میرا یہ اسکلپچر (مجسمہ) ایکسپورٹ پروموشن بیورو نے پاکستانی اسٹال پر لگایا تھا۔ اسے آرٹ کے مداحوں نے بہت پسند کیا، کیونکہ اس میں کانسی کو ڈھال کر خطاطی کا نمونہ بنایا گیا تھا۔

1973ء میں، میں نے شاہ فیصل اسپتال جدہ کے داخلے کی دیوار کے لیے ایک تجریدی میورل بنایا۔ میرا یہ تجربہ کامیاب رہا اور اسے قدر دانوں نے بہت سراہا۔ ایک میورل اسٹین پینٹنگ پر لکھا تھا کہ اللہ ہی شفا دیتا ہے۔ دوسرے میں لکھا تھا کہ ہم تمہیں بیمار ڈالتے ہیں اور ہم ہی تمہیں شفا دیتے ہیں۔

جب جدہ اسپتال کی یہ بڑی پینٹنگز لے کر میں سعودی عرب گیا تو میں نے سب سے پہلے عمرہ کیا۔ اس عمرے نے میری ذہنی کیفیت بدل کر رکھ دی۔ میرے دل میں خدا کا نور بس گیا تھا۔ جب میں وہاں سے واپس آیا تو میں نے زندگی مری میں رہائش اختیار کر لی۔ اس کے بعد حجر اسود کو اپنی پینٹنگز کا موضوع بنایا۔ میں نے تجریدی میں حجر اسود کو نمایاں کیا۔ اس کے علاوہ اللہ کا نام کئی طریقوں سے تجریدی میں لکھا۔

خطاطی میں، میں نے یہ تجربہ بھی کیا کہ رنگوں کے چھوٹے بڑے دھبے سے بنائے اور اس کے چاروں طرف آیات قرآنی لکھیں۔ تاکہ ان رنگوں سے دیکھنے والے کی آنکھوں کو سکون ملے۔ میری خطاطی بے حد متوازن ہوتی تھی۔ میں نے خطاطی کو تجریدی انداز سے پیش کیا۔

انجم جاوید رقم طراز ہیں۔ ''گل جی کے مصورانہ کیریئر میں اس کی پہچان اسلامی خطاطی ہے۔ وہ خطاطی کرتے ہوئے ڈوب جاتا تھا اور اس کی شخصیت میں موجود عارفانہ رنگ، اس کی گیلی گرافک پینٹنگز کا جزو بن جاتا تھا۔ اس بات کا احساس کرتے ہوئے وہ خود کہا کرتا تھا کہ میرا کیلی گرافک کا سہرا اصل میرا درویشانہ رقص ہے۔

اسلامک کیلی گرافک آرٹ اس کی پہچان ہی نہیں اس کا اثاثہ بھی ہے۔ اس نے فن مصوری کے لگے بندھے ضابطوں کی قید و بند کو قبول نہیں کیا۔ ہمیشہ نئی راہیں تراشیں اور جدت طرازی اختیار کی۔ قدرت نے اسے بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ جس کی مدد سے وہ ہمیشہ ایک نیا آہنگ پیش کرنے میں کامیاب رہتا تھا۔

وہ اپنے کام میں اس قدر مہارت رکھتا تھا کہ چھوٹے برش سے لے کر کوچی تک کا استعمال اپنی پینٹنگز میں کرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ برشوں کو ایک ساتھ جوڑ لیا کرتا تھا۔ تاکہ اسٹروک چوڑا لگے۔ پینٹنگ کرتے وقت اس پر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ رنگ اچھالتا اور کینوس پر بے ترتیب بکھرے ہوئے رنگوں سے ترتیب وار تجریدی آرٹ ابھر آتا۔''

مشہور مستشرق این میری شیمل نے بتایا۔ ''گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں خطاطی کی نمائش ہو رہی تھی جس میں پاکستان کے چند بڑے مصور شریک ہو رہے تھے۔ میں جب اس نمائش میں گئی تو اچانک ہی گل جی کے کینوس نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی پینٹنگز سے رنگوں کی بارش ہو رہی ہو۔ اس کی مصوری سب سے نرالی تھی۔ اس نے سنہری رنگ کا اس مہارت سے استعمال کیا

تھا کہ کیوس پر تارے دمکتے محسوس ہوتے تھے۔ اس کے بعد جب میں نے اس کی سہ رخی خطاطی دیکھی تو اور بھی متاثر ہوئی۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی مصور قرآنی آیات کے مجسمے بنا سکتا ہے؟ اس نے اسلامی خطاطی کا کام خط کوفی میں کیا تھا جس کا سلسلہ دسویں سے تیرھویں صدی تک جاتا ہے۔ جب خلفاء کے دور میں مصور پتھروں پر نقاشی کیا کرتے تھے۔''

میری خطاطی کو جب لوگوں نے خراج تحسین پیش کیا تو میں نے کنفشن.... پر ایک اسکپچر ل (قرآنی آیت کا مجسمہ) بنایا جس میں ایک ٹوٹے ہوئے طیارے کے ٹکڑے استعمال کیے گئے تھے۔ یہ قرآنی آیت کا مجسمہ تھا جس میں سونے اور چاندی کا استعمال بھی کیا گیا تھا۔

مصور حضرات برسوں سے خطاطی پر طبع آزمائی کر رہے تھے اور اس کے بہت اچھے نمونے اب بھی گالہ سے ملتے ہیں۔ لیکن خطاطی کو پینٹنگ کی حیثیت سے اسی زمانے میں پیش کیا گیا ہے۔ نت نئے رنگوں کا استعمال ہوا اور پھر اس کے اسکپچر ل بنانے کا رواج بھی شروع ہوگیا۔

اب تک پاکستان میں میرے فن پاروں کی نمائش نہیں ہوئی تھی اس لیے کہ میں جو کچھ بناتا تھا فوراً ہی فروخت ہو جاتا تھا۔ اسی طرح سے اسکپچر ل بھی میرے پاس نہیں رہتے تھے۔ پھر ان سب کو جمع کرنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ جب 1974ء میں میری پینٹنگز کی نمائش ہوئی تو اس میں، میں نے چھوٹی پینٹنگز کو رکھا۔ ان میں زیادہ تر سندھی رنگوں کا استعمال کیا گیا تھا اور شیشے کے چھوٹے ٹکڑے بھی لگائے گئے تھے جنہیں دیکھ کر سندھی کشیدہ کاری کی یاد آتی تھی۔ یہ محض اس لیے ہوا تھا کہ 1972ء میں گورنر سندھ ممتاز علی بھٹو نے میرے اسٹوڈیو کا ایک غیر رسمی دورہ کیا تھا اور مجھے ہدایت دی تھی کہ میں گھڑ سواروں کو پولو کھیلتے ہوئے پینٹ کروں اور اس کے علاوہ سندھ کے لوک فنون کی ترجمانی کرنے والی تصاویر بھی بناؤں۔ میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔

مجھ میں اور دوسرے تجریدی آرٹسٹوں میں یہ فرق نمایاں تھا کہ میرا کینوس ہمیشہ بڑا ہوتا تھا اور میں اس میں شیشوں، سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کا استعمال کرتا تھا اور اپنے کام میں ندرت پیدا کر دیتا تھا۔

1976ء میں جب امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر پاکستان کے دورے پر آئے تو وزیراعظم پاکستان کی ہدایت پر میں نے کسنجر کے مختلف اسکیچز بنائے۔ یہ اسکیچز میں نے ایڈیسن کی ایک شیٹ پر بنائے تھے جو 14 فٹ لمبی تھی۔ میں ہنری کسنجر کے 35 مختلف پوز تھے جنہیں شیٹ پر کچھ فاصلے سے کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ ہنری کسنجر اس کے کام کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مجھے امریکا آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے تاثراتی کتاب میں لکھا کہ اس کا کام مسحور کر لیتا ہے۔ میں نے تقریباً ہر ملک کی مصوری دیکھی ہے جو بات گل جی کی مصوری میں ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ جی چاہتا ہے کہ اسے سر پر بٹھا لیا جائے۔

☆☆☆

1974ء میں جب لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں 37 ممالک کے 24 سربراہان نے شرکت کی۔ جن میں شاہ فیصل بھی شامل تھے۔ شاہ فیصل اس سے پہلے مجھ سے جدہ اسپتال کے لیے میورل بنوا چکے تھے۔ اس بار انہوں نے فرمائش کی کہ میں ان کا پورٹریٹ موزائیک سنگ لاجورد میں بناؤں۔ اس ڈرائنگ کے لیے خاص طور پر میرے سامنے بیٹھے۔

میں نے اس پورٹریٹ پر چھ ماہ تک کام کیا۔ میں سنگ لاجورد (Lapis Luzuli) کے جو مختلف استعمال کیے گئے تھے۔ اس قیمتی پتھر کو خریدنے کے لیے تیس ہزار ڈالر صرف ہوئے۔ میں نے انتھک محنت کی۔ چودہ چودہ گھنٹے کام کیا۔ اس کے ساتھ ماہرین کی ایک ٹیم تھی جو پتھروں کو مطلوبہ شکل میں مہارت سے کاٹتے تھے۔

جب میں اس پورٹریٹ کو جدہ جا کر شاہ کو پیش کرنے والا تھا تو کسی شقی القلب نے شاہ کو 13 مارچ 1975ء کو ہلاک کر دیا۔ اس اطلاع سے مجھے بہت صدمہ پہنچا۔

آپ کسی چہرے پر چھ ماہ تک کام نہیں کر سکتے جب تک آپ نے اس چہرے کو بہت نزدیک سے نہ دیکھا ہو اور طرح سے محسوس نہ کیا ہو۔ شاہ کا چہرہ غیر معمولی تھا۔ اس پر روحانی پرتو تھا۔ میں نے اس پورٹریٹ کو دل کی گہرائیوں سے بنایا تھا۔ مگر افسوس وہ اس دنیا میں نہ رہے۔

ان کے بیٹے عبداللہ الفیصل مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب میں ریاض جاتا تھا تو وہ سارا عرصہ میرے ساتھ رہتے تھے۔ میرے ساتھ کھانا کھاتے تھے اور اتنا خیال رکھتے تھے کہ میری پلیٹ میں خود کھانا ڈالتے تھے۔ مگر جب ان کا موزائیک پورٹریٹ مکمل کر لیا تو ریاض جا کر دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ میری رہائش کا بندوبست حکومت کی طرف سے ہوٹل ریجنٹ میں تھا۔ میں محل سے

آ گیا۔

دوسرے دن شہزادے کا سیکریٹری آیا اور اس نے مجھے ایک لفافہ پیش کیا۔ میں اسے اپنی جیب میں رکھنا چاہتا تھا کہ اس نے درخواست کی کہ میں لفافے میں رکھی ہوئی رقم اس کے سامنے گن لوں۔

میں نے رقم گنی تو تیس ہزار ڈالر تھی۔ میں حیران رہ گیا کیونکہ معاوضہ اس سے کم طے ہوا تھا۔ میں نے سیکریٹری سے کہا کہ اس معاملے میں اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ وہ زائد رقم واپس لے جائے۔ سیکریٹری نے جواب دیا کہ اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ رقم مجھے دے دے۔ یہ حکم نہیں دیا گیا کہ اسے کچھ واپس بھی لانا ہے۔

جب شہزادے سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ نے مجھے اتنی زیادہ رقم کیوں دے دی تو انہوں نے جواب دیا کہ میری صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر اب اگر میں اس میں سے کچھ واپس کروں گا تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔

سنگ لاجورد کے علاوہ میں نے سنگ مرمر کو بھی اپنا میڈیم بنایا۔ اس کے سارے شیڈز کو استعمال کیا۔ تصویروں کا خاکہ بنا کر اس پر سنگ مرمر کے مختلف شیڈوں کو جوڑنا اور ان کو مطلوبہ انداز سے کاٹنا مذاق بات نہیں ہے لیکن میں نے یہ کارنامہ کر دکھایا تا کہ میرے فن پارے رہتی دنیا تک سلامت رہیں۔

☆☆☆

میں جب بھی کسی سے ملاقات کرتا ہوں تو یہ ظاہر نہیں کرتا کہ میں کوئی بلند پایہ آرٹسٹ ہوں، میری حیثیت اور مرتبہ بہت اعلیٰ ہے، میں ساری دنیا میں مشہور ہوں، میں نے حکمرانوں کے پورٹریٹ بنائے ہیں۔ اس کے بجائے میں بہت انکسار سے ملتا ہوں اور چھوٹے آرٹسٹوں سے بھی ہاتھ ملایا کرتا ہوں۔ اس ایک مسکراہٹ سے دلی طمانیت ہوتی تھی اور کام کرنے کا حوصلہ بڑھ جاتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں چھوٹے سے قد کا بلند قامت انسان ہوں۔ میں نوآموز فن کاروں کو تلقین کیا کرتا ہوں کہ خوب محنت اور خلوص سے کام کریں اور یہ سوچ لو کہ یہ آخری کام ہے۔ کام میں کم شہرت کو دیکھا ان میں نہ ڈالو اور یہ نہ سوچو کہ اس کام کو کرنے کے بعد کیا ملے گا۔

ماول انجم کہتے ہیں۔ ''میں ٹیلی وژن پر ایک پروگرام اینکر کیا کرتا تھا اور گل جی کا مداح تھا۔ ان سے کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ میں انہیں اپنے ایک پروگرام ''مہمان خصوصی'' میں بھی پیش کر چکا تھا۔ وہ بہت خوش مزاج تھے اور گفتگو کرتے وقت ہر چیز کی وضاحت کرتے تھے۔ کوئی موضوع ادھورا نہیں چھوڑتے تھے۔ کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ہاں میں نے ان سے انٹرویو کے دوران کہا کہ انہیں آرٹ میں وظیفہ کیوں نہیں ملا؟ کیا اس کے لیے انہوں نے کوشش نہیں کی؟''

وہ بولے۔ ''آرٹ میں یہاں کیا ملتا ہے؟ شکر کرو کہ آرٹسٹ کو مار نہیں دیتے۔''

کسی اور کو مارا ہو یا نہ مارا ہو، مگر گل جی کو کسی ظالم نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ ہم وہ ہیں جو اپنے فن کاروں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

☆☆☆

1983ء کی ایک رات کا واقعہ ہے کہ جب میں اپنی خواب گاہ میں آرام کر رہا تھا تو اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ تین آدمی جو وردیاں پہنے کھڑے تھے اندر آ گئے اور انہوں نے سیلوٹ مار کر کہا۔ ''آپ عظیم گل جی ہیں نا؟''

''ہاں میں گل جی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''عظیم ہوں یا نہیں اس کا فیصلہ تو تاریخ کرے گی۔''

''جناب! ہم محکمہ ٹیلی فون سے آئے ہیں، ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ کا فون خراب پڑا ہے۔'' ان میں سے ایک بولا۔

میرا فون واقعی خراب تھا اور میں اس کی اطلاع محکمے کو بار بار دے چکا تھا۔ اب رات کے دو بجے یہ لوگ کون تھے جو فون ٹھیک کرنے آ گئے تھے؟ انہوں نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر فون پر کام شروع کر دیا اور جب اپنا کام ختم کر چکے اور فون نے کام کرنا شروع کر دیا تو رہائش گاہ سے باہر نکل گئے اور ایک فوجی جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں حیران ہوا کہ ٹیلی فون کے محکمے کے لوگ فوجی جیپ میں کیوں آئے تھے؟

میں دروازہ بند کر کے اپنی خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔ ابھی میں اونگھ رہا تھا اور نیند کی وادیوں میں پہنچا بھی نہیں تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اٹھ کر ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا۔ دوسری طرف فون کے محکمے کا چیف انجینئر تھا جس نے اتنی رات گئے فون کرنے کی معذرت کی اور اس کے بعد سوال کیا کہ فون صحیح طور پر کام کر رہا ہے؟

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اس کی آواز بہت

صحیح طور پر سنائی دے رہی ہے۔

چیف انجینئر نے بتایا کہ جناب صدر مجھ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ پھر فون منقطع کردیا۔ میں پھر اپنے بستر پر نہیں گیا اور میں نے بنسن اینڈ ہیجز سگریٹ سلگا لیا۔ میری سمجھ میں آگیا تھا کہ [illegible] فون اس معاملے میں اتنی مستعدی کیوں دکھا رہا تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد صدر کے پرائیویٹ سیکریٹری اور پھر جناب صدر نے مجھ سے گفتگو کی اور ہدایت دی کہ میں صبح سات بجے کی فلائٹ سے پشاور جاؤں اور پناہ گزینوں کے کیمپ میں جاکر افغان مہاجرین کے اسکیچز بناؤں۔

میں نے خود کو تیار کیا اور چکلالہ ایئرپورٹ پہنچ گیا جہاں فلائٹ تیار تھی۔ میں پشاور پہنچا تو میں نے کیمپ میں لاکھوں مہاجرین کو دیکھا۔ میں نے مہاجرین کی جلاوطنی، بے کسی اور لاچاری کو اسکیچ کیا۔ میرے یہ اسکیچز ساری دنیا کے اخبارات میں شائع ہوئے اور ان سے رائے عامہ کو افغانستان کے بارے میں آگاہ کرنے میں بہت مدد ملی۔

☆☆☆

شاہ فیصل مسجد اسلام آباد کی تزئین کا کام صادقین کو دیا گیا تھا مگر ان کی زندگی نے وفا نہیں کی تو وہی کام مجھے دے دیا گیا۔ میں نے مسجد کے چاروں میناروں پر نصب ہلالوں اور درمیان میں بڑا ہلال بنایا۔ اس کے علاوہ مرکزی ہال میں کھلی ہوئی کتاب اور اس پر خطاطی میں تانبے سے سورۂ رحمٰن کی بھی خطاطی کی جس پر میں نے 1988ء میں (Monumental sculptural work) پر ستارۂ امتیاز ایک بار پھر حاصل کیا۔ اس سے پہلے میں یہ اعزاز 1982ء میں بھی حاصل کر چکا تھا۔

☆☆☆

ریچارڈ امریکی سفیر ہاورڈ کے وائز کہتا ہے۔ "1988ء کے وہ دن میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا جب گل جی نے اسلام آباد کو دیکھنے کی ذاتی طور پر مجھے دعوت دی۔ اس مسجد کو دیکھنے کا میں بھی متمنی تھا لہٰذا میں وہاں جا پہنچا۔ گل جی کا کام اور اس مسجد کی تزئین و آرائش دیکھ کر میں مبہوت ہو گیا۔ میرے ذہن میں مائیکل انجیلو کا نام گونجنے لگا جس نے سسٹائن چیپل کو مصور کیا تھا۔

جب ہم مسجد سے نکلے تو اسکولوں کی چھٹی ہو چکی تھی۔ طالب علموں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ گل جی ۔۔۔ گل جی کہتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑے۔ پھر انہوں نے اپنے بستوں سے آٹوگراف بکس نکالیں اور اس سے آٹوگراف کی فرمائش کرنے لگے۔ میرے لیے یہ منظر مسحور کن تھا۔ دوسرے شہروں میں جس طرح لوگ پاپ سنگرز اور کھلاڑیوں سے محبت کرتے ہیں اور انہیں دیکھ کر وہ ان کی طرف لپکتے ہیں اسی طرح اس ملک کی نسل اس سے والہانہ محبت کرتی ہے۔"

امریکی سفیر کے الفاظ میرے لیے مشعلِ راہ تھے۔ میں نے کوشش کی کہ اپنے کام میں مزید نکھار لاتا رہوں۔

مشہور مستشرق این میری شمل نے بھی اس طرح کے جملے لکھے ہیں کہ جب میں نے اسلام آباد کی فیصل مسجد میں اللہ تعالیٰ کے 99 ناموں کو انتہائی خوب صورتی سے لکھا دیکھا تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "یہ مسلم مصوری کا بہترین نمونہ ہے۔"

☆☆☆

جنرل ضیاء نے مجھے ہدایت دی کہ میں جارج سینئر کا ایک پورٹریٹ موزائیک سنگ میں بناؤں۔ میں نے اس حکم کی تعمیل کی۔

جارج بش نے میرا کام پسند کیا اور تعریف کی۔ کہا کہ میں نے یہ پورٹریٹ ان کی تصویر دیکھ کر بنایا۔ خواہش ہے کہ صدر خود میرے سامنے بیٹھیں تاکہ ڈرائنگ بنا سکوں۔ صدر نے معذرت کی کہ ان کے پاس وقت نہیں ہے۔

بہرحال میرے لیے یہ اعزاز بہت تھا کہ میں ان کے قریب کھڑا ہوں۔ میں نے جب صدر کو ان کی تصویر دی تو کوئی اخباری نمائندہ قریب نہیں تھا اور دوسرے اخبار یا میگزین میں اس کو خبر کے طور پر نہیں دیا گیا۔ ملاقات کی ایک تصویر ایوانِ صدر کے ایک فوٹوگرافر نے اتاری، جو میرے پاس یادگار کے طور پر رکھی ہے۔

☆☆☆

ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں میرا کہنا ہے کہ وہ دوست تھے۔ ہمیشہ مجھ سے مسکرا کر بات کرتے تھے۔ وزیر خارجہ تھے تو میرے سامنے اپنا پورٹریٹ بنوانے بیٹھے تھے۔ مجھے پاکستان کے سارے بڑے اعزاز ملے تھے۔ اس لیے وہ کہتے تھے کہ اب میں تمہیں کیا دوں۔ سب بڑے کام بھی کرلیے ہیں، تم سے کیا کراؤں؟ ان کی خواہش تھی کہ میں ان کا ایک ایسا پورٹریٹ بناؤں جس میں وہ ماؤزے تنگ کیپ پہنے ہوں۔ ان کی اس خواہش کا احترام نہ ہوسکا جس کا مجھے افسوس ہے۔ وہ اس پر بھی ناراض ہوتے تھے کہ میں نے سابقہ خاصیوں کے ہاتھوں سے پاکستان کے بڑے اعزازات کیوں لیے؟ میں اس ناراضی پر مسکرا کر رہ جاتا تھا۔ بہرحال جب 1974ء میں اسلامی سربراہ کانفرنس ہوئی تو میں نے اس کا ایمبلم بنایا۔ اس کا عنوان تھا۔ "خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور متحد ہو۔"

ان سے میری سب سے پہلی ناچاقی اس وقت ہوئی جب ٹائم میگزین میں ان کی ایک تصویر شائع ہوئی جس میں وہ قائداعظم کے ایک مجسمے کے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے ہدایت دی کہ میں اس کی ایک پینٹنگ بنا دوں۔ میں نے ان سے اختلاف کیا اور کہا کہ میں شائع شدہ تصویر کو دیکھ کر پینٹنگ نہیں بناتا۔ وہ اس پر کافی خفا ہوئے تھے۔

ایک واقعہ اور سناتا ہوں کہ جب ایک طیارہ کریش ہوگیا تو میں نے اس کے ٹکڑوں کو جوڑ کر "اللہ" کا اسکلپچر بنایا۔ اس میں سونے اور چاندی کا استعمال بھی کیا گیا تھا۔ اس اسکلپچر کو سندھ حکومت نے کلفٹن کے علاقے میں لگایا۔ انہی دنوں ایک پارٹی میں وزیراعلیٰ سندھ جتوئی نے مجھ سے کہا۔ "بڑے صاحب (بھٹو صاحب) کہتے ہیں کہ اسکلپچر (قرآنی مجسمہ) آپ نے بہت اونچا لگوا دیا ہے۔ اسے ذرا نیچا ہونا چاہیے۔"

میں نے جواب دیا۔ "وہ اللہ کا نام ہے لہٰذا اسے اونچا ہی ہونا چاہیے۔"

جتوئی یہ سن کر دوسری طرف چلے گئے۔ سعید احمد (شیخ والے) نزدیک ہی کھڑے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "تم بہت ضدی ہو۔ تم نے بڑے کی بات نہیں مانی۔ تم درست کہہ رہے تھے۔ وہ اللہ کا نام ہے لہٰذا اسے اونچا ہی ہونا چاہیے۔ وہ بڑے صاحب کا نام لے کر تم پر دھونس جما رہا تھا۔ بڑے صاحب ایسے نہیں ہیں۔ میں انہیں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ یہ لوگ ان کا امیج بگاڑ رہے ہیں۔"

جتوئی تک کسی نے یہ بات پہنچا دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اس اسکلپچر ہی کو اتروا لیا۔ ان کے اس اقدام پر لوگوں نے بہت تنقید کی۔

بات یہیں ختم نہیں ہوگی۔ میرے میوزیم میں کچھ پینٹنگز ایسی بھی تھیں جو برائے فروخت نہیں تھیں۔ ایک روز انکم ٹیکس والے آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ یہ جو پینٹنگز فروخت کے لیے نہیں ہیں بہرحال ان کی کوئی قیمت ہوگی؟ میں نے انہیں کہا "میں انہیں فروخت کروں گا تو اتنی قیمت پر۔"

"ایسی صورت میں آپ کو ٹیکس ادا کرنا چاہیے۔ لہٰذا آپ نکالیے تین ماہ کا ٹیکس سات لاکھ روپے۔"

اس کے برعکس بھٹو بہت اچھا آدمی تھا۔ مجھ سے شفقت کے ساتھ پیش آتا تھا۔ یہ احساس اسے بہر کیف رہتا تھا کہ وہ بہت بڑا شخص ہے۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب بھٹو نے وزارت خارجہ سے استعفیٰ دے دیا تھا اور ٹرین سے کراچی آیا تھا۔ اس وقت اسٹیشن پر استقبال کرنے کے لیے صرف میں اور رفیع منیر گئے تھے۔ جب اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا تو میں دھاڑیں مار کر رویا تھا۔

☆☆☆

میرے بارے میں کشور ناہید کہتی ہیں۔ "یہ 1977ء کی بات ہے۔ جس دن بھٹو صاحب کا تختہ ضیاء الحق نے الٹا تھا۔ مجھے اسلام آباد سے فون آیا کہ گل جی نے بھٹو صاحب کے پورٹریٹ پر مبنی ایک کتاب اسکیچ کی ہے۔ اس کتاب کا مجموعہ ڈرائنگ چھپوایا جارہا ہے۔ کسی بھٹی میں وہ سب جلوا دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اطلاع بھی تھی کہ اردو بازار کا کوئی دکان دار یہ کتاب سو سو روپے میں فروخت کر رہا ہے۔ فوراً پولیس کو اطلاع دے کر وہ سارا اسٹاک قبضے میں لے لیا جائے۔ میں یہ سنتے ہی خود اردو بازار گئی۔ گل جی کے بنائے ہوئے اسکیچز کی کتاب خریدی اور پھر باقی حکم ناموں پر عمل درآمد کیا۔

گل جی نے بہت سے زعمائے مملکت کے پورٹریٹ بنائے ہیں مگر جس محبت اور شیفتگی سے بھٹو صاحب کے پورٹریٹ بنائے تھے وہ دیکھنے والی چیز ہیں۔ اس کتاب میں جتنے پورٹریٹ تھے ان کے لیے تصاویر خود بھٹو صاحب نے منتخب کی تھیں۔

گل جی خود آگاہ مصور تھے۔ ان کا نتھیا گلی کا گھر بھی بہت خوب صورت تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ جمیل نقش اور ایف ایم حسین کی طرح اپنی تصویریں کیسے فروخت کی جاسکتی ہیں۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں نتھیا گلی میں آیا کرتے تھے اور یہاں کافی کام کرلیا کرتے تھے۔

وہ بلاشبہ ایک بڑے مصور تھے اور ان کے فن پارے سارے پاکستان میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مگر ان کا لیول بہت بلند تھا۔ انہوں نے عام آدمی کے لیے کچھ نہیں کیا۔ جہاں تک ان کی خطاطی کا تعلق ہے تو میں کہوں گی کہ وہ ترکی میں کی گئی خطاطی کی نقل اس طرح کرتے تھے کہ وہ خود ان کی اپنی معلوم ہوتی تھی۔"

☆☆☆

پورٹریٹ بناتے ہوئے میں خطاطی کی طرف چلا

گیا۔ میری ابتدائی تجریدی خطاطی پرانے ماسٹرز سے متاثر تھی اور میں ہر ایک کے انداز سے کام کر سکتا تھا۔ مگر میں نے اس معاملے میں بھی اپنی نئی راہ نکالی۔ ہمارے ہاں اس سلسلے میں زیادہ محنت نہیں ہوئی اور زیادہ تجربات نہیں ہوئے۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں "مغل موزائیک" ماسٹرز سے متاثر ہوں۔ میں سنہرے رنگ یا سونے کا پانی خطاطی یا پینٹنگز میں استعمال کرتا ہوں، کیونکہ یہ ہماری روایت ہے کہ ہم سونے کے پانی سے مسودات لکھتے تھے اور اسے آرائش و زیبائش میں بھی استعمال کرتے تھے۔ آپ اسے "گولڈن اسٹائل" کا نام دے سکتے ہیں۔

آرٹ تو ایک سمندر ہے اور اب تک دنیا میں اتنے آرٹسٹ پیدا ہو چکے ہیں کہ ان کی گنتی دشوار ہے۔ میں نے سب کا کام دیکھا ہے مگر مجھے پکاسو پسند تھا اور روڈن کا آرٹ بہت پسند ہے۔ میرے اندازے کے مطابق انہوں نے اچھا کام کیا ہے۔

بہرحال یہ کہنا غلط ہے کہ ضیاء الحق نے مجھ سے خطاطی کرنے کو کہا تھا اور وہ آرٹ کو غیر اسلامی سمجھتے تھے۔ میں آپ کو بتاؤں نیشنل آرٹ گیلری اسلام آباد میں ادیب محمد سرور کی پینٹنگز کا افتتاح کرتے ہوئے صدر ضیاء الحق نے کہا تھا کہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آرٹ اسلام کے خلاف ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اسلامی خطاطی، اسلامی تعمیر اور موسیقی نے تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

پاکستان میں آرٹ کا ٹیلنٹ ہے مگر لوگ آرٹسٹ کو شو بزنس کا کوئی شعبہ سمجھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ آرٹسٹ کو فلمی ہیرو جیسا ہونا چاہیے۔ اسی لیے ہمارے بیشتر آرٹسٹ فلمی ہیرو تو لگتے ہیں لیکن وہ آرٹسٹ نہیں ہیں۔

جب مجھ سے پوچھا گیا کہ مسلم آرٹسٹ اور مغربی آرٹسٹ میں سے کون بہتر ہے تو میں نے کہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ مسلم آرٹ اور آرٹسٹ مغربی آرٹسٹوں سے ہر لحاظ سے بہتر اور اعلیٰ ہیں۔ مگر ہم اپنے فن کاروں کی قدر نہیں کرتے۔ نصرت فتح علی خان نے کیسا کمال حاصل کیا ہے۔ جب وہ مغرب میں گیا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ مگر ہم نے اس کی قدر نہیں کی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو امیر نہ سہی لیکن غریب بہرحال مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ سر آغا خان کی پینٹنگ پر میں نے بہت محنت کی ہے اور سب لوگوں نے اس کی تعریف کی ہے۔ میں نے اس میں ایک تجربہ یہ کیا ہے کہ اسے سیکڑوں آڑی ترچھی باریک لکیروں سے بنایا ہے۔

ماہنامہ سرگزشت جولائی 1970ء کی اشاعت میں ہے کہ یہ واحد پینٹنگ ہے گل جی کے فن کا لازوال شاہکار ہے۔ اور اسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ آرٹ کا ماسٹر ہے۔ یہ کریم آغا خان کی تصویر تھی جس میں نے بنائی۔ ان کے ہمارے فیملی تعلقات ہیں۔ میں یہاں آپ کو ایک واقعہ بتاتا ہوں کہ ایک ابن الحقیقی آرٹسٹ ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا بہت بڑا آرٹسٹ تھا۔ … میں اس کا بڑا نام تھا۔ وقت کا بادشاہ اس سے ناراض ہو گیا تو اس نے آرٹسٹ کا ہاتھ کٹوا دیا۔ وہ بائیں ہاتھ سے تصویر بنانے لگا۔ بادشاہ نے بایاں ہاتھ بھی کٹوا دیا۔ وہ پاؤں سے کام کرنے لگا۔ بادشاہ نے جب یہ دیکھا تو اس کے ٹکڑے کروا دیے۔

ہمارے ہاں آرٹسٹوں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے۔

☆☆☆

جب 1993ء میں میری پینٹنگ کی نمائش واشنگٹن میں ہو رہی تھی تو اس میں مشہور آرٹ نقاد ایرک گبسن (Gibson) آیا تھا۔ غالباً اس لیے کہ وہ نمائش ایک … میں ہو رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا تو اس نے ناک سکیڑ کر کہا۔ "مسٹر گل جی! آپ میرے ساتھ نہ رہیں میں پینٹنگز کو خود ہی دیکھوں گا۔" (یقیناً اس کا مطلب یہ تھا کہ جاؤ دفع ہو جاؤ۔ تمہاری ضرورت نہیں ہے)

میں نے کہا کہ وہ میری صرف ایک پینٹنگ میرے ساتھ دیکھ لے۔ اس نے میری درخواست کو رد نہیں کیا اور میری پینٹنگ دیکھی پھر تبصرہ کرتے ہوئے بولا۔ "گل جی! آرٹسٹ وہی سب کچھ کر رہے ہیں جو تم نے کیا ہے لیکن کام کچھ مختلف ہے۔ تم تجربے سے قریب ہو۔"

میرے فن کے بارے میں اس کا تبصرہ واشنگٹن … میں شائع ہوا۔ اس نے لکھا تھا۔ "گل جی اپنے … آغاز پورٹریٹ بنانے سے کیا۔ اس کے بعد وہ خطاطی کی طرف آگیا۔ وہ گزشتہ بیس برس سے تجریدی خطاطی … ہے۔ اس نے اپنی پینٹنگز میں دو روایتوں کو ملا دیا ہے۔ اسلامی خطاطی ہے جو زیبائش اور آرائش کے کام بھی آتی ہے۔ دوسرا اس کا تجریدی پن جس میں ایکسپریشنزم شامل ہے۔ نئی پینٹنگز باوقار اور دل کش ہیں۔"

☆☆☆

جب مجھ سے پوچھا گیا کہ میری خطاطی صادقین کی خطاطی سے کیسے مختلف ہے تو میں نے جواب دیا تھا کہ میری خطاطی کا انداز ان سے مختلف ہے۔ صادقین تو زیادہ تر کلا… تا تھا دن کے دائرے میں ایک اور آیت لکھ دی۔ اگر آیت میں کائنات کا ذکر آیا تو کائنات کے ستارے آگے پیچھے بنا دیے۔ اگر کھجور کا ذکر آیا تو اس پر اپنی مہارت دکھا دی۔ صادقین صاحب اور شاکر علی بہت بڑے پینٹر تھے۔ شاکر علی صاحب کیوبک روایت سے متاثر تھے۔ اور اصل میں یہ سب انگریزوں کی روایت ہیں۔ ایک طرح تو یہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کی روایت لے لو اور اس پر اپنی لیبل لگا دو تاکہ … شاکر علی نے یہی سب کچھ کیا ہے۔ حالانکہ وہ بہت بڑے پینٹر تھے۔ میری خطاطی میں روایت ہے۔ میری روایت مولانا روم والی ہے۔ میں تو اپنی شخصیت بھول کر پرندوں کی سی اڑان لے کر لکھتا ہوں یا پینٹ کرتا ہوں۔ تخلیق اسی طرح سے ہوتی ہے۔

جب مجھ سے پوچھا گیا کہ مجھے استاد اللہ بخش کا کام کیسا لگتا ہے تو میں نے جواب دیا۔ "بہت شاندار۔ جب میں ہندوستان میں تھا تو وہاں شرما کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ اللہ بخش، شرما کا استاد تھا۔ اللہ بخش کے احترام کا یہ عالم تھا کہ … بھی جب اس نمائش کو دیکھنے آتے تھے تو اپنے جوتے باہر ہی اتار دیتے تھے۔

جبکہ ہمارے ہاں یہ حال ہے کہ انہیں کوئی … تھی۔ آپ یہ سن کر حیرت کریں گے کہ ایک فیملی … کی ساری پینٹنگز رکھ لیا کرتی تھی۔

☆☆☆

ساری بڑی عمارتوں پر میرے بنائے ہوئے میورل لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً حبیب بینک پلازہ، امریکن لائف انشورنس کمپنی، پی آئی اے، شاہ فیصل اسپتال، شاہ خالد کالج، … گروپ بلڈنگ (سان فرانسسکو)، ڈیفنس لائبریری …، ڈیفنس کالج (اسلام آباد)، ایوان صدر اسلام آباد کا دروازہ، جس پر سورۂ رحمن لکھی ہے۔ وہ … کا بنا ہوا ہے۔

اس دروازے کو بنانے کا کام کیپٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے … دیا تھا اور … اٹھارہ ماہ میں مکمل کرنا تھا۔ میری مدد کے لیے میرے بھائی صمد اسماعیل اور کراچی کے تین آرٹسٹوں نے … دیا۔ مگر اس کے باوجود وہ دروازہ تین برس میں مکمل … ہو سکا تھا کہ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کتنی بار … ملی تھی۔ میں سوچتا تھا کہیں کوئی غلطی نہ ہو … تین برس کے بجائے اسے مکمل … اگر … بھی لگ جاتیں تو کوئی پروا نہیں۔ میں

☆ اپنی موت سے کچھ روز پہلے گل جی نے قوم کو پیغام دیتے ہوئے کہا تھا۔ "پاکستان کے لوگ خود کو بہتر ثابت کرنے کے لیے محنت کریں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنی انرجی ضائع نہ کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو اصل کام کے لیے ان کے پاس کچھ باقی نہ بچے گا۔ ہم غلط سلط بیانات دے کر آپس میں لڑتے ہیں اور جس کا جو دل چاہتا ہے کرتا چلا جاتا ہے۔"

☆ اس کا کہنا تھا کہ وہ خطاطی اور قرآنی مجسمہ سازی کے بعد گیتا اور گرنتھ صاحب پر بھی خطاطی کرے گا۔ اس لیے کہ سارے مذاہب کی طرح وہ بھی اچھے مذہب ہیں، کیونکہ مذہب کوئی بھی ہو راستی کی طرف لاتا ہے اور سچائی کا پیغام دیتا ہے۔

☆ آرٹ کی مشہور تنقید نگار مارجوری حسین نے گل جی سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک دین کا کیا تصور ہے تو اس نے جواب دیا۔ میرے پاس عبادت کے لیے کوئی (مخصوص) جگہ نہیں ہے۔ اس لیے کوئی چیز مجھے خدا سے دور نہیں کر پاتی ہے۔ میرا خدا تو وہ ہے جو مجھ سے بہت قریب ہے اور میں اسے اپنے بازوؤں میں تھام سکتا ہوں۔ میں تو ایک باطنی صوفی ہوں جو اعلیٰ مدارج پر خدا سے ہم کلام ہوتا ہے۔ جب میں مصوری کرتا ہوں تو عاجزی اور انکسار سے قادر مطلق کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ہوں۔ میرے نزدیک دین کا تصور یہی ہے۔

☆ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ گل جی کو مرغ کا اچار گوشت بہت پسند تھا۔ اس کے علاوہ اسے کھانا پکانا اور کھانا کھلانا بھی پسند تھا۔ جب اس کے گھر پر بہت سے مہمان آ جاتے تھے تو وہ بالکل نہیں گھبراتا تھا اور ان کی تواضع میں لگ جاتا تھا۔

☆ وہ عورت سے دور اور ہوش سے قریب رہتا تھا۔

☆ اس کے جنازے میں اس کے بیٹے امین اور انور مقصود کے سوا کوئی نمایاں مصور یا فن کار شریک نہیں ہوا۔

نے کام تو پرفیکٹ کیا ہے۔
میری بنائی ہوئی قائداعظم کی پینٹنگ کیبنٹ ہال میں لگی ہے۔ جس میں وہ شیروانی پہنے ہیں اور انہوں نے کیپ لگائی ہوئی ہے۔ جب میں اس پینٹنگ کو بنا رہا تھا تو صدر ضیاءالحق کو وہ بہت پسند آئی۔ انہوں نے کہا مکمل کرنے کے بعد اسے ممبران کیبنٹ کے سامنے رکھا جائے گا۔ اگر انہوں نے اسے پاس کر دیا تو پھر اسے ہال میں آویزاں کر دیا جائے گا۔ بعد میں یہ پینٹنگ ہال میں لگا دی گئی، کیونکہ اسے سب نے پسند کیا تھا۔
جب مجھ سے سوال کیا گیا کہ آپ اپنی بات چھوڑ دیجئے۔ یہ بتایئے کہ وطن عزیز میں مصوری اور مصوروں کی صورت حال کیسی ہے؟ تو میں نے جواب دیا تھا۔ پاکستانی مصوروں کو جو مسائل درپیش ہیں وہ کچھ اس طرح سے ہیں:
مصوری کے کلر اور اس کا میٹریل اس قدر مہنگا ہے کہ عام مصور اسے خریدنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ جس میں پینٹ، برش، پوسٹر کلر اور واٹر کلر تک شامل ہیں۔ مصوروں کی پینٹنگ کے لیے کوئی مارکیٹ نہیں ہے۔ حکومت آرٹ کی سرپرستی نہیں کرتی اور آرٹسٹوں کی خدمات حاصل کر کے ان کا کام سرکاری عمارتوں میں نہیں لگاتی۔ آرٹ میٹریل پر ڈیوٹی بھی لگا دی جاتی ہے، جس سے ہر سال میٹریل اور مہنگا ہو جاتا ہے۔ اس بات کا انتظام ہونا چاہیے کہ آرٹ کے میٹریل پر ڈیوٹی عائد نہ کی جائے۔ پھر جب کئی برس کے بعد کوئی آرٹسٹ اپنی پینٹنگ مکمل کر لیتا ہے تو اسے خریدار نہیں ملتا کہ اس کے میٹریل کے پیسے ہی واپس آ جائیں۔ اب ایسے میں آرٹسٹ ذہنی کوفت میں مبتلا نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟
عالم یہ ہے کراچی جیسے بڑے شہر میں اگر 300 مصور ہیں تو سب کے سب کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا پاکستان کی کل آبادی ان کی کفالت نہیں کر سکتی؟ ایسے آرٹسٹ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جو پینٹنگز بنا کر گزر بسر کر رہے ہیں اور اپنا خرچہ اٹھا رہے ہیں۔

☆☆☆

وہ 83 سالہ انسان جسے ظلم و تشدد سے نفرت تھی اور جس نے زندگی بھر محبت تقسیم کی اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ معلوم نہیں وہ کون سے ہاتھ تھے جنہوں نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔
ایک اخباری رپورٹ کے مطابق گل جی، ان کی اہلیہ اور ان کی نوکرانی کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق ان تینوں کو تین روز پہلے ہلاک کیا گیا تھا۔ اس ہلاکت کے بارے میں ان کے صاحب زادے امین گل جی کو سب سے پہلے معلوم ہوا اور انہوں نے پولیس کو اطلاع دی۔ امین کا تین روز پہلے سے اپنے والدین سے رابطہ نہیں تھا اور آپس میں ناراضی چل رہی تھی۔ جب پولیس نے اسے بتایا کہ گل جی دو روز سے موبائل نہیں کر رہے ہیں تو وہ اپنے والد کے رہائشی حصے کی طرف گیا۔ واضح ہو کہ اس مکان کے تین حصے ہیں۔ ایک میں گل جی اور ان کی بیگم، دوسرے میں امین گل جی اور تیسرے میں قائم تھی۔
امین نے دروازے پر مسلسل دستک دی تو کوئی نہیں ملا۔ مجبوراً اس نے پڑوس کے چوکیدار سے کہا گھر میں کود جائے۔ چوکیدار نے ایسا ہی کیا۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا تو امین اندر گئے۔ پھر انہوں نے اپنے والد کی لاش ڈرائنگ روم سے ملحقہ اسٹوڈیو نما کمرے کے فرش پر پڑی دیکھی۔ سر خون میں لتھڑا ہوا تھا اور کچھ خون فرش پر پڑا ہوا تھا جو جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ گل جی کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔
امین کچن کی طرف گیا تو اسے اپنی والدہ زرینہ نظر آئی۔ زرینہ کے ہاتھ پاؤں ایک ٹیپ سے بندھے تھے۔ جبکہ ملازمہ آسیہ بی بی کی لاش اسٹور روم میں ملی۔ ملازمہ کے منہ پر بھی کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ تینوں کی لاشوں سے تعفن اٹھ رہا تھا۔
تفتیش سے معلوم ہوا کہ تینوں کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ گھر کا ملازم، چوکیدار اور ڈرائیور لاپتا ہے۔ گلابی رنگ کی ایک کار بھی غائب تھی۔ اس کے علاوہ کوئی قیمتی چیز غائب نہیں تھی۔
سی آئی اے پی اے کے انیس فاروقی نے بتایا کہ اس بارے میں ابھی کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے کے بعد کوئی نظریہ قائم کیا جاسکے گا۔ رہائش گاہ کے معائنے کے بعد انہوں نے اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ امین گل جی بھی قتل کے سلسلے میں مشتبہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔
دو روز بعد آئی جی کا بیان آیا کہ گل جی کی ہلاکت میں ان کا بیٹا امین ملوث نہیں ہے۔ انہوں نے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ اس نے کسی بھی زاویے سے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

کراچی ٹرام وے

ذکیہ شاہ

کبھی اس شہر قائد کی پہچان ٹرام وے تھی۔ گھنٹی بجاتی، پٹریوں پر دوڑتی، دو ڈبوں کی یہ سواری اب قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ نئی نسل نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ اب تو لوگوں کے ذہنوں سے اس کی تصویر بھی محو ہوتی جارہی ہے۔ ایسی سستی سواری شاید اب کبھی بھی شہر کراچی کی سڑکوں پر نظر نہ آئے جو خود میں تاریخ بھی ہو۔

سیر پاکستان کی ایک اور کڑی، خوش ذوق قارئین کے لیے

ٹرام، ٹرام کار، ٹرالی کار یا اسٹریٹ کار۔ ریل کی پٹری پر چلنے والی ایسی گاڑی کو کہا جاتا ہے جو تعمیر اور وزن کے اعتبار سے عام ٹرینوں سے ہلکی اور قدرے مختلف ہوتی ہے۔ یہ شہروں کے اندر، مضافات یا دو قریبی شہروں یا قصبوں کے درمیان مسافروں اور بہت ہی خصوصی مواقع پر مال کی نقل و حمل کی آمد و رفت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ٹرام کی خصوصیت یہ ہے اس کی پٹری عام طور پر سڑکوں پر ہی بچھائی جاتی ہے۔
سلسلین انٹرا رنز (پولینڈ) اور میلبورن نیٹ ورک (آسٹریلیا) کا دعویٰ ہے کہ ان کا نیٹ ورک دنیا کا سب سے بڑا ٹرام نیٹ ورک ہے۔ 1980ء کی دہائی میں سوویت یونین کے شہر لینن گراڈ (موجودہ سینٹ پیٹرزبرگ) کے ٹرام

کا سسٹم کو دنیا کا سب سے بڑا اور وسیع ٹرام کار سسٹم ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ اسی بنا پر اسے گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں بھی شامل کیا گیا۔ ٹرام کار کے دیگر بڑے بڑے سسٹم یورپ کے شہروں ایمسٹرڈیم، برسلز اور زیورخ کے علاوہ براعظم جنوبی امریکا کے بعض شہروں میں بھی موجود ہیں۔

جب تک ٹراموں کو ٹرالی بسوں (اور بعدازاں بسوں) میں تبدیل کرنے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا اس وقت تک یعنی 1930ء کی دہائی میں لندن نیٹ ورک کا شمار دنیا کے سب سے بڑے ٹرام کار سسٹم میں ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1934ء میں صرف لندن شہر کے ٹرام روٹ کی لمبائی 526 کلومیٹر (327 میل) تھی۔

سلیسین انٹرلوسٹر، پولینڈ میں ٹرام کا وسیع نیٹ ورک ہے۔ یہ 1894ء سے کام کررہا ہے۔ یہ نیٹ ورک تقریباً 50 کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے جبکہ اس کے ذریعے جنوبی پولینڈ کے اپر سلیسیا میٹروپولیٹن ایریا کے تیرہ شہر، قصبے اور ان کے مضافاتی علاقے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔

میلبورن نیٹ ورک کے ٹریک کی لمبائی 249 کلومیٹر ہے۔ اس کے 28 روٹس ہیں جبکہ 499 ٹراموں کے 1813 اسٹاپ ہیں۔ یہ نیٹ ورک 1885ء سے مسلسل کام کررہا ہے۔

ٹرام ویز اور ٹرام کارز (یا امریکی اصطلاح کے مطابق اسٹریٹ ریلوے اور اسٹریٹ کارز) انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا کے مختلف حصوں میں ٹرانسپورٹ کے لیے عام طور پر استعمال ہوتی تھیں لیکن بیسویں صدی کے وسط کے بعد سے یہ بیشتر برطانوی، کینیڈین، فرنچ اور امریکی شہروں سے غائب ہوگئیں۔ تاہم بعض یورپی ملکوں میں ان کا استعمال جاری رہا۔

حیرت انگیز طور پر 1980ء کے بعد ایک بار پھر ٹرامیں، ٹرانسپورٹ کی دنیا میں واپس آگئی ہیں۔ پہلے یہ اعتراض تھا کہ ٹرام سڑک کے بیشتر حصے کو گھیر لیتی ہے اور ٹریفک کے لیے جگہ نہیں بچتی لیکن اب اسی کو ٹرام کے حق اور ٹریفک حادثات کے بچاؤ کا ذریعہ قرار دیا جارہا ہے چنانچہ امریکا، برطانیہ، آئرلینڈ، فرانس اور بہت سے دیگر ملکوں میں ٹرام نئے رنگ روپ کے ساتھ واپس آگئی ہے۔

ٹرام کا شمار اب نسبتاً نئی اصطلاح "لائٹ ریل" کے زمرے میں بھی کیا جارہا ہے کیونکہ اب ٹرامیں بھی شاہراہوں کے علاوہ، زیرزمین سے اوپر آہنی رسوں کی مدد سے چلنا شروع ہوگئی ہیں۔

ٹرام اور ٹرام وے بنیادی طور پر اسکاٹش انگلش کے الفاظ ہیں۔ یہ اسی طرح کے لفظ ہیں جیسے کانوں میں چلنے والی گاڑیوں کو ٹرک اور ان کے را ٹریک کہا جاتا تھا۔

اس کے باوجود کہ ٹرام اور ٹرام وے کے الفاظ زبانوں میں استعمال ہونے لگے لیکن انگریزی کے سے انہیں عالمی پذیرائی نہ مل سکی اور شمالی امریکا والے اس کے بجائے ٹرالی، ٹرالی کار یا اسٹریٹ کے الفاظ استعمال کرتے رہے جبکہ اسٹریٹ کار کی اصطلاح سے پہلے 1860ء میں استعمال کی گئی۔

جب بجلی آئی تو امریکیوں نے اپنی عادت کے برعکس کام کیا (جیسے ہمارے یہاں فریج کا دروازہ الٹے ہاتھ سے کھولا جاتا ہے لیکن وہاں سیدھے ہاتھ سے کہ ہمارے ہاں رائٹ ہینڈ ڈرائیونگ ہے اور ان کے ہاں لیفٹ ہینڈ) اور ٹرالی کار اور بعد میں صرف ٹرالی کا لفظ اپنایا۔ امکان ہے کہ انہوں نے یہ لفظ ٹرالر سے لیا جو چار پہیوں یا بغیر بجلی کے بھی چل سکتا تھا۔

دنیا کی سب سے پہلی ٹرام سوانسی اینڈ ممبلز تھی جسے برطانیہ کے علاقے ساؤتھ ویلز میں چلایا۔ پہلے گھوڑوں سے کھینچی جاتی تھی لیکن بعدازاں اسے اور پھر الیکٹرک ٹرام میں تبدیل کردیا گیا۔ 1804 برطانوی پارلیمنٹ نے سوانسی ریلوے ایکٹ پاس کیا کے تین سال بعد 1807ء میں پہلی پسنجر ریلوے نے کام کا آغاز کیا۔

نیویارک میں ریلوے متعارف کرانے کا سہرا اسٹیفن سن کے سر ہے۔ یہ آئرش نژاد امریکی تھا۔ اور ہارلم ریل روڈ تھا یہ لائن جو بوویری اور فورتھ ایونیو کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ امریکا کی پہلی ریلوے کا آغاز 1832ء میں ہوا۔ 1835ء میں نیو اورلینز میں اس سروس کو شروع کیا گیا جو اب تک چل رہی ہے۔ اسی طرح امریکن سوسائٹی آف مکینیکل انجینئرز کے مطابق مسلسل کام کرنے والا دنیا کا سب سے قدیم ریلوے ہے۔

1883ء میں میگنس وولک نے برائٹن، انگ مشرقی ساحل سمندر کے سامنے دو فٹ چوڑائی کی الیکٹرک ریلوے شروع کی۔ اس دو کلومیٹر طویل 1884ء میں چوڑائی کو دو فٹ نو انچ کردیا گیا۔

سسٹم اب بھی کام کررہا ہے اور اسے دنیا کا سب سے قدیم اور مسلسل چلتے رہنے والے ٹرام وے سسٹم کا اعزاز حاصل ہے۔

برطانیہ میں سب سے پہلی الیکٹرک اسٹریٹ ٹرام وے کا آغاز 29 ستمبر 1885ء کو ہوا۔ اس کا نام بلیک پول ٹرام وے کمپنی تھا، جو اب بھی کام کررہی ہے۔

اسی طرح بوڈاپسٹ میں 1887ء، بلغراد اور بخارسٹ میں 1894ء، اور سراجیوو میں 1895ء میں ٹرامیں شاہراہوں پر دوڑنے لگیں جو اب بھی چل رہی ہیں۔

شروع میں ٹراموں کو گھوڑوں سے کھینچا جاتا تھا لیکن جب اسٹیم انجن متعارف ہوا تو ان کی جگہ اسٹیم ٹرام نے لے لی۔ اور جب بجلی "دریافت" ہوئی تو یورپ اور امریکا میں بجلی سے چلنے والی ٹراموں کو متعارف کرایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لندن، ساؤتھمپٹن، برلن، پیرس، سیول، کیوٹو، ہانگ کانگ اور میلبورن میں ٹرامیں سڑکوں پر چلتی نظر آنے لگیں۔ اسٹیم سے چلنے والی ٹرام 1873ء اور بجلی سے چلنے والی ٹرام 1881ء میں متعارف کرائی گئی۔

بجلی سے چلنے والی ٹرام متعارف کرانے کا سہرا دنیا کی مشہور کمپنی سیمنز کے سر ہے جس نے 1881ء میں پیرس کی انٹرنیشنل الیکٹریسٹی ایگزی بیشن میں اسے نمائش کے لیے پیش کیا۔

امریکی شہر شکاگو میں بیسویں صدی کے وسط میں دنیا کا سب سے بڑا ٹرام وے نیٹ ورک موجود تھا جس کے ٹریکس کی لمبائی 250 میل تھی اور یہ سالانہ 90 کروڑ مسافروں کو آمد و رفت کی سہولت مہیا کرتا تھا لیکن اب یہاں ٹرام کار یا ٹرالی کار نام کی کوئی شے نہیں۔ یہاں آخری اسٹریٹ کار 21 جون 1958ء کو چلائی گئی جس کے بعد یہاں ایلیویٹڈ ٹرین متعارف کرائی گئی۔ شہر کی کئی شاہراہوں پر اب بھی ٹرام کی پٹریاں دکھائی دیتی ہیں لیکن اب ان پر کاریں دوڑتی ہیں یا انسان چلتے ہیں۔

امریکا میں پہلی الیکٹرک ٹرام کامیابی کے ساتھ ورجینیا میں 1888ء میں رچمنڈ یونین پسنجر ریلوے نے چلائی جسے فرینک جے اسپراگ نے تعمیر کیا تھا۔

انگریزوں نے دنیا کے کم و بیش ہر اس حصے میں ٹرام کا تجربہ کیا جو بھی اس کی عمل داری میں شامل تھا۔ یہی حال برصغیر پاک و ہند کے ساتھ بھی رہی جہاں انہوں نے اپنے قیام کے دوران اپنے ملک کی ہر سہولت متعارف کرانے کی کوشش کی۔ برصغیر پاک و ہند میں کلکتہ (موجودہ کولکتہ) کو پہلی ٹرام چلانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 24 فروری 1873ء کو ریل کی آہنی پٹریوں پر سب سے پہلے لوگوں نے گھوڑوں کو ٹرام کھینچتے دیکھا۔ گھوڑوں سے چلنے والی یہ ٹرام [illegible] سے راجا بازار تک چلتی تھی۔ یہ ایک ہی کوچ پر مشتمل تھی لیکن اب اس کی کوئی نشانی بھی موجود نہیں مگر وہاں اب بھی ٹرام سب سے سستی سواری کے طور پر استعمال ہورہی ہے۔ کلکتہ کی پہچان دو سواری کے ذریعے ہے۔ ایک ہاتھ سے کھینچنے والے رکشے اور ٹرام۔

انگریزوں نے ان علاقوں پر جو اب پاکستان میں شامل ہیں۔ پر ایک صدی کے لگ بھگ حکومت کی لیکن وہاں سو سالوں میں یہاں ایسی نشانیاں چھوڑ گئے جو اب بھی اس سرزمین سے ان کے تعلق کی گواہی دیتی ہیں۔ لاتعداد پل، سیکڑوں عمارتیں، دور دور تک نہریں و بیراج، شاہراہیں، سرنگیں اور ایسی ہی کئی تعمیرات اب بھی ملک کے مختلف شہروں میں موجود ہیں جو انگریزوں کی اس سرزمین سے محبت و اپنائیت کی شہادت دیتی ہیں۔

پشاور سے کراچی ریلوے لائن کو ہی لیجیے یا روہڑی سے کوئٹہ اور پھر کوئٹہ کو چمن اور ایران کے شہر زاہدان سے ملانے والی ریلوے لائنوں پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ اگر انگریز اس علاقے میں نہ آتے تو یہ سب بھی ممکن نہ ہوسکتا کیونکہ آزادی کے بعد ہم ان ریلوے لائنوں کی لمبائی میں ایک انچ کا اضافہ کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ بلکہ یہ شرمناک حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ ہمارے بعض بااثر افراد، اپنے ہی شہروں کو جانے والی ریلوے لائن اکھاڑ کر اسکریپ میں بیچنے کے مرتکب ہوئے لیکن ان سے کوئی باز پرس نہ کی گئی۔

دوسری سہولتوں کی طرح انگریزوں نے پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں بھی ٹرام متعارف کرائی جو نہایت کامیابی کے ساتھ مسلسل نوے سال چلتی رہی لیکن بعدازاں ٹرانسپورٹ مافیا کی بھینٹ چڑھ گئی۔ میں نے اپنے بچپن میں خود اپنے والد مرحوم کے ہمراہ اس ٹرام پر سفر کیا ہے۔ میں تب اتنا چھوٹا تھا کہ شاید اپنے اس سفر کی مکمل جزئیات بیان نہ کرسکوں تاہم اتنا یاد ہے کہ میرے والد ان دنوں کیماڑی ریلوے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر تھے اور ہم کراچی کینٹ ریلوے اسٹیشن سے ٹرام کے ذریعے پہلے صدر،

آئے اور پھر وہاں سے دوسری ٹرام پر بیٹھ کر کیماڑی گئے۔ واپسی کے سفر میں بھی ہم نے اسی ٹرام کو استعمال کیا تھا۔

لیکن جو لوگ 1975ء میں اپنی عمر کے اس حصے میں ہوں گے جہاں سب کچھ یاد رکھا جا سکتا ہو تو انہیں یہ ٹرامیں اور ان میں سفر کا حیرت انگیز تجربہ ضرور یاد ہوگا۔ حیرت انگیز کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ ٹرام، میرے ذہن میں ریلوے کی بوگی جیسی تھی اور ٹرین کی ایک بوگی کو یوں سڑک پر دوڑتے دیکھنا مجھے حیرت انگیز ہی لگتا تھا۔ کیونکہ ہمارے دائیں بائیں سائیکلیں، اسکوٹرز، کاریں، بسیں اور دوسری گاڑیاں بھی چل رہی ہوتی تھیں اور ٹرام ان سب کے درمیان اپنی مخصوص پٹری پر پوری رفتار کے ساتھ رواں دواں ہوتی تھی۔ اگر ٹرام کے سامنے کوئی آ جاتا تو ڈرائیور باقاعدہ گھنٹی بجاتا اور ٹرام کے سامنے ریل کی پٹری آناً فاناً خالی ہو جاتی اور ٹرام وہاں سے گزر کر آگے بڑھ جاتی۔

کراچی میں دو مقامات ٹراموں کے لحاظ سے بے حد اہم تھے۔ ان میں سے ایک تو صدر کا علاقہ تھا جسے آپ ٹرام جنکشن کہہ سکتے ہیں کیونکہ جیسے آج ایمپریس مارکیٹ سے شہر کے مختلف علاقوں کو جانے کے لیے بسیں اور منی بسیں مل جاتی ہیں بالکل اسی طرح 1975ء سے پہلے یہیں سے تمام اطراف جانے والی ٹرامیں چلا کرتی تھیں، دوسری جگہ بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) پر موجودہ گل پلازہ اور گارڈن روڈ کا درمیانی علاقہ تھا۔ یہاں ایک چاردیواری ہوا کرتی تھی جس کے اندر باقاعدہ شیڈ بنے ہوئے تھے۔ اسے "ٹرام ڈپو" کہا جا سکتا ہے کیونکہ تمام ٹرامیں اپنے سفر کے اوقات ختم کر کے یہیں آ کر کھڑی ہوتی تھیں، جہاں ان کی مرمت وغیرہ کا کام ہوتا تھا اور یہیں سے اگلی صبح پھر وہ صدر کے لیے روانہ ہوتیں جہاں سے وہ اپنے اپنے متعینہ روٹس کے لیے چل دیتیں۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس وقت کراچی میں ٹراموں کے کل سات روٹ ہوا کرتے تھے جن میں سے چھ مسافروں کی آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتے تھے جبکہ ساتواں صرف مال بردار ٹراموں کے لیے مخصوص تھا (قارئین سے التماس ہے کہ اگر اعداد و شمار میں کوئی غلطی ہو تو وہ ضرور اس کی تصحیح فرما دیں تاکہ میں بھی اپنی درستی کر سکوں)

ٹرام کا کراچی میں سب سے طویل روٹ صدر سے کیماڑی تک تھا۔ سینٹ اینڈریوز چرچ کے سامنے، عبداللہ ہارون روڈ اور شاہراہ لیاقت کا مقام اتصال جسے اب ہم ریگل چوک کہتے ہیں سے کیماڑی کے لیے ٹرام چلا کرتی۔ یہ ٹرام بندر روڈ (موجودہ ایم اے جناح روڈ)، لیکن (جسے ایک کمرشل پلازہ کو راستہ دینے کی غرض سے گرا دیا گیا تھا) اور میری ویدر ٹاور سے ہوتے ہوئے کیماڑی جاتی۔

ٹرام کا دوسرا روٹ صدر سے لارنس روڈ (موجودہ [illegible] روڈ) تک تھا۔

تیسرا روٹ گو بہت چھوٹا تھا لیکن اسے ٹرام سے آمد و رفت میں سہولت پیدا کرنے اور مختلف روٹس کو آپس میں ملانے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ روٹ ریگل چوک سے ایمپریس مارکیٹ تک تھا۔

ٹرام کا چوتھا روٹ گارڈن روڈ سے کراچی ریلوے اسٹیشن تک تھا۔ یہ بندر روڈ پار کرتا ہوا صدر علاقے میں داخل ہوتا تھا اور یہاں سے فریئر روڈ (موجودہ ڈاکٹر داؤد پوتہ روڈ) سے ہوتا ہوا کینٹ اسٹیشن تک جاتا تھا۔ بندر روڈ پر ایک کی شاخ اس روٹ سے جا ملتی کیماڑی تک جاتا تھا۔ یہ پریڈی اسٹریٹ سے بھی گزرتا۔

ٹرام کا پانچواں روٹ صدر سے [illegible] (موجودہ ڈاکٹر ضیاء الدین روڈ) سے ہوتا ہوا سولجر بازار تک جاتا تھا اور یہ روٹ بھی بندر روڈ پر کیماڑی سے ہو جاتا تھا۔

کراچی ٹرام وے کا چھٹا روٹ چاکیواڑہ روڈ تھا اور یہ بھی بندر روڈ روٹ سے منسلک تھا۔

ٹرام کا ساتواں اور آخری روٹ بھی نیٹی جیٹی، میکلوڈ روڈ (موجودہ آئی آئی چندریگر روڈ) تک بچھایا گیا اور یہ گھاس بندر سے سامان کی ترسیل کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

کراچی میں ٹرام چلنے کا آغاز تو 1885ء میں ہوا مگر اس کی منصوبہ بندی 1880ء میں کر لی گئی تھی جبکہ اسے ختم ہوئے 35 سال بیت چکے ہیں لیکن لوگوں کے ذہنوں میں اس کی یادیں اب بھی تازہ ہیں کیونکہ ایک زمانے میں یہ کراچی کے وسطی حصے میں آمد و رفت کا نہایت سہل اور سستا ذریعہ ہوا کرتا تھا۔

کراچی ٹرام وے کی تاریخ 1885ء سے 75 کے پھیلے سالوں پر محیط ہے۔ کراچی کے بہت سے انقلابی منصوبوں کی طرح اس کا سہرا بھی کراچی کارپوریشن کے سابق میونسپل سیکریٹری اور انجینئر اسٹریچن کے سر جاتا ہے۔ اسٹریچن نے ہی سب سے

پہلے کراچی میں ٹرام متعارف کرانے کی تجویز پیش کی بلکہ حکومت برطانیہ کو اس پر آمادہ بھی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر اسٹریچن نے اپنی تجاویز 1880ء میں حکومت کو بھجوائیں۔

اس کے ایک سال بعد یعنی 1881ء میں لندن کے ایڈورڈ میسیوز نے کراچی ٹرام وے نیٹ ورک تعمیر کرنے کا ٹینڈر داخل کیا لیکن اسے تمام سہولتیں فراہم کرنے اور حکومت سے ٹراموں کے لیے اسٹیم کو موٹیو پاور کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت لینے میں مزید دو سال لگ گئے چنانچہ اسے اس کی اجازت 1883ء میں ملی۔ اس نے کراچی ٹرام وے کے ٹریکس کی چوڑائی چار فٹ رکھنے کی تجویز پیش کی تھی۔ حکومت نے اسے بھی منظور کر لیا اور اکتوبر 1884ء میں ٹرام وے کے اصل تعمیراتی کام کا آغاز ہوا۔

ایڈورڈ میسیوز اور اس کی کمپنی کراچی ٹرام وے کی تعمیر میں اس قدر سنجیدہ تھی کہ اس نے محض چھ ماہ کے عرصے میں کراچی ٹرام وے کی مین لائن مکمل کر لی اور 10 اپریل 1885ء کو اسے عوام کے لیے کھول دیا گیا۔

کراچی ٹرام وے کی پہلی لائن نیپیئر مول (موجودہ [illegible]) برج سے کیماڑی تک بچھائی گئی جبکہ اس موقع پر ایک شاندار اور پرتکلف افتتاحی تقریب کا اہتمام بھی کیا گیا جس میں کمشنر سندھ ہنری ایرکسن، کمانڈنگ آفیسر آف سندھ ڈسٹرکٹ بریگیڈیئر جنرل جی ٹک، ان کی صاحب زادی، اسسٹنٹ کمشنر ڈاکٹر بے چوان اور ہز ہائی نس پرنس شیر علی خان، سابق والی قندھار، افغانستان نے اپنے اسٹاف کے ہمراہ شرکت کی۔

ان تمام افراد کو پہلے کیماڑی پہنچایا گیا اور پھر اسٹیم لوکوموٹیو کے ایک کانوائے کی صورت میں ٹرام وے ٹریک کے ذریعے اس مقام تک لے جایا گیا جہاں ٹرام کا افتتاح ہونا تھا۔ نقاب کشائی کا پتھر اسکاچ چرچ پر نصب کیا گیا تھا۔ تقریب کے بعد مہمانوں کی خاطر مدارات کی گئی۔ اس موقع پر اپنی تقریر میں کمشنر سندھ نے انکشاف کیا کہ کراچی ٹرام وے "مغربی ہندوستان کی پہلی ٹرام وے" ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس ٹرام وے کو مسافروں کی آمد و رفت کے علاوہ سامان کی نقل و حمل کے لیے بھی استعمال کیا جائے گا۔

افتتاحی تقریب کے بعد مہمانوں کو اسی انداز میں لوکوموٹیو کے کانوائے کے ذریعے واپس پہنچایا گیا۔

کراچی بندرگاہ ان دنوں چونکہ زیادہ گہری نہیں تھی اس

ابراہیم لودھی | آج | بابر

[illegible] درمیان پانی پت میں فیصلہ کن جنگ ہو رہی تھی۔ ابراہیم لودھی [illegible] طرح کٹ رہا تھا۔ [illegible]

ابراہیم نے جواب دیا۔ "ایک بادشاہ کے لیے میدان سے بھاگ نکلنا [illegible]" [illegible]

[illegible]

لیے فریٹ سروس کے لیے بھی ٹراموں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس زمانے میں جہاز کیماڑی کے علاقے میں لنگرانداز ہوتے تھے اور وہاں سے سامان کو چھوٹی کشتیوں کے ذریعے بیری وہیڈ ریمپ (موجودہ جناح برج یا نیٹی جیٹی کا علاقہ) تک پہنچایا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے میسرز ریلی برادرز، اے میک من اینڈ کمپنی، وولکارٹ برادرز اور بعض دیگر بڑے اداروں کے گوداموں کے علاوہ جیٹی کے ساتھ بھی ٹرام کی لائنیں بچھائی گئیں تاکہ غلہ اور دیگر اجناس کو ویئر ہاؤسز سے براہ راست کشتیوں تک پہنچایا جا سکے۔

یہ گودام اور ویئر ہاؤسز چونکہ میکلوڈ روڈ (موجودہ آئی آئی چندریگر روڈ) پر تھے اس لیے یہاں سے نیٹی جیٹی اور گھاس بندر تک فریٹ ٹرام سروس کا ایک علیحدہ روٹ متعارف کرایا گیا۔

کراچی میں اسٹیم ٹرام وے صرف ایک سال ہی چل سکی اور 1889ء میں اس کی جگہ ایسی ٹرامیں متعارف کرائی گئیں جنہیں گھوڑے کھینچتے تھے۔ کراچی کے شہریوں نے اس تبدیلی پر سکھ کا سانس لیا کیونکہ اسٹیم انجن بہت زیادہ شور پیدا کرتے تھے جس کی وجہ سے رہائشی اور تجارتی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ ماحول پرسکون ہوتا لیکن ہر چند منٹ بعد ایک ٹرام کے گزرنے سے ہر طرف افراتفری مچ جاتی۔ گھوڑوں سے کھینچے جانے والی ٹراموں کے بعد اسٹیم کا رخ صرف ڈپو تک محدود ہو گئیں وہ وہاں شنٹنگ کرتیں اور سڑکوں پر ٹرامیں گھوڑے کھینچتے۔

اسٹیم ٹرام چونکہ کوئلے سے چلتی تھی اس لیے گھوڑوں سے چلنے والی ٹرامیں ان سے کہیں زیادہ سستی ثابت ہوئیں۔

اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کراچی میں چلنے والی ٹرام کارز میں استعمال ہونے والا تمام کوئلہ زرِ کثیر صرف کر کے انگلینڈ سے منگوایا جاتا تھا۔ کراچی سمیت موجودہ سندھ چونکہ ان دنوں بمبئی پریذیڈنسی کے ماتحت تھا اور یہ صورتِ حال 1912ء تک جوں کی توں رہی اس لیے کوئلہ حاصل کرنے کی غرض سے بمبئی کا کوئلہ کراچی آتا تھا اور کراچی میں کوئلے کی مقامی پیداوار نہ ہونے کے سبب ٹراموں کے لیے انگلینڈ کے کوئلے پر انحصار ناگزیر تھا۔

گھوڑوں والی ٹراموں کے راستوں میں پانی کے حوض تعمیر کیے گئے تھے جہاں ان تھکے ماندے گھوڑوں کو پانی پلایا جاتا تھا۔ ان حوضوں کی باقیات ایک عرصے تک صدر اور میکس ڈینسو ہال کے علاقوں میں موجود رہیں لیکن اب یہ تجاوزات و تعمیرات کے باعث ختم ہو چکی ہیں۔

گھوڑوں سے ٹرامیں کھینچے کے آغاز کے فوری بعد اس ٹیم وے نے ترقی کرنا شروع کر دی اور یہ اتنا تیز ہو گیا کہ اس سے پہلے ایسی کوئی مثال نہ ملتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض ٹرام کارز کو لائٹ ریلوے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور ٹرام کارز نے پیٹرول انجن استعمال کرتے ہوئے مسافروں کے ساتھ ساتھ شہر بھر میں سامان کی نقل و حمل بھی شروع کر دی۔

اب کمپنی کا نام بھی تبدیل کر دیا گیا اور کراچی ٹرام وے، ایسٹ انڈیا ٹرام وے کمپنی کہلانے لگی۔ ایسٹ انڈیا ٹرام وے کمپنی کے چیف انجینئر جان برونٹن تھے جن کا نام کم از کم کراچی بلکہ سندھ میں کسی تعارف کا محتاج نہ تھا کیونکہ یہ وہی جان برونٹن تھے جن کی زیرِ نگرانی پاکستان (یعنی وہ علاقے جو اب پاکستان کا حصہ ہیں) کی پہلی ریلوے لائن بچھائی گئی۔ یہ ریلوے لائن کراچی سے کوٹری تک بچھائی گئی تھی۔ کراچی ٹرام وے نیٹ ورک میں استعمال ہونے والے ساز و سامان کی فراہمی کی ذمے داری میسرز بولنگ اینڈ لووی انگلینڈ کے سپرد تھی۔ ٹرام وے میں استعمال ہونے والے ٹریکس یعنی ریل کا وزن اس زمانے میں 70 پونڈ یعنی 32 کلوگرام فی گز تھا۔ ٹرام وے کے انجن میسرز کٹسن اینڈ کمپنی آف لیڈز، انگلینڈ نے فراہم کیے۔ رولنگ اسٹاک بھیجنے کا اسٹاربوک کارپوریٹڈ وکین کمپنی آف برکن ہیڈ، انگلینڈ کی ذمے داری تھی جبکہ تعمیراتی کاموں کے ٹھیکے دار میسرز بیشمور اینڈ کراس فورڈ تھے۔

سامان کی نقل و حمل کے لیے استعمال ہونے والی ٹراموں کا عرصۂ حیات خاصا مختصر ثابت ہوا۔ جب نیپیئر مول برج (موجودہ جناح برج) سے کیماڑی تک باقاعدہ ریلوے کی پٹریاں بچھا دی گئیں تو سٹی اسٹیشن اور میکلوڈ گوداموں میں ٹراموں کی ضرورت ختم ہو گئی۔ اب ریلوے کے ذریعے براہِ راست جیٹی پر پہنچایا اور وہاں لایا جاتا۔ اس لیے ٹرام وے کے اس مختصر روٹ کو ختم کر دیا گیا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ان کی لائی ہوئی یا متعارف کرائی ہوئی ٹرام سروس ہو گئی۔ پاکستانیوں نے اپنی روایتی بے حسی اور غیر ذمے داری کا مظاہرہ کیا اور ٹرام کی سروس اور صفائی ستھرائی کی حالت تیزی سے بگڑتی چلی گئی۔

اویس مغل نے اپنے مضمون میں کراچی کے ایک ماہرِ تعلیم، موسیقار، اسکول پرنسپل اور سماجی کارکن سہراب ایچ جے رستم جی (1912ء سے 2002ء) کے بعض جملے نقل کیے ہیں جو انہوں نے 1952ء میں کہے تھے۔

''کراچی کی ٹرام کارز کا معیار اتنا گر گیا ہے کہ انہیں بند ہو جانا چاہیے کیونکہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ شہر کے ہر حصے میں ایسی صاف ستھری ٹرانسپورٹ سروس ہو جائے جس کے بارے میں ہمیں یقین ہو کہ وہ صد حوالے سے ایسٹ انڈیا ٹرام وے کمپنی جیسی ہو گی۔''

بہرام سہراب ایچ جے رستم جی کے ان سخت کے باوجود لولی لنگڑی کراچی ٹرام وے اگلے تیس سال چلتی رہی اور کراچی کے لاکھوں شہری اس سے مستفید ہوتے رہے۔

کراچی ٹرام وے کی پوری تاریخ 96 سال پر ہے لیکن آج یورپ و امریکا کے جدید شہروں میں خوب صورت ٹرامیں دوڑتی بھاگتی دیکھ کر دل میں ایک حسرت سی ہے کہ کاش ہم اپنی اشیا خصوصاً عوامی استعمال کی حفاظت کرنا سیکھ گئے ہوتے اور ذاتی مفادات کے اجتماعی مفادات کو مقدم رکھتے تو شاید جدید ٹرامیں آج کراچی یا پاکستان کے دیگر شہروں میں رواں دواں ہوتیں۔ پھر یہ سوچ کر اور ایک ٹھنڈی آہ لے کر خاموش ہو جاتا کہ پاکستان، پاکستان میں واقع ہے، یورپ میں تعمیر اپنے کل کی حفاظت آج سے زیادہ کی جاتی ہے۔

بہرحال ان جملہ ہائے معترضہ سے اس ''خدا داد'' میں کچھ نہیں بدلنے والا۔ ہم جیسے تھے، ویسے ہی رہیں گے۔ ہمیں گزرے ہوئے کل سے سروکار ہے نہ محبت اور بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ ہمیں اپنے آنے والے کل کی بھی کوئی پروا نہیں، ایسی صورت میں صرف یہی دعا کی جا سکتی ہے کہ ''اے مولا! ہم پر رحم فرما!''

بہرطور یہ 1879ء کا ذکر ہے جب جان برونٹن نے کراچی کوٹری ریلوے لائن کی تعمیر کے دوران ان پٹڑیوں پر لائن کی مضبوطی کے لیے ٹریک کے اندرونی حصے میں انگریزی حروف ال کی طرح کا ایک چار فٹ چوڑا اضافی ٹریک ڈلوایا۔

گھوڑے کی نعل جیسا بنا ہوا یہ اندرونی ٹریک آج بھی آپ کو تمام ریلوے پٹڑیوں پر نظر آئے گا لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ چار فٹ چوڑائی کا یہی اضافی ٹریک نہ صرف کراچی ٹرام وے کی بنیاد بنا بلکہ اس میں استعمال بھی ہوا۔ جی ہاں کراچی ٹرام وے کے ٹریک کی چوڑائی چار فٹ ہی تھی۔

ٹرام کی تاریخ کو ایک نظر میں دیکھی جائے تو یوں بنتی ہے۔

1881ء میں کراچی میونسپل کارپوریشن کے میونسپل سیکریٹری اور انجینئر جیمز اسٹریچن (جسے جدید کراچی کا بانی بھی کہا جاتا ہے) نے کراچی ٹرام وے کا تصور پیش کیا اور اسی سال لندن کے رہائشی ایڈورڈ ولیمز نے ٹرام وے کی لائنوں کی تعمیر کے لیے ٹینڈر جمع کرا دیے۔

1899ء، 1900ء کے دوران صدر سے لارنس روڈ (موجودہ نشتر روڈ) تک ٹرام کار کے نئے روٹ کا آغاز ہوا اور اسی عرصے میں اسکاٹس کراس (یعنی ریگل چوک) سے بولٹن مارکیٹ تک ٹریک کو توسیع دی گئی لیکن ان دونوں کی تکمیل کی صحیح تاریخیں دستیاب نہیں۔

1902ء میں ایسٹ انڈیا ٹرام وے کمپنی (ای آئی ٹی سی) لمیٹڈ کی از سرِ نو تشکیل کی گئی۔ یہ اس وقت کراچی میں ٹرام وے نیٹ ورک کی مالک تھی۔ جان ایبٹ کو نو تشکیل شدہ کمپنی کا انجینئر ان چیف مقرر کیا گیا۔

1904ء کے لگ بھگ گھوڑوں سے کھینچی جانے والی ٹرامیں متعارف کرائی گئیں جو وزن میں بے حد ہلکی تھیں۔

23 مارچ 1905ء کو کراچی میں پیٹرول سے چلنے والی ٹراموں کا افتتاح ہوا۔

1907ء میں جان ڈکسن کو کراچی ٹرام وے کا انجینئر مقرر کیا گیا۔

1909ء میں گھوڑوں سے چلنے والی ٹرامیں مکمل طور پر ختم کر دی گئیں اور ان کی جگہ پیٹرول ٹرام کارز نے لے لی۔ ان ٹرام کارز میں 46 مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور ان کی رفتار 18 میل فی گھنٹا تھی۔ پیٹرول ٹرام کارز کے لیے تمام پٹڑیاں نئے سرے سے بچھائی گئیں۔

پیٹرول سے چلنے والی پہلی دو ٹرام کارز کو مکمل طور پر انگلینڈ میں ڈیزائن اور تیار کیا گیا اور بعد ازاں انہیں کراچی ٹرام نیٹ ورک میں شامل کیا گیا۔ یہ کاریں جان ایبٹ اور ان کے بیٹے جان ڈکسن ایبٹ نے مشترکہ طور پر ڈیزائن کیں جبکہ انہیں ڈکسن ایبٹ پیٹنٹ گیئر باکس کا نام دیا گیا۔

1911ء میں مین لائن ٹریک کو ڈبل کر دیا گیا چنانچہ صدر سے کیماڑی جانے اور کیماڑی سے صدر آنے والی ٹرام کارز علیحدہ علیحدہ ٹریک استعمال کرنے لگیں۔

30 ستمبر 1911ء کو فریئر اسٹریٹ (موجودہ ڈاکٹر داؤد پوتا روڈ) روٹ کو کھول دیا گیا۔ اس روٹ پر چلنے والی ٹرام کارز کراچی کینٹ ریلوے اسٹیشن تک جاتی تھیں۔

فروری 1912ء میں پیٹرول موٹر کاروں کے آنے کی وجہ سے گھوڑا گاڑی کا استعمال ختم ہو گیا۔

1913ء کے اواخر میں کراچی میں پیٹرول سے چلنے والی ٹرام کارز کی تعداد 37 ہو گئی۔

17 فروری 1916ء کو منسفیلڈ اسٹریٹ (موجودہ سید تاج الدین روڈ) کے راستے سولجر بازار تک ٹرام سروس کا آغاز کیا گیا۔

1928ء میں بولٹن مارکیٹ براستہ پاتھ کی سمت سے لوٹ تک کا آغاز ہوا۔

22 اکتوبر 1928ء کو صدر سے چاکیواڑہ روٹ پر ٹراموں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔

1928ء کے اواخر یا 1929ء کے آغاز میں سولجر بازار روٹ کو منسفیلڈ اسٹریٹ (موجودہ سید تاج الدین روڈ) سے بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) سے ملا دیا گیا۔

1931ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کے لیے سولجر بازار سے مشرق کی جانب ٹرام ٹریک کا عارضی بندوبست کیا گیا لیکن اجلاس ختم ہونے کے بعد ان ٹریکس کو اکھاڑ دیا گیا۔

1945ء میں نئی تیار شدہ ڈیزل ٹرام کارز متعارف کرائی گئی۔ واضح رہے کہ بعض ٹرام کارز 1939ء سے ہی ڈیزل پر چلنا شروع ہو گئی تھیں۔

1949ء میں کراچی ٹرام وے کا مکمل انتظام و انصرام ایسٹ انڈیا ٹرام وے کمپنی لمیٹڈ سے لے کر محمد علی ٹرام وے کمپنی (ایم ٹی سی) کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ کمپنی کراچی کے ایک رہائشی شیخ محمد علی کی ملکیت تھی۔ ایم ٹی سی، کراچی میں ....

ٹراموں کے خاتمے تک اس نیٹ ورک کی مالک رہی۔

30 اپریل 1953ء کو ایم ٹی سی کے کارکنوں کی ہڑتال کے بارے میں ایک خبر "ڈیلی ہندو" میں شائع ہوئی جس کے مطابق پاکستان میں کراچی ٹرام وے کے سیکڑوں کارکنوں نے مالکان کے رویے اور اپنے استحصال کے خلاف احتجاج کے طور پر ہڑتال کردی۔ اخبار کے مطابق سات سو ہڑتالی مزدوروں کو حراست میں لے لیا گیا۔ مزدور رہنماؤں نے دعویٰ کیا کہ صرف 80 کارکن ہڑتال میں شریک ہوئے تھے جبکہ باقی بے گناہ تھے بہرحال پاکستانی دارالحکومت (اس وقت کراچی، پاکستان کا دارالحکومت تھا) میں سبز اور سفید پینٹ والی چند ٹرام کارز چلتی ہوئی دیکھی گئیں۔ پولیس نے ان 800 مزدوروں پر لاٹھی چارج بھی کیا جو ٹرام وے کمپنی کے دفتر کے گیٹ پر دھرنا دیے ہوئے تھے۔

1955ء میں کراچی میں پٹرول سے چلنے والی ٹرام کارز کی تعداد 64 .... تک پہنچ گئی۔ ان 64 ٹراموں کو 94 سے 157 تک کے نمبر الاٹ کیے گئے۔ یہ چار پہیوں والی سنگل ڈیک بیک کراس بنچوں والی کاریں تھیں۔ ان کا وہیل بیس آٹھ فٹ تھا جبکہ یہ 28 فٹ لمبی اور 6 فٹ 8 انچ چوڑی تھیں۔

یہ کاریں 1924ء سے 1948ء کے درمیان تیار کی گئی تھیں اور ان میں پرکنس پی فور ڈیزل انجن اور سمپلیکس (ڈکسن ایبٹ) گیئر باکس نصب تھے۔

145 سے 157 نمبر والی ٹی ڈیزل کاریں تھیں جبکہ باقیوں کو پیٹرول سے ڈیزل کاروں میں تبدیل کیا گیا تھا۔

یہ بھی ایک ریکارڈ ہے کہ انگریز اپنے دور میں ٹرام کارز کی جتنی پٹریاں بچھا گئے تھے ان میں بعد کے اکہتر سالوں کے دوران ایک انچ کا اضافہ بھی نہیں ہوا۔ بالآخر 10 اپریل 1885ء کو اپنے سفر کا آغاز کرنے والی کراچی ٹرام وے 90 سال 20 دن کے بعد 30 اپریل 1975ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کردی گئی۔

1975ء میں ٹرام کارز کی بندش کی وجوہات صدر کے علاقے میں ٹریفک کا رش، ٹراموں کی وجہ سے حادثات میں اضافہ اور پرانی ٹرام کاروں کی ورکشاپ اور مرمت نہ ہونے کو بتایا جاتا ہے لیکن بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ ٹرام کارز کی بندش کی بنیادی وجہ ٹرانسپورٹ مافیا تھا جو اس دور میں جڑ پکڑ رہا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس سستے ترین ذریعہ نقل و حمل پر

کسی ایک فرد یا ادارے کی اجارہ داری ہو۔

ٹرام کار میں سفر بہرحال کراچی کے شہریوں کے لیے ایک دلچسپ اور منفرد تجربہ تھا۔ ہر ٹرام میں ایک رسی تھی جس میں آویزاں گھنٹی سے ڈرائیور کو ٹھہرو یا ٹرام روکنے کا اشارہ دیا جاتا تھا۔

ڈرائیور ٹرام کی انتہائی اگلی نشستوں پر مسافروں کے درمیان کھڑا ہو کر ٹرام آپریٹ کیا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کا ہینڈل ہوتا تھا جسے وہ بریک کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا جبکہ ایکسیلریٹر، بریک وغیرہ اس کے قدموں کے پاس ہوتے تھے۔ گیئر عام طور پر اس کے ہاتھ کی جانب ہوتا جس سے وہ ٹرام کی رفتار کم یا زیادہ کرتا تھا۔

ایک ٹرام کے کئی دروازے ہوتے تھے۔ دروازوں کی تعداد آٹھ ہوا کرتی تھی جن میں سے چار ایک جانب اور چار دوسری جانب ہوتے۔ بعض منچلے ٹرام کو کم رفتار کے حساب سے چلتی ٹرام پر چڑھ جاتے یا اتر جایا کرتے تھے۔

ٹرام میں باقاعدہ ٹکٹ جاری ہوتا تھا جس کے لیے ایک ٹکٹ چیکر ہر نئے آنے والے مسافر پر نظر رکھتا تھا۔ ٹرام کے چاروں جانب فٹ بورڈ ہوتا تھا اور ٹکٹ چیکر عموماً اسی فٹ بورڈ کے ذریعے کبھی ٹرام کے اگلے اور کبھی پچھلے حصے میں پہنچ جایا کرتا تھا۔

ایک ٹرام کار کا وزن تین ٹن کے قریب ہوتا تھا اور ایک گیلن میں آٹھ میل کا فاصلہ طے کرتی تھی۔

ٹرام کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ یہ دونوں اطراف چلائی جا سکتی تھی۔ جس طرف کو جانا ہوتا، ڈرائیور اسی جانب جا کر کھڑا ہوتا۔ ٹرام کو اسٹارٹ کرتا، چند کل پرزے کھینچتا، ٹرام چل پڑتی۔

1980ء کے اواخر تک صدر، سیٹ ایم اے جناح روڈ اور بعض بغلی سڑکوں پر ٹرام کی پٹریاں دکھائی دیتی تھیں لیکن بعدازاں انہیں اکھاڑ لیا گیا یا یہ کارپیٹنگ کے نیچے دب گئیں اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پرانی ٹرام کاریں اور اس کے انفرااسٹرکچر کا کیا ہوا۔ اس کا جواب بھی شاید کسی کے پاس ہو۔

بہرحال کراچی ٹرام وے اب ایک خواب ہو چکی اور دُور دُور تک اس کی بحالی کا کوئی امکان نہیں کیونکہ اس کی تصویروں اور یادوں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا۔

●●

اپنے گھر سے روانہ ہوتے اور اپنی بیوی یا شکیا سے دوبارہ ملاقات کرتے ہوئے میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس سفر میں مجھے نہ صرف حیرت انگیز بلکہ ایک دہشت ناک واقعے کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ میرا نام کوئی شی زو ہے۔ یہ میرا اصلی نام ہے اور میں نے ابھی اپنا پورا نام نہیں لکھا ہے ورنہ نام مزید طوالت اختیار کر جاتا۔ میرے دوست احباب اور کام کے ساتھی مجھے کوئی شی کہتے ہیں۔ میں ایک ماہی گیر ٹرالر پہ کام کرتا ہوں جو جاپان کے شمال میں واقع ٹھنڈے سمندروں میں وہیل کا شکار کرتا ہے۔ شمال کے یہ سمندر ماہی گیروں کے لیے کھلی شکارگاہیں ہیں۔ اکثر ماہی گیر شکار کے دوران ملکی اور بین الاقوامی قانون کی پروا بھی نہیں کرتے۔

زودی گیری نامی یہ ٹرالر خاص طور سے وہیل مچھلی کے شکار کے لیے بنایا گیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم صرف وہیل کا شکار کرتے تھے بلکہ اگر کہیں ہمیں اچھی مچھلیوں کا کوئی جھنڈ نظر آ جاتا تو ہم نیٹ استعمال کرکے اسے بھی شکار کرلیتے تھے۔ بہرحال ہمارا خاص کام وہیل کا شکار کرنا ہی ہے دوسری مچھلیاں تو سمجھ لیں مفت میں ہاتھ آجاتی ہیں۔ جدید ترین کمپیوٹرائز سسٹم سے لیس زودی گیری پر ہاتھ سے کرنے والے کام بہت کم ہیں اور خودکار مشینیں تقریباً سارا کام نمٹا دیتی ہیں۔ ہمارا اصل کام ایک ہی تھا۔ وہیل کا شکار کرنا اور اس کے بعد اسے کاٹ پیٹ کر سردخانے میں محفوظ کرنا۔

لقمہ تر

مریم کے حسن

کبھی کبھی لقمہ تر لقمہ اجل ثابت ہوتا ہے۔ وہ سب شکاری تھے۔ سمندر کے چوڑے سینے پر شکار کھیلتے تھے۔ خشکی اور تری کے سب جانوروں کا شکار کرتے تھے مگر اس دن انہوں نے ایک ایسا شکار کیا جس نے سب کو دنگ کردیا۔ خود اس کی جان بھی جا سکتی تھی مگر بروقت اس کے ساتھی اس کی مدد نہ کرتے تو وہ شکار کے "شکار" کا شکار ہوچکا ہوتا۔

ایک الگ انداز کی شکار کہانی، ذائقہ بدلنے کے لیے تحفہ

شکار کرنے کے بعد اسے طاقت ور کرین کی مدد سے اٹھا کر کشتی کے عرشے پر لایا جاتا تھا اور پھر ہم برقی آریوں سے اس کے ٹکڑے کر کے اپنے مطلب کی چیزیں نکال لیتے تھے اور باقی بچ جانے والا پنجر ایک جگہ کھونٹا کر دیتے تھے۔ یہ پنجر ابھی بندرگاہ پر اپنے راستوں تک جاتا تھا کیونکہ اس سے کئی صنعتی اشیا کی تیاری کے ساتھ پولٹری فیڈ بھی بنائی جاتی تھی۔ بہت کم جسے سمندر کی نظر کیے جاتے تھے جیسے خون یا معدے سے نکلنے والی گندگی اور ان چیزوں کا وزن بھی ٹنوں میں ہوتا ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ وہیل مچھلی سے گوشت حاصل کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اگرچہ ضرورت پڑنے پر وہیل کا گوشت بھی کھایا جا سکتا ہے لیکن یہ بدذائقہ اور چربی سے بھرپور ہوتا ہے پھر پکانے پر بھی اس کی بو ختم نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے وہیل کو کھانے کے لیے شکار نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کے شکار کا اصل مقصد چربی اور کا آئل کا حصول ہے۔ وہیل کا جگر...... آئل کا خزانہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہیل کے جسم سے ٹنوں کے حساب سے چربی نکلتی ہے جو بے شمار صنعتوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس سے دوائیں اور دوسری صحت سے متعلق اشیا بھی بنتی ہیں۔

ایک وہیل جو سرد پانیوں میں رہتی ہے اس کے جسم میں چالیس فیصد تک تیل اور چربی ہو سکتی ہے۔ ایک سو ٹن وزنی وہیل کے جسم میں چربی کی تین فٹ موٹی تہ ہوتی ہے جو اس کی کھال کے نیچے اسے سردی اور ہر قسم کی چوٹ سے محفوظ رکھتی ہے۔ ہاں نر وہیل سے اس کا اسپرم مل جائے تو ہم ماہی گیروں کے مزے ہو جاتے ہیں۔ یہ اسپرم ایک نہایت غلیظ اور گندہ بلکہ مادہ ہوتا ہے۔ ہم ماہی گیر بدبو کے عادی ہوتے ہیں لیکن آپ یقین کریں جب نر وہیل کے جسم سے یہ مادہ نکالا جاتا ہے تو ہم بھی اپنی ناک بند کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ جب یہ اتنا ہی بدبودار اور غلیظ مادہ ہے تو اسے پا کر ہمارے مزے کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ اس مادے سے نکلنے والی خوشبو ہے جسے عنبر کہتے ہیں اور خالص حالت میں اس کا شمار دنیا کی مہنگی ترین خوشبوؤں میں ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک ناقابل یقین بات ہے۔ ایک بدبودار ترین مادے سے دنیا کی مہنگی ترین خوشبو نکالی جاتی ہے۔ لیکن اسے نکالنے کے لیے اسے ریفائن کرنا پڑتا ہے اور ریفائن کرنے کے طریقے دنیا میں صرف چند افراد کو آتے ہیں۔ کبھی سمندر میں آئی ہوئی نر وہیل اپنا اسپرم خود سمندر میں خارج کر دیتی اور یہ پانی سے ہلکا ہونے سے سمندر کی سطح پر تیرنے لگتا ہے۔ جسے یہ عنبر مل جائے گویا لاٹری نکل آتی ہے۔

بڑی وہیل مچھلیوں میں کوئی شکاری نہیں ہوتی جیسے بلو وہیل یا وہیل شارک بلکہ یہ خوردبینی پودے اور کیڑے کھا کر گزارہ کرتی ہیں۔ ان کے منہ میں بہت سے چھلنی نما دانت ہوتے ہیں۔ یہ ایک وقت میں ٹنوں پانی منہ میں بھر لیتی ہیں اور پھر دانت بند کر کے اس پانی کو خارج کرتی ہیں۔ اس طرح پانی میں موجود تمام چیزیں چھلنی کے منہ میں رہ جاتی ہیں اور یہ اسے کھا جاتی ہیں۔ اس طرح خوراک حاصل کرتی ہیں۔ شکاری وہیلوں میں سب سے مشہور کلر وہیل ہے۔ یہ دوسرے جانوروں اور جل کے حیوانات جیسے سیل کا شکار کرتی ہے اور عام طور سے وہاں پائی جاتی ہے جہاں سیل مچھلیاں موجود ہوں۔ اس کے علاوہ یہ چھوٹے آکٹوپس، مچھلی اور دوسری سمندری مخلوق کا شکار بھی کرتی ہے لیکن شارک کے برعکس یہ انسانوں کے لیے خطرناک نہیں ہوتی ہے۔ انسانوں سے کلر وہیل بلکہ تمام ہی اقسام کی وہیل مچھلیوں کا رویہ دوستانہ ہوتا ہے۔ کئی ایسے واقعے سننے میں آتے ہیں جب کسی وہیل نے کسی کی مدد کی ہو۔ یہ ڈولفن کی طرح انسان دوست مخلوق ہے۔

ٹرولر کیری کا کپتان کینی جو ولی ایک دوغلا ہے یعنی اس کا باپ جاپانی لیکن ماں امریکن ہے۔ اپنے عملے کے ساتھ اس کا رویہ نہایت مشفقانہ ہے اور اگر کسی کو تکلیف ہو تو وہ باپ کی طرح فکرمند ہو جاتا ہے وہ ہمیں اور آرام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن جب کام ہو تو اس کا رویہ کسی سخت گیر باس کا ہوتا ہے اور اس وقت ہماری ذرا سی غلطی بھی برداشت نہیں کرتا ہے۔ ٹرولر پر کل چار افراد ہیں۔ اگرچہ دوران سفر تین چار لوگ ہی کام کرتے ہیں لیکن جب شکار کا وقت آتا ہے تو ایک ایک فرد چار کا مصروف ہو جاتا ہے۔ اس وقت ہمیں صحیح معنوں میں کھانے کی فرصت بھی نہیں ملتی ہے۔

میں ٹرولر کے عام عملے میں شامل تھا یعنی میرا خاص کام نہیں تھا اور میں سارے کام کرتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر میں شکار میں استعمال ہونے والا اضافی بارپون چلا لیتا تھا۔ اصل بارپون ماسٹر گورے زوجیر تھا۔ وہ پستہ قد لیکن نہایت مضبوط جسم کا شخص تھا۔ جیسا کہ ایک بارپونر کو ہونا چاہیے۔ ہمارا تعلق شمالی وسطی جاپان کے بحر الکاہل

ساتھ آباد ایک چھوٹے سے قصبے سے ہے۔ یہاں رہنے والے ہر دس میں سے تین افراد ماہی گیر ہیں۔ وہیل کے شکار کا سیزن یوں تو سارے سال چلتا ہے لیکن بہار کے موسم میں ہم وہیل کو شکار کرنے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کے ملاپ کا موسم ہوتا ہے اور ان کی نسل برقرار رکھنے کے لیے اکثر شکاری اس وقت شکار سے گریز کرتے ہیں۔ اسی طرح مادہ وہیل کو شکار نہیں کیا جاتا ہے اور صرف نر کو شکار کرتے ہیں۔

ستمبر میں ہم دو ہفتے کے ٹرپ سے واپس آئے تھے۔ اس سفر میں ہمارے ہاتھ ایک درمیانے درجے کی وہیل بھی تھی لیکن اس کے ساتھ ہم نے خاصی تعداد میں ٹیونا شکار کی تھیں۔ ٹیونا مہنگی مچھلی ہے۔ یوں ہمارا یہ ٹرپ منافع بخش رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے کم سے کم ایک ہفتہ گھر میں رہنے کا موقع ملے گا۔ ایک سال پہلے ہی میری شادی ہوئی تھی۔ یاشیکا میری پڑوسن تھی اور اس سے میری ملاقات سمندر کے بارے میں ایک سیمینار میں ہوئی تھی۔ اب یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ہمیں پہلی ملاقات میں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی تھی لیکن یہ ضرور ہوا تھا کہ اس پہلی ملاقات کے بعد جب میں نے دوبارہ یاشیکا کو کال کی تو وہ مجھ سے ملنے آگئی۔ دوستی ہو گئی۔ چھ مہینے بعد ہم نے شادی کر لی تھی اور اب یاشیکا ماں بننے والی تھی۔ آخری بار جب میں جانے سے پہلے ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ تو تم ہی نئی ہے۔ اسی لیے اس بار میں گھر آتے ہوئے بہت پُرجوش تھا۔

جاپانیوں میں بچے پیدا کرنے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے اور جاپانی دنیا کی ان چند قوموں میں شامل ہو گئے ہیں جو بڑھنے کے بجائے گھٹ رہی ہیں۔ خود میں اپنے ماں باپ کی ایک ہی اولاد ہوں اسی طرح یاشیکا بھی اکلوتی ہے۔ ہم دونوں کو ہی بچوں کی خواہش تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمارے کم سے کم تین بچے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ جب یاشیکا کو ڈاکٹر نے ماں بننے کی خبر سنائی تو ہم دونوں ہی خوش ہو گئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ان دنوں زیادہ سے زیادہ یاشیکا کے پاس رہوں۔ مگر روزگار کی مجبوری تھی۔ مجھے یاشیکا سے دور جانا پڑتا تھا۔ میں پُرامید تھا کہ مجھے ایک ہفتہ چھٹی کا موقع ملے گا لیکن تین دن بعد چارلی نے مجھے کال کی۔

"کوری شی... کل صبح روانگی ہے۔"

"اتنی جلدی۔" میں نے احتجاج کیا۔

"مجبوری ہے بیٹے۔" اس نے جواب دیا۔ "شمال کی طرف وہیل کا ایک بڑا جھنڈ آیا ہوا ہے۔ بلیو وہیل ہے، ہم

دسویں صدی عیسوی کا ایک دعوت نامہ دیکھیے ـــــ یہ دعوت نامہ اسماعیل بن عباد نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ "ہماری رفاقت میں سب احباب موجود ہیں، صرف آپ کی کمی ہے۔ گل نرگس یہ چشم وا اور گل لالہ یہ عارض روشن آپ کے منتظر ہیں۔ لیمو اور نارنگی کے درخت اپنے پھولوں کی خوشبو ہر طرف بکھیر رہے ہیں، پھول ہنس رہے ہیں۔ کلیاں مہک رہی ہیں۔ ضیافت کے سجے ہوئے کمرے کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں اور نقیب آپ کی آمد کا اعلان کرنے کے لیے مستعدی سے ایستادہ ہے۔ آپ کی آمد پر ہم سمجھیں گے کہ گویا ہم جنت میں پہنچ گئے۔ ہم آپ کو اپنے سچے موتیوں کے ہار میں مرکزی دانہ بنا کر پروئیں گے۔"

(احیائے اسلام ... از۔ خدا بخش)

جانتے ہو ایسا موقع سال میں ایک دو بار ہی آتا ہے۔"

میں نے اسے یاشیکا کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے اس کا ذکر کیا تو چارلی نے کہا۔ "میں جانتا ہوں لیکن ابھی تو آغاز ہے اور جب یاشیکا کو تمہاری ضرورت پڑے گی تو میں تمہیں چھٹی دے دوں گا۔"

چارلی کی اس بات نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ واقعی آخری دنوں میں یاشیکا کو میری زیادہ ضرورت پڑتی۔ ابھی تو اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے چارلی سے کہا۔ "ٹھیک ہے میں یاشیکا سے پوچھ کر تمہیں بتاتا ہوں۔"

"پوچھو نہیں اسے بتاؤ۔" چارلی نے زور دے کر کہا۔ "اس بار جانا لازمی ہے۔"

میں نے یاشیکا سے کہا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے تم اپنے کام پر جاؤ۔"

"میں تمہاری وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔"

وہ ہنس دی۔ "مجھے کیا ہوا ہے؟"

"تم ماں بننے والی ہو۔" میں نے احمقانہ انداز میں کہا۔

یاشیکا اس بار زور سے ہنسی تھی۔ "تو یہ کون سی انوکھی بات ہے، ہر عورت ماں بنتی ہے لیکن اس کا شوہر کام چھوڑ کر گھر تو نہیں بیٹھتا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ یاشیکا میرے جانے کا سن کر رونے دھونے لگے گی لیکن اس کا ردعمل بالکل مختلف تھا۔ اس نے کہا۔ "ابھی تو ابتدائی مرحلہ ہے اور میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ پھر میں یونیورسٹی بھی جایا کروں گی تو تم اکیلے گھر میں کیا کرو گے۔ ویسے بھی ابھی ہمیں رقم کی ضرورت ہے۔"

یوں میرے جانے کا فیصلہ ہو گیا۔ دس منٹ بعد میں نے چارلی کو کال بیک کی۔ "میں صبح بندرگاہ پر ملوں گا۔"

قصبے کے ساتھ ایک چھوٹی سے لیکن جدید سہولتوں سے آراستہ بندرگاہ تھی۔ زودی گیری وہیں لنگر انداز ہوتا تھا۔ ستمبر کے آخر میں موسم نہایت سرد ہو جاتا ہے۔ زمین پر تو اس کا اتنا پتا نہیں چلتا ہے لیکن جب ہم کھلے سمندر میں نکلتے ہیں تو شمال کی طرف سے چلنے والی نہایت تیز اور یخ ہوا سے سامنا کرنا پڑتا ہے اوپر سے سمندر کے پانی کا درجہ حرارت تقریباً منفی ہو جاتا ہے۔ میں صبح تیار ہو کر نکلا تو ہوا بہت یخ تھی اور اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہمیں نہایت سرد موسم کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ بندرگاہ پر زودی گیری روانگی کے لیے تیار تھا اور میرے تمام ساتھی بھی وہاں آ چکے تھے۔ چارلی مذہبی رجحانات رکھنے والا شخص تھا۔ اس نے روانگی سے پہلے دیوتاؤں سے دعا کی کہ ہمارا سفر خیر و عافیت سے کٹے اور ہم کامیاب واپس آئیں۔

ہوا کا درجہ حرارت صرف دو سینٹی گریڈ تھا اور ابھی کھلا سمندر دور تھا۔ موسم کی مناسبت سے ہم نے بھاری اور گرم لباس پہن لیے تھے۔ جب سورج کی روشنی نمودار ہوئی تھی تو ہم بندرگاہ سے کوئی دس میل دور نکل آئے تھے۔ کھلے سمندر میں پہنچ کر زودی گیری کا رخ اس طرف موڑ دیا گیا جہاں بلیو وہیل کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔ جاپانی وہیل گیر شکار کی تلاش میں جدید ٹیکنالوجی کا سہارا لیتے ہیں۔ ان میں سیٹلائٹ اور سمندر میں موجود ایسے سینسر ہیں جو مچھلیوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ بلیو وہیل کے جھنڈ کے بارے میں اطلاع سیٹلائٹ سے ملی تھی۔ مصنوعی سیارے نے کیمرے کی مدد سے اس جھنڈ کا پتا چلایا تھا۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی بارہ سو سمندری میل کا سفر کرنا تھا۔ تیس ناٹیکل میل فی گھنٹے کی رفتار سے ہم کوئی چالیس گھنٹے بعد شکار والی جگہ پہنچے۔

زودی گیری میں ہماری رہائش، کھانے پینے اور تفریح کرنے کے بہترین انتظامات تھے۔ ہمارا ڈائننگ روم اور تفریح کا کمرا ایک تھا۔ اس میں ایک بڑا ٹی وی لگا تھا جس پر جاپان کے بہترین چینل دیکھ سکتے تھے۔ اس پر گیم بھی کھیل سکتے تھے۔ بہ وقت ضرورت کھانے کی میز کو کاروز اور طرح کے دوسرے کھیلوں کے لیے استعمال کیا جا تھا۔ رہائش کے لیے کامن روم تھا۔ اس میں سونے کے اوپر تلے بیڈ تھے۔ زودی گیری بڑا ٹرالر تھا۔ اس کی لمبائی پچاس فٹ اور چوڑائی تیس فٹ سے زیادہ تھی۔ لیکن بیشتر حصہ سرد خانے پر مشتمل تھا جس میں شکار کی ہوئی وہیل کے مختلف حصے رکھے جاتے تھے۔ اوپری حصے میں شکار متعلق سامان تھا۔ یعنی وہیل کو شکار کرنا اور پھر اسے سمندر سے کشتی میں لانا۔ زودی گیری کا اپنا وزن چالیس ٹن تھا اور اس پر ساٹھ ٹن تک وزن بار کیا جا سکتا تھا۔ یعنی ٹرالر کا زیادہ سے زیادہ وزن سو ٹن تک ہو سکتا تھا۔ ہم شکار کے لیے ایسی وہیل انتخاب کرتے تھے جس کا وزن بیس ٹن سے زیادہ نہ ہو ورنہ اسے کشتی پر اٹھانا اور سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ بیس ٹن وہیل کی لمبائی تیس سے چالیس فٹ تک ہو سکتی ہے۔

روانگی کے بعد کوئی اور کام نہیں تھا اس لیے ہم آرام کرتے رہے۔ زودی گیری میں انٹرنیٹ کی سہولت تھی اور اپنے موبائل فون کے ذاتی تعاون کی مدد سے یہ نیٹ استعمال کر سکتے تھے۔ مگر اس کا استعمال ایک حد سے زیادہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ٹرالر کے لیے یہ سیٹلائٹ انٹرنیٹ خاصا مہنگا پڑتا تھا اور اس کی ڈاؤن لوڈنگ کے حساب سے ادائیگی کرنا پڑتی تھی اس لیے ہم اسے صرف ای میل کے لیے یا کسی بہت اہم کام کے لیے ہی استعمال کرتے تھے۔ انٹرنیٹ کا اصل مقصد سمندر اور آس پاس کے موسم سے آگاہ رہنا تھا۔ زودی گیری کے کنٹرول روم میں ایک بڑی سی اسکرین پر ہر وقت علاقے کا موسمی نقشہ بنا رہتا تھا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوتا کہ سفر کس طرح کرنا ہے۔ یہاں دکھاتا ہے یا واپسی کا سفر اختیار کرنا ہے۔

میں نے رات کو یاشیکا کو ای میل کی کہ ہم خیریت سے سفر کر رہے ہیں اور اس کی طبیعت کیسی ہے۔ اس نے فوراً جواب دیا کہ اس کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اپنا خیال رکھے۔ یاشیکا نے پوچھا کہ میری واپسی کتنے دن بعد ہوگی۔ جب میں ٹرالر پر آیا تھا تو چارلی نے بتایا تھا کہ ٹرپ ایک ہفتے سے لے کر دس دن تک کا ہے۔ میں نے یاشیکا کو بتا دیا۔ اس نے بھی کہا کہ میں خیال رکھوں۔ اگلے دن ہم نے سفر کے دوران کچھ ٹونا شکار کیں۔ انہیں فشنگ راڈ کی مدد سے بھی شکار کیا جاتا ہے۔ چارلی کی طرف سے اجازت تھی کہ اگر کوئی فشنگ سے شکار کرتا ہے تو یہ شکار اس کا ہوگا اور وہ چاہے تو اسے دے یا گھر لے جائے البتہ ایسے ہر شکار پر چارلی کو اختیار تھا۔

[illegible] میں سو ین ادا کرنے پڑتے تھے۔ یہ رقم ہمارے حصے میں سے کٹ جاتی تھی۔ میں نے دو ٹونا شکار کیں جن کا مجموعی وزن بیاسی کلوگرام تھا۔ اس کے بدلے میں چارلی دو سو ین دیتا تھا اس کے باوجود میں خوش تھا کیونکہ یہی ٹونا قصبے کی مقامی مارکیٹ میں دس ہزار ین سے زیادہ کی بکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں اسے گھر لے جاؤں گا اور آنے والے ایک دو مہینے میں اور یاشیکا ٹونا کے گوشت کے مزے لے سکتے تھے۔ میری کوشش تھی کہ کچھ ٹونا اور شکار کر لوں تاکہ آنے والے سرما میں ہمارے گوشت کی ضرورت پوری ہو جائے۔

دوسری رات کے آغاز کے بعد ہم مطلوبہ جگہ پہنچ گئے تھے۔ چارلی نے بلیو وہیل کی پوزیشن معلوم کرنے کے لیے تازہ تصویروں کی درخواست کی تھی۔ یہ تصویریں بہت جلدی پرانی ہو جاتی تھیں اس لیے ہم بار بار ان کی درخواست بھیجا کرتے تھے۔ وہیل بہت تیزی سے سفر نہیں کرتی ہے یہ ایک دن میں کوئی تیس ناٹیکل میل کا سفر کرتی ہے۔ وہ بھی اگر اسے کہیں دور جانا ہو۔ اگر اسے شکار میسر ہو تو یہ عام طور سے ایک ہی علاقے میں کوئی دس میل کے دائرے میں موجود رہتی ہے۔ جس جگہ وہیل کی موجودگی کی اطلاع تھی یہاں شمال سے آنے والے منجمد پانی کی بحری رو چلتی ہے۔ بحری رو سمندر میں بہنے والے پانی کے دھارے کو کہتے ہیں۔ یہ دھارے گرم اور سرد ہوتے ہیں اور در حقیقت یہی دھارے دنیا کا موسم بناتے ہیں اور دنیا کے حیاتیاتی سائیکل کو برقرار رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے سمندروں کا درجہ حرارت ایک حد سے زیادہ یا کم نہیں ہوتا ہے۔ یہ دھارے بہتے ہیں اور اپنے اندر بہت بڑا غذائی مواد لے کر سفر کرتے ہیں جس سے سمندر کی بہت ساری مخلوق کو غذا ملتی ہے۔ بحیرہ منجمد شمالی سے آنے والے اس دھارے میں کرل اور پلانکٹن نامی چھوٹے اور خوردبینی کیڑے بڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں اور بلیو وہیل یقیناً اسی لیے یہاں موجود تھیں۔ یہ دونوں چیزیں اس کی مرغوب غذا ہیں۔

چارلی نے عملے کو آلات تیار کرنے کا حکم دیا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ میں سرد خانے کی صفائی کرنے لگا۔ یہ خاصا مشکل کام تھا کیونکہ سرد خانے کی مشینیں بند نہیں کی جاتی ہیں اور اندر درجہ حرارت منفی دس ڈگری سینٹی گریڈ سے نیچے ہی ہوتا ہے۔ یہاں ہم زیادہ گرم لباس پہن کر آتے تب اس کے باوجود سردی سے برا حال ہو جاتا ہے۔ میں اور میرے ایک ساتھی نے چار گھنٹے میں سرد خانے

ایام طالب علمی میں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب مونگیری مجددی سے راقم الحروف کے خصوصی تعلقات تھے، شاہ صاحب موصوف کا اگرچہ طالب علمی کا زمانہ تھا مگر وہ جس خاندان کے چشم و چراغ تھے اس کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، نام پڑھ کر ہی ناظرین کرام سمجھ گئے ہوں گے۔ ایک روز میں نے ان سے کہا، شاہ صاحب میرا دل اپنی آنکھوں سے جنات کو دیکھنے کو چاہتا ہے، شاہ صاحب نے جواب دیا، جمعہ کی شب کو دکھائیں گے۔ چنانچہ جمعہ کی شب کو رات کے ایک بجے مجھے جگا کر کہا جاؤ، فلاں مقام پر تمہیں دو شخص اس ہیئت کے ملیں گے مگر تم ان سے کوئی بات نہ کرنا۔ مجھے شوقِ دیدار تھا ہی مجھے پاؤں چل پڑا۔ قریب پہنچ کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دارالعلوم مسجد تک تو میں ان کا ساتھ رہا مگر مسجد میں داخل ہونے کے بعد مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ یہ دونوں جن دراز قد اور سفید پوش تھے، آپس میں باتیں کر رہے تھے مگر میں نہ سمجھ سکا وہ کس زبان میں گفتگو کر رہے ہیں۔

اقتباس: جنات کے پُراسرار حالات از شبیر حسن چشتی

کو مکمل طور پر صاف کر دیا۔ اوپر ہارپون اور گن کی آزمائش کی جا رہی تھی۔ دوسرے آلات کو صاف کر دیا گیا تھا۔ چارلی کی درخواست کے دو گھنٹے بعد ہی سیٹلائٹ سے بلیو وہیل کی تازہ ترین لوکیشن فراہم کر دی گئی تھی۔ یہ خبر سنتے ہی سب میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ شکار کے وقت سب پُرجوش ہو جاتے تھے کیونکہ شکار کا مطلب تھا آمدنی اور آدمی کمانے کے لیے تو ساری جدوجہد کرتا ہے۔ لوکیشن کے مطابق بلیو وہیل کا جھنڈ پہلے والے مقام سے کوئی بیس میل دور مشرق کی طرف چلا گیا تھا۔

چارلی نے زودی گیری کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ تصویروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ بڑا جھنڈ تھا جس میں کوئی چالیس کے قریب چھوٹی بڑی بلیو وہیل تھیں۔ یہ تعجب خیز بات تھی کیونکہ بلیو وہیل جھنڈ کی صورت میں رہتی ہے لیکن اس کا جھنڈ شاذ ہی دس بارہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جھنڈ غیر معمولی تھا۔ ایک تصویر بہت واضح تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ ایک درجن بچے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ کم سے کم ایک درجن مادائیں تھیں اور یقیناً نروں کی تعداد دس

سے کم تھی۔ کیونکہ باقی ماندہ دو وہیلوں میں بھی مادائیں تھیں لیکن وہ ابھی ماں بننے کی عمر کو نہیں پہنچی تھیں۔ اگر جھنڈ میں چار یا پانچ بڑے نر ہوتے تو یہ شکار کا بہت مناسب موقع تھا۔ ان میں سے دو تین بھی ہمارے ہاتھ لگ جاتے تو یہ ٹرپ شاندار بن جاتا۔ یہی سب سوچ کر ہم ماہی گیر پُرجوش ہوتے جا رہے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ جلد از جلد شکار والی جگہ پہنچ جائیں۔

ایک گھنٹے بعد ٹرالر سمندر کی اونچی نیچی لہروں پر ڈولتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا اور مجھے نیک ستول سے سب سے پہلے وہیل کی جھلک دکھائی دی۔ میں نے چلّا کر دوسروں کو اس بارے میں بتایا۔ چارلی پاکٹ روم سے دوربین کی مدد سے وہیلوں کا جائزہ لینے لگا۔ شکار کا انتخاب وہی کرتا تھا۔ اس کے بعد ٹرالر شکار کا پیچھا کرتا تھا اور ہارپون ماسٹر گوسے زوجیرا اپنی نشست پر آ گیا تھا۔ وہ ایک بلند مقام سے ہارپون استعمال کرتا تھا تاکہ اسے وہیل کو نشانہ بنانے میں آسانی رہے۔ اس کے ساتھ دوسرے اور چھوٹے ہارپون کی نشست تھی اگر شکار بچ نکلتا ہوتا تو یہ دوسرا ہارپون بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ عام طور سے ایک وہیل کو شکار کرنے کے لیے اسے دو سے تین ہارپون مارنے پڑتے تھے۔ ہارپون اصل میں نیزوں کو کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں بانس اور دھاتی انی سے بنے ہارپون استعمال کیے جاتے تھے جن کو توپ میں رکھ کر وہیل کو مارا جاتا تھا۔ نیزوں کے ساتھ رسے منسلک ہوتے ہیں جن سے مرنے کے بعد وہیل کو کشتی کی طرف کھینچ لیا جاتا ہے۔

آج کل المونیم سے بنے ہلکے لیکن مضبوط ہارپون استعمال کیے جا رہے ہیں۔ جو وہیل کے جسم میں اتر کر اندر سے مزید کھل جاتے ہیں اور وہیل کسی صورت ان کو اپنے جسم سے نہیں نکال سکتی ہے۔ جب وہ انہیں نکالنے کی جدوجہد کرتی ہے تو یہ اسے اندر سے مزید زخمی کرتے ہیں۔ اس ہارپون کو ایک توپ سے پھینکا جاتا ہے جس میں فائر کرنے کے لیے ہائیڈروجن کیپسول استعمال ہوتے ہیں۔ جب کہ چھوٹا ہارپون اسپرنگ ویپن کی مدد سے پھینکا جاتا ہے۔ چارلی نے ایک بڑی نر وہیل کا انتخاب کیا۔ اس کی لمبائی کوئی پچیس فٹ تھی اور وزن کم سے کم اٹھارہ ٹن تو تھا۔ وہ کوئی نصف کلومیٹر کے فاصلے پر سمندر میں مست خرامی سے تیر رہی تھی۔ جیسے ہی ٹرالر اس وہیل کی طرف بڑھا سب چوکنا ہو گئے تھے۔

شکار کے دوران وہیل کے نزدیک جانا ہمیشہ سے خطرناک کام ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ مشتعل ہو کر ٹرالر یا کشتی کو ٹکر مار دے تو اس کے الٹنے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شکار کے دوران وہیل شدید مزاحمت کرتی ہے اور جب اسے ہارپون لگتا ہے تو یہ بچنے کے لیے گہرے سمندر میں جاتی ہے۔ اس دوران میں رسا مسلسل کھلتا ہے اور اگر رسے کی حد ختم ہو جائے تو کشتی کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور اگر وہیل طاقت ور ہو تو کشتی کو سمندر میں بھی کھینچ سکتی ہے۔ اس لیے ہم ہر وقت محتاط رہتے تھے۔ اگر ایسی کوئی صورتحال پیش آئے تو سب سے پہلے رسہ کاٹنے کو ترجیح دی تھی۔ وہیل عام طور سے دس منٹ تک زیرِ آب رہتی ہے۔ ویسے تو یہ آدھے گھنٹے تک بھی پانی کے اندر رہ سکتی ہے اور سانس لینے باہر آتی ہے لیکن زخمی ہونے کے بعد اور جدوجہد کرتے ہوئے اس کا سانس جلد اکھڑ جاتا ہے اور اسے سانس لینے کے لیے اوپر آنا پڑتا ہے۔ اس وقت اس پر ہارپون سے دوسرا حملہ کیا جاتا ہے۔ چالیس فیصد وہیل مچھلیاں ہارپون کا شکار ہو کر دم توڑ دیتی ہیں اور چالیس فیصد ہی دو ہارپون کھا کر ہار مانتی ہیں۔ صرف بیس فیصد وہیل کو شکار کرنے کے لیے تیسرا ہارپون بھی چلانا پڑتا ہے۔ گوزوجیرو اپنے کام میں ماہر تھا اور اسے شاذ ہی دوسرا ہارپون چلانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔

عام طور سے وہیل کو سو گز کے فاصلے سے ہارپون مارا جاتا ہے۔ یہ فاصلہ کسی قدر محفوظ ہوتا ہے۔ اس سے نزدیک جانا خطرناک ہوتا ہے اور اس سے دور ہونے کی صورت نشانہ اچھا نہیں لگتا ہے اور نیزہ بھی زیادہ گہرائی میں نہیں جاتا ہے جس سے وہیل کو اسے نکالنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس وقت وہیلوں کے جھنڈ کے درمیان پہنچ گیا تھا۔ خطرہ محسوس کرتے ہی مادائیں اپنے بچوں کو لے کر زیرِ آب چلی گئیں۔ زیرِ آب رہ کر وہ ٹرالر سے دور چلی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے اچھا تھا کہ ہم خود بھی ماداؤں اور بچوں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے لیکن بعض اوقات شکار کے دوران انہیں بھی نقصان ہوتا ہے۔ ایک موقع پر ٹرالر کی ٹکر سے وہیل کے دو بچے ہلاک ہو گئے تھے۔

ہارپون چلنے کے موقع پر تمام عملہ اس جگہ سے ہٹ جاتا ہے کیونکہ نیزے کے ساتھ بندھا رسا نہایت تیزی سے کھلتا ہے اور اگر کوئی اس کی زد میں آ جائے تو وہ زخمی بھی ہو سکتا ہے۔ ہم ہیلمٹ اور دوسرے حفاظتی سامان سے لیس تھے۔ ہر قسم کی صورتحال کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ نر وہیل خطرے سے بے نیاز پانی میں ڈوب اور ابھر رہی تھی۔ یہ وہیل کے آرام کرنے کا انداز ہوتا ہے۔ اگرچہ دوسری وہیلوں نے خطرہ محسوس کر لیا تھا لیکن شاید اس وہیل کو اپنی طاقت پر بھروسا تھا۔ ٹرالر اس سے کوئی سو گز دور پہنچ گیا۔

فاصلہ بہت کم ہو گیا تھا۔ چارلی نے واکی ٹاکی پر گوسے سے حملہ کرنے کو کہا۔ وہ پہلے ہی نشست باندھ چکا تھا اور حکم ملتے ہی اس نے ہارپون چلا دیا۔ ایک خوفناک دھماکا ہوا اور المونیم سے بنا ہوا نیزہ آواز سے دوگنی رفتار سے وہیل کے جسم میں سر سے ذرا نیچے اتر گیا۔ یہ وہیل کے جسم کا سب سے نازک مقام ہوتا ہے کیونکہ دل اور دماغ سمیت تمام اہم اعضا اسی جگہ ہوتے ہیں اس لیے وہیل کو ہمیشہ یہیں نشانہ بنایا جاتا ہے۔ نیزہ کھاتے ہی وہیل تیزی سے پانی میں گئی اور ڈرم سے لپٹا رسّا تیزی سے کھلنے لگا تھا۔ رسّا کھلنے کی رفتار بتا رہی تھی کہ وہیل بہت تیزی سے زیرِ آب جا رہی ہے۔ میں نے نیزے کو تقریباً دو گز اس کے جسم میں اترتے دیکھا تھا۔ یہ نہایت کاری زخم تھا اس کے باوجود وہیل کی رفتار حیران کن تھی۔ میں گوزو کے ساتھ ڈرم کے پاس آیا اور کلہاڑی اٹھالی۔ ڈرم میں کوئی ایک کلومیٹر طویل رسّا تھا اگر یہ نوے فیصد تک پانی میں چلا جاتا تو ڈرم میں بندھے رسّے کے آخری سرے کو کلہاڑی سے کاٹ دیا جاتا۔ رسّا نصف کے قریب کھل گیا تھا مگر اس کے کھلنے کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ میرے کان واکی ٹاکی پر مرکوز تھے جیسے ہی چارلی حکم دیتا میں رسّا کاٹ دیتا۔

تین منٹ میں رسّا ستر فیصد کھل چکا تھا۔ "کیپٹن۔" میں نے کہا۔

"ابھی رک جاؤ۔" چارلی نے حکم دیا۔

اسی لمحے رسّا کھلنے کی رفتار میں کمی آئی اور پھر یہ تیزی سے کم ہوتی چلی گئی تھی۔ نوے فیصد پر پہنچ کر رسّا کھلنا بند ہو گیا۔ ہم نے کوئی دس منٹ انتظار کیا لیکن رسّے کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے تناؤ میں بھی کمی نہیں آئی تھی۔ دس منٹ بعد چارلی نے رسّا واپس کھینچنے کا حکم دیا اور ڈرم سے منسلک ہائیڈرولک جیک چلا دیا گیا۔ جو رسّے کو واپس کھینچ رہا تھا اور شدید تناؤ بتا رہا تھا وہیل رسّے سے بندھی ہوئی ہے۔ وہ مر چکی تھی یا بے ہوش ہو گئی تھی اس وجہ سے مزاحمت کے قابل نہیں رہی تھی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہیل سطح پر نمودار ہوئی۔ وہ بے جان اور الٹی ہوئی تھی۔ اس کے زخم سے بے تحاشا خون نکل کر سمندر کو لال کر رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کی بڑی شریان کٹ گئی تھی اور یہی چیز اس کی موت کا سبب بنی۔ وہیل کی مرکزی شریان کوئی سوا انچ قطر کی ہوتی ہے اور اس میں ایک دس سال تک کا بچہ آرام سے تیر سکتا ہے۔

احتیاطاً ٹرالر کے پاس لانے سے پہلے وہیل کے سر میں ناٹ گن سے کئی بلٹ مارے گئے تاکہ موت یقینی ہو جائے۔ اس کے بعد اسے کھینچ کر کشتی کے پاس لایا گیا۔ اس کی دم سے کرین کے رسے منسلک کیے گئے اور اسے آہستہ آہستہ کشتی پر کھینچ لیا گیا۔ کشتی کا جھکاؤ بتا رہا تھا کہ اس کا وزن ہمارے اندازے سے زیادہ تھا۔ شاید وہ بائیس ٹن وزنی تھی۔ یہ مشکل کام والے حصے میں ہوئی تھی۔ اس کے وزن اور جسامت کی وجہ سے چارلی نے فوراً اس کے حصے بخرے کرنے کا حکم دیا۔ ٹرالر روک کر لنگر ڈال دیا تھا اور چارلی سمیت تمام افراد وہیل کاٹنے میں لگ گئے۔ سب سے پہلے ہارپون الگ کیا گیا۔ پھر اس کے دل اور آس پاس کی شریانیں کاٹ دی گئیں تاکہ خون نکل جائے اور وہیل کا وزن کم ہو جائے۔

وہیل کے جسم میں کوئی بارہ فیصد وزن خون کا ہوتا ہے۔ یعنی ایک پچاس ٹن وزنی وہیل کے جسم میں تقریباً پونے پانچ ٹن خون ہوتا ہے۔ اس وہیل کے جسم میں بھی دو ڈھائی ٹن خون یقینی تھا۔ شریانیں کٹتے ہی عرشے پر خون دھاروں کی صورت میں بہہ کر سمندر میں گرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہم تیزی سے اسے کاٹنے لگے۔ وہیل کی چربی بہت تیزی سے خراب ہوتی ہے اور اگر اسے مرنے کے چند گھنٹوں کے اندر سرد خانے میں نہ رکھا جائے تو یہ بدبو دینے لگتی ہے۔ ہم نے

سرگودھا وہ شہر ہے جس نے دنیا کو بہترین کینو دیے ہیں۔ کیلیفورنیا اور فلوریڈا کے سنگتروں کا نام اس لیے ہے کہ ان کے پیچھے دنیا کی مارکیٹنگ سپر پاور کا ہاتھ ہے۔ ورنہ ان میں اس کے علاوہ کوئی خوبی نہیں کہ پوری فصل میں ایک رنگ اور ایک سائز کا پھل اترتا ہے۔ مشینوں پر بنی مصنوعات کی طرح۔

لیکن اگر آپ کو تلاش ہو ایسے موسمی کینو اور مالٹے کی جس کا چھلکا خوشبودار ہو، ہر پھانک رسیلی ہو اور اسے منہ میں رکھتے ہی ذائقوں کی ایک نئی دنیا سے شناسائی ہو تو آپ سرگودھا کی مٹی پر بھروسا کیجیے کہ دنیا میں اس سے بہتر مالٹے اور کینو کہیں اور پیدا نہیں ہوتے۔

سرگودھا کی ایک اور وجۂ شہرت پینسٹھ کی جنگ اور اسکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم کی یادگار ڈاگ فائٹ ہے..... اور دشمن کے تیسرے اور چوتھے جہاز کے گرائے جانے کے درمیانی وقفے میں میری پیدائش بھی۔

اقتباس: چلو از مسعود عالم

خون اور دوسری گندگیوں سے بچنے کے لیے پلاسٹک کے اوور آل پہن رکھے تھے۔ جب تک وہیل کا تمام خون نکلا ہم نے اس کے کئی ٹکڑے کر لیے تھے اور ان ٹکڑوں کو سرد خانے میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ آنے والے پانچ گھنٹے میں وہیل ٹکڑے ہو کر سرد خانے میں جا چکی تھی۔ اس کے آلائش والے حصے آلائش کے لیے مخصوص جگہوں پر رکھ دیے تھے اور بیکار حصے سمندر کی نظر کیے جا چکے تھے۔ صرف دس گھنٹے میں ہم نے کوئی دس ہزار ڈالرز مالیت کی ایک وہیل شکار کر لی تھی۔ اس دوران میں باقی وہیل ہمارے ٹرالرز سے دور چلی گئی تھیں۔

وہیل بنیادی طور پر امن پسند اور دفاعی مزاج رکھنے والا جانور ہے۔ یہ کسی حملے کی صورت میں جوابی کارروائی کی اہلیت کم رکھتا ہے اور اجتماعی دفاع کا وہیلوں میں کوئی تصور نہیں ہے۔ اگر کسی وہیل پر کوئی حملہ کرے تو اسے خود ہی حملہ آور سے نمٹنا پڑتا ہے باقی وہیلیں راہ فرار اختیار کرتی ہیں۔ اس جھنڈ نے بھی کیا تھا اپنے ایک ساتھی کے مرنے پر انہوں نے فرار کی راہ اختیار کی اور کئی میل دور نکل گئی تھیں۔ لیکن ہم سونار کی مدد سے ان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ٹرالر کا سونار اتنا طاقت ور تھا کہ کئی میل دور موجود وہیل کا پتا چلا لیتا تھا۔ سونار بتا رہا تھا کہ وہیلوں کا جھنڈ سات میل مغرب کی طرف جا چکا ہے اور وہ ہم سے مزید دور ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی ہم شکار کی ہوئی وہیل کے بڑے حصوں سے فارغ ہوئے چارلی نے لنگر اٹھا دیا تھا اور ٹرالر وہیلوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ پانچ گھنٹے بعد پریشر سے پانی مار کر عرشہ تک صاف کر دیا گیا تھا اور ہم سب اس کامیاب شکار کا جشن منانے بیٹھے ڈائننگ والے حصے میں جمع تھے۔ لیکن سب نے شراب کے بجائے بیئر پر اکتفا کیا تھا کیونکہ ابھی شکار جاری تھا۔ کسی وقت بھی کوئی دوسری وہیل نشانے پر آ سکتی تھی۔

لیکن وہیلوں کا یہ جھنڈ آنے والے دو دن تک ہم سے آگے رہا۔ جیسے ہی ہم ان کے پاس پہنچتے اور وہ ٹرالر کی موجودگی محسوس کرتے فوراً آگے روانہ ہو جاتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنا رخ مغرب سے جنوب کی طرف کر لیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ فرار کے لیے سرد پانی کا دھارا استعمال کر رہا تھا۔ اس دھارے کی اپنی رفتار دس سے گیارہ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے اور کسی بھی بڑے جسم والے جانور کے لیے اس کے ساتھ تیرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ ہمارے لیے یہ صورت حال تشویشناک تھی کیونکہ ہم ایک حد سے زیادہ وہیلوں کے پیچھے نہیں جا سکتے تھے۔ ٹرالر میں ایندھن کی مقدار محدود تھی اور ہم اگر زیادہ ایندھن استعمال کر لیتے تو واپسی میں مشکل ہوتی۔ دو دن بعد ایسا لگا جیسے وہیلیں ہمیں کسی پاس آنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا تعاقب جاری رکھا تو یہ ہمیں بہت آگے لے جائیں گی اور ہماری واپسی مشکل ہو جائے گی۔

تب چارلی نے ایک حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بین الاقوامی سطح پر ممنوع ہے لیکن ماہی گیر اکثر اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس نے وہیل کی آواز والا ریکارڈ چلا کر اسپیکرز سے خارج ہونے والی یہ آوازیں وہیلیں تقریباً پچاس میل کی دوری سے واضح سن سکتی ہیں۔ آوازوں کو سن کر وہیلیں دھوکا کھا جاتی ہیں اور آواز کی سمت آتی ہیں۔ اس سے پہلے بھی چارلی یہ حربہ استعمال کر چکا تھا اور اکثر کامیابی ملتی ہے اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ ریکارڈر چلایا گیا تو وہیل مچھلیاں رک گئیں اور پھر پلٹ کر ہماری طرف آنے لگیں۔ دو گھنٹے بعد ہم دوبارہ جھنڈ کے قریب تھے اور شکار کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس بار بھی چارلی نے ایک بڑی نر وہیل منتخب کی۔ بھی کوئی ساٹھ فٹ لمبی تھی لیکن وزن میں یہ پچھلی سے زیادہ لگ رہی تھی۔ کیونکہ اس کے جسم کا درمیانی حصہ زیادہ چوڑا تھا۔ گوے زوچ دوبارہ ہارپون استعمال کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ تمام عملہ مستعد تھا لیکن اس بار شکار آسان ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہیل نے شدید مزاحمت کی اور ایک بار تو اس نے جھٹکا مار کر ٹرالر کو تقریباً الٹ دیا تھا۔ اگر پچھلی وہیل کا وزن نہ ہوتا تو اس وقت ہم سمندر میں ہوتے۔ مگر وزنی ہونے کی وجہ سے کشتی الٹنے سے بچ گئی۔ وہیل کو دو بار بیونی مارنے پڑے تھے اور اس نے ایک درجن شاٹ اس کے سر میں مارے تب کہیں جا کر اس نے ہار مانی تھی۔ پچھلی وہیل سے ہمیں اسپرم ہاتھ نہیں آیا تھا لیکن اس وہیل سے ہمیں کوئی چار گیلن اسپرم ہاتھ لگا۔ جنسی لحاظ سے مست دور میں تھی اور شاید اسی وجہ سے طاقت ور ہو رہی تھی۔

اسپرم نے شکار کی خوشی دوبالا کر دی تھی۔ سرد خانہ کوئی ساٹھ فیصد بھر گیا تھا۔ اگر ہم اسی وقت واپس جاتے تو بھی یہ ٹرپ کامیاب شمار ہوتا لیکن ابھی پاس وقت تھا اور یہاں شکار کے لیے خاصی وہیلیں موجود تھیں۔ اس لیے فیصلہ ہوا کہ ہم آنے والے دو دنوں میں مزید آزمائی کریں گے اور ممکن ہے اسی دوران میں ایک دو ہاتھ لگ جائیں۔

دوسرے شکار نے سب کو تھکا دیا تھا اس لیے فیصلہ ہوا کہ فی الحال ایک دن آرام کیا جائے اور اس کے بعد تیسرے شکار کی کوشش کی جائے۔ اگلے دن صبح چارلی نے ہمیں بتایا کہ وہ چار میل کے فاصلے پر ایک بڑی وہیل ہے لیکن وہ بہت سست روی سے تیر رہی ہے جب کہ اس دوران میں باقی جھنڈ اس سے کہیں آگے جا چکا تھا کوئی بیس میل آگے تھا۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ وہیل پیچھے کیوں رہ گئی تھی۔ چارلی نے کہا۔ ”ممکن ہے یہ بیمار ہو اور اس وجہ سے اپنے ساتھیوں کا ساتھ نہ دے پا رہی ہو؟“

”یا پھر کسی وجہ سے زخمی ہو گئی ہو۔“ میں نے کہا۔

”وجہ کچھ بھی ہو مجھے تو یہ ایک آسان شکار نظر آ رہی ہے۔“ گوسے نے کہا۔ ”اگر یہ وہیل ہاتھ آ جاتی ہے تو کل تک ہم واپسی کا سفر شروع کر سکتے ہیں۔“

”ہم سب تھکے ہوئے ہیں۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”ٹھیک ہے لیکن اگر تھوڑی ہمت کر کے شکار جلدی نمٹا لیں تو پھر گھر جا کر آرام کر سکتے ہیں۔“ ایک ساتھی اینڈریو نے کہا۔

کسی قدر بحث کے بعد سب ہی شکار کے لیے راضی ہو گئے تھے۔ ٹرالر کا رخ اس اکیلی وہیل کی طرف کر دیا گیا۔ دھوپ کی جگہ آسمان پر گہرے سیاہ بادل تھے اور بارش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اگر بارش ہو جاتی تو اس میں شکار مشکل ہو جاتا۔ اگرچہ ہم بارش میں بھی شکار کرتے رہے ہیں لیکن وہ بہت مشکل ہوتا ہے جسے شکار کرنا اور کرنے کے بعد سنبھالنا آسان نہیں ہوتا ہے جب کہ یہ سست رو وہیل جسامت میں خاصی بڑی لگ رہی تھی شاید ان دونوں وہیلوں سے بڑی تھی جنہیں ہم شکار کر چکے تھے۔ پندرہ منٹ بعد ٹرالر اس وہیل کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس وقت وہیل سطح آب پر تھی۔ وہ بے حسی کے انداز میں لہروں پر ڈول رہی تھی۔ اگر وہ سیدھی نہ ہوتی اور اس کے سر والے سوراخ سے رہ رہ کر ہوا نہ خارج ہو رہی ہوتی تو ایک نظر میں وہ مردہ ہی لگ رہی تھی۔

چارلی دوربین سے اس کا معائنہ کر رہا تھا اس نے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے یہ بیمار ہے کیونکہ اس کے جسم پر کہیں زخم کے نشان نہیں لگ رہے۔“

”ممکن ہے کسی دوسری وہیل سے لڑائی میں اندرونی چوٹ لگی ہو۔“ گوسے زوچ نے کہا۔ عہدے کے لحاظ سے چارلی کے بعد وہ دوسرے نمبر پر تھا۔

چارلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہیلوں میں لڑائی بہت کم ہوتی ہے اور وہ بھی ملاپ کے موسم میں کسی مادہ کے پیچھے ہوتی ہے۔ عام طور سے اس کی نوبت بھی نہیں آتی ہے کیونکہ مادہ

خود کسی نر کا انتخاب کر لیتی ہے اور اس کے انتخاب پر دوسرے نر کو اعتراض نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے یہ ملاپ کا موسم نہیں ہے۔"

بلیو وہیل بیمار بھی ہوتی ہے لیکن اسے جان لیوا بیماریاں بہت کم ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا کا یہ سب سے بڑا حیوان سب سے طویل عمر بھی رکھتا ہے۔ اگر ایک بلیو وہیل کو شکار نہ کر لیا جائے اور اسے کوئی خطرناک بیماری نہ ہو تو وہ آرام سے سو سال تک زندہ رہتی ہے۔ سمندری حیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ سمندر میں ایسی بلیو وہیل بھی ہیں جو تین سو سال سے زندہ ہیں لیکن اب تک مشاہدے میں ایسی کوئی وہیل نہیں آئی ہے۔ بلیو وہیل عام طور سے پندرہ سے تیس سال کی عمر میں جوان ہو جاتی ہے لیکن یہ ساری عمر بڑھتی رہتی ہے۔ سو سال کی عمر کی بلیو وہیل ساٹھ فٹ سے زیادہ طویل اور کوئی اسی ٹن تک وزنی ہو جاتی ہے۔ اگر اس کی لمبائی سو فٹ ہو جائے تو اس کا وزن سو ٹن سے بڑھ جاتا ہے۔ طوالت میں وہیل شارک بلیو وہیل سے بڑی ہو جاتی ہے لیکن وہ کبھی بھی سو ٹن تک وزنی نہیں ہوتی ہے۔ ماہرین اب تک طے نہیں کر سکے ہیں کہ دونوں میں سے کس کو سب سے بڑا حیوان ہونے کا اعزاز دیا جائے۔ کیونکہ وہیل شارک ایک سو فٹ تک طویل بھی ہو چکی ہے جبکہ بلیو وہیل بھی اتنی طویل نہیں ہوئی ہے۔ دوسری طرف وہیل شارک وزن میں بلیو وہیل کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ دراصل بلیو وہیل سرد سمندر کی وہیل ہے اور وہیل شارک گرم سمندروں کی باسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہیل شارک کو موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے چربی کی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہوتی ہے اور یہی اس کے کم وزن ہونے کی وجہ ہے۔

چارلی نے کئی گھنٹے تک وہیل کا معائنہ کیا اور بالآخر اسے شکار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گوسے زوجر بہت خوش تھا کیونکہ اتنا آسان شکار اس نے آج تک نہیں کیا تھا۔ اس نے ہارپون سنبھالا اور وہیل کی مرکزی شریان کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ دھماکے کے ساتھ تیز دھار وہیل کے جسم میں اتر گیا۔ اس نے معمولی سا جھٹکا لیا اور پہلے کی طرح ساکت ہو گئی۔ زخم سے فوارے کی طرح خون نکلا تھا اور اس سے ثابت ہوا کہ گوسے زوجر کا نشانہ بالکل درست لگا تھا۔ وہ جان لیوا زخم کھانے کے باوجود ساکت تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس میں تڑپنے کی سکت بھی نہ ہو۔ کوئی آدھے گھنٹے تک خون وہیل کے جسم سے فوارے کی صورت میں ابلتا رہا تھا پھر رفتہ رفتہ اس میں کمی آنے لگی۔ پھر خون تقریباً رک گیا۔

ہمارا اندازہ درست تھا، یہ سالانہ وہیل سے زیادہ وزنی تھی اس کی لمبائی چالیس فٹ اور وزن کم سے کم بائیس سے پچیس ٹن تھا۔ اگرچہ اس کے جسم سے خاصا خون نکل چکا تھا اس کے باوجود میرا اندازہ تھا اسے کرنے کے لیے کرین کے ساتھ ہائڈرولک جیک کی مدد حاصل کرنا پڑے گی۔ ہارپون سے لگے رسے کی مدد سے اسے کشتی کے قریب کھینچا گیا۔ پھر اس کی دم سے رسے کو باندھ کر کرین کی مدد سے اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہیل کے وزن کی وجہ سے کرین اسے اٹھانے میں ناکام رہا۔ اس لیے ہائڈرولک جیک کی مدد بھی لی گئی۔ اس کے باوجود بے پناہ وزنی مچھلی کو بہت مشکل سے کشتی پر لادا گیا۔ کا وزن ہمارے اندازوں سے زیادہ تھا اور کشتی اس سے ایک طرف جھک رہی تھی۔ کشتی کے جھکاؤ کو ختم کرنے کے لیے چارلی نے فوری طور پر وہیل کو کاٹنے کا حکم دیا۔ اپنے اوزار لے کر اس پر لگ گئے تھے۔

میرے ذمے وہیل کا درمیانی حصہ آیا تھا اور ہو رہا تھا کہ کشتی کے نچلے حصے میں بہ مشکل سما رہا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کیونکہ عام طور سے وہیل کا جسم متناسب ہوتا ہے جب کہ پیٹ کا یہ حصہ پھولا ہوا تھا۔ میں نے چارلی کو یہ حصہ دکھایا۔ اس نے کہا۔ "ممکن ہے کوئی ایسی چیز کھائی ہو جو اس سے ہضم نہیں ہو پائی ہو اس کی موت اسی وجہ سے واقع ہوئی ہو۔"

"ممکن ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ مجھے عجیب لگ رہا ہے۔"

"جب کاٹو گے تو خود پتا چل جائے گا۔" چارلی نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے ایک بڑے تیز دھار آرے سے وہیل کے جسم کے اس حصے کو کاٹنا شروع کیا۔ چربی والا حصہ کٹا اور آرے کی دھار نے اندر گوشت کے حصے تک رسائی حاصل کی فوراً ہی خون دھاروں کی صورت میں نکلنے لگا تھا لیکن یہ خالص خون نہیں تھا بلکہ اس میں کچھ ملا ہوا تھا اسی وجہ سے یہ بہت پتلا اور ہلکے رنگ کا تھا اور شدید بدبو آ رہی تھی۔ وہیل کے پیٹ کا بڑھا ہوا حصہ ہل رہا تھا جیسے کسی بہت بڑے غبارے میں پانی بھر کر زمین پر رکھ دیا جائے تو وہ ہلتا ہے۔ خون ملا پانی ساتھ ہی اس حصے کا سائز کم ہو رہا تھا۔ شاید وہیل کو اس میں کوئی اندرونی چوٹ آئی تھی اور جریانِ خون ہوا جو اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ میں نے اس حصے کو جو کاٹا اس کے ہلنے کی رفتار مزید بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ اکثر پانی نکل گیا تھا۔ پھر یہ حصہ کیوں ہل رہا تھا؟

میں نے تیز دھار آلے سے کاٹنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اچانک ہی آرے کی نوک کسی سخت چیز سے ٹکرائی اور وہیل کے پیٹ میں جیسے طوفان آ گیا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اندر کوئی چیز بہت تیزی سے حرکت کر رہی ہو۔ پیٹ کا یہ حصہ تقریباً دو میٹر لمبا کٹ چکا تھا۔ میں فکرمند ہو کر پیچھے ہٹا تھا کہ کٹا ہوا حصہ یک دم شق ہوا اور اس سے گوشت کے ٹکڑوں، خون ملے پانی اور غلیظ پیپ جیسی چیز باہر کی طرف ابلی تھی اور یہ اتنی زیادہ مقدار میں تھی کہ میرے پاؤں اس میں ڈوب گئے۔ دھیلے کے زور نے مجھے فرش پر گرا دیا۔ کوئی چیز تیزی سے حرکت کرتی وہیل کے پیٹ سے نکلی۔ وہ مجھ پر گری۔ گندگی اور پیپ میں لتھڑی ہونے کی وجہ سے وہ قابلِ شناخت نہیں تھی۔ لیکن جب وہ مجھ پر آئی اور میں نے پاس سے اسے دیکھا تو خوف سے ساکت رہ گیا۔ یہ ایک شارک تھی اور اس کے خوفناک دانتوں والا منہ میرے سامنے تھا۔ پہلے میں سمجھا کہ شارک مردہ ہے لیکن وہ حرکت کر رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اسے دھکیلنے کی کوشش کی اور میرا ہاتھ اس کے منہ کی طرف گیا۔ شارک نے فوراً میرے ہاتھ پر منہ مارا اور کلائی کے اوپر سے میرا ہاتھ اپنے مہیب جبڑوں میں دبوچ لیا۔ درد نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ میں نے چیخ ماری اور چلا کر اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ اس کے ساتھ ہی میں شارک کے منہ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس کی گرفت بہت سخت تھی اور اس کا دباؤ مستقل بڑھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے اس کے منہ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا تو یہ اسے کاٹ ڈالے گی۔ تیز دھار آلہ میرے پاس ہی پڑا تھا لیکن میں اسے آسانی سے استعمال نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ کئی تندرو ٹائیگر کی شکل کا ہوتا ہے اور اس کے پیچھے تین فٹ لمبا ڈنڈا لگا ہوتا ہے۔ پھر بھی میں نے ہمت کر کے اسے اٹھایا اور شارک کے سر پر مارا۔ اس پر قطعی اثر نہیں ہوا۔

درد سے میرا برا حال تھا اور میں اپنے حواس برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک مجھے اپنے لباس سے بندھے بڑے چاقو کا خیال آیا۔ یہ کسی چھوٹی موٹی چیز کو کاٹنے کے کام آتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ چاقو دائیں طرف بندھا تھا اور شارک نے میرا دایاں بازو ہی پکڑ رکھا تھا۔ میں نے کوشش کی اور بائیں ہاتھ سے چاقو نکالنا چاہا۔ مگر یہ کام بہت مشکل تھا۔ میں چکناہٹ میں اس طرح لتھڑ گیا تھا کہ کروٹ بھی نہیں لے سکتا تھا اور پھسل کر سیدھا ہو جاتا تھا۔ ہاتھ چھڑانے کی جدوجہد کے ساتھ میں چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں

کو مدد کے لیے بھی بلا رہا تھا۔ سب سے پہلے آنے والا گوشت
دیو تھا۔ پہلے تو اسے بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ معاملہ کیا ہے۔
میں اور شارک گندگی اور گوشت کے ٹکڑوں میں اس طرح گتھم
گتھے کہ واضح پتا نہیں چل رہا تھا۔
"کیا ہوا؟"
"شارک۔" میں نے چلا کر کہا۔ "اس نے میرا بازو
پکڑ لیا ہے۔"
"شارک۔" گوشت دیو نے ناقابلِ یقین انداز
میں کہا۔ "یہ بلا کیوں سے آ گئی؟"
"ڈولفن کے پیٹ سے نکلی ہے۔" میں نے کہا اور ہاتھ
چھڑانے کی کوشش جاری رکھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ
شارک کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ میں نے بائیں ہاتھ سے
اس کے سر پر مکے مارے۔ اسی دوران میں گوشت دیو بھی
مدد کو آ گیا۔ اس نے اپنے تیز دھار آلے سے شارک کے سر
پر کئی وار کیے اور پھر اس کے اوپر آ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا
جبڑا کھولنے لگا۔ جیسے ہی گرفت ڈھیلی ہوئی میرا ہاتھ اس کے
منہ سے نکل آیا۔ شارک کے نوکیلے دانتوں نے میری کلائی
و بری طرح زخمی کیا تھا اور خون دھاروں کی صورت میں بہہ
رہا تھا۔ مجھے آزاد کراتے ہی گوشت دیو نے شارک کے سر
پر تیز دھار آلے سے کئی وار کیے اور اس کے سر کو کاٹ کر رکھ
دیا۔ پانی سے باہر آنے کے بعد وہ ویسے ہی ادھ مری ہو رہی
تھی۔ میرے دوسرے ساتھی بھی آ گئے تھے۔ وہ مجھے فوراً اندر
لے گئے اور مجھے طبی امداد دینے لگے۔ انہوں نے میرے بازو
پر اوپر سے باندھ دیا تا کہ خون رک جائے۔ شارک کے
دانتوں نے نسوں اور پٹھوں کو چھلنی کر کے رکھ دیا تھا۔ چوٹی سے
بچنگا بھی منہ کے بیچ کاٹ دی تھی۔

زیادہ خون بہنے سے مجھ پر غشی طاری ہو رہی تھی۔
آدھ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد میرے ساتھی خون روکنے
میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس وقت ہم کھلے سمندر میں ساحل
سے کوئی چار سو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھے۔ چارلی کی کال کے
جواب میں جاپانی کوسٹ گارڈ کے ایک بحری جہاز سے ایک
ہیلی کاپٹر اڑا اور ہمارے ٹرالر کی طرف آیا۔ یہ جہاز خوش قسمتی
سے صرف چالیس کلومیٹرز دور تھا۔ ہیلی کاپٹر پندرہ
منٹ میں آ گیا۔ اس دوران میں میرے ساتھی مجھے ایک
بس اسٹریچر پر لٹا چکے تھے اور ہیلی کاپٹر کے آتے ہی
اس اسٹریچر کو رسی سے باندھ دیا گیا اور ہیلی کاپٹر مجھے لے کر
ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں ہوا میں لٹک رہا تھا لیکن میں
اتنا ہی محفوظ تھا جتنا کہ ہیلی کاپٹر میں ہو سکتا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد

مجھے ساحل پر منتظر ایمبولینس اور طبی عملے کے حوالے کیا گیا۔
ایک ڈاکٹر نے دوران سفر میرے ہاتھ کی ڈریسنگ کی۔
اسپتال پہنچتے ہی مجھے آپریشن روم میں لے جایا گیا۔ جہ
ماہر ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے میرے ہاتھ کی باریک بینی
سے سرجری کی۔ انہوں نے ہڈیاں سیٹ کیں۔ نسوں اور پٹھوں
کو ٹانکوں کی مدد سے جوڑا اور آخر میں اوپر کھال کی گرافٹنگ کی۔
اس وقت مجھے علم نہیں تھا لیکن بعد میں پتا چلا میرے
ہاتھ کی حالت اتنی خراب تھی کہ سرجری کرنے والے ماہرین
کو بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اسے بچا سکیں گے یا نہیں۔ شارک
نے اسے بہت بری طرح چبایا تھا اور اس کے دانتوں کے
زخم میں انفیکشن بھی ہو چکا تھا۔ لیکن مسلسل دیکھ بھال
کوشش کے بعد ڈاکٹر میرا ہاتھ بچانے میں کامیاب ہو گئے
تھے۔ جب سرجری کے بعد مجھے ہوش آیا تو باشی کا میرے
سرہانے موجود تھی اور مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں سرخ
ہو رہی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ خوشی سے چہک اٹھی
تھی۔ تین دن بعد جب ڈاکٹروں کو میرے ہاتھ کی طرف
سے اطمینان ہو گیا تو انہوں نے مجھے گھر جانے کی اجازت
دی۔ اس وقت میرے ہاتھ کی ہڈیاں سیٹ ہو گئی تھیں لیکن
ہونے والی کھال کی گرافٹنگ کا ایک آپریشن ہونا تھا۔
میں گھر پہنچا تو میرے ٹرالر کے ساتھیوں اور دوستوں
نے شاندار طریقے سے میرا استقبال کیا تھا۔ میرا ہاتھ بچ جانے پر
وہ سب بہت خوش تھے۔ اس دوران میں ڈولفن میں شارک
موجودگی کی کہانی میڈیا تک پہنچ گئی تھی۔
میں نے بھی اس بارے میں پڑھا تھا۔ بلیو ڈولفن نے
غلطی سے اس ساحلی شارک کو نگل لیا ہوگا جو نصف مردہ حالت
میں تھا اور یہی شارک اس کی موت کا سبب بن گئی۔
ڈولفن کے معدے میں پہنچ کر اس نے اندر سے کھانا شروع کر
دیا۔ اتنا سازگار اور اتنا آسان گوشت شاید ہی کبھی کسی شارک
کو نصیب ہوا ہو۔ وہ خوب بڑی تھی اور اس نے ڈولفن کو
بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ ڈولفن اندرونی جریان خون
کی وجہ سے مرنے کے قریب تھی جب ہم نے اسے
شکار کر لیا۔ ڈولفن نے یقیناً غلطی سے شارک کو نگلا تھا اور یہ
اس کے لیے تو انتہائی مہلک ثابت ہوا تھا ساتھ ہی اس نے
مجھے بھی مارنے کے لیے دوچار کیا تھا۔
میرا بازو مکمل طور پر ٹھیک ہونے اور پہلے جیسا ہونے
میں پورا سال لگ گیا تھا۔ آج میں پھر ڈولفن گیری
کا کام کر رہا ہوں لیکن جب کوئی ڈولفن شکار کرتے ہیں تو
یقین کر لیتے ہیں کہ اس کے اندر کوئی زندہ شارک تو نہیں ہے۔
●●

فلمی الف لیلہ

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزِ اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہوئی نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آیا۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی صلاحیتوں کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان دردداستاں سرگزشت

قسط 201

2011ء کے پی ٹی وی کی سالگرہ کی تقریب میں سب کی نظریں صرف ایک شخصیت پر مرکوز تھیں اور یہ تھیں
یوں تو بہت لوگ تھے۔ بہت سے اہم چہرے غیر حاضر تھے مگر اداکارہ و ہدایت کارہ شمیم آرا۔ چشم بددور، باوجود شریف کو فرشتوں نے

بابرہ شریف

کسی خاص میٹریل سے بنایا ہے کہ انہیں جب بھی دیکھو یوں لگتا ہے جیسے کل ہی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہی تازگی، شادابی، شوخی، متانت، ویسی ہی شرمیلی سی مسکراہٹ۔ انہیں محفلوں اور تقاریب میں بھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ آج بھی بابرہ شریف کو دیکھ کر بہت سی نوارد ہیروئنیں اور ماڈلز رشک کرتی ہیں اور دعا کرتی ہیں کہ انہیں اللہ بابرہ شریف جیسا سدا بہار کرے۔

بابرہ شریف نے اس تقریب میں ایک رقص بھی پیش کیا، بہت اچھی ڈانسر وہ کبھی بھی نہیں رہیں لیکن ان کے رقص میں بقول جوش ملیح آبادی مرحوم اعضا کی شاعری دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہم تو اس تقریب میں شامل نہیں تھے مگر لوگوں سے سنا اور پھر ٹی وی اسکرین پر بھی بابرہ کو دیکھا تو بہت دل خوش ہوا دل کو بہت کہانیاں یاد آ کے رہ گئیں۔

اب ہمارا یہ حال ہے کہ جب بھی کسی پرانے فن کار کا خیال آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے ایک فلم سی چلنی شروع ہو جاتی ہے۔

بابرہ شریف کو پہلی بار 1970ء میں ہم نے شباب کیرانوی کی مشہور و معروف فلم "انسان اور آدمی" کے سیٹ پر دیکھا تھا۔ اس فلم میں بابرہ کی بڑی بہن فاخرہ کو رول کے لیے کراچی سے بلایا گیا تھا۔ بابرہ بہن کے ساتھ آئی تھیں۔ اس وقت ان کی عمر مشکل سے گیارہ برس ہوگی۔ کم از کم دیکھنے میں یہی لگتا تھا لیکن ان کی دلکشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ گورا رنگ، تیکھا ناک نقشہ، مسکراتے ہوئے لب اور شوخ بڑی آنکھیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے دیکھنے میں بابرہ اپنی عمر سے بڑی نظر آتی تھیں لیکن چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی بابرہ ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ ویسا ہی معصوم چہرہ، مسکراتی ہوئی شریر آنکھیں جن میں وہی بے نیازی۔

اس دن ہم نے بابرہ سے کوئی بات نہیں کی۔ بہن فاخرہ سے البتہ گفتگو ہوئی۔ بابرہ شریف اور ان کا اخلاق، مکمل ملاقات، بے تکلفی اور اپنائیت کے احساس کی وجہ سے فلمی دنیا میں سب سے الگ نظر آتی ہیں۔ بہنوں میں باہمی انسیت اور بے تکلفی بھی بہت زیادہ ہے جو آج تک قائم ہے۔ بابرہ شریف دیکھتے دیکھتے بہت بڑی ہیروئن بن گئیں مگر ان بہنوں کے آپس کے برتاؤ اور محبت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ ایک ایسا گھرانا ہے جس کے اندر قدم رکھتے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے آپ برسوں سے ایک دوسرے سے واقف ہیں اور یہاں آتے رہتے ہیں۔ ان میں بناوٹ، ظاہرداری کا نام و نشان تک نہیں۔۔۔۔ جس سے بے تکلف ہوتی ہیں اس کو بھی غیریت کا احساس نہیں ہونے دیتیں۔ ایک اور خاص بات ان کی خوش مزاجی اور لطیفہ بازی۔ لطیفے بھی فلم والوں کے اور حسب حال۔ فاخرہ کو اداکاروں کی نقل کرنے میں ہمیشہ کمال حاصل رہا ہے۔ ان سے نقل کی فرمائش یہی ہوتی ہے کہ وہ اداکاروں کی نقل تو شادو اور دو بلا ایسے شروع ہو جاتیں جیسے بٹن دبانے سے ٹی وی۔ سب کا ہنسی کے مارے برا حال ہو جاتا ہے۔ فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد لطیفہ کا سلسلہ شروع ہوتا۔ ادھر ادھر کی باتیں، مختلف فلمی [illegible] احوال اور شرکا کی حرکات اور بات چیت کا نقشہ ایسے پیش کیا جاتا کہ سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے لیکن ایک بات کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ ان کے گھر میں دوسروں کی غیبت اور عیب جوئی کبھی نہیں ہوتی۔ مذاق کی بات اور ہے۔

پھر جب بابرہ کو ایک ٹی وی اشتہار میں دیکھا تو معصوم چہرے کے وہ ایک شگفتہ نوجوان لڑکی نظر آئیں۔ اتنی بار ٹی وی کے اشتہاروں میں نمودار ہوئیں کہ فلم والے ان کا نوٹس لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح وہ کراچی سے لاہور آ گئیں اور پھر ان کے خاندان نے لاہور میں رہائش اختیار کر لی۔

بابرہ کو دوسری بار ہم نے سید سلیمان کی فلم "بھیا" کے سیٹ پر دیکھا۔ وہ کچھ بڑی بڑی سی لگ رہی تھیں مگر ساتھ ہی تھا یعنی ان کے چہرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور فلم میں وہ منور ظریف کے ساتھ سیکنڈ ہیروئن کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ اول تو بابرہ شریف فقرہ بازی میں سست تھیں، دوسرے منور ظریف کے سامنے کسی کا بھی ٹھہرنا مشکل تھا۔ وہ جب تک سیٹ پر رہتے تھے چٹکلے چھوڑتے رہتے تھے۔ خود بھی ہنستے تھے، دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ بابرہ کیونکہ نئی نئی فلموں میں آئی تھیں اور بول چال میں ابھی تیز بھی نہیں ہوئی تھیں اس لیے وہی منور ظریف کی فقرہ بازی اور چٹکلوں کا نشانہ بنتی رہی تھیں لیکن بابرہ میں قوت برداشت کی کمی نہیں تھی اس لیے وہ بھی ان کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

ایک بات اور آپ کو بتا دیں کہ فلمی دنیا میں یہ خبر گرم ہو گئی تھی کہ منور ظریف اور بابرہ شریف میں رومان چل رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد جب منور ظریف کو ہارٹ اٹیک ہوا تو یار لوگوں نے مشہور کر دیا کہ بابرہ کیونکہ اب ہیروئن بن گئی تھیں اس لیے انہوں نے منور ظریف کے ساتھ رومان ختم کر دیا ہے اور منور ظریف کی بیماری کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔ حقیقت میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اگر منور ظریف بابرہ کی محبت میں گرفتار ہو بھی گئے تھے تو یہ یکطرفہ محبت تھی۔ بابرہ ہر ایک سے خوش مزاجی سے ہنستی بولتی تھیں۔ ہوسکتا ہے منور ظریف نے اس کا کوئی اور مطلب لے لیا ہو۔

بابرہ سے تو اس سلسلے میں کبھی بات چیت نہیں ہوئی اور یہ ایسی بات بھی نہ تھی کہ خاص طور پر بابرہ سے کی جاتی کیونکہ رویے میں ہم نے ذرہ برابر بھی فرق نہیں دیکھا لیکن منور ظریف سے جب انگلینڈ میں ملاقات ہوئی تو ہم اپنی بیگم کے ساتھ برمنگھم میں عزیز دوست مایہ شاہ کے عقیت میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شاہ جی کنوارے تھے۔ دوست نواز بھی تھے اور سب سے بڑھ کر مہمان نواز تھے۔ انہیں دیکھ کر حاتم طائی کا وہ زمانہ یاد آ جاتا تھا جب حاتم طائی انجان لوگوں کو بھی زبردستی مہمان بنا لیا کرتے تھے۔ وہ پرانے عرب کا زمانہ تھا۔ برمنگھم میں اس طرح کے انجان مسافر ملتے بھی نہیں تھے اس لیے شاہ جی اپنے دوستوں کو گھیر لیا کرتے تھے۔ گھر میں رہنے والے اس کو اپنا گھر سمجھ کر بے تکلفی سے رہا کرتے تھے۔ کھانے پینے کا بندوبست شاہ جی کے ذمے تھا۔

ان دنوں منور ظریف بھی چند دن کے لیے برمنگھم آئے اور ان سے کافی ملاقاتوں کا موقع ملا ان کی وجہ سے کبھی کوئی بوریت محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ صبح آنکھ کھولتے ہی چٹکلے شروع کر دیا کرتے تھے اور گھر میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔

آشا پوسلے

اس شام انہوں نے ہم سے کہا کہ ساتھ والے گھر کے ساتھ جو پب ہے (شراب خانہ) ایسے مخصوص لوگوں کا جو کبھی نہ تو بہکتے ہیں نہ لڑائی جھگڑے کرتے ہیں۔ یہ انگریزوں کی قدیم روایات کا ایک حصہ ہے۔ انگلستان میں بڑا شہر ہو یا چھوٹے سے چھوٹا قصبہ۔ پب کی موجودگی ہر جگہ لازمی ہے) منور ظریف سوٹ بوٹ پہن کر اور فیلٹ ہیٹ لگا کر تیار ہوئے۔ اپنے جسم پر خوشبو کی بوچھار کی اور شاہ جی کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔

بولے "آفاقی صاحب اس وقت آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"تو پھر سمجھ لیجیے کہ آپ کا پروگرام بن گیا۔ آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں۔"

"مگر کہاں؟"

"یہ میں آپ کو منزل پر پہنچ کر بتاؤں گا۔"

ہم نے کہا۔ "دیکھو بھائی اگر کسی کلب یا پارٹی میں جانا ہو تو ہم بالکل تیار نہیں ہیں۔"

"تیار تو آپ ہیں۔"

"بھئی کپڑے بھی تو پہننے پڑیں گے۔"

"معاف کرنا لباس کے بغیر تو آپ اس وقت بھی نہیں ہیں۔ شرٹ پتلون اور سوئٹر پہنے ہوئے ہیں۔ ہم کسی تکلف والی جگہ تو نہیں جا رہے۔"

"تو پھر یہ سوٹ بوٹ اور ہیٹ کس لیے؟"
بولے۔ "انگریزوں پر رعب بھی تو ڈالنا ہے۔"
ہم دونوں چل پڑے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک پب تھا۔ انہوں نے اس طرف کا رخ کیا۔
میں نے کہا۔ "پب میں جائیں گے؟"
"جی ہاں، بہت سکون کی جگہ ہے اور آفاقی صاحب سچ بات بتاؤں اس پب کی "ساقیا" بہت خوب صورت اور خوش مزاج ہے۔ یہ ساری بات میں نے اس لیے کی ہے کہ یہاں تو بوڑھے تھکے ہوئے ٹائپ کے انگریز ہی یہاں آتے ہیں۔"
ہم نے کہا۔ "اچھی خدا حافظ ہم واپس گھر جا رہے ہیں۔"
"کس بات پر ناراض ہو گئے؟"
"ناراض نہیں ہوئے بات یہ ہے کہ ہم پیتے پلاتے نہیں ہیں۔"
کہنے لگا۔ "وعدہ رہا آپ نہ پئیں گے نہ پلائیں گے بس باتیں کریں گے۔ میں نے بھی بیماری کے بعد چھوڑ دی ہے اور کبھی کبھی بیئر پی لیتا ہوں۔"
اس اثنا میں ہم اندر داخل ہو گئے۔ پب میں روشنی بہت کم تھی۔ باہر دھوپ سے آنے کی وجہ سے شروع میں تو تاریکی ہی نظر آئی پھر میزوں کے گرد صوفوں پر بیٹھے ہوئے لوگ نظر آنے لگے۔ کچھ اور آگے بڑھے تو روشنی زیادہ ہو گئی اور ہم نے لکڑی کے بنے ہوئے خم کے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی بار گرل کو دیکھ لیا۔ وہ نصف آستینوں کی سفید شرٹ پہنے ہوئے تھی، باقی لباس کاؤنٹر کے پیچھے چھپ گیا تھا۔
"اس نے نیچے کیا پہن رکھا ہے؟" ہم نے اشتیاق سے پوچھا۔
بولے۔ "فی الحال تو کاؤنٹر چھپا ہوا نظر آتا ہے مگر اس کے پیچھے اس نے اسکرٹ بھی ضرور پہنا ہوگا۔ نیلا اسکرٹ اور سفید شرٹ اس کی یونیفارم ہے۔"
ہم کاؤنٹر کے پاس پہنچے تو لڑکی کی نظر ہم دونوں پر پڑی۔ منور ظریف کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔
"ہیلو ہینڈسم، آئی سی یو ان اے لانگ ٹائم۔"
"نو ... اونلی آفٹر تھری ... مس۔ میٹ ہم۔ ہیئر از مسٹر آفاقی۔ ہی از اے رائٹر اینڈ پروڈیوسر فرام لاہور۔" اس نے مسکرا کر ہمیں بھی ہیلو کہا۔ اچھی شکل کی لڑکی تھی۔ سنہری بال، نیلی آنکھیں، متناسب جسم۔
ہم دونوں کاؤنٹر کے سامنے والے اونچے اونچے اسٹولوں پر بیٹھ گئے۔
"یہاں بیٹھ کر دوسرے لوگ کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں۔" پھر انہوں نے لڑکی سے کہا۔ "سوہنو ... پلا دے ساقیا۔"
لڑکی نے مسکرا کر پوچھا۔ "سیم بیئر باؤل؟"
"یس بیئر کا گولا پیش کیا جائے۔" وہ ایک نصف گلاب نما شیشے کے بڑے سے پیالے میں بیئر ڈالنے لگی پوچھا۔ "اینڈ یور فرینڈ؟" مطلب یہ کہ آپ کا دوست کیا پیئے گا۔
"تو تو یہ بہت شریف آدمی ہیں۔ ایسی چیزوں سے دور رہتے ہیں۔" اس نے وہ بہت بڑا گول پیالہ لا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ہم سے مخاطب ہوئے۔
"سر اچھا نہیں لگتا کہ میں یہ آدھی دنیا جتنا بڑا پیالہ چڑھاؤں اور آپ کچھ نہ پئیں، کوکا کولا ہے۔"
ہم نے کہا۔ "مگر سچ کا کوکا کولا؟"
"انگریزوں میں اب بھی ایک خوبی تو رہ گئی ہے کہ کافر لوگ ملاوٹ نہیں کرتے۔"
"ٹھیک ہے مگر دیکھو منور کوئی گڑبڑ نہ کرنا۔" انہوں نے دونوں کان پکڑ لیے۔
"توبہ کیجیے اگر آپ کو دھوکے سے پلاؤں تو اپنا خو ہوں۔" لڑکی سامنے کھڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی تماشا ہو رہا ہو۔
"او کے۔" منور ظریف اس سے مخاطب ہوئے۔ "جنی، ون گلوب کوکا کولا فار مائی فرینڈ۔"
لڑکی حیران رہ گئی۔ "کوک ان بگ باؤل؟"
"آہو یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں بڑے پیالے میں پیوں اور آفاقی صاحب چھوٹے سے گلاس میں، انڈر اسٹینڈ۔"
"یس سر۔" وہ ہنسی اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک کوک کی بوتل لے آئی۔ بوتل کو اس نے بڑے سے باؤل میں ڈالتے ہوئے ایک بار پھر منور ظریف کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"اوئے نہ ڈر، ڈال دے اوے وچ۔" اس نے بوتل بڑے سے باؤل میں ڈال کر ہمارے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اتنے بڑے شیشے کے پیالے میں کوک کی ایک پوٹ صرف اس کے پیندے میں نظر آ رہی تھی۔ رنگت کی وجہ سے شراب ہی نظر آتی تھی۔ ہم نے پوچھا۔
"یہ لڑکی پنجابی جانتی ہے؟"

ندیم اور سرور بارہ بنکوی ڈھاکا کے فلم اسٹوڈیو ایف ڈی سی کے فلور پر 1967 میں بنے والی فلم "تم میرے ہو" کے سیٹ پر

بولے۔ "میں بات سمجھ گئی ہے۔" ہم نے اپنا پیالہ اٹھایا تو منور ظریف نے ہمارے پیالے سے اپنا پیالہ ٹکراتے ہوئے کہا "چیئرز۔"
ہم نے بھی دستور کے مطابق "چیئرز" کہہ دیا۔
جب ہم کوکا کولا پینے لگے تو انہوں نے کہا۔ "سر ایک بات یاد رکھیے گا اگر آپ کا پیالہ خالی ہوا تو روزی آپ کے کہے بغیر اس میں ایک اور بوتل ڈال دے گی کیونکہ خالی گلاس یا پیالہ لے کر پب میں بیٹھنا گوروں کی روایت کے خلاف ہے۔"
ہم نے بہت آہستہ آہستہ چسکیاں لگا کر کوک پیا مگر پیالہ خالی ہو گیا۔ بار گرل نے ہمارے کہے بغیر اس میں ایک اور کوکا کولا ڈال دیا۔ اتنی دیر میں منور ظریف اپنا قدح نما پیالہ ختم کر چکے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے خالی پیالہ کاؤنٹر پر رکھا روزی نے نہایت پھرتی سے اس کو پھر نصف سے زائد بھر دیا۔
"منور کیا تم اتنی زیادہ پیو گے؟"
"سر یہ تو بیئر ہے۔ اس میں نشہ نہیں ہوتا اس لیے نقصان بھی نہیں ہوتا۔" مگر وہ ذرا ترنگ میں آ گئے تھے۔
ہم نے کہا۔ "دیکھو تمہاری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ ہارٹ اٹیک بھی ہو چکا ہے۔ تمہیں بھرپور احتیاط کرنا چاہیے۔"
منور ظریف کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر چلا گیا۔ کچھ افسردہ سے ہو گئے۔ "آفاقی صاحب بہت کچھ کر لیا ہے میں نے۔ اللہ کی مہربانی سے بہت کچھ ملا ہے۔ وہ بڑا مہربان ہے۔"
"پھر تمہیں کس بات کا غم ہے۔ ہم نے دیکھا کہ تم کچھ ناخوش سے نظر آتے ہو؟"
"ناخوش نہیں ہوں آفاقی صاحب۔ میرا دل خوش نہیں ہے۔" وہ کچھ بجھے بجھے سنجیدہ اور اداس ہو گئے۔
"منور ایک بات بتاؤ کیا تمہیں کسی بات کا غم ہے؟"
"غم سے کون سا دل خالی ہوتا ہے سر۔"
"مگر تم کس بات کا ہے۔ بظاہر تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ مگر تم زندگی سے بیزار کیوں ہو گئے ہو۔ سچ بتاؤ کہیں دل کا معاملہ تو نہیں ہے؟"
"آپ تو کمال کے حکیم ہیں۔" وہ ہنسنے لگے۔ "نبض دیکھے بغیر ہی مرض بتا دیا۔"
"مطلب یہ کہ یہی بات ہے؟"
انہوں نے چاروں طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولے۔ "دل کا معاملہ ہے کوئی دل لگی تھی۔"
"وہ کون ہے جس نے تمہارا دل توڑ دیا ہے؟"

"اس کو پردے میں ہی رہنے دیجئے۔ دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ دل توڑنے والے بھی دل جوڑنے والے بھی۔ دنیا میں سب چلتا ہے سر۔" وہ مزید اداس ہونے لگے تھے۔

ہم نے کہا۔ "بہتر ہے کہ اس کے بعد اب ہم گھر چلیں۔ تم نے دو بڑے پاؤل پی لیے ہیں۔ ہم نے بھی دو بڑے پاؤل خالی کر دیے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا پیا جائے۔"

"وہ حکم کی تعمیل ہوگی۔" انہوں نے پیالہ رکھ دیا۔ "روزی ڈیئر۔" انہوں نے بار گرل کو پکارا وہ تھوڑی دیر بعد آگئی۔ "بل پلیز؟"

اس نے بل سامنے رکھ دیا۔ منور ظریف نے رقم اس طشتری میں ڈال دی۔

"تمہارا انعام بھی اس میں شامل ہے۔"

"تھینک یو۔ گڈ لک۔" وہ مسکرائی۔ ہم دونوں اندھیرے ماحول سے باہر دن کی روشنی میں نکلے تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ چند قدموں کا سفر ہم دونوں نے خاموشی سے طے کیا۔ منور ظریف کسی سوچ میں گم تھے۔ اس کے بعد اس موضوع پر ان سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی لیکن ہمیں احساس تھا کہ وہ اندر ہی اندر کسی غم میں مبتلا ہیں۔ اب غم عشق تھا یا غم روزگار؟ غم روزگار تو ہو نہیں سکتا اس لیے کہ ان دنوں ان پر فلموں کی بارش ہو رہی تھی اور لوگوں کے اصرار پر وہ دن رات کام کرتے تھے تو پھر یہ کون سا غم تھا جو گھن کی طرح انہیں کھائے جا رہا تھا۔

لیکن یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ بابرہ شریف سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بابرہ کے ساتھ انہوں نے بہت کم فلموں میں کام کیا تھا۔ ان کی اور بابرہ کی دنیا الگ الگ تھی۔ بابرہ اردو فلموں میں مصروف تھیں اور وہ بیشتر پنجابی فلموں میں مصروف تھے۔ اصل حقیقت کیا ہے یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

دیکھیے بابرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی لیکن ان باتوں کو جو دماغ میں یا قلم کی نوک پر آجائیں، لکھ دینا ہی بہتر ہے۔

بابرہ شریف کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ ان کے والد کا نام شریف تھا جس کی وجہ سے وہ بابرہ شریف کہلاتی تھیں۔ ہم نے انہیں نہیں دیکھا لیکن ان کی والدہ سے ملاقات ضرور ہوئی تھی۔ وہ بہت ہی سادہ لوح اور معصوم قسم کی خاتون تھیں۔ وہ بیٹیوں اور بیٹے سے بہت پیار کرتی تھیں۔ کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتی تھیں۔ یہاں تک کہ مشورہ تک دینے سے پرہیز کرتی تھیں۔ دراصل وہ گھریلو خاتون تھیں۔ وہ دنیا کے جھگڑوں سے بے نیاز اور بے خبر تھیں البتہ وہ کھانا بہت اچھا اور لذیذ پکاتی تھیں جس کا بابرہ بھی بہت فخر سے ذکر کیا کرتی تھیں۔

بابرہ کو ہم نے دوسری ہیروئنز سے مختلف پایا۔ وہ تو بچپن میں فلمی دنیا کے خارزار میں قدم رکھ چکی تھیں۔ ابتدا میں کبھی کبھار والدہ ان کے ساتھ شوٹنگ پر اسٹوڈیو آیا کرتی تھیں مگر بعد میں وہ تنہا ہی اسٹوڈیو آیا کرتی تھیں۔ دن ہو یا رات وہ اکیلی کار چلاتی ہوئی شوٹنگ پر پہنچ جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے ڈرائیور تک نہیں رکھا تھا۔ اتنی نو عمری میں اس قدر اعتماد کم ہی لڑکیوں میں ہوتا ہے اور فلم کی ہیروئنوں کی والدہ یا دوسرے خبر گیر تو سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتے تھے مگر بابرہ نے اس رسم کو توڑ دیا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ان کی بہنوں اور گھر والوں کو بھی اس بارے میں کوئی فکر نہ تھی۔ یہ بابرہ کی صلاحیتوں اور کردار پر ان کے اعتماد کا نتیجہ تھا۔

بابرہ شریف کو ہم نے شروع سے آخری زمانے تک دیکھا۔ ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ ہر ایک سے بے تکلف نہیں ہوتی تھیں اور ایک فاصلہ درمیان میں رکھتی تھیں۔ جن لوگوں سے وہ بے تکلف تھیں ان کے اظہار میں کوئی پس و پیش نہ تھا۔

ایورنیو اسٹوڈیو کے جنرل منیجر ایم اے خان صاحب سے بھی وہ بہت مانوس تھیں۔ ان کے دفتر میں جا کر بچوں جیسی حرکتیں کیا کرتی تھیں۔ ان کے کاغذات الٹ پلٹ کر دیتی تھیں۔ ان سے عجیب عجیب سوال کرتی تھیں۔ خان صاحب بھی مشفقانہ انداز میں مسکراتے رہتے تھے۔ ان دونوں میں قریباً باپ بیٹی جیسا رشتہ دیکھا جاتا تھا۔ اگر خان صاحب آفس میں نہ ہوتے تو وہ بے تکلفی سے ان کی کرسی پر جا کر بیٹھ جاتیں اور کرسی گھمانے لگتیں۔ خان صاحب آفس میں داخل ہوتے تو مسکرا کر دوسری کرسی پر بیٹھ جاتے تھے۔

بابرہ پوچھتیں۔ "خان صاحب مجھ سے کرسی سے اٹھنے کو نہیں کہیں گے؟"

"بالکل نہیں کیونکہ تم میرے کہنے سے تو اٹھو گی نہیں۔ بس میرے کاغذات گڑبڑ نہ کرنا۔ ابھی سیٹ پر سے کوئی بلانے والا آجائے گا تو تم خود ہی رخصت ہو جاؤ گی۔"

"خان صاحب آپ کتنے سمجھدار آدمی ہیں۔ آپ نے واقعی اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔" اور کرسی سے اٹھ کر کہتیں۔ "میں بریک میں آؤں گی تو چائے کے ساتھ کیک بھی کھاؤں گی۔"

اسٹوڈیو میں وہ ہم پر بھی کافی مہربان تھیں۔ کبھی ٹائی کی تعریف کرتے ہوئے کہتیں۔ "ٹائی کی ناٹ درست نہیں ہے۔ کر دوں؟"

"جی نہیں مہربانی۔"

ہم بھی کبھی ان کے لیے ٹافیاں لے کر جاتے تھے۔ کبھی ان سے ملاقات ہوتی تو وہ ٹافیوں کے لیے ہمارے جیبوں کی تلاشی بھی لیا کرتی تھیں۔ اسٹوڈیو میں ہمارے بازو میں بازو ڈال کر اتنا بوجھ ڈالتیں کہ ہم ایک طرف کو جھک جاتے۔

"آفاقی صاحب، کچھ جان بنائیں میرے وزن سے جھک گئے؟"

"آپ نے شاید کبھی اپنا وزن نہیں کیا اور پھر قد بھی اتنا چھوٹا ہے کہ مجھے ایک طرف جھکنا پڑتا ہے۔"

"اب اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے۔ آپ سے ایک دو بالشت ہی کم ہوگا۔"

لیکن اسٹوڈیو میں اور سیٹ پر وہ بہت احتیاط برتی تھیں۔ نہ کسی سے بے تکلف ہوتیں نہ کسی کو بے تکلف ہونے کا موقع دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں تنہا اسٹوڈیو آنے میں کوئی جھجک نہیں تھی۔ سب سے قابل ذکر بات یہ ہے جب وہ ہیروئین بن گئیں تو انہوں نے معاوضہ طے کرنے اور دوسرے بزنس کی ذمے داری خود ہی سنبھال لی تھی اور بہت ہوشیاری اور سلیقے سے یہ کام کرتی تھیں۔ چند لوگوں کو چھوڑ کر معاملات طے کرتے ہوئے ان کا انداز خاصا کاروباری ہوتا تھا۔

بابرہ بہت بے خوف تھیں۔ "عاشی" کی شوٹنگ میں انہوں نے سائیکل چلائی تھی۔ انہوں نے آغا صاحب کی کوٹھی میں اس کی مشق کی اور تھوڑی دیر بعد ہی کوٹھی سے باہر گلبرگ کی مین روڈ پر نکل گئیں۔ ہمیں یہ ڈر کہ ابھی اناڑی ہیں کسی سے ٹکرا نہ جائیں یا حادثہ نہ کر بیٹھیں۔ ان کے پیچھے لڑکے کو دوڑایا تو وہ سائیکل دیکھ کر ان سے ریس لگانے لگیں۔ ظاہر ہے کہ ستم زدہ لوگ انہیں زبردستی تو نہیں روک سکتے تھے۔

آغا صاحب ہی کی کوٹھی میں شوٹنگ کرتے ہوئے ایک دن ساتھ والی کوٹھی کی اونچی دیوار پر چڑھ گئیں اور بچوں کی طرح پیر ہلانے لگیں۔

"بابرہ کیا کرتی ہو گر جاؤ گی۔ نیچے اترو۔"

"کیسے ___ سیڑھی تو ہے نہیں۔ کیا کود جاؤں۔" یہ کہہ کر وہ کودنے کو تیار ہو گئیں۔

"ارے نہیں۔ خدا کے لیے کود نہ جانا۔ ٹانگ نہ ٹوٹ جائے۔" بڑی مشکل سے سہارا دے کر انہیں دیوار سے اتارا گیا۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے ہمارے پاس آ گئیں۔

"آفاقی صاحب آپ کو میری اور میری ٹانگ کی کتنی فکر ہے۔ آپ بہت اچھے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "ہمیں تمہاری ٹانگ کی نہیں اپنی شوٹنگ کی فکر تھی۔"

"آپ کتنے خراب ہیں۔ سیلفش آپ کو اپنی شوٹنگ میری ٹانگ سے زیادہ عزیز ہے۔"

"بھئی بعد میں آرٹسٹوں کی ڈیٹس کی مشکل پڑ جاتی ہے فلم اٹک جاتی ہے۔"

"یہ بات ہے تو میں آپ کو کود کر دکھاؤں گی۔" وہ پھر دیوار کی طرف جانے لگیں تو ہم نے بازو پکڑ کر روک لیا۔

"بابرہ کیا تم سمجھتی ہو کہ ہم نے اپنی شوٹنگ کے لیے تم کو کودنے نہیں دیا۔"

وہ مسکرائیں۔ "بالکل نہیں اور نیچی دیوار سے گر کر ٹانگ نہیں ٹوٹ سکتی۔"

"ہاں مگر موچ تو آ سکتی ہے۔"

"تو آپ کو میری موچ کی فکر بہت تھی؟"

"ہمیں یہی ڈر تھا کہ تمہاری چال بدل گئی تو کتنی خوبی میں فرق آ جائے گا۔" انہوں نے دو مکے مارے۔

"آپ بہت خراب ہیں مگر سارے کے سارے خراب نہیں ہیں۔"

لیکن سیٹ پر کام کرتے ہوئے وہ بہت سنجیدگی اور توجہ سے کام کرتی تھیں اور سیٹ کے ڈسپلن کا ہمیشہ خیال رکھتی تھیں۔

ہم نے بتایا تھا کہ بابرہ بہت نڈر اور بے خوف تھیں۔ مثال کے طور پر سانپ چاہے بے ضرر اور سپیرے کے قابو میں بھی ہو اس کو چھونے سے جسم میں عجیب قسم کی کراہیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ شوٹنگ کے لیے سانپ پکڑ کر گلے میں ہار کی طرح لٹکانے کو بھی تیار تھیں۔

شمیم آرا کی فلم کی شوٹنگ کے لیے مری لے گئے۔ یہاں انہیں ہاتھی پر بٹھانا تھا۔

"بابرہ اب تم کو اس ہاتھی پر بیٹھنا ہے۔" ہدایت کار شمیم آرا نے کہا۔

"باجی، جب تک ہاتھی کھڑا رہے گا میں اس پر کیسے

بیٹھوں گی۔" ہاتھی کے ٹرینر نے ہاتھی کو بٹھا دیا۔ ایک چھوٹی سی سیڑھی لا کر اوپر چڑھنے کے لیے لگا دی گئی۔ بابرہ سیڑھی کے بغیر ہی ہاتھی پر چڑھ کر بیٹھ گئیں۔ فلم کی ضرورت کے مطابق وہ ہاتھی کی سونڈ پکڑ کر اس سے جھولنے لگیں۔ ہم نے بھی ڈرتے ڈرتے ہاتھی کی سونڈ کو چھو کر دیکھا مگر ہاتھ فوراً کھینچ لیا۔ ایک عجیب قسم کا احساس پیدا ہوا مگر بابرہ ان چیزوں سے بے نیاز تھیں۔

ہاتھی پر سے اترنے کے لیے بھی انہوں نے شمیم آرا سے پوچھا۔ "باجی کیا نیچے چھلانگ لگا دوں؟"

"ارے نہیں۔ خدا کے واسطے ایسا نہ کرنا۔" شمیم آرا تو گھبرا گئیں۔ اگر سین کا تقاضا ہوتا اور شمیم آرا چھلانگ لگانے کے لیے کہتیں تو وہ یقیناً ہاتھی کے اوپر سے چھلانگ لگا دیتیں۔

شام کو شوٹنگ ختم ہونے کے بعد ہوٹل کی طرف چلے گئے تو بابرہ بولیں۔ "اللہ میاں نے بھی کیسی کیسی چیزیں بنائی ہیں۔"

ہمارا خیال تھا کہ وہ اب ہمیں کچھ کہیں گی مگر ان کا دھیان کسی اور طرف تھا۔

"ہاتھی دیکھا ہے آپ نے؟"

"کیوں نہیں دیکھا۔ ابھی شوٹنگ کر کے آ رہے ہیں۔"

"میں سوچتی ہوں کہ یہ کیسا بے تکا اور بے ڈھنگا جانور ہے۔ اتنا بڑا جسم، اتنے موٹے موٹے ہاتھ پاؤں، اتنی لمبی اور موٹی سونڈ، اتنے بڑے بڑے کان، اتنا بڑا سر، اتنے بڑے دانت مگر اتنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور اتنی سی دم۔"

"ہاں۔" ہم نے کہا۔ "واقعی ہاتھی کی آنکھیں تو تم سے بھی زیادہ چھوٹی ہیں۔"

انہوں نے اَن سنی کر دی۔ "یہ بتایئے کہ آخر اللہ میاں نے اس کی آنکھیں اور دم اتنی چھوٹی کیوں بنائی ہے؟"

"یہ تو کسی فرشتے سے پوچھنا پڑے گا۔"

فائٹ کے منظر میں وہ ڈپلی کیٹ کے بجائے خود ساری اچھل کود اور فائٹ کرنے پر اصرار کرتی تھیں۔ اونچے نیچے سے کودنے میں انہیں کوئی عار نہ تھا۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ ڈائریکٹر نے انہیں کچھ کرنے کے لیے کہا ہو اور وہ عذر پیش کر دیں۔

بابرہ کو بچوں سے بہت پیار بلکہ عشق تھا۔ ہماری چھوٹی بچی پارو سوا سال یا ڈیڑھ سال کی تھی جب ہم سب بابرہ کی کوٹھی پر گئے جسے انہوں نے بہت شوق سے سجایا تھا۔ پوری علیک سلیک بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان کی نظر پارو پر پڑی۔

"ارے کتنی پیاری گڑیا ہے۔" انہوں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ "بس اب کوئی نہ بولے اس کو دیکھوں گی۔"

اس کے بعد ہم لوگ جتنی دیر ان کے گھر میں رہے پارو کو دیہاتی عورتوں کی طرح بازو ڈال کر کمر سے لگائے پھرتی رہیں۔ اس کے بعد جب بھی ان کے گھر کا ارادہ ظاہر کرتے وہ کہتیں۔ "دیکھیے پارو کے بغیر [illegible] ہے۔"

پرویز ملک صاحب کی فلم "مہربانی" کی شوٹنگ کے لیے ہم لوگ ایبٹ آباد گئے۔ یہاں ندیم اور نجمہ محبوب کے ساتھ کچھ مناظر فلمانے تھے۔ فلم یونٹ کے کچھ اور لوگ اپنے بچوں کو لے کر گئے تھے۔ ہمارے ساتھ نادیہ تھیں۔ شوٹنگ سے فارغ اوقات میں سب مختلف قسم کی تفریح میں مصروف ہو جاتے مگر بابرہ غائب ہوتیں۔

وہ سب بچوں کو اپنے کمرے میں اکٹھا کر کے دروازہ بند کر لیتیں اور گھنٹوں بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتیں۔ نہ جانے اتنے بچوں کو اتنی دیر تک خوش اور اپنے ساتھ ایک کمرے میں مصروف کیسے رکھ لیتی تھیں۔

بابرہ کو اچھے کھانے کا شوق تھا۔ اچھے کھانے سے کسی بڑے ہوٹل یا ریسٹوران کا کھانا نہیں بس شرط یہ ہے کہ مزیدار ہو۔ ایک روز ایورنیو اسٹوڈیو میں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ رات دیر گئے تک جاری رہی تھی۔

انہوں نے کہا۔ "آفاقی صاحب آج ڈنر میں دوں گی آپ کو۔"

ہم نے پوچھا۔ "کیا گھر سے کھانا منگوایا ہے؟"

"نہیں باہر ڈنر کھلاؤں گی۔"

رات کو ڈنر کا وقت ہوا تو انہوں نے ہمیں اپنی کار میں بٹھایا اور ملتان روڈ پر چل پڑیں۔ ہم سمجھے کہ وہ روڈ کے راستے مال روڈ کے کسی ہوٹل میں جائیں گی مگر وہ روڈ کی طرف مڑنے کے بجائے انہوں نے دائیں جانب ٹرکوں کے اڈے کی طرف کار موڑ دی۔ رات کا وقت تھا ہوٹل گرم تھے۔ ٹرک ڈرائیور وغیرہ چارپائیوں پر بیٹھے کھا رہے تھے۔ کچھ چارپائی پر لیٹے سستا رہے تھے۔ کچھ تاش کھیل رہے تھے۔ بابرہ نے کار لے جا کر سیدھی ایک ہوٹل کے سامنے روک دی۔

مالک کی نظر پڑی تو اس نے دور ہی سے خوش ہو کر کہا۔ "میڈم آئی ہیں۔ چلو لڑکو۔" دو لڑکے ایک میز اور کرسیاں لے آئے اور کار کے نزدیک ہی رکھ دیں۔ مالک تو ہاتھ پونچھتا ہوا کار کے پاس آیا۔ ہم دونوں کو سلام کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"آج کیا کھائیں گی میڈم؟"

"وہی ماش کی دال تڑکے والی اور کڑک تندوری تازہ روٹی۔"

"ابھی لیجیے۔ میں برتن صاف کرا کے کھانا بھجواتا ہوں۔"

یہ اڈا [illegible] اسٹوڈیو کے بالکل سامنے تھا۔ اب اسٹوڈیو تو رہا نہیں اس عمارت کو منصورہ کہا جاتا ہے اور یہ جماعت اسلامی کا ہیڈ آفس ہے۔

اسلام آباد اور مری آتے جاتے ہم نے بھی کئی دیہاتی تندوری ہوٹلوں میں کھانا کھایا ہے۔ ماش کی دال اور چنے کی دال کے ساتھ گرم گرم تندوری روٹی کا مزہ واقعی الگ ہے پھر اس کے بعد کڑک چائے۔ لیکن ایسے سفر میں ہمیشہ ڈرائیور کو کھانے کی باسکٹ ساتھ رکھنے کی ہدایت کرتی تھیں جس میں دھلی ہوئی پلیٹیں، چمچے اور چائے کی پیالیاں رکھی جاتی تھیں۔ ہم لوگ اپنے برتن اور صاف کپڑا اور دسترخوان ساتھ ہی لے جاتے تھے کیونکہ ان جگہوں پر برتنوں وغیرہ کی صفائی پر دھیان نہیں دیا جاتا۔

کچھ دیر میں دو لڑکے کھانا لے کر آ گئے۔ "میڈم میز پر رکھوں یا گاڑی میں کھائیں گی؟"

"او ہو لڑکے ادھر آؤ۔ سامنے سے کوکا کولا کی دو بوتلیں لے آؤ۔" وہ اچھا جی کہہ کر رخصت ہو گیا۔

"آفاقی صاحب میں یہاں کا پانی پینے میں ذرا احتیاط ہی کرتی ہوں۔"

"بہت اچھا کرتی ہو مگر اگر خود اپنے برتن وغیرہ بھی لے آیا کرو تو زیادہ بہتر ہے۔"

"آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔ اب ڈنر کھائیں ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" گرم گرم تندوری روٹی نے بہت لطف دیا۔

"مگر یہ دو بوتلیں کس لیے؟"

"بس آپ کے [illegible] میں۔" کھانا کھا کر اور کوکا کولا پی کر بابرہ نے فوراً [illegible] سے بل ادا کیا اور ٹپ دی۔

ہم نے کہا۔ "بابرہ اچھا نہیں لگتا کہ ہمارے ہوتے ہوئے بل تم ادا کرو۔"

بابرہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولیں۔ "آفاقی صاحب سمجھتی ہوں آپ کی چالاکیاں۔"

"اس میں چالاکی کی کیا بات ہے؟"

"یہ معمولی خرچ ہے کہ آپ بڑے بیٹھے ڈنر سے بچنا چاہتے ہیں۔ آپ یہ بتایئے کہ ڈنر کیسا لگا آپ کو؟ میں تو اکثر یہاں ڈنر کھانے آ جاتی ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "بہت ہی مزا آیا مگر بابرہ تم رات کے وقت یوں اکیلی ٹرکوں کے اڈے پر مت آیا کرو یہ ماحول۔"

"اچھا اچھا۔" وہ بات کاٹ کر بولیں۔ "مجھے ڈرایئے نہیں یہاں میرے بہت سے حفاظت کرنے والے ہیں۔ کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ اللہ پر بھروسا ہے میرا۔"

ہاتھی کی شوٹنگ کے دوران بابرہ نے دل کھول کر مشورے دیے اور فلم کا حصہ انہیں بہت پسند آیا تھا جس میں انہوں نے ایک انوکھا کردار ادا کیا تھا۔ وہ اپنے کردار کو بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔ فلم بندی سے پہلے ہم نے انہیں سمجھایا کہ وہ ذہنی طور پر بالکل درست ہیں مگر والدین کی کمی محسوس کرنے کی وجہ سے اور والدین کے رویے نے انہیں ایک تخریبی بنا دیا ہے جو ضد بھی بہت کرتی ہے۔ اسے یہ بھی احساس نہیں ہے کہ وہ جوان ہو چکی ہے۔ ہر ایک سے بچوں کی طرح ہی برتاؤ کرتی ہے پھر انہوں نے ہمیں کچھ مکالمے مختلف انداز میں بول کر سنائے۔ ہم نے ان میں سے ایک انداز پسند کیا اور پھر سمجھایا کہ اداکاری کی خوبی یہ ہے پہلے منظر میں جس انداز میں بولے، چلے پھرے اور جس قسم کی حرکتیں کرے انہیں یاد رکھے اور تمام فلم کے بھی مناظر میں اسی طرح نظر آئے اور بابرہ نے اس کردار کو اپنے آپ پر اس طرح طاری کر لیا کہ بعد میں بھی کئی فلموں میں غیر ارادی طور پر اسی انداز میں مکالمے بولے اور اسی قسم کے انداز اختیار کیے۔ ہدایت کاروں نے بھی انہیں نہیں ٹوکا۔

ہم نے انہیں احساس دلایا کہ "دیکھو بابرہ تم ہاتھی کے کردار میں ایسے گم ہو گئی ہو کہ بلا ارادہ وہی انداز اختیار کر لیتی ہو۔ احتیاط رکھو کہ ایسا نہ ہو۔"

کئی سال کے بعد انہوں نے ایک بہت اچھے ٹی وی ڈرامے "نادان نادیہ" میں مرکزی کردار ادا کیا۔ یہ ڈراما [illegible] انور مقصود نے لکھا تھا۔ بہت اچھا ڈراما تھا مگر بابرہ نے اس ڈرامے میں ہاتھی کا انداز اپنایا جو ڈرامے کے کردار کے

مرزا اسد اللہ خان غالب

مطابق نہ تھا۔ شاید کسی نے انہیں احساس بھی نہیں دلایا۔

کافی عرصے بعد ہماری ان سے فون پر بات ہوئی تو ہم نے کہا کہ ”بابرہ تم تاون تادیہ میں تادیہ سے زیادہ عاشی نظر آتی تھیں۔“

عاشی میں ایک منظر میں اپنے انکل سے باتیں کرتے کرتے ان کی ٹائی سے کھیلتے اور پینچنے لگتی ہیں۔ یکا یک انہیں خیال آیا۔ ”آفاقی صاحب اگر میں اس ٹائی کو کھینچتے ہوئے ادھیڑ دوں تو اچھا نہیں لگے گا۔“

ہم نے کہا۔ ”بہت اچھا لگے گا مگر یہ ٹائی ہی ہوتی نہیں ہے جس کے دھاگے کھنچتے چلے جائیں اور ٹائی ختم ہو جائے۔ ایسا منظر ہم نے انگلش کامیڈین نارمن وزڈم کی ایک فلم میں دیکھا تھا۔ نارمن وزڈم بہت اچھے مزاحیہ اداکار تھے اور ہمیشہ بیوقوف اور سادہ لوح آدمی کا کردار ان کے لیے لکھا جاتا تھا جس میں وہ دل کھول کر بے وقوفیاں کرتے تھے۔ دوسرے کامیڈین اداکاروں کے برعکس ان کی اداکاری کا انداز یہ تھا کہ خود بھی بے تحاشا ہنستے اور قہقہے لگاتے تھے۔ یہ ان کی اداکاری کی ایک ایسی خوبی تھی جس کی وجہ سے وہ ہر عمر کے فلم بینوں میں مقبول تھے۔ کچھ عرصہ قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ بہت ہی اچھے اور منفرد مزاحیہ اداکار تھے۔

عاشی کے ایک منظر میں میک اپ کا سامان بابرہ کے ہاتھ لگ گیا ہے اور وہ اپنے منہ پر عجیب انداز میں میک اپ کر رہی ہیں جس کی وجہ سے وہ کامیڈین نظر آتی ہیں۔ وقت انہیں بتایا گیا کہ دادی تمہیں بلا رہی ہیں۔ میک اپ کے بعد وہ اپنی لاڈلی بکری کے ساتھ کھیل رہی ہیں۔ کچھ دیر بکری کو رسی سے باندھے ہوئے دادی اماں کے کمرے پہنچتی ہیں تو اس حلیے میں کہ منہ پر بھونڈے انداز میں میک اپ تھوپا ہوا ہے۔

دادی دیکھ کر کہتی ہیں۔ ”ابھی تو یہ کیا حلیہ بنایا ہے؟“

”دادی اماں آج میں نے میک اپ کیا ہے۔“

”میک اپ کیا ہے یا چہرہ بگاڑ لیا ہے۔“ پھر ان کی نظر بکری پر پڑتی ہے۔ ”یہ بکری کمرے میں کیوں لے آئی قالین گندا کر دے گی اور تم نے اس کا حلیہ کیسا بنایا۔ ارے بیٹی تمہارے اندر عقل کب آئے گی؟ بھگاؤ اس بکری کو کمرے سے۔“ بکری خود ہی گھبرا گئی تھی۔ وہ رسی چھڑا کر ایسی بھاگی کہ کمرے میں دوڑ پھرتی۔

بنگال کے معروف موسیقار خان عطا الرحمن

”ارے ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”دادی اماں آپ ہی نے تو کہا تھا کہ اس کو بھگاؤ۔“

اس فلم میں بابرہ کو دل کھول کر من مانی کرنے کا موقع ملا تھا۔ ان کے کردار میں اتنی گنجائش تھی کہ جو چاہے کرتی تھیں۔ ان کے نفسیاتی علاج کے لیے عامل بلائے گئے۔ جن نکالنے کی بجائے تنگ آ کر عامل صاحب خود ہی بھاگ گئے۔

اس سین کے لیے ایک بہت دلچسپ گانا لکھا گیا جس کے لیے انہیں دلہن بنایا گیا تھا اور بابرہ شریف نے اس

بات خوبی سے کچھ اثر کرایا تھا پھر ان کے لیے ماہر نفسیات سے مشورہ لینے کے لیے کہا گیا مگر پہلی ہی ملاقات کے بعد ماہر نفسیات بھی پریشان ہو کر بھاگ گیا۔ آخر محبت نے عاشی کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔

بابرہ شریف نے فلمی زندگی میں بہت سے یادگار کردار نبھائے لیکن یہ سب سے مختلف اور منفرد تھا۔ ایک بار ہم بابرہ کے گھر گئے تو انہوں نے بابرہ کو حسب معمول گھر سے نکالا اور کچن کی طرف چل پڑیں۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”میں نے آج اپنے ہاتھ سے گلاب جامن بنائی ہے۔ کھائیں گے تو مان جائیں گے۔“ اس روز ایک ڈسٹری بیوٹر اور فلم ساز بھی گھر میں موجود تھے حالانکہ کبھی فلم سازوں کو وہ اپنے گھر نہیں بلاتی تھیں۔ ان کا نام یاد نہیں رہا کوئی ملک صاحب تھے۔ بہت شریف اور معقول آدمی تھے۔ کچھ دیر بعد گلاب جامن کی ٹرے اور چند پیالیاں اور چمچے آگئے۔

سرور بارہ بنکوی

”واہ۔ کیا خوب صورت گلاب جامنیں ہیں۔“ انہوں نے فوراً آؤ دیکھا نہ تاؤ چمچے سے ایک گلاب جامن منہ میں ڈال لی۔ گلاب جامن چولھے سے اتار کر لائی گئی تھیں۔ منہ میں ڈالتے ہی ملک صاحب کی زبان جل گئی اور گلاب جامن کا ایک حصہ ان کے تالوے سے چپک گیا۔ ان کی حالت بہت بری ہو گئی۔ ہم سب گھبرا گئے۔ بابرہ فوراً بہت ٹھنڈا پانی لے کر آئیں اور ملک صاحب کو پلایا۔ کچھ دیر بعد ان کے دم میں دم آیا۔ بابرہ بہت شرمندہ تھیں۔

طالش

”سوری ملک صاحب میں یہ بتانا بھول گئی تھی کہ بہت گرم ہیں۔ ابھی چولھے پر سے اتری ہیں۔“

ملک صاحب خود بہت شرمندہ تھے۔ جب کچھ دیر بعد حالات معمول پر آئے تو ہم نے کہا۔ ”ملک صاحب بابرہ نے جان بوجھ کر آپ کو نہیں بتایا تھا۔“ اس کے بعد یہ لطیفہ ہی بن گیا تھا۔

بابرہ جب بھی اسٹوڈیو میں ملک صاحب سے ملتیں تو کہتیں۔ ”ملک صاحب کسی دن آیئے نا اپنے ہاتھ سے گلاب جامن بنا کر کھلاؤں گی آپ کو۔ پریشان نہ ہوں اس بار آپ کو ٹھنڈی گلاب جامن کھلاؤں گی۔ فریج میں سے نکال کر۔“ اور ملک صاحب مسکرا کر رہ جاتے۔

”عاشی“ کے سلسلے میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گئے۔ فلم کا معاوضہ تو طے ہو چکا تھا لیکن ساری فلم کے دوران میں بابرہ نے کبھی اشارے کنائے میں بھی پیسوں کا مطالبہ نہیں کیا۔

ایک دن ہمیں پیغام ملا کہ بابرہ شریف نے کہا ہے کہ آج رات ضرور آئیں بہت ضروری کام ہے۔ ہمیں یہ خیال آیا کہ شاید بابرہ کو پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ ہمارے پاس اس وقت پیسے نہیں تھے۔ سوچا اگر اس نے پیسوں کا مطالبہ کر دیا تو ہم کیا کہیں گے۔

اسی پریشانی میں رات کو پہنچ گئے۔ وہاں جا کر معلوم

ہوا کہ دراصل انہوں نے کسی بہن کی سالگرہ منائی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس وقت دو بہنیں لاہور میں بھی نہیں تھیں۔ بابرہ حسبِ معمول پارو کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ کھانا بہت پُرتکلف اور لذیذ تھا۔ انہوں نے فخریہ طور پر یہ بتایا کہ کون کون سی ڈش ان کی امی نے بنائی ہے۔ واقعی بہت لذیذ کھانا تھا۔

کافی کا دور چلا اس کے بعد بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں نے اجازت طلب کی۔ بابرہ حسبِ دستور باہر تک چھوڑنے آئیں۔ ہم دل ہی دل میں ڈر رہے تھے کہ اب یہ کہیں گی کہ آفاقی صاحب مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ ہم کار میں بیٹھ گئے مگر بابرہ نے پارو کو پیار کرنے کے بعد ہمارے حوالے کیا اور ہم چلے آئے۔

کچھ دن بعد ہمارے پاس پیسے آئے تو ہم نے خود ہی بابرہ کے ایک سیٹ پر جا کر کہا کہ اگر پیسوں کی ضرورت ہو تو لے لو۔ آج کل ہم بہت مالدار ہیں۔ وہ ہنسنے لگیں۔

''آفاقی صاحب میں جانتی ہوں بہت پیسے والے آدمی ہیں مگر مجھے ابھی ضرورت نہیں ہے۔''

فلم ختم ہو گئی۔ پرنٹ تقسیم ہو گئے۔ ڈسٹری بیوٹرز نے بھی رقم ادا کر دی۔ فلم ریلیز بھی ہو گئی مگر بابرہ کی طرف سے کوئی پیغام نہیں آیا۔ آخر ہم نے خود ہی انہیں ساری رقم یکمشت ادا کر دی۔

وہ کہنے لگیں۔ ''شکریہ آفاقی صاحب آپ واقعی بہت مالدار آدمی ہیں۔'' ''ہم ایماندار بھی بہت ہیں، قرض بھی فرض سمجھتے ہیں۔''

ہم نے بابرہ سے اکٹھی تین فلموں کے لیے بات کی تھی۔ اس وقت ان کا جو معاوضہ تھا وہ طے پا گیا حالانکہ اس وقت بھی ان کے معاوضے میں اضافہ ہو چکا تھا۔ فلم ''آگ اور آنسو'' کی شوٹنگ کے دوران میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ ہم ناراض ہو کر سیٹ پر بہت چیخے اور غصے کا اظہار کیا۔ یہ کسی ایک شخص کے خلاف نہیں تھا مگر بابرہ کو لوگوں نے بھڑکایا کہ ''بابرہ تمہاری تو آفاقی صاحب نے بہت بے عزتی کر دی۔ تم کیسی ہیروئن ہو۔''

چند دن کے بعد ہم شباب اسٹوڈیو میں ان سے ملنے گئے تاکہ اگلی فلم کی تاریخوں کو ایک بار پھر کنفرم کر لیں۔ وہ میک اپ روم میں بیٹھی میک اپ کروا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے میک اپ مین کو جانے لانے کے لیے بھیجا۔

ہم نے کہا۔ ''بابرہ اگلی فلم کی شوٹنگ دو ماہ بعد شروع ہونے والی ہے۔ ہم نے سوچا ایک بار پھر ڈیٹس کنفرم کر لیں۔''

بابرہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر آہستہ سے بولیں ''آفاقی صاحب آپ اس فلم میں کوئی اور ہیروئن لے لیں۔''

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ ''کیا تم مذاق کر رہی ہو؟''

''نہیں، بہت سیریس ہوں۔''

''مگر بات کیا ہے اور ہم دوسری ہیروئن کہاں سے لائیں گے۔''

کہنے لگیں۔ ''آپ کو کون انکار کرے گا۔''

''مگر معلوم تو ہو کہ ہوا کیا ہے؟''

کہنے لگیں۔ ''آفاقی صاحب آپ نے سیٹ پر بہت بے عزتی کی تھی۔ سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔''

''وہ تمہیں خوامخواہ بھڑکاتے ہیں اور تم ان کی باتوں میں آ گئیں۔ دیکھو بابرہ ہمیں جب غصہ آتا ہے اور جو کچھ کہنا ہوتا ہے ہم اسی وقت کہہ دیتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے کچھ نہیں کہتے۔ کسی نے بتایا ہے کہ تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ تم دیر سے سیٹ پر آتی ہو تو بہت بکتے جھکتے ہیں مگر تمہارے پیچھے تمہیں کس طرح یاد کرتے ہیں۔ بہرحال تمہاری مرضی ہے اگر تم ہماری فلم میں کام نہ کرنا چاہتی تو نہ سہی مگر ایسا ہماری طرف سے صاف رہا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم اور تم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔''

اتنے میں چائے آ گئی ... نے اپنے ہاتھ سے پیالیاں بنائیں۔ ہماری پیالی میں زیادہ چینی ڈالی۔ ہم دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔

چائے پی کر ہم کھڑے ہو گئے۔ ''اچھا تم میک اپ کرو ہم چلتے ہیں۔''

''سنئے ایک منٹ بیٹھیے۔''

ہم بیٹھ گئے۔ کہنے لگیں۔ ''آپ کی ڈیٹس کنفرم ہیں اور آپ خوش ہیں۔''

''بہت زیادہ۔'' ''پھر ہمیں کچھ خیال آیا۔'' ''بابرہ سنا ہے کہ آج کل تم بہت زیادہ معاوضہ لے رہی ہو۔ ہماری تمہاری بات کو ایک سال کے قریب ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے تم ہم سے بھی وہی معاوضہ لو جو آج کل سب سے لیتی ہو۔''

وہ مسکرائیں۔ ''آفاقی صاحب جو طے ہو چکا وہ ہو چکا۔ آپ سے میں وہی معاوضہ لوں گی جو طے ہوا تھا۔'' ہم خدا حافظ کہہ کر چلے آئے مگر بابرہ کی یہ بات ہمیشہ یاد رہے گی۔

بابرہ کے بارے میں ہم نے دیکھا کہ ان کی شخصیت کے دو مختلف پہلو ہیں۔ ایک سادہ، معصوم، بچپن کی طرح کھلنڈری اور خوش مزاج۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوشیاں حاصل کرنا۔ بچوں کے ساتھ کھیل کر مصروف اور مگن۔ بابرہ کی شخصیت کا ایک دوسرا رخ نہایت سنجیدہ، غور و فکر کے بعد فیصلے کرنے والا۔ دوسروں کے مشوروں کی بجائے خود اپنے ارادے پر بھروسا کرنا۔ وہ ایک پُرعزم اور اپنے فیصلے خود ہی کرنے والی ہستی ہیں حالانکہ اس طرح بذاتِ خود دوسروں کے مشوروں کے باوجود فیصلے کرتیں اور فیصلے کرنے سے انہوں نے نقصان بھی اٹھایا جن میں سے ایک اداکار شاہد کے ساتھ شادی کرنا بھی ہے۔ ان کے مخلص دوستوں، بہی خواہوں یہاں تک کہ بہنوں تک نے انہیں اس شادی سے روکنے کے لیے بہت زور دیا لیکن کسی نے انہیں مجبور نہیں کیا اس لیے کہ ان کی آزادی پسند خصلت دباؤ کو قبول نہیں کرتی ہے۔ انہیں شاہد سے سچ معنوں میں محبت ہو گئی تھی۔ جب ان سے شاہد کی رنگین مزاجی اور غیر ذمے داری و بے پروائی کے بارے میں کہا جاتا تو ان کا کہنا یہ تھا کہ شاہد کو دراصل محبت، ہمدردی اور خلوص کی ضرورت ہے۔ ماں کی وفات کے بعد وہ شدت سے ماں کی کمی محسوس کرتے رہے ہیں۔ اگر انہیں کوئی سچا رفیق مل جائے تو ان کی زندگی کا رخ بدل جائے گا۔

بہرحال انہوں نے ایک لحاظ سے پُراسرار انداز میں شادی کی اور ایک دن یہ دونوں اچانک غائب ہو گئے۔ فلم ساز منتظر ہی رہے۔ ان کے بارے میں کسی کو علم نہ تھا۔ جب کچھ عرصے بعد ہم لندن گئے تو وہاں ایسٹ لندن میں مرشد صاحب نے اصرار کر کے ایک رات اپنا مہمان بنایا اور یہ بھی بتایا کہ جس بیڈروم میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں شاہد اور بابرہ شریف شادی کے بعد یہیں آ کر رہے تھے۔ وہ دونوں دراصل کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں کسی کا ذہن نہ جائے اور دنیا سے پوشیدہ رہ سکیں۔ مرشد صاحب کا گھر ان کے لیے بہترین پناہ گاہ تھی۔

شادی کے بعد وہ بہت خوش تھیں۔ گلبرگ میں انہوں نے ایک کوٹھی کرائے پر لے کر اس کو سجایا تھا اور ایک نئی اور خوش و خرم زندگی کا آغاز کرنا چاہتی تھیں لیکن شاہد کی لاابالی طبیعت میں تبدیلی نہ آ سکی۔ کچھ عرصے بعد شاہد نے پھر غائب ہونا شروع کر دیا اور بابرہ ان کی جستجو اور تلاش کے لیے اس طرح سارے پاکستان میں ٹیلی فون کیا کرتی تھیں۔ جس طرح شاہد کی بیوی اور ان کی بچی شاہد کی تلاش میں ہر ایک جاننے والے سے امداد طلب کیا کرتی تھیں۔

نارمن وزڈم

خدا جانے یہ تلخ تجربہ اس کی وجہ ہے یا کوئی اور بات ہے کہ اس کے بعد بابرہ شریف نے شادی کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ ہماری تو کافی عرصے سے ان سے تفصیلی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس لیے یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کے خیالات اور ارادے کیا ہیں۔ فی الحال وہ ایک پُراسرار شخصیت ہیں جن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت وہ لاہور میں ہیں، کراچی میں ہیں یا لندن میں ہیں۔ عموماً یہی تین ان کے پسندیدہ مقامات ہیں۔ وہ ملک سے باہر بھی ماڈلنگ کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنی کمائی کو بہت سلیقے سے خود ہی سنبھال کر رکھا یا کسی کاروبار میں سرمایہ کاری کی لیکن وہ مالی اعتبار سے ایک مطمئن اور خوشحال زندگی گزار رہی ہیں لیکن ہم جیسے ان کے جاننے والوں کو ان کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ پاکستان میں اور اس کے باہر ہمارے مخلص دوستوں کی بھی کمی نہیں رہی۔ آج بھی ان میں سے کچھ باقی رہ گئے ہیں لیکن ہمارا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ہم نے جن دو دوستوں کو انتہائی مخلص، بے لوث، ہمدرد اور ہر قسم کی امداد کے لیے ہر وقت تیار پایا وہ دونوں خواتین ہیں۔ ایک زیبا بیگم اور دوسری بابرہ بیگم۔ یہ ہم اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔

کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ میڈیا پر ایک اشتہار دیں کہ بابرہ شریف تم کہاں ہو جہاں بھی ہو پاکستان اپنے گھر لوٹ

تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

بابرہ شریف کے ساتھ ہم فلموں کی شوٹنگ کے سلسلے میں بھی مختلف ملکوں میں جاتے رہے ہیں۔ شبنم آرا کی فلم "پلے بوائے" میں بابرہ ہیروئن اور ندیم ہیرو تھے۔ سائڈ کردار آصف رضا میر اور محسن کی تیج کر رہے تھے۔ یہ ان دونوں کی پہلی فلم تھی اور یہ اسے کم عمر تھے کہ انگلستان جانے کے لیے پہلی بار ان کے شناختی کارڈ بنوائے گئے تاکہ پاسپورٹ حاصل کیا جا سکے۔

لندن میں وہ، شبنم آرا اور اداکارہ فرزانہ ایک ہی فلیٹ میں مقیم تھیں۔ اچانک لندن پہنچنے پر ایڈوانس بکنگ نہ ہونے کی وجہ سے جس کو جہاں سر چھپانے کا موقع ملا وہ اسی جگہ رہائش پذیر ہو گیا۔ ہم حسب معمول سینٹرل لندن میں اپنے بھانجے طارق میر کے پاس ٹھہرے تھے۔ شوٹنگ کا اہتمام پروڈکشن انچارج اور شریک پروڈیوسر محسن ملک کر رہے تھے۔ ٹیلی فونوں کے ذریعے سب کو پروگرام سے مطلع کر دیا جاتا تھا۔ اس فلیٹ میں صبح بہت دیر سے ہوتی تھی۔ ایک دن ہم دس بجے وہاں گئے تو دیکھا بابرہ شریف اور فرزانہ ناشتا بنا رہی ہیں۔

"آپ لوگ ابھی تیار نہیں ہوئیں۔ دس بجے تو شوٹنگ کا وقت ہے۔"

بابرہ نے کہا۔ "میں تو تیار ہوں۔ دیکھ لیجیے میک اپ، ہیر اسٹائل اور لباس پہن لیا۔ دو منٹ میں تبدیلی کر سکتی ہوں۔"

"مگر آپ لوگ شوٹنگ پر کیوں نہیں گئے؟"

"بات یہ ہے آفاقی صاحب کہ ہماری ڈائریکٹر ابھی سو رہی ہیں۔ اب انہیں جگایا ہے۔ یہ ناشتا ان ہی کے لیے بنا رہے ہیں۔"

کچھ دیر میں شبنم آرا بھی جمائیاں لیتی ہوئی نمودار ہو گئیں۔ "بھئی آپ کیسی ڈائریکٹر ہیں۔ اب سو کر اٹھی ہیں۔ ڈائریکٹر تو سب سے پہلے لوکیشن پر پہنچتا ہے۔"

وہ مسکرائیں۔ "یہ الٹی گنگا ہے آفاقی صاحب۔ مرد ڈائریکٹر میں اور عورت ڈائریکٹر میں کچھ فرق تو ہونا چاہیے۔ میں ناشتا کر کے تیار ہوں۔ راستے میں بابرہ کے لیے کچھ ڈریس بھی خریدنے ہیں۔"

"پہلے کیوں نہیں خریدے؟"

"بہت تلاش کیے مگر اس سائز کے لیڈی ڈریس نہیں ملے۔ یہ معلوم ہوتا تو پاکستان سے ہی بنوا لاتے۔"

ہم نے کہا۔ "ایسا کرو تم مدرکیئر چلی جاؤ۔ وہاں بابرہ کے سائز کے کپڑے، جوتے سب کچھ مل جائے گا۔ ہم تو [illegible] کے لیے وہیں سے سامان خریدتے ہیں۔"

مدرکیئر اس زمانے میں لندن میں واحد بہت بڑا اسٹور تھا جس میں ہونے والی ماؤں اور ہر عمر کی دس بارہ سال بچوں کے ملبوسات اور جوتے وغیرہ مل جاتے تھے اور پائیدار اور خوبصورت ہوتے تھے۔

بابرہ کچن سے باہر آئیں تو شبنم آرا نے ان سے کہا بابرہ سنو، آفاقی صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کیا ....؟"

"یہ کہتے ہیں کہ مدرکیئر سے تمہارے بہت اچھے ڈریس مل جائیں گے۔"

"آفاقی صاحب آپ بھی ایسی باتیں کرنے لگے؟"

ہم نے کہا۔ "بھئی ہم نے تو مشورہ دیا ہے تاکہ تمہاری اور پروڈیوسر کی مشکل آسان ہو جائے۔"

وہ ناراض ہو گئیں۔ "مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی۔ سب کے لیے یہ چوتے بنا کر لائی تھی مگر اب آپ کو نہ دوں گی۔" ایک بار لندن کے ہائیڈ پارک میں ان پر ایک گانا فلمایا جا رہا تھا۔

انگریز عموماً رک کر شوٹنگ وغیرہ نہیں دیکھتے مگر ایک بڑی عمر کی میم نے ہم سے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ہم نے بتایا۔ "ایک پاکستانی فلم کا گانا پکچرائز کیا جا رہا ہے۔"

"کیا یہ بچوں کی فلم ہے؟"

"جی نہیں۔" وہ کچھ سمجھ نہ سکی عجیب سا منہ بنا کر آگے چلی گئیں۔

منیلا میں شبنم آرا کی ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ کہانی ہم نے نہیں لکھی تھی مگر شبنم آرا کا خیال تھا کہ ان کی فلم کی کہانی کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے کے لیے ہم آ جائیں تو بہتر ہوگا۔ ہم وقت نکال کر منیلا ان کے لیے۔ گئے مگر قسم لے لیجیے جو ایک دن بھی کسی فلم کے بارے میں بات چیت ہوئی ہو۔ سیر و تفریح، گپ شپ اور شاپنگ ہی میں وقت گزر جاتا تھا۔ یہ بہت اچھے اور پرلطف دن تھے ہم سب ایک ہی اپارٹمنٹ کے مختلف فلیٹس میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں کھانا پکانے کے برتن اور دیگر گھریلو سامان موجود ہوتا تھا صفائی کے لیے ایک ملازمہ ہر روز آ کر فلیٹ صاف کر، تولیے اور چادریں وغیرہ بدل دیتی تھی لیکن ایک علیحدہ فلیٹ میں پاکستان سے لے جائے گئے باورچی بھی موجود تھے۔

چاہے وہاں جا کر ناشتا کرے یا کھانا کھائے۔

بارہ دن گزر گئے تو ہم نے یاد دلایا کہ ہم صرف چودہ دن کے لیے آئے تھے۔ وہ دو دن بعد ہمیں واپس جانا ہے۔ شبنم آرا نے بہت کہا کہ ابھی تو ہمارا کام ہی شروع نہیں ہوا۔ کچھ دن اور رک جائیں واپسی پر ہانگ کانگ سے ہوتے ہوئے چلیں گے مگر ہمارا وقت پر واپس جانا ضروری تھا۔ معلوم ہوا کہ اسی روز بابرہ شریف بھی پاکستان جا رہی ہیں۔ پروڈکشن والوں نے بہت کوشش کی مگر کراچی کے لیے کوئی سیٹ نہیں ملی۔ بابرہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے فون اٹھا کر پی آئی اے کے منیجر سے بات کی اور ان ہی کی فلائٹ میں ہماری سیٹ بک ہو گئی۔

منیلا سے فلائٹ شام کو دیر سے پرواز کر کے صبح ڈھائی تین بجے کراچی پہنچتی تھی۔ ہمیں پریشانی تھی کہ لاہور کے لیے نہ جانے کب سیٹ ملے گی۔

بابرہ نے کہا۔ "آفاقی صاحب آپ کراچی تو چلیں وہاں سے لاہور جانا کچھ مشکل نہیں ہے۔" منیلا ائرپورٹ پر بابرہ نے ہم سے کہا۔ "کراچی میں آپ کہاں ٹھہریں گے؟"

"ٹھہرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ ائرپورٹ پر ہی رہیں گے اور پہلی فلائٹ سے لاہور چلے جائیں گے۔"

"اور اگر فلائٹ نہ ملی تو؟"

"تو پھر کسی ہوٹل میں۔"

ہم دونوں ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے۔ بابرہ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہی تھیں اور ہم اکانومی کلاس میں تھے۔ ہوائی جہاز کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ آدھے سے زیادہ جہاز خالی تھا حالانکہ ہم کو بتایا جا رہا تھا کہ ایک سیٹ بھی خالی نہیں ہے۔ پی آئی اے کے یہی انداز ہیں جنہوں نے اسے موجودہ حالت تک پہنچایا ہے۔

ہوائی جہاز نے پرواز کی، سیٹ بیلٹ کھول دینے کا اعلان ہوا تو بابرہ ہمارے پاس آ گئیں۔

"آفاقی صاحب، آپ اکیلے ہیں دل تو نہیں گھبرا رہا؟"

"اکیلے کیوں، اتنے سارے دوسرے مسافر ہیں۔"

"مگر آپ کا جاننے والا تو کوئی نہیں ہے۔ آپ کس سے باتیں کریں گے؟"

"ہم میگزین پڑھیں گے۔"

"ہر وقت پڑھنا بھی صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔"

"تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"آپ بیٹھیں میں کچھ دیر میں سوچ کر بتاؤں گی۔" پندرہ بیس منٹ بعد وہ پھر آ گئیں۔

"آفاقی صاحب آپ میرے ساتھ ہی چلیے۔ وہاں بھی کئی سیٹیں خالی ہیں۔"

"مگر ہمارا ٹکٹ تو اکانومی کا ہے۔"

"آپ اٹھیے تو سہی آپ کا سامان یہیں حفاظت سے رہے گا۔" وہ مجھے زبردستی لے کر چلی گئیں اور اپنی ساتھ والی سیٹ پر بٹھا لیا۔

جو ائرہوسٹس چائے کی ٹرالی لیے کھڑی تھی اس کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ خوشی خوشی آ گئی۔

"دیکھیے۔ یہ آفاقی صاحب ہیں۔"

"وہی فلم والے۔"

"ہاں۔ وہی فلم والے۔"

"سر آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" اس نے ہم سے کہا۔

"دیکھیے۔ اب یہ اسی کلاس میں میرے پاس ہی بیٹھیں گے۔ آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"جی۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے مگر وہ کیپٹن ..."

"آپ کیپٹن صاحب سے میری طرف سے پوچھ لیجیے ورنہ میں خود جا کر ان سے بات کر لیتی ہوں۔"

"نہیں نہیں، آپ بیٹھیے۔ میں ابھی دریافت کر کے آتی ہوں۔"

ائرہوسٹس گئی اور کچھ دیر بعد مسکراتی ہوئی آئی۔ "انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ تو آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"بہت شکریہ۔" پھر وہ ہم سے بولیں "اب آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔"

کچھ دیر بعد کیپٹن بھی آ گئے۔ بابرہ کو ہیلو ہیلو کیا۔ ہم سے تعارف ہوا تو ہم سے بھی مسکرا کر ہاتھ ملایا۔

بابرہ نے کہا "دراصل یہاں اتنی بہت سی سیٹیں خالی خالی اچھی نہیں لگتی ہیں فرسٹ کلاس۔"

"کوئی بات نہیں، موسٹ ویلکم۔ میں نے آپ کی کئی فلمیں دیکھی ہیں مگر مس ہانگ کانگ میں تو آپ نے بہت ہی اچھی اداکاری کی ہے۔"

"شکریہ، ایک فلم میں تو آپ کو میرا کام پسند آیا۔"

"ارے نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ اس میں آپ کا کیریکٹر بہت اچھا تھا اور آپ نے خوب کام کیا

تھا۔"

"بہت شکریہ۔"

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔"

"دیکھیے ہم مسافروں کے چاکلیٹ، پرفیوم اور کھلونے پی آئی اے والے ہی رکھ لیتے ہیں مسافروں کو بھی تو ملنا چاہیے۔"

"جی ضرور ملیں گے مگر بچے تو آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔"

"آفاقی صاحب کے بچے گھر پر ہیں۔" وہ سر ہلا کر مسکرا کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ پیکٹ ائر ہوسٹس نے لا کر دے دیے۔

بابرہ نے شکریہ ادا کیا اور ہم سے کہا۔ "آپ کی وجہ سے آج مجھے بھی یہ چیزیں مل گئیں۔"

کراچی ائرپورٹ پر پہنچے تو صبح کے ڈھائی یا تین بجے تھے۔ بابرہ کی دونوں بہنیں ائرپورٹ پر انہیں لینے آئی تھیں۔ ہم سے بھی صاحب سلامت ہوئی۔

ہم نے کہا۔ "اچھا بابرہ خدا حافظ۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"لاہور کی فلائٹ میں سیٹ بک کرائی ہے۔"

"دیکھیے آفاقی صاحب آپ اس وقت میرے ساتھ چلیں گے۔"

"مگر ہماری سیٹ؟"

"وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

ان کی بڑی بہن الماس نے کہا۔ "آپ فکر نہ کیجیے لاہور کے لیے جو پہلی فلائٹ جائے گی اس میں آپ جائیں گے۔ یہ گارنٹی ہے۔" ہمیں یقین تو نہیں تھا مگر ان لوگوں کے مخلصانہ اصرار کی وجہ سے مجبور ہو گئے اور ان کی کار میں سوار ہو گئے۔ گھر پہنچے تو سارے گھر کی روشنیاں جل گئیں جیسے دن نکل آیا ہو۔

"آفاقی صاحب فریش ہو جایئے۔ وہ رہا غسل خانہ۔ یہ رہا آپ کا سوٹ کیس۔"

ہم نے موقع غنیمت جانا غسل خانے میں جا کر شیو بنائی۔ نہا کر لباس تبدیل کیا۔ لاؤنج میں آئے تو وہ تینوں بہنوں کے قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر انہوں نے کہا۔ "اب تو صبح ہونے والی ہے سو کر کیا کریں گے آیئے باتیں کرتے ہیں۔ چائے پئیں گے یا کافی؟" ہم نے چائے کی فرمائش کر دی مگر لاہور کی سیٹ کی فکر پڑی ہوئی تھی۔

"ہماری سیٹ؟"

"آفاقی صاحب فکر نہ کیجیے آٹھ بجے کی فلائٹ میں آپ کی سیٹ بک ہو گئی ہے۔ ہم خود آپ کو ائرپورٹ چھوڑ آئیں گے۔" اس طرف سے ہم بے فکر ہو گئے۔ باقی وقت گپ شپ میں اور لطیفہ بازی میں گزرا۔ چھ بجے سے ہم نے کہنا شروع کر دیا کہ ہمیں ائرپورٹ پہنچا دیں۔

"آفاقی صاحب آپ بے فکر ہو جائیں۔ پی آئی اے کا ہوائی جہاز آپ کے بغیر نہیں اڑے گا۔"

سات بجے گھر سے نکلے ساڑھے سات بجے ائرپورٹ پہنچ گئے۔ ان دنوں تلاشی وغیرہ کا دستور نہیں تھا۔ ان تینوں بہنوں کو خدا حافظ کہہ کر ہم لاؤنج میں گئے اور آٹھ بجے کی فلائٹ سے روانہ ہو گئے۔

لاہور میں گھر پہنچ کر جب ہم نے پی آئی اے کا دیا ہوا پیکٹ کھولا تو اس میں چاکلیٹ، پرفیوم کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں اور بچوں کے کھیلنے اور پینٹ کرنے کا سامان موجود تھا۔

"یہ سب کہاں سے آیا ہے؟"

"بابرہ شریف نے دیا ہے۔" ہم نے جواب دیا اور بھی تھا۔ ابھی بھی بہت سی باتیں قطار باندھے کھڑی ہیں مگر فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ وہ زمانہ اور اس زمانے کے لوگ۔ کہاں چلے گئے۔ اب گیا وقت دوبارہ بھی واپس بھی آئے گا مگر گزرا ہوا زمانہ کب واپس آتا ہے۔

☆☆☆

جو لوگ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان میں حقیقت پسند اور آرٹ فلمیں نہیں بنائی گئیں وہ بہت بے خبر ہیں۔ پاکستان میں ایسی کئی فلمیں بنائی گئیں لیکن بد قسمتی سے کسی فلم کو بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ لاہور اور کراچی میں "دور ہے سکھ کا گاؤں"، "نیلا پربت"، "دھوپ اور سائے" وغیرہ بنائی گئیں مگر کوئی ایک فلم بھی کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ، بات اور اسباب کیا ہیں یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔

معروف شاعر مصنف اور ہدایت کار سرور بارہ بنکوی نے بھی ڈھاکا میں ایک حقیقت پسندانہ فلم بنائی تھی جس کا نام "آخری اسٹیشن" تھا۔ اسے خالص آرٹ فلم تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہ حقیقی زندگی سے بہت زیادہ قریب اور ایک خوب صورت فلم تھی جسے اوسط درجے کی کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

اس کے فلم ساز، مصنف، نغمہ نگار اور ہدایت کار وہ خود ہی تھے۔ دراصل اس فلم کی کہانی مشہور افسانہ نگار ہاجرہ مسرور کے افسانے "پگلی" سے اخذ کی گئی تھی۔ پگلی ایک بہت انوکھا اور مشکل کردار تھا جسے اداکارہ شبنم نے بہت عمدگی سے ادا کیا تھا۔ فلم کی کہانی مرکزی کردار پگلی کے گرد گھومتی تھی جس کا نام چنبیلا تھا۔ اس فلم کی خاص بات یہ بھی تھی کہ ایک عام سی فلم کو سرور بارہ بنکوی کی مہارت اور ہنر مندی نے آرٹ فلم کا درجہ بھی دے دیا تھا۔

آیئے پہلے فلم "آخری اسٹیشن" کی کہانی سنیے۔ ایک غریب گھرانے کی کہانی ہے۔ فلم کی ہیروئن چنبیلا (شبنم) کی شادی کی تقریب تھی۔ مہمان موجود تھے۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں لیکن عین وقت پر دولہا کے لالچی والد (مرزا شاہی) نے دلہن کے باپ سے کہا کہ اس کو ایک ہزار روپے ادا کیا جائے ورنہ برات واپس چلی جائے گی۔ ہیروئن کا باپ بہت غریب تھا۔ خدا جانے کس طرح اس نے اپنی بیٹی کی شادی کا بندوبست کیا تھا۔ ایک ہزار روپیا ادا کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اس نے بہت منت سماجت کی لیکن دولہا کے باپ کا دل نہ پگھلا نتیجہ یہ ہوا کہ برات واپس چلی گئی۔ یہ غم اور یہ رسوائی ہیروئن کا باپ برداشت نہ کر سکا اور مر گیا۔

برات کی واپسی کا دکھ کیا کم تھا کہ محبت کرنے والا باپ بھی اچانک دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ان پے در پے صدمات اور لوگوں کی باتوں کی وجہ سے ہیروئن اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ سکی اور ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اس دنیا میں کوئی اور نہ تھا اس کا۔ وہ ہوش و حواس کھونے کے بعد پاگل ہو گئی۔ بستی میں وہ جس طرف سے گزرتی بچے پگلی پگلی کا شور مچاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگتے اور پتھر مارتے تھے۔ بچے اس کو طرح طرح سے پریشان بھی کرتے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے وہ بستی سے دور ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی جاتی ہے۔ ریلوے کے مسافروں سے وہ صرف ایک چیز مانگتی تھی۔ اکثر مسافر اس پر ترس کھا کر یہ معمولی خواہش پوری کر دیتے تھے۔

فلم کا دوسرا اہم کردار ریلوے کا ایک انجینئر تھا جس کا نام جمیل (اداکار ہارون) تھا۔ وہ ایک با اصول اور دیانت دار افسر تھا لیکن بد دیانت افسروں کو اس کا یہ رویہ سخت ناپسند تھا۔ ان ہی افسروں میں محفوظ بھی شامل تھا جو اسٹیشن ماسٹر کی بیٹی فوزیہ سے محبت کرتا تھا۔ فوزیہ محفوظ کے کردار سے بخوبی واقف تھی اس لیے اس کو سخت ناپسند کرتی تھی مگر فوزیہ (رانی) کی ماں ایک لالچی عورت تھی اور رشوت خوری کے روپے کے باعث محفوظ کے ساتھ بیٹی کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ ہارون بھی فوزیہ کو پسند کرتا تھا اس طرح یہ باہمی پسند کا معاملہ تھا۔

ہارون ایک نیک دل نوجوان تھا۔ وہ پگلی پر ترس کھا کر اس سے ہمدردی کا اظہار اور اس کی مدد بھی کرتا رہتا تھا لیکن ہارون نے جب رانی کے باپ سے رشتہ مانگا تو اسٹیشن ماسٹر فوراً رضامند ہو گیا۔ شادی طے ہونے کے بعد ہارون اپنے گھر چلا گیا تاکہ برات لے کر شادی کے لیے آئے۔

محفوظ کو بھی ان تمام باتوں کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے ریلوے کے ایک ملازم (شوکت اکبر) کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ہارون جس ٹرین سے برات لے کر آئے گا اس کو آنے والی مال گاڑی لائن پر ڈال دیا۔ اس طرح ہارون کی برات ٹرین حادثے کا شکار ہو جائے گی۔ شوکت اکبر ایک ٹانگ سے محروم تھا اور پگلی سے محبت کرتا تھا۔ وہ رشوت کے لالچ میں تیار ہو گیا کہ حاصل ہونے والے روپے سے اپنی ٹانگ کا اور پگلی کا علاج کرائے گا لیکن جب ٹرین آنے والی تھی تو اس کے ضمیر نے فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ آنے والی ٹرین کو صحیح لائن پر تبدیل کرنے لگا۔ محفوظ جو اس کی نگرانی کر رہا تھا اس نے شوکت اکبر کی یہ حرکت دیکھ کر اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اب مال گاڑی اسی لائن پر آنے والی تھی جس پر ہارون کی بارات آ رہی تھی۔ پگلی بھی یہ سب دیکھ رہی تھی اس نے ٹریک تبدیل کر کے آنے والی ٹرین کو صحیح لائن پر ڈال دیا۔ محفوظ نے غضب ناک ہو کر اس پر حملہ کیا تو پگلی نے اسی کے پستول سے محفوظ کو گولی مار دی اور وہ موت کے گھاٹ اتر گیا۔ پولیس موقع پر پہنچی تو اس نے پگلی کے ہاتھ میں پستول اور دو لاشوں کو دیکھا اور پگلی کو گرفتار کر کے لے گئی۔ اس منظر پر فلم ختم ہو گئی۔

سرور بارہ بنکوی نے اس فلم کو خالص آرٹ فلم بنانے کی کوشش کی تھی لیکن منظر کشی اور اداکاری کا معیار بہت بلند تھا۔ فلم میں روایتی فلموں کی طرح عشق و محبت، نغمات وغیرہ بھی کچھ تھا لیکن انداز میں انفرادیت اور حسن تھا جس کی وجہ سے یہ ایک یادگار کلاسیکل فلم کا درجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ فلم کا اسکرین پلے بہت مضبوط اور رواں تھا۔ مکالمے بہت اچھے، مختصر اور برجستہ تھے۔ سب سے بڑی خوبی شبنم کی اداکاری تھی۔ ہدایت کار نے حقیقی ماحول پیدا کرنے کے لیے اصلی لوکیشنز پر فلم بندی کی تھی جس نے فلم کی انفرادیت اور کشش میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اس وجہ سے اس فلم کو آرٹ فلم

کا درجہ دیا گیا۔
فلم کے نغمات سرور بارہ بنکوی نے حالات کے مطابق بہت اچھے اور سادہ الفاظ میں لکھے تھے جو احمد رشدی اور اختر عباس کی آوازوں میں صدا بند کیے گئے تھے۔ گانوں کی فلم بندی کے لیے بستی، ریلوے اسٹیشن اور ریلوے کے ڈبوں کی لوکیشنز استعمال کی گئی تھیں۔ ان تمام چیزوں نے اس فلم میں ایک انوکھا پن پیدا کر دیا۔
شبنم نے اپنے آپ کو اس کردار میں اس طرح ڈھالا تھا اور اتنی بے ساختہ اداکاری کی تھی کہ اس پر حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔ اس فلم کو شبنم کی اداکاری کے اعتبار سے اس کی بہترین فلموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کرداروں میں بھی اچھے اداکاروں سے کام لیا گیا اور سب نے بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ چھوٹے چھوٹے مختصر کردار کسی بھی فلم کی جان ہوتے ہیں جبھی اداکاروں سے ہدایت کار نے بہت اچھا کام لیا تھا۔ اے آر ناصر اس فلم کے عکاس تھے ان کی بے عیب اور خوب صورت عکاسی نے فلم کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ انہوں نے رات کا وقت، ریلوے اسٹیشن اور دوسرے مناظر کی عکاسی میں بھی ہنرمندی اور بلند خیالی کا مظاہرہ کیا تھا۔ عطاءالرحمٰن خان اس کے موسیقار تھے۔
یہ فلم 26 نومبر 1965ء کو نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی لیکن کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی تاریخ کو ہماری اور حسن طارق صاحب کی فلم ''کنیز'' بھی ریلیز ہوئی تھی جس میں بڑے نامور اداکاروں کا جھمگھٹا تھا۔ اس کے برعکس آخری اسٹیشن میں کوئی بڑا نام شامل نہیں تھا لیکن تعلیم یافتہ فلم بینوں اور نقادوں نے فلم ''آخری اسٹیشن'' کو بہت سراہا تھا۔ اس فلم کی کہانی کے لیے ہاجرہ مسرور اور بہترین اداکاری کے لیے شبنم کو نگار ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

☆☆☆

جن لوگوں کے ساتھ جوانی اور اس کے بعد کا زمانہ گزارا۔ دن رات اسٹوڈیوز میں ساتھ رہا، ساتھ کام کیا۔ گپ شپ کی، ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا رہا۔ جو کسی زمانے میں پاکستان کی فلمی صنعت کے ستون کہلاتے تھے وہ ہنستے بولتے اور دل لگا کر کام کرنے کا دور اب کہاں چلا گیا۔ وہ لوگ کہاں گئے جن سے روز کی ملاقات تھی اور رشتے داروں سے زیادہ قربت اور محبت تھی۔ اب وہ کہاں چلے گئے وہ دن وہ رات کیا ہوئے۔
پچھلے دنوں جرمنی سے ایک فون آیا۔ خاتون بول رہی تھیں جن کا نام یاد نہیں رہا۔
''معاف کیجیے آپ کو بے وقت تکلیف دے رہی ہوں۔'' اس وقت لاہور میں دن کے بارہ بجے تھے۔
''نہیں نہیں، کوئی بات نہیں۔ آپ کیسے اتنی دور سے کیوں یاد کیا؟''
بولیں۔ ''آفاقی صاحب پاکستان کی فلم انڈسٹری اس سے تعلق رکھنے والے ممتاز لوگوں کے بارے معلومات حاصل کرتی ہوں تو بہت مشکل پیش آتی ہے صرف آپ ہی کا نام یاد آیا اور ایسے لوگ اب رہے نہیں جن سے معلومات حاصل کی جائیں۔ ہم پاکستانی فلمی صنعت کے ابتدائی زمانے کے لوگوں کے بارے میں اردو پروگرام کر رہے ہیں۔ یاد ہے آپ کو پہلے بھی مالا اور چند دوسرے فنکاروں کے بارے میں تکلیف دیتی رہی ہوں۔''
انہیں یاد آ گیا۔ یہ بھی یاد آیا کہ ان کا نام غالباً شہناز ہے۔ وہ پاکستان کے اولین فلم بینوں کے اور خو رضا میر صاحب کے بارے میں دریافت کر رہی تھیں۔ اور حسن کے علاوہ ہر بات مجھے یاد ہے جیسے کہ کل ہی کی ہے۔ انہیں رضا میر صاحب کے بارے میں کچھ معلو معلوم کرنی تھیں اور کچھ کی تصدیق کرنی تھی۔
انہیں رضا صاحب کے بارے میں بتا کر بہت خوشی ہوئی۔ دراصل پرانے زمانے اور پرانے لوگوں کے بارے میں کوئی دریافت کرتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ اس بہانے بہت سی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ انہیں جو معلومات درکار تھیں وہ فراہم کیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ بتا دیا۔ بات طویل ہو گئی تھی۔ انہوں نے شکریہ ادا کر کے بند کر دیا۔ فون تو بند ہو گیا مگر یادوں کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ ایک سیلاب کی طرح یادوں کا ریلا اور دل و دماغ کو سیر کر گیا۔
رضا صاحب کے بڑے صاحب زادے آصف رضا میر جو امریکا چلے گئے تھے۔ چند سال قبل پاکستان واپس آ گئے ہیں اور ٹیلی وژن پروڈکشن میں کامیاب ہیں۔ آصف رضا ہمارے سامنے فلموں میں آئے۔ ہمارے سامنے لا میں ان کی شادی ہوئی۔ ہمارے سامنے انہوں نے ا کامیاب ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلائی جو کچھ عرصے بعد ہو گئی۔ اس میں عظمیٰ گیلانی بھی ان کی شریک کار تھیں۔ آصف

رضا میر امریکا یا کینیڈا چلے گئے۔ رضا صاحب اور ان کی بیگم سے ملنا جلنا جاری رہا۔ ہم اس زمانے میں فلم سازی چھوڑ چکے تھے۔ رضا صاحب بھی فلموں سے دستبردار ہو چکے تھے۔ بس ادھر ادھر کی باتیں اور پرانے دور کی یادیں تازہ کرتے رہتے تھے پھر سنا کہ رضا صاحب آصف کے پاس چلے گئے ہیں۔ ہم ان دنوں پاکستان میں نہیں تھے۔ واپس آئے تو یہ خبر ملی۔ سوچا رضا صاحب واپس آئیں گے تو شکوہ کریں گے کہ بتائے بغیر ہی سمندر پار چلے گئے مگر رضا صاحب واپس لوٹ کر نہ آئے۔ ان کے انتقال کی خبر آ گئی۔ کئی سال سے وہ نظروں سے اوجھل تھے مگر دوبارہ ملنے کی آس تو تھی۔ اس خبر کے ساتھ وہ بھی ختم ہو گئی۔
ان سے ہماری شناسائی اس وقت ہوئی تھی جب فلمی صحافت کے سلسلے میں ہم نے اسٹوڈیوز میں آنا جانا شروع کیا تھا۔ ان ہی دنوں سارے فلم والوں سے جو شناسائی اور تعلقات قائم ہوئے وہ ہمیشہ ویسے ہی رہے۔ ہدایت کار لقمان نے رضا صاحب سے ملوایا تھا۔
''یہ رضا میر ہیں، پاکستان کے سب سے پہلے کیمرا مین۔ پاکستان بننے سے پہلے اسسٹنٹ تھے اب ان کے بہت سے شاگرد ہیں۔ استاد ہو گئے ہیں یہ۔''
رضا صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ ایک خوبرو شخص ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ سانولی رنگت مگر ملاحت کے ساتھ۔ ناک ایسی باریک اور ستواں جیسے یونان کا کوئی دیوتا۔ پتلے پتلے ہونٹ، بڑی بڑی خمار آلود خوبصورت آنکھیں، اکہرا جسم، دیکھنے میں بالکل بلڈر نظر آتے تھے۔ وہ بہت خوبصورت اور پُرکشش انسان تھے۔ ان کی شخصیت مرعوب کن تھی۔ وجاہت اور وقار ان کی دو نمایاں خصوصیات تھیں۔ بات کم کرتے تھے، ہنستے رہتے تھے اور مسکراتے رہتے تھے۔ ان کی مسکراہٹ میں بڑی جاذبیت تھی۔ اس وقت تک ان کے سر پر خاصے بال تھے جو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئے مگر اس کے باوجود ان کی وجاہت اور دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا۔
لقمان صاحب نے ایک اور دراز قد اور خوبصورت شخص سے ملوایا۔
''یہ افضل حسین ہیں، ساؤنڈ ریکارڈسٹ۔''
افضل صاحب بھی خوبرو تھے۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ رضا صاحب اور ان کی جوڑی مشہور تھی۔ کام کے اوقات میں اور اس کے بعد بھی وہ اکثر ساتھ ہی رہتے تھے۔
بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پاکستان ٹائمز کے چیف رپورٹر امجد حسین کے بھائی ہیں جو افسانہ نگار بھی تھے مگر افسانے اردو میں لکھتے تھے۔ دونوں بھائیوں میں کافی مشابہت تھی۔ امجد صاحب سے پاکستان ٹائمز اور دیگر مقامات پر اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی۔
رضا صاحب اور افضل صاحب بظاہر دو مختلف مزاجوں کے لوگ تھے مگر آپس میں ایسے گھل مل گئے تھے کہ فلم انڈسٹری میں ہنسوں کی جوڑی کہلاتے تھے۔ دونوں اپنے اپنے کام میں ماہر تھے۔ کچھ عرصے بعد ان دونوں نے ایک فلم ساز ادارہ قائم کیا جس کی پہلی فلم ''لاکھوں میں ایک'' تھی۔ شمیم آرا اور اعجاز اس میں مرکزی کردار تھے۔ مصطفیٰ قریشی کو پہلی بار فلم میں پیش کیا تھا۔ ضیا سرحدی اس کے مصنف تھے۔ یہ بطور ہدایت کار رضا صاحب کی پہلی ذاتی فلم تھی اور کیا خوب فلم تھی۔ پوری فلم ایک مصور کی تصویر کی طرح تھی۔ نثار بزمی کی موسیقی، تنویر نقوی اور سرور انور کی نغمہ نگاری نے اس میں چار چاند لگا دیے تھے اور فلم کے دوسرے اداکاروں میں ساقی، طالش بھی شامل تھے۔ اس فلم کی موسیقی نے دھوم مچا دی تھی۔ اسے پاکستان کی یادگار فلموں میں شمار کیا جاتا ہے جسے چھ نگار ایوارڈز ملے تھے۔ اس سے قبل وہ اقبال شہزاد کی فلم ''بیٹی'' کی ہدایت کاری کر چکے تھے۔ یہ بھی ایک یادگار فلم تھی۔ رضا صاحب جب ہدایت کار بنے تو انہوں نے عکاسی ترک کر دی۔ ان کے شاگرد رشید کامران مرزا ہی ان کی فلموں کی عکاسی کرتے رہے۔ وہ بھی اپنی جگہ ایک استاد تھے۔ کئی نامور شاگرد چھوڑ گئے ہیں۔ ہماری کئی فلموں کے عکاس کامران مرزا ہی تھے۔
پاکستان میں جن کیمرا مینوں نے ہدایت کاری کے فرائض بھی ادا کیے ان میں سب سے پہلے تو اے حمید ہیں جو بھائیا حمید کے نام سے مشہور تھے۔ وہ قیام پاکستان سے پہلے کے عکاس تھے اور کلکتہ کی فلموں میں بھی عکاسی کر چکے تھے۔ بھائیا حمید ہماری پہلی لکھی ہوئی فلم ''ٹھنڈی سڑک'' کے ہدایت کار بھی تھے۔ جن دوسرے عکاسوں نے ہدایت کاری کے فرائض سنبھالے اور بہت کامیاب بھی رہے ان میں جعفر شاہ بخاری، ان کے بھائی ریاض بخاری (اور اب ان کے بیٹے فیصل بخاری) جان محمد اور سعید رضوی کا بھی ذکر ہیں۔ فیصل بخاری موجودہ دور (2010-11ء) کے ہدایت کار ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر ٹی وی ڈراموں کی ہدایت کاری کی ہے اور بہت اچھے ہدایت کار ہیں۔

پاکستان کی پہلی فلم ''تیری یاد'' دراصل قیام پاکستان سے پہلے شروع ہوئی تھی۔ اس کے فلم ساز اور مصنف دیوان سرداری لعل تھے۔ موسیقی عنایت علی ناتھ نے مرتب کی تھی۔ جو فلم کی ہیروئن آشا پوسلے کے والد تھے۔ اس فلم کے ہدایت کار داؤد چاند تھے۔ قتیل شفائی اور تنویر نقوی نغمہ نگار تھے۔ پلے بیک آوازیں آشا پوسلے، علی بخش ظہور، منور سلطانہ نے فراہم کی تھیں۔ خادم محی الدین نے مکالمے تحریر کیے تھے۔

اس فلم میں مرکزی کردار ناصر خان اور آشا پوسلے نے ادا کیے تھے۔ ناصر خان دلیپ کمار کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ پاکستان کی ابتدائی چند فلموں میں کام کرنے کے بعد ہندوستان چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ یہ فلم پاکستان بننے کے بعد ریلیز ہونے والی پہلی فلم ہے اس لیے پہلی پاکستانی فلم کہلاتی ہے ورنہ سب سے پہلے ہدایت کار لقمان کی فلم ''شاہدہ'' کی شوٹنگ شروع ہوئی تھی۔ ''تیری یاد'' زبردست فلاپ ہوئی تھی۔ شاہدہ کا حشر بھی اچھا نہ ہوا لیکن تیری یاد سے بہتر تھی۔

رضا میر فلموں میں عکاس بننے کے لیے آئے تھے مگر ہدایت کار برکت نے انہیں اسسٹنٹ کیمرا مین کے ساتھ فلم کا ہیرو بھی منتخب کرلیا۔ اس فلم میں بینا (شوری) ان کی ہیروئن تھیں۔ سید امتیاز علی تاج اس کے مصنف اور موسیقار پنڈت امرناتھ تھے۔ فلم کا نام ''شہر سے دور'' تھا۔ اس فلم میں رضا میر بھی ایک مرکزی کردار میں تھے۔ اداکار کی حیثیت سے یہ رضا میر کی پہلی اور آخری فلم تھی۔

قیام پاکستان کے بعد ہندو ہنرمند چلے گئے تو مسلمانوں نے ان کی جگہ سنبھالی اور رضا میر کیمرا مین ہوگئے۔

بینا شوری (صرف بینا سے ان کی شناخت نہیں ہوتی) شہر سے دور میں کام کرنے کے دوران میں رضا صاحب کے قریب ہوگئیں اور پھر ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اس شادی کے بارے میں رضا صاحب ہمیشہ خاموش رہے۔ اگر کوئی صحافی دریافت بھی کرتا تو ٹال دیا کرتے تھے مگر ہم نے ان کے امریکا جانے سے کچھ عرصہ قبل خاص طور پر ان سے انٹرویو لیا۔ اس سوال پر وہ بہت سٹپٹائے اور ٹالنے کی کوشش کی مگر ہم پیچھے پڑ گئے تو مجبوراً انہوں نے اس موضوع پر لب کشائی کی۔

بینا سے شادی کے تذکرے پر وہ کچھ مضطرب سے ہوجاتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دراصل ہمارا گھرانہ متوسط خیالات کا حامل تھا۔ بینا نے شادی کا کہا تو میں انہیں بہت سمجھایا اور بتایا کہ شادی کے بعد تمہیں میرے گھر میں رہنا ہوگا اور اداکاری ترک کرنی پڑے گی۔ بینا نے شرائط مان لیں۔ شادی کے بعد وہ رضا صاحب کے گھر رہیں۔ فلموں میں کام بھی نہیں کیا مگر یہ ان کے شباب تھا۔ فلموں میں انہیں اپنا مستقبل بہت تابناک نظر آتا تو فلمی دنیا کی چمک دمک کے بعد گھروں کی سادگی اور چہرہ زندگی کیسے گوارا ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ کچھ عرصہ بعد یہ شادی ختم ہوگئی۔

رضا صاحب کو اس کا کوئی افسوس نہ تھا بلکہ احساس شرمندگی تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بینا بھی پاکستان آگئیں اور یہیں کی ہو رہیں۔ کئی فلموں میں بھی کام کیا مگر فلم میں رضا صاحب سے واسطہ نہیں پڑا۔ شاید یہ دونوں کبھی آمنے سامنے بھی نہیں ہوئے۔

رضا صاحب ایک لاجواب کیمرا مین تھے۔ اچھے سمجھدار کیمرا مین کی نظر ایک ہدایت کار، ایڈیٹر اور آرٹسٹ کی نظر بھی ہوتی ہے اسی لیے کیمرا مین اکثر بہترین ہدایت کار ثابت ہوتے ہیں۔ ہالی ووڈ میں بھی کیمرا مین جب ہدایت کار بنتے ہیں تو بہت نامور اور کامیاب ہوتے۔ رضا میر صاحب خود بھی نہ صرف ہدایت کاری کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے بلکہ ہدایت کاری کا شوق بھی تھا۔ اس لیے جب فلم ساز اقبال شہزاد نے انہیں اپنی فلم ''بنجی'' کی ہدایت کاری کی پیش کش کی تو انہوں نے فوراً قبول کرلی۔ ایک اچھے فلم ساز کے ساتھ کام کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ ہدایت کار کی تمام ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں اور ایک بہت اچھی فلم بنتی ہے۔

''بنجی'' بھی ایک بہت معیاری اور کامیاب فلم تھی۔ بنجی میں نیلو اور اعجاز نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ طالش، ناصرہ، رخسانہ بھی اداکاروں میں شامل تھیں۔ بنجی کرداروں کے لیے ایک بہت پیاری بچی کو چنا گیا تھا جو اقبال شہزاد کی رشتے دار بھی تھی۔ اس کا فلمی نام گڈو رکھا گیا تھا۔

ایسٹرن اسٹوڈیو کراچی میں اقبال شہزاد ریکارڈسٹ تھے۔ بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور انگلستان سے تعلیم و تربیت حاصل کرکے آئے تھے۔ ہمارے بہت اچھے دوست تھے۔ کراچی میں بھی ان سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ وہ لاہور بھی آتے رہتے تھے۔ ان کا سارا خاندان لاہور ہی میں تھا۔ دوست احباب بھی یہیں تھے۔ اقبال شہزاد کے کئی بھائی تھے جو اپنے اپنے شعبوں میں مصروف تھے۔ لاہور میں بھی انہیں

اور ان کے خاندان کو جانتے تھے۔

انہیں فلم سازی کا شوق ہوا تو کراچی میں پہلی فلم ''رات کے راہی'' بنائی جس کے ہدایت کار اقبال یوسف تھے۔ رابن گھوش جو مشرقی پاکستان سے آئے تھے ان کے موسیقار تھے اور ان کی فلموں کی موسیقی دیتے رہے۔ کراچی میں اقبال شہزاد نے فلم ''بنجارن'' بنائی جس کی داستان بیان کرچکے ہیں۔ نیلو اور کمال اس فلم کے مرکزی کردار تھے۔ موسیقی دیبو نے بنائی تھی۔ مصنف ذاکر حسین تھے۔ اس کے ہدایت کار حسن طارق تھے۔ بنجارن کی موسیقی اور نیلو کی اداکاری نے بہت دھوم مچائی تھی مگر اس پر نکتہ چینی اور اعتراضات بھی ہوئے یہاں تک کہ ڈھاکا میں ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں اس کے بارے میں سوال بھی پوچھا گیا کہ ایسی قابل اعتراض فلم کی نمائش کی اجازت کیوں دی گئی مگر فلم چلتی رہی۔ اقبال شہزاد، حسن طارق، نیلو اور کمال کے علاوہ دیبو نے بھی بہت شہرت حاصل کی اور یہ سب کے سب معروف اور مقبول ہوئے۔

رضا صاحب کو بطور ہدایت کاری، موسیقی کا بہت اچھا شعور تھا۔ ان کی تمام فلموں کی موسیقی بہت دلکش اور مقبول ہوتی تھی۔ وہ ان ہدایت کاروں میں سے تھے جنہیں اسکرین پلے اور کہانی کے فن سے بھی آگاہی تھی۔ اداکاروں سے، فلم ساز سے کام لینے کا ڈھنگ بھی خوب جانتے تھے اور ان کی فلموں میں اداکاروں کی اداکاری لوگ بہت اچھی ہوتی تھی۔ بچوں سے کام لینا ایک مشکل کام ہے لیکن رضا صاحب نے فلم ''بنجی'' میں ایک ننھی اور ناآموز بچی سے بہت اچھا کام لیا تھا۔ اس فلم میں ایک کتے کا بھی بہت اچھا کام تھا۔ اس مقصد کے لیے فوج سے ایک تربیت یافتہ کتا منگوایا گیا تھا جس کے ساتھ اس کا ٹرینر بھی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رضا صاحب نے ہدایت کار کی حیثیت سے جو فلمیں بنائی ہیں وہ پاکستان کی بہترین اور کامیاب فلموں میں شمار ہوتی ہیں۔ انہوں نے رضیہ بٹ کا ناول ''انیلا'' بھی فلمایا تھا جس کے ندیم اور دیبا مرکزی کردار تھے۔ موسیقی نثار بزمی نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم نے اوسط درجے کا بزنس کیا تھا۔ روزینہ، نمّا، طالش، ساقی اور مصطفیٰ قریشی بھی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھے۔ حسب معمول کامران مرزا اس فلم کے بھی عکاس تھے۔

''انیلا'' کی موسیقی بہت مقبول ہوئی تھی۔ دیکھیے چند گانے شاید آپ کو ابھی تک یاد ہوں۔

1- بہت یاد آئیں گے یہ دن،

تجھے تڑپائیں گے یہ دن صنم تیری قسم (یہ گانا مہدی حسن اور مالا نے الگ الگ گایا تھا)

2- روٹھے سیاں کو کیسے مناؤں

بیدردی کچھ تجھے کیسے سمجھاؤں

3- بے چین کرگئی ہے کسی کی نظر مجھے

یاد آئے گا وہ ابھی شام و سحر مجھے

آصف صاحب کی ہدایت کاری میں بننے والی ایک فلم ''پرائی آگ'' تھی۔ اس فلم کے ہدایت کاروں میں شمیم آرا، ندیم، وزمرد، آسیہ، ساقی اور رنگیلا شامل تھے۔

حمیدہ جبیں کی کہانی کی موسیقی خواجہ خورشید انور نے بنائی تھی۔ کامران مرزا نے عکاسی کی تھی۔ یہ فلم انہوں نے فلم ساز حمید اختر کے لیے بنائی تھی مگر فلم ساز کے طور پر ان کی بیگم سعدیہ حمید کا نام دیا گیا تھا۔ اس فلم کو کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ خواجہ خورشید انور کے چند نغمات مقبول ہوئے تھے۔

''آسرا'' ان کی تیسری ذاتی فلم تھی جس کے موسیقار نثار بزمی اور عکاس کامران مرزا تھے۔ شبنم، محمد علی، رتن کمار، روزینہ، ساقی، رنگیلا، نمّا اور مصطفیٰ قریشی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھے۔ اس فلم میں محمد علی اور رتن کمار ''پھیرے'' کے روپ میں تھے۔

''آسرا'' ایک کامیاب فلم تھی۔ خصوصاً گانے بہت پسند کیے گئے تھے۔ چند گانے یہ تھے

(1) نیناں ترس کر رہ گئے

پیا آئے نہ ساری رات

(2) موسم بہار کا ہے

من کے ستار کا ہے، آجا آجا رے ساجنا

(3) اے حسین نازنین

یہ تیرا پھول سا چہرہ، یہ ستاروں سی جبیں

(4) جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا

کہتے ہیں جو رہا گا کس نے دیکھا

یہ رضا میر اور افضل حسین کی مشترکہ فلم تھی۔ بطور فلم ساز یہ دونوں ہی اس فلم میں ساتھ رہے۔ ان دونوں کی ایک اور مشترکہ یادگار فلم ''ناگ منی'' تھی۔ اس فلم میں وحید مراد اور رانی شامل تھے اور دونوں نے ڈبل کردار ادا کیے تھے۔ نثار بزمی نے اس فلم کی بہت خوبصورت موسیقی بنائی تھی۔ آغا طالش، قوی، سنگیتا نے بھی اہم کردار ادا کیے تھے۔ ناگ منی ایک تخیلاتی کہانی تھی جسے بہت پسند کیا گیا۔ اس فلم کے یہ گانے بہت سپرہٹ ہوئے تھے۔

(1) آج بھی سورج ڈوب گیا ہے
آج بھی تم نہیں آئے
(2) میرا ایمان محبت ہے محبت کی قسم
(3) تن تو پہ واروں
من تو پہ واروں
بگڑی بنا دے تو جسے روز پکاروں
(4) ساجنا رے
جیا ترسے نیناں برسیں
دکھیا من تجھ کو پکارے

یہ فلم صحیح معنوں میں ایک کامیاب اور نرالی فلم تھی۔ یہ ایک فرضی سرزمین کی کہانی تھی لیکن فلم کا ماحول اس انداز سے پیش کیا گیا تھا کہ اس پر حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔ فلم دیکھنے والا اسی میں کھویا رہتا تھا۔ فلم ختم ہونے پر یہ خوبصورت رنگین خواب ٹوٹ جاتا تھا اور لگتا تھا جیسے ایک نہایت خوبصورت خواب دیکھتے ہوئے اچانک آنکھ کھل گئی ہے۔

رضا صاحب نے دوسرے فلم سازوں کے لیے دو فلمیں ''آرزو'' اور ''پروفیسر'' بھی بنائی تھیں۔ ''پروفیسر'' ایک بامقصد اور اصلاحی فلم تھی جس میں تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ محمد علی نے پروفیسر کا مرکزی کردار بہت خوبی سے ادا کیا تھا۔ اس فلم میں استاد اور طالب علم کے رشتے پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس فلم میں انہوں نے جوانی سے بڑھاپے تک کا کردار کیا تھا۔ نیر سلطانہ، شبنم، شاہد اور صوفیہ بانو نے اس فلم میں اہم کردار ادا کیے تھے۔ فلم بینوں کے لیے یہ قدرے خشک فلم تھی اس لیے انہیں پسند نہ آئی۔

فلم ''آرزو'' نے بھی اچھا بزنس نہیں کیا۔ اس کے موسیقار ایم اشرف تھے۔ محمد علی، زیبا، حسنہ، اسلم پرویز، لہری، طالش اور مصطفیٰ قریشی بھی اداکاروں میں شامل تھے۔ اس کی موسیقی اچھی تھی۔ خصوصاً دو گیت بہت مقبول ہوئے تھے۔ نور جہاں اور مہدی حسن گلوکار تھے۔ اس فلم کو اوسط درجے کی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

رضا صاحب نے پنجابی فلمیں بھی بنائی تھیں۔ ان کی پہلی پنجابی فلم ''سوہنی ماہیوال'' تھی۔ اے حمید اور ایم اشرف نے موسیقی دی تھی۔ یہ فلم 1976ء میں ریلیز ہوئی تھی مگر کامیاب نہ ہوسکی۔

ان کی ایک فلم ''دل کے داغ'' 1978ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس کو اوسط درجے کی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ محمد علی، شبنم، مسعود اختر، لہری، صاعقہ اور علاؤالدین اہم کرداروں میں تھے۔ اس کی موسیقی بہت پسند کی گئی تھی۔

رضا میر کی ایک پنجابی فلم 1981ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ طافو اس کے موسیقار تھے۔ یوسف خاں، ممتاز اس کے مرکزی کردار تھے۔ بدقسمتی سے یہ فلم بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔

بات دراصل یہ تھی کہ فلمی دنیا کا ماحول بہت تبدیل ہوچکا تھا۔ فلم سازوں کی سوچ بدل چکی تھی۔ ہم نے ان سے کئی بار کہا کہ ''رضا صاحب اب فلمی دنیا آپ جیسے لوگوں کے لیے اجنبی اور ممنوع ہوچکی ہے۔ آپ اپنے مزاجوں کے خلاف فلمیں بنا رہے ہیں۔ چھوڑ دیجیے۔''

رضا صاحب کا جواب تھا۔ ''آفاقی صاحب، مجھے صرف دو کام آتے ہیں اور کوئی کام نہیں کرسکتا۔ ساری زندگی فلموں کی عکاسی اور ہدایت کاری کرتے ہوئے گزر گئی۔ کوئی کام آتا نہیں ہے۔'' وہ دراصل مجبوراً مالی ضروریات کے لیے فلمیں بنا رہے تھے مگر بےزار اور دل برداشتہ ہو چکے تھے۔

ہدایت کار کی حیثیت سے رضا صاحب کی آخری فلم ''انہونی'' تھی۔ ندیم، نیلی اس میں مرکزی کردار تھے۔ یہ 1993ء میں ریلیز ہوئی تھی لیکن یہ آخری فلم بھی کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کے بعد رضا صاحب نے بعض فلم سازوں کی پیشکش کے باوجود فلم نہیں بنائی۔ اس کے بعد وہ آصف رضا میر کے پاس کینیڈا چلے گئے تھے۔ تمام عمر ان کی صحت قابلِ رشک رہی تھی مگر کینیڈا میں ایسے بیمار ہوئے کہ سنبھل نہ سکے اور انتقال کرگئے۔ ان کی تاریخ وفات 16 دسمبر 2002ء ہے۔ اس وقت ان کی عمر 75 سال تھی۔

رضا صاحب جس قدر اچھے عکاس تھے اس سے کہیں زیادہ اچھے ہدایت کار اور اس سے بھی زیادہ اچھے انسان تھے۔ وہ انتہائی شائستہ اور بااخلاق انسان تھے۔ کبھی کسی سے تلخ کلامی یا جھگڑا نہیں کیا۔ نہ اونچی آواز میں کسی سے بات کی۔ وہ کم گو اور کم آمیز تھے لیکن جس سے مزاج اور طبیعت ملتی تھی اس سے بےحد خلوص اور محبت سے ملتے تھے اور ہمیشہ دوستی اور مراسم نبھاتے تھے۔ ایسے ہنرمند اور نفیس و اخلاق کے لوگ اب کہاں ---- ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے وہ نسل اب معدوم ہوتی جارہی ہے جس سے رضا صاحب تعلق رکھتے تھے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ زندگی بھر لاہور میں رہنے کے باوجود انہیں اس شہر کی مٹی نصیب نہ ہوئی اور وہ کینیڈا میں دفن کیے گئے۔ دیکھیے قدرت کی ستم ظریفی کون جانتا تھا کہ وہ کینیڈا میں دفن ہوں گے اور بالکل اکیلے کیونکہ آصف رضا بھی اب کینیڈا سے آگئے ہیں۔ کیسی غربت اور بےبسی کی موت!

رضا صاحب کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی زندگی میں کیا نشیب و فراز آئے۔ انہوں نے اسسٹنٹ کیمرا مین کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ 1946ء میں بننے والی فلم ''شہر سے دور'' میں وہ سائیڈ ہیرو تھے یا انہیں دوسرا ہیرو بھی کہا جاسکتا ہے لیکن اداکاری سے انہیں دلچسپی نہ تھی۔

اسی زمانے میں انہوں نے ہیروئن بینا سے شادی کی تھی جو مزاجوں کے فرق اور بینا کی بےقرار طبیعت کی وجہ سے زیادہ دیر نہ چل سکی۔ اس کے بعد انہوں نے خاندان میں شادی کی اور بہت خوش و خرم اور مطمئن زندگی گزاری۔ عکاس کے طور پر ان کی فلمیں حسب ذیل ہیں۔

1948ء۔ تیری یاد میں وہ بھائیا حمید کے معاون تھے۔
1950ء۔ میں انہوں نے ان فلموں کی عکاسی کی۔ بیلی، انوکھی داستان
1952ء۔ بھیگی پلکیں کی عکاسی کی۔
1953ء۔ گمنام کی عکاسی کی۔
1955ء۔ انتخاب، خاتون اور محفل کی عکاسی کی۔
1956ء۔ بطور عکاس ہار جیت، لخت جگر۔
1957ء۔ بطور عکاس سات لاکھ، نگار، آنکھ کا نشہ، معصوم۔
1958ء۔ سپیرا، آخری نشان کی عکاسی کی۔

اس کے بعد بھی انہوں نے چند فلموں کی عکاسی کی اور ایوارڈ حاصل کیے۔ فلم ساز کی حیثیت سے انہوں نے تین فلمیں پروڈیوس کیں۔ چھ فلموں کی ہدایت کاری کے فرائض سرانجام دیے۔

انہوں نے بہت اچھے دن گزارے۔ نام کمایا، دولت حاصل کی۔ دوست احباب بنائے۔ بہت کامیابیاں دیکھیں۔ جب دن پھرے تو بھی ان کے معمولات اور انداز میں فرق نہیں آیا۔ وہ بڑے وضع دار، خوش لباس، خوش مزاج انسان تھے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ اب دوسرا رضا میر نہیں آئے گا۔ جس طرح دوسرے وہ لوگ بھی دوبارہ نہیں آئیں گے جو اس دنیا سے ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ دنیا اچھے انسانوں سے خالی کیوں ہوتی جارہی ہے؟

☆☆☆

زمانے کے انقلابات بھی خوب ہیں۔ کیسے کیسے لوگوں نے عروج حاصل کیا اور پھر وقت کی دھول میں گم ہوگئے۔ وہ لوگ جنہیں ان کے زمانے میں پسند نہیں کیا جاتا تھا کچھ عرصے بعد بلندیوں کی انتہا تک پہنچ گئے۔

مثال کے طور پر مرزا غالب کو دیکھ لیجیے۔ اپنے دور میں انہیں زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ سب انہیں مشکل پسند کہتے تھے۔ ان کے ہم عصر ان کا مذاق اڑاتے تھے

کلام میر سمجھے اور کلام مرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب کو اپنی اہمیت کا علم تھا۔ اس لیے معترضین کو خاطر میں نہ لاتے ان کا جواب تھا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ایسا بھی نہیں ہے کہ اس زمانے میں ان کی اہمیت نہیں تھی۔ وہ ایک معزز اور خوش گو شاعر سمجھے جاتے تھے لیکن ہم عصروں کو شکایت یہ تھی کہ وہ بہت مشکل الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دراصل اردو غزل انیسویں صدی سے عشق و محبت، فراق و وصال، لب و عارض اور گیسوؤں کی حد تک پسندیدہ تھی۔ میر تقی میر اور مرزا سودا نے بہت اچھی غزلیں کہیں۔ ان کی غزلیں اس زمانے میں اتنی مقبول تھیں کہ لوگ اپنے ساتھ ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتے تھے اور اس پر بہت ناز کرتے تھے۔ غالب جیسی معاملہ بندی، نکتہ طرازی، بصیرت اور زندگی کا فلسفہ اس قدر بلند خیالی اس زمانے میں نہ تھی۔ غزل کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا۔ ابتدائی اردو شاعری بھی اسی خیال کے گرد گھومتی رہی۔ یہ اور بات ہے کہ میر، سودا، درد وغیرہ نے بہت نازک خیالی اور نزاکت طبع سے غزلیں کہی ہیں جنہیں کلاسیکی حیثیت حاصل ہے لیکن غالب کو جو بلندی اور شہرت حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہ آئی۔ یہاں تک کہ انہیں دنیا بھر میں شہرت اور عزت ملی۔ کئی زبانوں میں ان کے کلام کے ترجمے کیے گئے۔ جتنی تحقیق غالب کے کلام پر کی گئی اور دنیا بھر میں جتنا غالب کے بارے میں لکھا گیا ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ انگلستان اور امریکا میں بھی یورپین اسکالر جنہوں نے اردو سیکھی وہ غالب کے پرستار ہیں اور غالب کے کلام کے ترجمے اور تفسیریں لکھ رہے ہیں۔ غالب کے اشعار میں جو معنی پنہاں ہوتے ہیں ان کو سمجھنے سمجھانے کے لیے درجنوں بلکہ اس سے زیادہ مشہور و ممتاز اہلِ علم اور نقادوں نے تفسیریں لکھی ہیں لیکن مطالب بیان کرنے کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ غالب کی شاعری کو

الہامی کہا جاتا ہے۔ ان کے ہر لفظ اور شعر کے کئی پہلو اور کئی معنی ہوتی ہیں۔ غالب نے خود بھی کہا تھا کہ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

یہ نہ سمجھیے کہ اس سلسلے میں غالب کے کلام پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مقصد صرف یہ بیان کرنا ہے کہ غالب کو فلموں میں بھی پیش کیا گیا۔ ان کی زندگی کے بارے میں ٹی وی ڈرامے اور ویڈیوز بنائی گئی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب اردو کے خلاف تعصب عام ہو چکا تھا مرزا غالب کے نام پر فلم بنائی گئی۔ اس فلم میں گانے بھی تھے اور یہ سب غالب کی غزلیں تھیں۔ مشہور مصنف اور ہدایت کار عزیز میرٹھی اس زمانے میں انڈیا گئے تھے۔ واپسی پر انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بمبئی کے سینما میں فلم مرزا غالب دیکھی جس میں غالب کے زمانے کی زبان مکالموں میں استعمال کی گئی تھی اور فلمی گیتوں کی جگہ غالب کی غزلیں پیش کی گئی تھیں۔ سینما ہاؤس فل تھے لیکن دیکھنے والے جن میں بیشتر بمبئی کے رہنے والے تھے خاموشی سے مسحور ہو کر فلم دیکھ رہے تھے۔ پورے سینما ہال میں ایسی خاموشی تھی کہ اگر کوئی کروٹ بھی بدلتا تو آواز پورے ہال میں سنائی دیتی۔ انہیں حیرت تھی کہ مہاراشٹر کے مرہٹے اس قدر انہماک سے فلم دیکھ رہے تھے اور غالب کی غزلوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کو غالب کے کلام کا جادو ہی کہا جا سکتا ہے کہ جو ان کے اشعار کے مکمل معنی بھی نہیں سمجھتا وہ بھی ان کے اشعار سن کر متاثر ضرور ہوتا ہے۔

اس فلم میں ثریا نے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ ہیروئن کی ایک ڈومنی تھی جو مرزا اور ان کے کلام پر عاشق تھی۔ اس فلم کی موسیقی غلام محمد نے بنائی تھی۔ انہوں نے غالب کی غزلوں کو اس انداز سے پیش کیا تھا کہ سننے والے متاثر ہو جاتے اور ان سے لطف بھی اٹھاتے۔ فلم کے ہدایت کار اور فلم ساز سہراب مودی بمبئی کی پارسی برادری سے تعلق رکھتے تھے لیکن انہوں نے اہلِ زبان حضرات سے اس زمانے کے طور طریقوں، ملبوسات، رہن سہن اور آدابِ زندگی کے بارے میں تحقیق کرانے کے بعد اہلِ کمال سے مکالمے لکھوائے تھے اور اس زمانے کے ماحول کو زندہ کر دیا تھا۔ اس فلم کو بے پناہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے کافی عرصے بعد گلزار جیسے ذہین شاعر اور ہدایت کار نے غالب کے بارے میں جو طویل ویڈیو فلم بنائی اس میں اردو کے معروف ادیبوں کے تعاون کے باوجود نہ تو اس زمانے کی دلی کے رسم و رواج، رہن سہن اور طور طریقے نظر آتے ہیں اور نہ ہی وہ تہذیب دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہوں نے غالب کو سڑکوں پر پیدل چلتے، اپنے گھر کی بالکونی میں کھڑے ہو کر راہ چلتے لوگوں سے بات چیت کرتے ہوئے دکھایا ہے جو کہ اس زمانے میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس عہد کے شرفا اور رئیسوں کی طرح غالب بھی نہایت وضع دار اور رکھ رکھاؤ والے شخص تھے۔ انہوں نے کبھی پالکی کے بغیر گھر سے قدم باہر نہیں رکھا تھا۔ گلزار نے غالب کو سڑکوں پر گھومتے اور لوگوں سے بات کرتے دکھایا ہے جس کا اس زمانے میں تصور بھی نہیں تھا۔ غالب کے گھریلو حالات بھی حقیقت سے بہت دور تھے۔ اس سے بھی زیادہ افسوس اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جب پاکستان میں اس فلم کا چربہ بنایا گیا تو اس میں اس سے زیادہ غلط ماحول دکھایا گیا۔ آغا شورش کاشمیری جیسے نامور ادیب اور شاعر نے اس فلم کے مکالمے لکھے تھے۔ مکالمے بہت زوردار تھے مگر غالب کے زمانے کی زبان استعمال نہیں کی گئی۔ لباس اور رہن سہن میں بھی تحقیق نہیں کی گئی۔ اگر پرانے دلی والے کو مشیر کے طور پر ساتھ رکھ لیا جاتا تو غلطیاں نظر نہ آتیں۔ دراصل اس قسم کی فلمیں بنانے کے لیے تحقیق کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ کے آصف نے "مغل اعظم" بنانے کے سلسلے میں کیا تھا اور فلم میں حقیقت کا رنگ بھر دیا تھا۔

بیان دراصل غزل کے بارے میں کرنا تھا کہ برصغیر کی موسیقی ادھوری رہ جاتی ہے اگر یہاں غزل پر توجہ نہ دی جائے۔ ایک زمانے میں کلاسیکل موسیقی اور گائیکی کا بہت زور تھا۔ بادشاہوں کے درباروں میں بھی اس کی بہت آؤ بھگت تھی۔ تان سین جیسے گویے ہر زمانے میں بادشاہوں کے دربار کی زینت بنے رہے ہیں۔ اس زمانے میں اچھے موسیقار گائیک غزل گانے کو کمتر سمجھتے تھے لیکن بیسویں صدی میں غزل کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں اور بے شمار شائقین ان میں موجود ہوتے تھے۔ مشاعرے کی روایت کافی پرانی ہے۔ ایران اور ایشیائی ممالک میں غزل کو کافی مقبولیت حاصل تھی۔ کلاسیکی موسیقی کے مقابلے میں غزل کی بہت کم اہمیت تھی اور بڑے بڑے گائیک غزل گانے کو اچھے طریقے سے گرا ہوا سمجھتے تھے۔

1930ء، وہ زمانہ جب غزل کو بہت مقبولیت حا

ہوئیں۔ بیگم اختر (اختری بائی فیض آبادی) اور مختار بیگم نے غزل کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کی گائی ہوئی غزلوں کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ گھر گھر ان کے نام کا چرچا ہو گیا۔ غزل ہر عمر اور ہر ذوق کے لوگوں کی پسندیدہ چیز بن گئی۔ ریکارڈ ساز کمپنیوں نے جب ہندوستان میں اپنا کاروبار پھیلایا تو انہوں نے بھی غزل ہی کا سہارا لیا۔ ایک زمانے میں مشہور گلوکاروں کی غیر فلمی غزلیں اتنی مقبول ہوئیں کہ سارا ملک ان کا دیوانہ ہو گیا۔

فلموں میں اس سے پہلے گیتوں کو اہمیت دی جاتی تھی مگر غزل کی مقبولیت دیکھ کر فلموں میں بھی غزلوں کا رواج ہو گیا اور یہ دیکھا گیا کہ قریب قریب سبھی لوگ غزل کے دلدادہ ہیں۔ غزل کی مقبولیت اور دلکشی فلموں میں داخل ہو گئی تو دیکھتے ہی دیکھتے غزل کی طرزیں بنانے اور گانے والوں کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا۔ برصغیر کی فلموں میں موسیقی ایک لازمی حصہ ہوتی ہے اور فلم کی کہانی میں خاص طور پر موسیقی اور کانوں کے لیے کچھ [illegible] ڈالی جاتی ہیں۔ موسیقی کی وجہ سے فلموں کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

فلم ایک ایسا کام ہے جس میں ہر مزاج اور ذوق کے لوگوں کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے اور یہی فلموں کی کامیابی اور ناکامی میں نمایاں طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بہترین وہی فلم ہوتی ہے جسے ہر طبقے اور معیار کے لوگ پسند کریں۔ فلم سازوں نے دیکھا کہ غزل ہر خاص و عام کی پسند ہے اس طرح فلموں میں غزلوں کو رسائی حاصل ہوئی اور پھر وہ اس کا ایک لازمی حصہ بن گئیں۔ غزل سننے والوں کو مسرور کر دیتی ہے۔ اس کے اندر خوبصورت جذبات پیدا کر دیتی ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ غزلیں زیادہ دیر تک لوگوں کو یاد رہتی ہیں۔ غزلوں میں سریلے اور میٹھے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن میں نغمگی ہوتی ہے جس کی وجہ سے گانے میں مزید حسن اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔

دیکھا جائے تو ہندوستان میں غزلوں کو سب سے پہلے پرائیویٹ ریکارڈنگ کمپنیوں نے مقبول کیا تھا۔ ان کمپنیوں نے غزلیں ریکارڈ کر کے بڑے بڑے گلوکاروں کی آوازوں میں گوائیں۔ فلم والوں نے دیکھا کہ غزلیں مقبول ہو رہی ہیں اور لوگ انہیں پسند کر رہے ہیں تو انہوں نے سوچا غزلوں کو اپنی فلموں میں شامل کر لینا چاہیے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے مختار بیگم اور بیگم اختر دو ایسی گلوکارائیں تھیں جنہوں نے نہایت دلکش انداز میں غزلیں گائیں جو گراموفون ریکارڈوں کے ذریعے اتنی پسند کی گئیں کہ یہ دونوں نام گھریلو نام بن گئے۔ کون تھا جو ان کے ناموں سے واقف نہیں تھا۔ اس اعتبار سے ان دونوں گلوکاراؤں کو غزلیں مقبول عام بنانے کے سلسلے میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس راستے سے غزلیں فلموں میں داخل ہوئیں اور فلمی موسیقاروں نے انہیں مزید بناؤ سنگھار کے ساتھ پیش کیا تو یہ فلموں کے لیے رفتہ رفتہ ایک ضرورت بن گئیں۔ فلمی موسیقار زیادہ سازوں کے ساتھ بہترین طرزیں بنا کر نامور گلوکاروں کی آوازوں میں گوا کر بہت زیادہ حسین رنگ دے دیا کرتے تھے۔

اس سے پہلے اس زمانے کے نہایت معروف گلوکار کے ایل سہگل نے نہ صرف غزلیں گائیں بلکہ غالب کی غزلوں کو منتخب کیا۔ غالب کی غزلیں گانے کی وجہ سے وہ محض عوام تک محدود نہیں رہے بلکہ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ ذوق رکھنے والے طبقے میں بھی سہگل کا نام محبت اور عزت کے ساتھ لیا جانے لگا۔

سہگل کی گائیکی کا ایک نرالا اور منفرد انداز تھا۔ ان کی آواز بھی سب سے مختلف تھی۔ انہوں نے جب غالب کی غزلیں گائیں تو ان کے ذریعے غالب عوام کے دلوں میں اتر گئے۔ انہوں نے غالب کی ایسی غزلیں بھی گائیں جو عام فہم تھیں۔

مشکل غزلیں مقبول ہونے کے بعد فلم والوں کو احساس ہوا کہ ہم بھی غالب کی غزلیں پیش کر سکتے ہیں چنانچہ جب فلم غالب بنی تو موسیقار غلام محمد نے اس فلم میں غالب کی سہل غزلوں کے ساتھ ساتھ ایسی غزلیں بھی شامل کیں۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

طلعت محمود نے بھی فلموں میں غالب کی غزلیں بہت خوبصورتی سے گائیں مثلاً

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اس کے علاوہ طلعت محمود نے یہ غزلیں بھی گائیں

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی

اور

پھر وہی دیدۂ تر یاد آیا

بیگم اختری نے غالب کی جو غزلیں گائیں ان میں ایسی مشکل غزلیں بھی شامل تھیں

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مزے کی بات یہ ہے کہ یہ غزل ان کی مقبول ترین غزلوں میں شمار کی جاتی ہے۔ جب غالب کی مقبولیت بڑھی تو ہر گلوکار نے غالب کو گانا شروع کردیا۔ پاکستان کا کوئی بڑا گلوکار ایسا نہیں ہوگا جس نے غالب کی غزلیں نہ گائی ہوں یہاں تک کہ ہندوستان کے پرائیویٹ طور پر گانے والوں نے بھی غالب کی غزلیں گانی شروع کردی۔ جگجیت سنگھ کی گائی ہوئی غزلیں کس نے نہیں سنی ہوں گی۔ دیکھا جائے تو موجودہ عہد میں غالب کو عوام تک پہنچانے میں گلوکاروں اور فلموں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

غالب کی غزلوں کی پذیرائی دیکھ کر کلاسیکل گویوں نے بھی غالب کو اپنالیا جو کہ اس سے پہلے غزل گانے کو کمتر سمجھا کرتے تھے۔ استاد برکت علی خان جیسے کلاسیکل گائیک نے بھی غالب کی غزلوں کو ہی گانے کے لیے منتخب کیا۔ ان کی گائی ہوئی غالب کی غزل بے حد پسند کی گئی۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

لتا منگیشکر نے بھی غالب کی غزلیں گائیں۔ اگرچہ وہ غزلوں کو اس قدر جامع اور مکمل انداز میں نہ گا سکیں۔ ان کی گائی ہوئی یہ غزل بہت مشہور ہوئی۔

ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

محمد رفیع نے غالب کی غزلیں بہت خوبی سے گائیں۔

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

غالب کی یہ مشکل غزل بھی محمد رفیع کی آواز میں بہت مقبول ہوئی۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مکیش نے بھی غالب کی غزلیں گائیں اور وہ پسند کی گئیں خصوصاً

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی

مہدی حسن نے تو اپنی شہرت کا آغاز ہی غالب کی غزلیں گا کر کیا۔ جب ان کی گائی ہوئی یہ غزل ریڈیو سے نشر ہوئی تو مہدی حسن کی شہرت کا آغاز ہوگیا۔

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا

بے حد مقبولیت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے غالب کی یہ غزل گائی

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

فریدہ خانم اور اقبال بانو نے بھی غالب کی غزلیں بہت خلوص اور احترام کے ساتھ گائی ہیں۔ اقبال بانو تو اس معاملے میں بہت زیادہ حساس تھیں۔ محفل میں حاضرین عموماً باتیں کرتے اور چائے پینے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں جبکہ اقبال بانو غالب کی غزلوں کا آغاز کرنے سے پہلے مائیکروفون پر کہتی تھیں۔ "معزز حضرات و خواتین آپ کو جو باتیں کرنی ہیں، چائے پینی ہے، سگریٹ نوشی کرنی ہے وہ کرلیں کیونکہ کچھ دیر بعد میں غالب گا رہی ہوں۔" اور ہم نے دیکھا کہ حاضرین محفل سب ہمہ تن گوش ہوکر بیٹھ گئے۔

پاکستان کے ایک اور گلوکار جنہوں نے غالب بہادر شاہ ظفر کی غزلیں نہایت ہی خوب صورت انداز میں گائی ہیں۔ انہوں نے غالب کو بہت دور تک پھیلا دیا۔ ان کی گائی ہوئی غالب کی یہ غزل کس کو یاد نہ ہوگی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

حبیب ولی محمد پیشہ ور گانے والے نہ تھے لیکن انہوں نے شوقیہ طور پر جو بھی گایا بہت اچھا گایا۔ عام طور پر وہ غزل ہی گایا کرتے تھے۔ ہم نے یہ دیکھا اور محسوس کیا کہ گلوکاروں نے غالب کی غزلیں گائیں ان کی قدر و احترام میں اضافہ ہوگیا۔

غالب کو ابھی تک پوپ سنگرز نے نہیں گایا ہے۔ حالانکہ اقبال اور فیض کو انہوں نے اپنے انداز میں گانا شروع کر دیا ہے۔ پوپ سنگرز نے ہر طرح کی موسیقی کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ لوک گیت، پنجابی، سندھی اور پشتو نغمے گانے اب تو وہ غزلیں بھی گانے لگے ہیں، وہ دن دور نہیں جب پوپ سنگرز بھی غالب کی غزلوں کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے لگیں گے۔

غالب کو کسی زمانے میں بہت مشکل پسند شاعر کہا جاتا تھا لیکن اب وہی غالب فلموں کی زینت بن چکا ہے اور اس کے بعض علاقوں میں اس کے اشعار کے معنی نہ سمجھنے والے الفاظ کی خوبصورتی اور شعر کی نغمگی سے لطف اندوز ہو۔

ہیں۔ کسی معروف گائیک کے لیے غالب کا کلام گانا اب ایک اعزاز کی بات سمجھی جاتی ہے۔ انڈیا کی فلم غالب میں ثریا نے غالب کی غزلیں گائی تھیں۔ پاکستان میں میڈم نور جہاں نے اس نام کی فلم میں غالب کی غزلیں گائیں اور بہت داد سمیٹی۔

☆☆☆

غالب کی غزلوں کے سلسلے میں ایک گلوکار حبیب ولی محمد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اس نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں اور نئی نسل کے نوجوان تو شاید اس نام کے کسی گلوکار کے وجود سے بھی ناآشنا ہیں۔

حبیب ولی محمد قیام پاکستان کے بعد پرائیویٹ کمپنیوں کے ذریعے موسیقی کی دنیا میں متعارف ہوئے تھے۔ ان کے گانے کے انداز اور آواز کی کشش دوسرے تمام گلوکاروں سے مختلف تھی۔ وہ بہت سادہ اور دلکش انداز میں غزل گاتے تھے۔ ٹی وی کا دور آیا تو ان کی گائیکی کے کچھ پروگرام ٹی وی پر بھی پیش کیے گئے۔ جو لوگ محض ان کا نام سنا کرتے تھے انہوں نے پہلی مرتبہ اس انفرادی آواز اور لب و لہجے والے گلوکار کو دیکھا۔ ایک نہایت شائستہ شکل انسان، مناسب لباس پہنے بیٹھا نظر آیا جو خود ہی ہارمونیم بجا رہا تھا اور چند سازندے سنگت کررہے تھے۔ کسی گلوکار کا یہ روپ پہلی مرتبہ ہی دیکھا گیا۔ ان میں کسی قسم کی بناوٹ نہیں تھی۔ سادگی سے چوکی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے بڑے اطمینان سے غزل گا رہے تھے۔

حبیب ولی محمد کو شروع شروع سنا گیا تو وہ بہادر شاہ ظفر کی غزلیں گا رہے تھے اور ان ہی دل کو چھو جانے والی غم زدہ غزلوں کو انہوں نے درد بھری آواز میں گا کر امر کردیا۔

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں

بہادر شاہ ظفر کی یہ غزل انہوں نے 1941ء میں بمبئی کے ایک موسیقی کے مقابلے میں گائی تھی۔ اس مقابلے میں ہندوستان بھر سے بارہ سو سے زائد گانے والوں نے حصہ لیا تھا جن میں اس زمانے کے معروف گلوکار مکیش، چند ماتھر بھی شامل تھے۔ اس مقابلے میں حبیب ولی محمد نے پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ وہ اس وقت عنفوان شباب میں تھے۔

حبیب ولی محمد کا تعلق بمبئی کی ایک بہت اچھے میمن خاندان سے تھا۔ وہ رنگون میں پیدا ہوئے تھے لیکن بعد میں ان کا خاندان بمبئی منتقل ہوگیا تھا۔ ان کا خاندان ایک کاروباری خاندان تھا۔ متحدہ ہندوستان میں تاپائی انڈسٹریز کے نام سے اس خاندان کا بہت نام تھا۔ حبیب ولی محمد نے بہادر شاہ ظفر کی غزلوں سے اس لیے گانے کا آغاز کیا تھا کہ وہ رنگون میں پیدا ہوئے تھے جہاں ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا مزار تھا۔ انہوں نے جس بے کسی کے عالم میں انگریزوں کی قید میں زندگی کے آخری ایام گزارے تھے اور اس سے قبل جن مصیبتوں سے گزر چکے تھے اس کو سن کر ہر آنکھ آبدیدہ اور دل غمزدہ ہوجاتا ہے۔

حبیب ولی محمد کو اوائل عمر ہی سے گلوکاری کا شوق تھا انہوں نے لطافت حسین سے تربیت حاصل کی تھی جو استاد فیاض خاں کے بھتیجے تھے۔ کالج میں تعلیم کے دوران.... تقاریب میں شرکت کرتے تھے اور اپنے گانوں کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے آل انڈیا میوزیکل مقابلے میں شرکت کی اور کامیابی حاصل کی تھی۔ بمبئی سے بی اے کرنے کے بعد وہ ایم بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے امریکا چلے گئے۔ امریکا میں ان کی سوشل مصروفیات نہیں تھیں اور وہ بور ہوتے رہتے تھے۔ اسی زمانے میں انہیں غزل کی گائیکی کا شوق پیدا ہوا تھا جسے انہوں نے ہندوستان واپس آکر باقاعدہ تربیت حاصل کرکے پورا کیا اور غزل گانے والوں میں رفتہ رفتہ ان کا شمار ہونے لگا۔ وہ امریکا سے تعلیم مکمل کرکے 1940ء میں واپس آئے تھے۔

خود ان کا کہنا تھا کہ وہ اجڑے دیار میں زیادہ خوش نہیں تھے اور نئی راہیں اور منزلیں تلاش کرنا چاہتے تھے۔ ایک غزل کی ان سے فرمائش کی جاتی تھی جسے سنا سنا کر وہ بیزار ہوچکے تھے حالانکہ اسی غزل نے انہیں ہندوستان بھر میں شہرت بخشی تھی۔

انہیں ایک ترکیب سوجھی۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفر کی غزلیں اس طرح ریکارڈ کرائیں کہ ریکارڈ کے ایک جانب بہادر شاہ ظفر کی غزلیں تھیں اور دوسری جانب غالب کی غزلیں تھیں۔ ان کا یہ گراموفون ریکارڈ زیادہ مقبول نہ ہوسکا لیکن اس زمانے کی معروف..... اداکارہ مینا کماری ان کی غزلوں سے بہت متاثر ہوئیں۔ وہ شاعری کی دلدادہ تھیں اور بذات خود بھی شعر کہتی تھیں۔ اس زمانے میں ریڈیو سیلون سے ہندوستانی فلموں کے گانے نشر کیے جاتے تھے۔ گیت مالا کے عنوان سے یہ پروگرام ہندوستان بھر میں بہت شوق سے سنا جاتا تھا۔

مینا کماری کی خواہش پر ریڈیو سیلون سے حبیب ولی محمد کی غزلیں بھی پیش کی گئیں۔ جنہیں سن کر ایک زمانہ ان کا

گرویدہ ہوگیا تھا اور ان کے ریکارڈ کی فروخت میں بھی بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ اس طرح وہ ایک شہرت یافتہ گلوکار کی حیثیت سے مشہور ہوگئے۔

قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان پاکستان منتقل ہوگیا جہاں انہوں نے از سرِنو اپنا کاروبار جما لیا اور صنعت کار بن گئے۔ اس خاندان کی ملکیت میں شالیمار رسنگ طرز جیسے ادارے شامل تھے۔

فکر معاش کی طرف سے آزاد ہونے کے بعد حبیب ولی محمد کا پرانا شوق پھر ابھر آیا۔ فرصت کے اوقات میں انہوں نے غزلیں ریکارڈ کرانی شروع کر دیں۔ انہوں نے بہت شہرت اور مقبولیت حاصل کی لیکن گلوکاری ہمیشہ ان کا شوق ہی رہا۔ پاکستان میں ان کی گائی ہوئی بہادر شاہ ظفر کی غزل

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں
نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے
میں وہ ایک مشت غبار ہوں

استاد قمر جلالوی کی غزل

کب میرا نشیمن اہلِ چمن گلشن میں گوارا
کرتے
ہیں
غنچے اپنی آوازوں میں بجلی کو پکارا کرتے
ہیں

وہ اپنی غزلوں کی طرزیں بھی خود ہی بنایا کرتے تھے۔ فلم ساز اقبال شہزاد نے ان کے ایک ریکارڈ میں گائی ہوئی غزل سے متاثر ہو کر ان کی غزل اپنی فلم میں بھی شامل کر لی۔ انہوں نے چند فلموں میں غزلیں گائی ہیں۔ ان کا گایا ہوا قومی ترانہ

روشن و درخشاں تیرہ تاباں
پاکستان رہے

بھی بہت مقبول ہوا تھا۔

کچھ عرصہ قبل وہ نقل مکانی کر کے امریکا چلے گئے ہیں اور کیلی فورنیا میں اپنی بیگم کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی بیگم کا نام ریحانہ اور بیٹے کا نام ندیم ولی محمد ہے۔ ولی محمد ان کا خاندانی نام ہے۔

حبیب ولی محمد نے ایک باقاعدہ پیشہ ور گلوکار نہ ہونے کے باوجود اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کی کہ جس صاحبِ ذوق کے کانوں میں ایک بار ان کی آواز پڑ گئی وہ اس آواز کو کبھی نہ بھلا سکا۔ اپنے عہد کے نامور گلوکاروں کے جھرمٹ میں انہوں نے اپنی علیحدہ شناخت بنائی اور گلوکار کی حیثیت سے ہمیشہ کے لیے گلوکاروں کی صف میں شامل ہوگئے۔

اقبال شہزاد کی فلم میں ان کی گائی ہوئی غزل کو ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ یہ ان کے کمالِ فن کا ثبوت کہ فلمی صنعت سے غیر وابستہ اور اس زمانے کے نامور گلوکاروں کے مقابلے میں انہوں نے نگار ایوارڈ حاصل کیا تھا۔

1980ء میں موسیقار نثار بزمی نے آڈیو کیسٹ حبیب ولی محمد کی غزلیں ریکارڈ کیں جن کی طرزیں بھی بزمی نے ہی بنائی تھیں۔ انہوں نے معروف شاعرہ پر شاکر کا ایک گیت ریکارڈ کرایا تھا جس کے بول تھے۔

گوری کرت سنگھار

حبیب ولی محمد کی گائی ہوئی چند غزلیں ذیل میں پیش جا رہی ہیں۔

نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

شاعر مرزا غالب

جا کہیو ان سے نسیم سحر — شاعر بہادر شاہ ظفر
عمر آبتا کے لیے آ گا تھیا — شاعر فیاض ہاشمی
آج جانے کی ضد نہ کرو — شاعر فیاض ہاشمی

پاکستانی فلموں میں ان کے نغمے شامل کیے گئے ہیں۔

آج جانے کی ضد نہ کرو
یہ کانا ندیم پر فلمایا گیا تھا۔

آشیاں جل گیا گلستاں لٹ گیا
ہم قفس سے نکل کر کہاں جائیں گے
اتنے مانوس صیاد سے ہوگئے
اب رہائی ملی بھی تو مر جائیں گے

شاعر۔ راز الہ آبادی، فلم

☆ راتیں تھیں چاندنی فلم بازی
☆ مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں
جینے کی تمنا کون کرے فلم بازی

امریکا میں بھی حبیب ولی محمد نے غزل سرائی کا ترک نہیں کیا ہے۔ وہ امریکا کے مختلف شہروں میں میوزک کنسرٹ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے بیٹے ندیم ولی محمد بھی کے ساتھ گاتے ہیں۔ شوق جو ہوا۔

جاری۔

آئی رن وے

مختار آزاد

اس وقت کرۂ ارض دہشت گردی کے گرداب میں ہے دنیا کا کوئی خطہ نہیں بچا جہاں دہشت گردی کی وبا نہ پہنچی ہو افریقا کے اس دور افتادہ ملک میں سیاح تعطیلات گزارنے آتے تھے لیکن واپسی کے وقت ان پر جو بیتی وہ کبھی بھول نہ پائیں گے اس دن زندگی سستی ہوگئی تھی۔ کسی کا بھی زندہ بچ جانا ممکن نہ تھا مگر معجزے تو ہوتے ہیں۔ سمندر میں تیرتے ہوائی جہاز کے مسافروں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوگیا، مگر کتنے عجیب انداز میں

دہشت گردی کا ایک خونی واقعہ جسے مہذب دنیا کبھی بھول نہ پائے گی

کیپٹن لیول اباطے پرواز کے لیے تیار تھے۔ اڑان سے پہلے انہوں نے بوئنگ 767 کا آخری بار معائنی نظروں سے تنقیدی جائزہ لیا۔ فنی لحاظ سے ہر چیز درست تھی۔ ہر ممکن تسلی کرنے کے بعد وہ کاک پٹ میں آگئے۔ انہوں نے ائیر ٹریفک کنٹرول ٹاور سے رابطہ کر کے بتایا" جہاز تکنیکی لحاظ سے اڑان بھرنے کے لیے تیار ہے۔ مسافروں کو جہاز میں سوار کرایا جائے۔"

اس پیغام کے تھوڑی دیر بعد مسافر جہاز میں سوار ہو رہے تھے۔ ایتھوپیا کی قومی ائیر لائن کے فضائی بیڑے میں شامل یہ طیارہ پرواز 961 کے ذریعے مسافروں کو دارالحکومت

عدیس ابابا سے لے کر آئیوری کوسٹ جانے والا تھا۔ پرواز کو اُڑان کے بعد بارہ گھنٹے تک کا طویل سفر کرنا تھا۔ راستے میں ایک جگہ رُک کر دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے لیے مزید ایندھن بھروانا تھا۔

گھنی مونچھوں والے بیالیس سالہ پائلٹ ابا لٹے کا شمار اتھوپین کے تجربہ کار ہوا بازوں میں ہوتا تھا۔ وہ کئی سال سے جہاز اُڑا رہے تھے۔ بوئنگ 767 جیسا بڑا مسافر بردار طیارہ تھا۔ ابا لٹے کو یہ جہاز اُڑانے میں ذاتی طور پر بھی بہت مزہ آتا تھا۔ بوئنگ کا شمار ان کے پسندیدہ جہازوں میں ہوتا تھا۔ کاک پٹ میں ان کا معاون عملہ بھی مستعدی سے اپنا اپنا کام کر رہا تھا۔ ان کے برابر کی نشست پر چونتیس سالہ معاون پائلٹ یونس مرکوریا بیٹھا ہوا تھا۔ ابا لٹے کی طرح وہ بھی اُڑان بھرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی نظریں پینل بورڈ پر لگے آلات پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ چاق و چوبند بیٹھا ہوا مستعدی سے پائلٹ اور کنٹرول ٹاور کے حکم کا منتظر تھا۔

آدھا گھنٹے کے اندر اندر سارے مسافر اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ فلائٹ 961 کے کل مسافروں کی تعداد ایک سو چھیاسٹھ تھی۔ ان کا تعلق دنیا کے مختلف ممالک سے تھا جن میں زیادہ تر وہ سیاح شامل تھے جنھوں نے گرمیوں کی تعطیلات گزارنے کے لیے افریقا کی سحر انگیز سر زمین کو منتخب کیا تھا۔ اجنبی سرزمین پر قدم رکھنے کا اشتیاق اور اس جہاز میں سوار ہونے سے قبل اتھوپیا میں گزارے گئے دنوں کا خوشگوار تاثر ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ اکثر مسافر گروپ کی صورت میں سفر کر رہے تھے۔ اس وقت سب لوگ اپنی اپنی بولیوں میں ایک دوسرے سے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ جہاز پرواز ...... کے لیے آخری تیاری کر رہا تھا۔ فضائی میزبان مسافروں کا سامان درست طریقے سے کیبن میں رکھوا رہے تھے۔

جہاز کے عملے کو اطلاع دی گئی تھی کہ ایک سو چھیاسٹھ مسافر سوار ہوں گے تاہم مقررہ وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے لیکن اب تک ایسے تین مسافر نہیں پہنچے تھے جنھیں بورڈنگ پاس جاری کیے جا چکے تھے۔ لوگ بدستور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ گیٹ پر ایک ائر ہوسٹس کھڑی ہوئی اُن تین مسافروں کے آمد کی منتظر تھی جن کے آنے کے بعد جہاز کے اندر موجود زمینی عملے کو واپس جانے کا حکم دیا جاتا۔ سیڑھیاں ہٹالی جاتیں اور گیٹ بند کر دیے جاتے۔ اس کے بعد پائلٹ کو صرف ائر ٹریفک کنٹرولر کے اُڑان بھرنے کے لیے آخری حکم کا انتظار ہوتا۔ آخر وہ تینوں مسافر بھی پہنچے۔

سب سے آخر میں سوار ہونے والے یہ تینوں مسافر نوجوان اور قومیت کے لحاظ سے اتھوپیا کے شہری تھے۔ تینوں میں سے جو شخص جہاز میں سب سے پہلے داخل ہوا اس نے جسم کی ڈھیلی ڈھالی جینز، ٹی شرٹ اور سر پر ہیٹ کیپ پہن رکھی تھی۔ بورڈنگ پاس پر اس کا نام متھیا سولومن درج تھا۔ اس کے پیچھے ایلیمو بیکالی اور سب سے آخر میں سلطان نور حسن اندر داخل ہوئے۔ ان تینوں مسافروں کے اندر آجانے کے بعد پائلٹ نے زمینی عملے کو باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ جہاز کے دروازے بند کیے جا چکے تھے۔ سیڑھی بھی ہٹالی گئی تھی۔ پائلٹ نے کنٹرول ٹاور کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا اور اُڑان بھرنے کی اجازت مانگی۔ اسے چند لمحے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔

23 نومبر 1996ء کی اس صبح گیارہ بج کر دو منٹ ہو چکے تھے، جب کنٹرول ٹاور نے پرواز 961 کو اُڑان بھرنے کی آخری اجازت دی۔ جہاز کے پہیوں سے رکاوٹ ہٹالی گئیں۔ طاقتور انجنوں کی گڑگڑاہٹ کچھ تیز ہوئی اور چند لمحوں کے اندر اندر جہاز نے ٹیکسی شروع کر دی۔ جہاز کے اندر ایک فضائی میزبان مسافروں کو حفاظتی انتظامات کے بارے میں آگاہ کر رہی تھی۔ اکثر سیاح کھڑکی سے باہر جھانک کر اس سرزمین کو شاید آخری بار دیکھ رہے تھے جس کی سیاحت کی خواہش نجانے کب سے ان کے دل میں پرورش پا رہی تھی اور آخر کار وہ پیسے جمع کر کے اپنے شوق کی تکمیل کر چکے تھے۔

جہاز پر سوار دیگر مسافروں کے برعکس تینوں اتھوپین مسافر خاموشی سے اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں سے سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں ایسی چمک آرہی تھی جو ان کے دل میں موجود بے چینی کو عیاں کر رہی تھی۔ وہ تینوں بدستور خاموش تھے لیکن ان کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ وہ وقتاً فوقتاً کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشاروں سے گفتگو کر رہے تھے۔

چند منٹ بعد جہاز رن وے پر پہنچ کر رک گیا۔ اس وقت جہاز کے دونوں انجن کام کر رہے تھے۔ پائلٹ نے کنٹرول ٹاور سے ...

تحریکِ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ

1918ء کا زمانہ تھا۔ انگریز ترکی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے محسوس کیا کہ اس وقت درسگاہ سے زیادہ سیاست کا میدان اہم ہے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند سے مستقل ہو کر انھوں نے ریشمی رومال کی تحریک میں زبردست حصہ لیا۔

غیر مسلم طاقتوں سے مل کر جب ہندوستان میں انگریزوں کا تختہ اُلٹ دینا چاہتے تھے۔ اس اسکیم کی آخری کڑی یہ تھی کہ ترکی کے غازی افغانستان کی طرف سے آئیں گے اور وہ اس شیخ الہند کے ساتھ آخری منصوبہ طے ہوگا۔ انگریزوں پر یہ راز کسی طرح کھل گیا اور انھوں نے شریف مکہ کے ذریعے شیخ الہند کو گرفتار کر کے چار سال کے لیے مالٹا بھیج دیا۔ اسیری کے بعد شیخ الہند دوبارہ تشریف لائے مگر زندگی نے زیادہ دیر وفا نہ کی اور آپ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

اُن کے زمانے کی سیاست کا جھنڈا مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور کانگریس اُن کے پیچھے پیچھے چلتی تھی، لیکن حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے چلے گئے۔ 1947ء سے کچھ عرصے قبل یہ نوبت آگئی کہ سیاست کا علم ہندو کانگریس کے ہاتھ میں تھا اور مسلمان اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

ماخوذ ____________________

مرسلہ: راجہ جہانگیر قیصر، گھٹنگریلہ، تحصیل، گوجر خان

وہ کو اپنی پوزیشن سے آگاہ کیا۔ اگلے ہی لمحے اسے رن وے پر دوڑنے کی اجازت مل گئی۔ پائلٹ ٹیک آف کے لیے تیار تھا۔ اس نے عملے کو اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے کا حکم دیا اور پھر چند لمحوں تک نہایت تیز رفتاری سے دوڑنے کے بعد جہاز فضا میں اٹھا۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ اپنی مطلوبہ اونچائی تک پہنچ چکا تھا۔ پائلٹ نے ایک بار پھر تمام آلات پر نظر ڈالی۔ اونچائی بتانے والے آلات کے مطابق جہاز اکتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا تھا اور اب ہموار پرواز جاری تھی۔ پائلٹ نے سائن آن کیا۔ مسافروں سے رسمی کلمات کہے۔ حفاظتی سیٹ بیلٹ باندھے رکھنے کے نشانات بجھا دیے۔ ہر چیز درست تھی۔ موسم بھی خوش گوار تھا۔ ابا لٹے کو یقین تھا کہ سفر اچھا گزرے گا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ جہاز پر ایسی گڑبڑ رونما ہو چکی ہے جسے یہ آلات کبھی بھی ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ بظاہر ہر چیز اطمینان بخش تھی۔ ابا لٹے نے اطمینان کی سانس لی۔ اپنا سیٹ بیلٹ کھولا۔ نشست کو تھوڑا سا پیچھے کی طرف کیا۔ اس وقت جہاز آٹو پائلٹ سسٹم پر کام کر رہا تھا۔ دوسری طرف کیبن میں فضائی عملہ مسافروں کی تواضع کی تیاری کر رہا تھا۔

اچانک کاک پٹ کا دروازہ ایک زوردار جھٹکے سے کھلا۔ ابا لٹے کو اندر آنے والے نے دروازے کے پٹ پر زوردار لات مار کر اسے کھولا ہے۔ جس وقت دروازہ کھلا، ابا لٹے اطمینان سے نشست سے سر ٹکائے پینل کو دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی یہ آواز اس کے لیے نامانوس تھی۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا تھا کہ ائر ہوسٹس ان کے لیے مشروبات لے کر آئی ہوگی لیکن اگلے ہی لمحے اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک زوردار بھاری آواز گونجی۔ ”جہاز اغوا ہو چکا ہے۔“ ابا لٹے نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ ”اب تم وہی کرو گے جو ہم کہیں گے۔“ کاک پٹ میں گھسنے والے ہائی جیکر نے چلاتے ہوئے اسے حکم دیا۔ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے کہ وہ شدید ہیجان میں مبتلا ہے۔ یہ سولومن تھا۔ اس کے دوسرے دو ساتھی کاک پٹ کے باہر تھے۔ انھوں نے مسافروں کو بم کی دھمکی دے کر انھیں اپنی زد پر رکھا ہوا تھا۔ ابا لٹے کے لیے یہ صورتِ حال نہایت پریشان کن تھی لیکن وہ ایک ماہر اور تجربہ کار پائلٹ تھا۔ اسے احساس تھا کہ جہاز کے تمام مسافروں کی زندگی داؤ پر لگ چکی ہے۔ اس نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس نازک وقت میں اس کی بدحواسی کے باعث ہونے والی معمولی سی غلطی بھی ان سب کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ پائلٹ نے نرم لیکن بارعب آواز میں کاک پٹ کے اندر داخل ہونے والے ہائی جیکر سے

پوچھا۔ اس نے چند لمحوں میں ہی اپنے حواس پر قابو پالیا تھا۔ اب وہ اس اچانک پڑنے والی اُفتاد کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار نظر آرہا تھا۔

"جیسا ہم کہتے ہیں، ویسا ہی کرو۔" سولومن نے بارعب آواز میں اسے حکم دیا۔

"بہتر ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔" ابابے جانتا تھا کہ اس وقت ان کی بات مان لینے ہی میں عقلمندی کا تقاضا ہے۔

سولومن کے پیچھے پیچھے ایک اور ہائی جیکر کاک پٹ میں گھس آیا۔ یہ بیکال تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دستانے میں لپٹی ہوئی ٹینس بال جیسی کوئی چیز تھام رکھی تھی۔ "اگر تم نے ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو ہم جہاز کو تباہ کردیں گے۔" اس نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا ہاتھ لہرایا۔ "یہ دستی بم ہے.... سمجھے تم۔" وہ ایک بار پھر چیخا۔

"تم جیسا کہو گے ہم ویسا ہی کریں گے۔" ابابے نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اچانک بیکال معاون پائلٹ یونس مرکورپا پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اس پر گھونسے برسا رہا تھا۔

"اسے چھوڑ دو۔" ابابے چیخا۔ یہ سن کر اس نے یونس کو چھوڑا اور اس کی طرف لپکا۔ ہائی جیکر کی وحشت کا اندازہ اسے ہو چکا تھا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر ابابے نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ "مار پیٹ مت کرو۔" وہ چلایا۔ "ہم تیار ہیں، جیسا کہو گے، ویسا ہی ہوگا۔" ابابے ڈر گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پائلٹ پر حملہ آور ہوتا سولومن نے اسے پکڑ لیا۔ "ہوش کرو۔ ان کے پاس ہماری بات ماننے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔" اس نے بیکال کو سمجھایا۔ وہ بدستور وحشت ناک انداز میں اسے گھور رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے سولومن نے اسے باہر کی جانب دھکیلا۔ "تم باہر کی صورت حال دیکھو۔"

بیکال کے باہر نکلتے ہی فوراً احمد داخل ہوا۔ وہ بھی شدید غصے میں تھا یا شاید پہلے تاثر کے طور پر پائلٹ اور معاون کو سخت خوفزدہ کرنے کے لیے ایسا کر رہا تھا۔ اس نے کاک پٹ میں داخل ہوتے ہی دیوار پر لگے ہوئے آگ بجھانے والے سلینڈر کو اتار لیا۔ "اگر تم نے کچھ عقلمندی دکھانے کی کوشش کی تو جہاز کو تباہ کرنے سے پہلے ہی ہم تمہارا سر کچل دیں گے۔" اس نے سلینڈر کو لہراتے ہوئے انھیں دھمکی دی۔ وہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ صرف دھمکی ہی نہیں دے رہا، وقت پڑنے پر عمل بھی کرسکتا ہے۔

ابابے اور یونس دم بخود اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کی پیشہ ورانہ زندگی میں پہلی بار اس طرح کی صورت حال پیش آئی تھی۔ معاون کی طرح پائلٹ ابابے بھی سخت خوف زدہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس صورت حال کا سامنا کیا جاسکتا ہے۔ جہاز کا عملہ، یہ دونوں انتہائی اہم ارکان اور وہ ہائی جیکر سب ایتھوپیا کے شہری تھے۔ اس وقت ہائی جیکر اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ لیکن ابابے کو ان کی باتیں سننے سے زیادہ مسافروں کی فکر ستا رہی تھی۔ پائلٹ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھا کہ اس وقت جہاز کے زیادہ تر مسافر غیر ملکی تھے۔ گرمیوں کی تعطیلات منانے والے ان سیاحوں پر نہ جانے اس وقت کیا بیت رہی ہوگی۔

جہاز ہائی جیک ہوئے چند منٹ گزر چکے تھے۔ صورت حال پوری طرح واضح نہیں تھی۔ ابابے نہ تو یہ جانتا تھا کہ ہائی جیکر کتنے ہیں اور نہ ہی اسے یہ علم تھا کہ وہ کس قسم کے اسلحے سے لیس تھے۔ ایک بات جو سب سے زیادہ اسے پریشان کر رہی تھی وہ یہ کہ زمین سے انتیس ہزار فٹ کی بلندی پر فضا میں وقوع پذیر ہونے والی اس واردات سے اس وقت تک پوری دنیا بے خبر تھی۔ یہ تو وہ سمجھ رہا تھا کہ ہائی جیکروں کے کچھ مقاصد بھی ہوں گے جس کی تکمیل کے لیے یقیناً وہ ائیر ٹریفک کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کریں گے مگر ایک بات اس کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن تھی۔ ہائی جیکروں کا رویہ وحشیانہ تھا۔ جس طرح انھوں نے چند لمحے پہلے ان دونوں سے مار پیٹ کی تھی، اسے دیکھتے ہوئے ابابے ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ انتہائی جذبات میں بہ کر کوئی غلطی نہ کر بیٹھیں۔

جہاز میں اس وقت اتنا زیادہ ایندھن موجود تھا جو کئی گھنٹوں کی پرواز کے لیے کافی تھا۔ اگر ایسے میں کچھ ہوا اور اسلحہ چل گیا تو جہاز بڑی آسانی سے چند لمحوں کے اندر اندر جل کر بھسم ہوسکتا تھا۔ دوسری پریشان کن بات یہ تھی کہ یہ ایندھن طویل ترین سفر کے لیے کافی تھا۔ ایسے میں ہوسکتا تھا کہ ہائی جیکر اگلے کئی گھنٹوں تک زمین سے رابطہ قائم نہ کریں۔ اس صورت میں مسافروں کو جس شدید نفسیاتی صدمے سے دوچار ہونا پڑتا وہ ایک علیحدہ مسئلہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ اگر اس صورت حال میں کچھ کمزور دل یا ایسے عمر رسیدہ مسافر کو جو دل کے عارضے میں مبتلا ہو، دل کا جان لیوا دورہ پڑ گیا تو وہ کیا کرے گا۔۔۔ اگر ایسا ہوا تو ایک بھی

سیٹ کھڑی ہوجائے گی۔ اس صورت میں مریض کو طبی امداد دینے کے لیے درکار سہولیات اور طبی عملہ جہاز پر دستیاب نہیں تھا۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کس طرح جلد سے جلد وہ دنیا بھر کو یہ اطلاع پہنچا سکتا ہے کہ ایتھوپیا کی ائرلائن کا بوئنگ 767 وہ جس پرواز ایک سو تریسٹھ غیر ملکی مسافروں اور عملے کے ارکان سمیت ہائی جیک کرلیا گیا ہے۔

ابابے بہت تیزی سے ممکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے تو جہاز میں موجود ایندھن کی بڑی مقدار کو ضائع کرے گا۔ اس فیصلے سے وہ کئی مقاصد حاصل کرسکتا تھا۔ اول تو جہاز میں اسلحہ چل جانے کے سبب آتشزدگی اور پھر آگ کے پھیلاؤ کو کسی حد تک ٹالا جاسکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جہاز ایتھوپیا کی فضائی حدود سے باہر نکلے۔ تیسرے یہ کہ ایندھن کی کمی کے باعث وہ ہائی جیکروں کو جہاز کسی بھی قریب ترین ائرپورٹ پر اتارنے کے لیے مجبور کرسکتا تھا۔ اس صورت میں ایتھوپیا کی حکومت ہائی جیکروں کے خلاف کوئی مؤثر ایکشن کرسکتی تھی۔

ابابے کام کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن میں تیزی سے صورت حال کا تجزیہ کرنے کے علاوہ ممکنہ لائحہ عمل مرتب کرنے پر بھی غور کیے جا رہا تھا۔ اچانک کاک پٹ میں بیکال گھس آیا۔ وہ سخت غصے میں لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ "اسے باہر نکالو۔" اس نے معاون پائلٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سولومن کو مخاطب کیا۔ بیکال کے اندر آنے کے باعث سولومن کی توجہ ابابے کی طرف سے ہٹ چکی تھی۔ ابابے نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور لمحہ بھر ضائع کیے بغیر وہ تمام بٹن تیزی سے دبا دیے۔ وہ جہاز سے ایندھن پھینک رہا تھا۔ اس نے صرف دو ڈھائی گھنٹے کا ایندھن رکھ کر باقی سب کچھ ضائع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ سولومن اور بیکال آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان دونوں کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔ اس نے تیزی سے ایک اور کام کیا۔ اس نے ایک بٹن دبایا۔ جس سے کوڈ 7500 آن ہوگیا۔ یہ وہ سگنل تھا، جسے ریسیو کرنے والے کسی بھی جہاز یا قریب ترین ائر ٹریفک کنٹرول ٹاور کو یہ علم ہوسکتا تھا کہ جس جہاز سے سگنل بھیجا گیا ہے، اسے ہائی جیک کیا جاچکا ہے۔

"تم کہاں لے جانا چاہتے ہو اسے؟" سولومن چیخ چیخ کر بیکال سے پوچھ رہا تھا۔۔۔ وہ دونوں بدستور اس کی طرف سے غافل اور آپس کی بے مقصد بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

وہ گرمجوشی سے ملے۔ جوابی سردمہری دیکھ کر وہ پریشان ہوگئے اور پوچھا۔ "آپ نے پہچانا نہیں؟" دوست نے جواب دیا۔ "نہیں۔" بولے۔ "آج سے پچیس سال پہلے کوٹ ادو میں ایک مشاعرہ ہوا تھا آپ نے بھی اس میں شرکت فرمائی تھی، وہاں میں نے آپ کو ایک شعر پہ داد دی تھی۔" میرے شاعر دوست نے یہ واقعہ سنا کر رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ "یار وہ شخص شکوے میں بالکل حق بجانب ہے۔ پوری زندگی میں ایک ہی شخص نے تو تمہیں داد دی اور تم اسے بھی بھول گئے۔"

(عطاء الحق قاسمی کی "[illegible] منع ہے" سے
ایک شگفتہ انتخاب... ولید بلال)

ابابے نے گردن جھکائی اور ریڈیو آن کرکے نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ "فلائٹ 961 کو ہائی جیک کرلیا گیا ہے۔" یہ ابابے کی خوش قسمتی تھی کہ جیسے ہی اس نے پیغام دیا۔ کچھ فاصلے پر گزرنے والے ایک غیر ملکی جہاز کے پائلٹ نے یہ سن لیا۔ اس نے فوراً جواب دیا۔ اس نے آواز کے بجائے روشنی کا سگنل بھیجا تھا۔ ریڈیو پینل پر سبز بتی روشن ہوگئی تو ابابے نے سکھ کا سانس لیا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ اب دنیا کے علم میں جہاز کے اغوا کی خبر پہنچ چکی تھی۔

ابابے نے نہایت تیزی سے کام کرتے ہوئے چند لمحوں میں دو اہم مقاصد حاصل کرلیے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ایندھن کی کمی کی وجہ سے جہاز کو ایتھوپیا سے باہر نہیں لے جایا جاسکتا۔ دوسرا یہ کہ ہائی جیکر مجبور ہوں گے کہ وہ جہاز جلد سے جلد کسی قریبی ہوائی اڈے پر اتروا دیں۔ یوں ایتھوپیا کی حکومت کو کارروائی کا موقع مل سکتا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک وہ بہت خوفزدہ تھا لیکن اب اسے یقین تھا کہ وہ مسافروں کی زندگی بچا سکتا ہے۔ اس نے گردن موڑ کر یونس کو دیکھا۔ وہ انہماک سے پینل پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر شدید تناؤ تھا۔ ابابے بھی ڈر رہا تھا کہ آخر وہ یونس کو کیوں کاک پٹ سے باہر لے جانا چاہتے ہیں۔ ابابے نے نہایت آہستہ سے گردن موڑی۔ وہ دونوں بدستور باتیں کر رہے تھے۔ ابابے کو ان کی گفتگو سے زیادہ مسافروں اور اپنے عملے کی زندگی عزیز تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ ہائی جیکروں کا اگلا قدم کیا ہوسکتا ہے۔ انہوں نے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جانا چاہتے ہیں تاہم وہ مطمئن تھا کہ اس

نے ایندھن ضائع کرکے ان کا مطالبہ فوری طور پر نہ ماننے کا مقدر تراش لیا تھا۔

اچانک بیگال یونس کی طرف لپکا۔ اس نے یونس کے سر، کندھوں اور پیٹھ پر گھونسوں کی بارش کردی۔ "مت مارو... پلیز... اسے مت مارو۔" یہ دیکھتے ہی اپالے چلایا۔ مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اپالے اسے بچانے کے لیے کھڑا ہونے لگا تو سولومن نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ اپنی نشست پر جا پڑا۔ سولومن، یونس کو پٹتا دیکھ کر دانت نکالے ہنس رہا تھا۔ وہ بے چارہ پینل پر سر جھکائے، ہونٹ بھینچے خاموشی سے پٹے چلا جارہا تھا۔

"چلو... دفع ہو یہاں سے۔" اچانک سولومن چلانے لگا۔ "اسے یہاں سے باہر نکالو۔" سولومن کا حکم سنتے ہی بیگال نے یونس کو کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور دھکے دیتا ہوا کاک پٹ سے باہر لے گیا۔ یہ دیکھ کر ایک بار پھر اپالے خوف زدہ ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ یونس کو کہیں یہاں سے لے کر گئے ہیں۔ آخر وہ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر اسے یونس کے ہونے سے بہت ہمت حاصل تھی لیکن اب وہ تنہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یونس کے نہ ہونے کی وجہ سے اب اسے جو کچھ کرنا ہے، وہ اکیلے ہی کرنا ہوگا۔

اچانک جہاز نے ہلکا سا جھٹکا کھایا۔ اپالے نے فوراً سر جھکا اور مکمل توجہ سے پینل پر لگے آلات پر نظریں مرکوز کردیں۔ جہاز اچانک ہوا کے کم دباؤ میں آگیا تھا۔

"مائیک کہاں ہے؟ مجھے مسافروں سے بات کرنی ہے۔" سولومن نے اس کے کندھے پر تھپکا دیتے ہوئے کہا۔

"ابھی رک جاؤ۔ جہاز جیول سسٹم پر ہے۔ باہر موسم تھوڑا سا خراب ہوگیا ہے۔ اس وقت ذرا سی غلطی جہاز کو تباہ کرسکتی ہے۔"

"اوکے۔" سولومن نے اس کی بات سن کر کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں جہاز خراب صورت حال سے نکل آیا۔ اپالے نے آٹو پائلٹ ایک بار پھر لگا دیا۔

"اب تو سب ٹھیک ہوگیا نا؟" سولومن نے شاید اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اسی لیے اس نے فوراً سوال کر ڈالا۔

"ہاں..."

"مائیک اور جہاز کے اسپیکر آن کرو۔ مجھے مسافروں سے بات کرنی ہے۔" سولومن نے اپنا مطالبہ ایک بار پھر دہرایا۔

"ٹھیک ہے۔" اپالے نے مختصر سا جواب دیا۔

"جہاز اغوا ہوچکا ہے۔ میں ہائی جیکر بول رہا ہوں۔ ہمارے پاس بم ہے۔ اب ہم آئیوری کوسٹ کے بجائے کہیں اور جارہے ہیں۔" سولومن نے سرد اور دھمکی آمیز لہجے میں پہلی بار مسافروں کو مخاطب کیا تھا تاہم سب کے علم میں یہ بات پہلے ہی آچکی تھی۔ "ہمارے پاس بم ہے۔ ضرورت پڑنے پر اسے استعمال بھی کرسکتے ہیں۔ اس لیے سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر خاموشی سے بیٹھے رہیں، ورنہ..." اس نے جان بوجھ کر اپنی بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔

بیگال اور نور پہلے ہی چلا چلا کر مسافروں کو کسی بھی حرکت سے گریز کی ہدایت کرچکے تھے۔ جس طرح انہوں نے جہاز کے اندر آگے اور پیچھے کھڑے ہوکر مسافروں کو اپنی نظروں میں رکھا ہوا تھا، اس سے بے چارے مسافر سخت دہشت زدہ ہوچکے تھے۔ اب جب انہوں نے یہ دھمکی سنی کہ بم استعمال بھی کرسکتے ہیں تو وہ اور بھی خوف زدہ ہوگئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ زمین سے ہزاروں فٹ بلندی پر ہزاروں ٹن ایندھن والی ٹنکی کے ساتھ اگر جہاز میں بم استعمال کرلیا گیا تو نتیجہ کیا ہوسکتا ہے۔ اپالے اور یونس کی طرح یہ سارے مسافر بھی اپنی زندگی میں پہلی بار اس طرح کی بھیانک... صورت حال سے دوچار ہوئے تھے۔

جیسے ہی سولومن نے اپنا بیان ختم کیا، اپالے نے اسپیکر اور مائیک کا بٹن آف کردیا اور سر اوپر کرکے سولومن کو استفساریہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" اس کا لہجہ نرم تھا۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ ان کی دھمکیوں سے خوف زدہ نہیں ہے۔

"ہم آسٹریلیا جانا چاہتے ہیں۔ سنا ہے وہاں سیاسی پناہ ملتی ہے۔ سمجھے تم۔" اس نے اپالے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بتایا۔ "اب جہاز کا رخ تبدیل کردو۔ ہمیں آسٹریلیا پہنچنا ہے۔" اس نے ایسے حکم دیا جیسے کوئی شخص ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد ڈرائیور کو اپنی منزل کا پتا بتا رہا ہو۔

"آسٹریلیا..." یہ کہتے ہوئے اپالے کی آنکھیں پھیل گئیں تھیں۔ "یہ تو نو گھنٹوں کا راستہ ہے... ناممکن۔" اس نے سوئچ بورڈ پر نظریں ڈالیں اور پھر مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں... ہم وہاں کیوں نہیں جاسکتے، کیا مسئلہ ہے تمہیں؟" سولومن نے غصے سے پوچھا۔

"ہمارے پاس ایندھن بہت کم ہے اور راستہ بہت

لمبا... اس حالت میں ہمارا وہاں پہنچنا قطعی ناممکن ہے۔" اپالے کا لہجہ گمبھیر ہوچکا تھا۔ وہ ہر ممکن طور پر اسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اگر ہم کہیں رکے بغیر کسی بھی طرح اُن کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

"دیکھو..." اس بار سولومن غصے سے چلا اٹھا۔ "ہمیں ہر حال میں آسٹریلیا پہنچنا ہے ورنہ ہم جہاز کو بم سے اڑا دیں گے۔" اس نے بھاری آواز میں دھمکی دی۔ "اب ہمیں نہ تو تمہاری زندگیوں کی فکر ہے نہ ہی اپنی... سمجھے تم۔"

"میں غلط بیانی نہیں کررہا، یہاں دیکھو۔" اپالے نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کرکے انگلی سے پینل بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایندھن کی مقدار ظاہر کرنے والا میٹر یہ بتارہا ہے کہ ٹینک میں صرف چودہ ٹن ایندھن باقی ہے اور ہمیں فی گھنٹہ پانچ ٹن چاہیے۔ اس طرح ہمارے پاس اس وقت صرف ڈھائی سے پونے تین گھنٹے کی پرواز کا ایندھن موجود ہے۔ ایسے میں ہم راستے میں کہیں رک کر، ٹینک بھروائے بغیر آسٹریلیا نہیں پہنچ سکتے۔" اس نے سولومن کو ساری صورت حال تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ بولتے ہو تم..." اپالے کی بات سن کر اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ "یہ دیکھو۔" اس نے اپنی جیکٹ کی پچھلی جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ یہ ائرلائن میگزین میں چھپا ہوا بوئنگ 767 کا ایک اشتہار تھا۔ "اس میں لکھا ہوا ہے کہ یہ جہاز بغیر رکے گیارہ گھنٹے تک کی پرواز کرسکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"یہ بات ٹھیک ہے مگر ایسا اسی وقت ممکن ہے کہ جب اس کا ٹینک ایندھن سے فل ہو۔ ہمارے پاس ایندھن کی کمی ہے۔ ہم نے عدیس ابابا میں ٹینک فل نہیں کروایا تھا۔" اپالے نے وہ کاغذ دیکھے بغیر اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں راستے میں رکنا تھا۔ اگلی منزل کے لیے ہم ٹینک وہیں سے بھرواتے۔" اس کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔ وہ ہائی جیکروں کو مشتعل کیے بغیر اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"میں نے تم سے کہا ہے نا کہ ہمیں آسٹریلیا پہنچنا ہے۔" وہ شدید غصے میں تھا۔ جب وہ یہ کہہ رہا تھا تو اس کے منہ سے تھوک اُڑ رہا تھا۔ "سوچ لو... ہمیں آسٹریلیا پہنچادو یا پھر مرنے کو تیار ہوجاؤ۔"

"اوکے..." یہ کہتے ہوئے سولومن نے اپنا رخ پینل کی طرف کیا اور جہاز کا رخ کینیا کی طرف موڑنے لگا۔

سولومن نے دستانے کے اندر رکھی ہوئی ٹینس بال سائز کی جو شے پکڑ رکھی تھی، وہ اسے بار بار دستی بم کہہ رہا تھا مگر ایک بار بھی اس نے وہ مبینہ بم باہر نکال کر اسے دکھایا نہیں تھا۔ جس وقت اپالے نئی منزل کا تعین کررہا تھا، اس وقت سولومن کاک پٹ میں تنہا تھا۔ اچانک ایک انسان کی حیثیت سے اپالے کے دل میں لمحے بھر کے لیے خیال آیا کہ وہ ہائی جیکر پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ ممکن ہے کہ جو شے اس کے ہاتھ میں ہے، وہ دستی بم نہ ہو مگر پھر یہ سوچ کر وہ باز رہا کہ اگر سولومن کی بات سچ ہوئی اور وہ اس پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہوسکا تو پھر سب لوگوں کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ......اگلے ہی لمحے وہ اپنے اس خیال پر عمل درآمد کو رد کرچکا تھا۔ اسے ائرلائن کمپنیوں کا وہ ہدایت نامہ یاد آگیا تھا جس میں تحریر ہے کہ "جہاز اغوا ہونے کی صورت میں کوئی پائلٹ ہائی جیکروں سے مزاحمت نہ کرے چاہے صورت ایسی ہی کیوں نہ ہو کہ وہ آسانی اس پر قابو پاسکتا ہو۔"

وہ خاموشی سے پینل پر نظریں گڑائے یہ سوچ رہا تھا کہ اس صورت حال سے کس طرح باہر نکلا جاسکتا ہے۔ ویسے یہ بات اس کے لیے تسلی کا باعث تھی کہ اب تک دنیا بھر کے ائر ٹریفک کنٹرول ٹاورز کو جہاز کے اغوا کی اطلاع مل چکی ہوگی۔ فلائٹ 961 اس وقت دنیا بھر کے ریڈار اور کنٹرول ٹاور کی مانیٹرنگ پر ہوگا۔ اب ایسے میں وہ جہاں بھی جائیں گے، ریڈار پر کنٹرول ٹاور انہیں دیکھ لے گا۔ اسے یقین تھا کہ ایندھن کی جو مقدار ان کے پاس ہے، اس سے وہ کسی بھی صورت میں بحر ہند عبور نہیں کرپائیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد پائلٹ کا رابطہ کینیا ائرپورٹ کے ایک ائر ٹریفک کنٹرولر سے قائم ہوگیا۔ اسے خوشی ہوئی کہ ائرپورٹ حکام تک یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ فلائٹ 961 ہائی جیک کی جاچکی ہے۔

"ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔" رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ سولومن اس کے سر پر کھڑا ہوا تھا۔

"کس قسم کی مدد چاہیے؟" کنٹرول ٹاور سے ڈیوٹی افسر نے فوراً پوچھا۔

"ہمیں آسٹریلیا جانا ہے۔"

"کیا تمہارے پاس وہاں تک پہنچنے کے لیے مقررہ مقدار میں ایندھن موجود ہے؟"

"بالکل نہیں۔" اپالے نے جواب دیا۔

"تمہارے پاس کتنا ایندھن ہے؟" ایک بار پھر سوال

کیا گیا۔
"صرف دو گھنٹے کی پرواز کے لیے۔"
"ٹھیک ہے۔ تم رابطہ منقطع مت کرو۔ ہم جواب دیتے ہیں۔" کنٹرول ٹاور نے اسے اسٹینڈ بائی رہنے کو کہا اور پھر دوسری طرف مکمل خاموشی ہو گئی۔ ایالطے سمجھ گیا کہ وہ اس وقت پولیس یا دیگر اعلیٰ حکام سے مشاورت کر رہے ہوں گے۔
"فلائٹ ٹائن سکس ون، فلائٹ ٹائن سکس ون۔"
کچھ دیر کے بعد کنٹرولر نے رابطہ قائم کیا۔
"فلائٹ ٹائن سکس ون — کیپٹن اسپیکنگ۔" ایالطے نے فوراً جواب دیا۔
"تم جہاز کو ممباسا ائرپورٹ کی طرف لے چلو۔ وہاں تمہیں ایندھن فراہم کر دیا جائے گا۔"
"ہمارا جہاز ہائی جیک ہو چکا ہے اور ہائی جیکر بدستور اڑتے رہنے پر بضد ہیں۔" پہلی بار ایالطے نے زبان کھولی۔ سولومن بھی حالات کی نزاکت کو سمجھ چکا تھا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا۔
"ٹھیک ہے۔" کنٹرولر نے سکون سے جواب دیا۔ "انہیں بتا دو کہ ممباسا ائرپورٹ پر انہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ تیل بھرنے کے بعد تم دوبارہ پرواز کر سکتے ہو۔" یہ بات سولومن نے بھی سن لی تھی۔ ایالطے نے کنٹرول ٹاور سے رابطہ ہونے پر اسپیکر آن کر دیا تھا اور دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کاک پٹ میں صاف سنائی دے رہی تھی۔
"تم جہاز کو ممباسا ائرپورٹ کی طرف لے جاؤ..... اوور۔" یہ کہتے ہوئے فوراً ہی کنٹرولر نے رابطہ منقطع کر دیا۔ ایالطے نے بھی بات چیت مکمل ہونے کے بعد ریڈیو اور اسپیکر آف کر دیا۔ اس نے سر اٹھا کر سولومن کی طرف دیکھا۔ اس نے خاموشی سے ہاں میں سر ہلا دیا۔
دن کا ایک بج رہا تھا جب ایالطے نے جہاز کا رخ جنوب کی طرف موڑا۔ جہاز کے نیچے گہرا نیلا بحیرۂ ہند، سامنے کی سمت موزمبیق اور دائیں جانب مڈغاسکر تھا۔ اسے ایک سفید پٹی نظر آئی۔ یہ رن وے تھا۔ اس وقت وہ جزیرہ کوموروز کے اوپر تھے اور یہ رن وے جزیرے کے ائرپورٹ کا تھا۔
جزیرہ کوموروز چھوٹے بڑے کئی جزیروں پر مشتمل ایک گروپ کا نام تھا۔ جو سیاحت اور تفریح کے حوالے سے مشہور تھے۔ جزیرے کا یہ چھوٹا سا رن وے ان کی منزل نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ ایک چھوٹا سا ائرپورٹ تھا جہاں انہیں درکار مطلوبہ مقدار میں ایندھن ملنا مشکل تھا۔ انہیں اسی لیے سیدھے ممباسا ائرپورٹ کی طرف سفر کرنا تھا۔ ان کی عارضی منزل ابھی کافی دور تھی۔
سولومن بالکل خاموش تھا۔ ایک لمحے کے لیے ایالطے نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے سکھ کا سانس لیا۔ سولومن کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ یہ بات سمجھ چکا ہے کہ انہیں ہر حال میں ممباسا ائرپورٹ اترنا ہی پڑے گا۔ ایالطے دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ اس نے جیسا سوچا تھا، ویسا ہی ہو رہا ہے۔ اس نے جہاز کی بلندی کم کرنا شروع کر دی۔ اچانک کاک پٹ میں بیگال آیا۔
"یہ کیا ہو رہا ہے، جہاز کو نیچے کیوں لا رہے ہو؟" اس نے اندر گھستے ہی چلا کر ایالطے سے پوچھا۔
"ایندھن ختم ہو رہا ہے۔ دوبارہ ٹینک بھروانے کے لیے ہم ممباسا ائرپورٹ پر اتریں گے۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔
"کیا ..." وہ ایسے چونکا جیسے اسے بجلی کا زبردست کرنٹ لگ گیا ہو۔
"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" اس بار سولومن نے جواب دیا۔
"ہم کہیں نہیں اتر رہے، جہاز کو اوپر اٹھاؤ۔" بیگال غصے سے دھاڑا۔ "یہ سب چال ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہیں سولومن کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ "تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ یہ ہمیں پھنسوانا چاہتا ہے۔" اس نے اس طرح یہ بات کہی جیسے ایالطے کی سازش کو بے نقاب کر رہا ہو۔
"مگر......"
"تم بکواس مت کرو۔" ایالطے نے کچھ کہنا چاہا لیکن بیگال نے کچھ کہنے سے قبل ہی اسے خاموش کروا دیا۔
"پھر کیا کریں؟" سولومن نے استفساریہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد دونوں میں یہ بحث شروع ہو گئی کہ ممباسا ائرپورٹ پر اترا جائے یا نہیں۔ بیگال اسے شدت سے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایسا کرنا ان کی سب سے بڑی حماقت ہوگی۔ ایالطے ان کی باتوں کو سنی ان سنی کرتا ہوا ممباسا ائرپورٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاز کی بلندی بدستور کم ہوتی جا رہی تھی۔ کافی دیر تک وہ دونوں اونچی آواز میں ایک دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ کافی دیر کی بحث و تکرار کے بعد آخر سولومن نے ہار مان لی۔
"ٹھیک ہے۔" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ وہ بیگال کی باتوں میں آ چکا تھا۔ اب وہ بھی یہ سمجھنے لگا تھا کہ ممباسا پر اترنا ایک بہانہ ہو سکتا ہے۔ انہیں اس بات کا تو یقین تھا کہ جہاز ہائی جیک کیے جانے کے بعد اگر وہ کسی بھی افریقی ملک کے ائرپورٹ پر اترے تو کمانڈو آپریشن سے نہیں بچ سکیں گے۔ شاید اسی لیے وہ ممباسا ائرپورٹ پر اترنے سے ڈر گئے۔ "جہاز اوپر اٹھاؤ۔" اچانک سولومن نے دھاڑتے ہوئے حکم دیا۔
"مگر —" ایالطے نے منمناتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "ہمارے پاس ایندھن بہت کم رہ گیا ہے۔ پلیز — صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"
"اچھی طرح سمجھ گئے ہیں تمہاری بات کو۔" بیگال چیخا۔ "جہاز اوپر اٹھاؤ۔" اس کا لہجہ نہایت درشت تھا۔ "اگر تم نے جہاز کو اوپر اٹھانا شروع نہیں کیا تو میں یہیں بم چھوڑ دوں گا۔" اس نے اپنا داہنا ہاتھ اوپر اٹھایا، جس میں اس کے مطابق دستی بم موجود تھا۔
"ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جہاز کو ایک بار پھر اوپر لے جانا شروع کر دیا۔
جہاز فضا میں گول چکر کاٹ رہا تھا۔ ایالطے جہاز کو ایک بار پھر بحیرۂ ہند کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہیں جزیرہ کوموروز کے اوپر سے گزرنا تھا۔ اس کے بعد سیکڑوں میل طویل ساحلی پٹی تھی۔ کافی دیر بعد ایک بار پھر وہ بحیرۂ ہند کے اوپر تھے لیکن جہاز اس بار کھلے سمندر کے اوپر پرواز کرنے کے بجائے ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔
"آسٹریلیا کی طرف رخ رکھو۔" بیگال نے چلاتے ہوئے حکم دیا۔ وہ اس کی تمام حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ "کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔"
"ہم اس حالت میں آسٹریلیا نہیں پہنچ سکتے۔" اس بار ایالطے کا لہجہ تھوڑا سا سخت تھا۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ بیگال نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔
"کیوں نہیں پہنچ سکتے؟"
"وجہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ ہم راستے میں ہی ایندھن ختم ہونے پر تباہ ہو جائیں گے۔"
"یہ بکواس ہے۔" بیگال چلایا۔
"تم میٹر چیک کرو۔" ایالطے نے انگلی کے اشارے سے پینل پر نظر ڈالی۔ اب واقعی وہ خود دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ اگر ہائی جیکروں کی ہٹ دھرمی ختم نہ ہوئی تو ایندھن ختم ہونے پر جہاز کو تباہی سے بچانا ناممکن ہوگا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ تباہی کے اور قریب پہنچتے جا رہے تھے۔
"اور یہ تم ساحل کے ساتھ ساتھ کیوں جہاز اڑا رہے ہو؟" اچانک اس نے معاون پائلٹ کی نشست کے برابر والی گزرگاہ سے پیچھے کی طرف جھانکتے ہوئے کہا۔ "کھلے سمندر پر یہ جہاز نہیں اڑ سکتا ہے کیا۔" اس نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔
"اڑ سکتا ہے۔" ایالطے نے بیزاری سے جواب دیا۔
"تو پھر کھلے سمندر پر جہاز لاؤ۔" بیگال نے حکم دیا۔
ایالطے خاموش تھا۔ ممباسا ائرپورٹ پر اترنے میں ناکامی کے بعد وہ یہ بات تو جان چکا تھا کہ یہ ضدی ہائی جیکر کسی بھی افریقی ملک میں اترنا نہیں چاہیں گے۔ دوسرا یہ کہ تیزی سے ختم ہوتے ہوئے ایندھن کے باعث ان کی تباہی یقینی تھی۔ اس لیے اس نے مسافروں کی زندگیاں بچانے کے لیے اچانک ایک فیصلہ کیا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ جہاز اڑائے گا تاکہ کسی بھی ممکنہ خطرے کی صورت میں وہ جہاز کو ساحل کے قریب سمندر کے سینے پر اتار سکے لیکن بیگال نہایت چالاک لگ رہا تھا۔ شاید وہ یہ بات بھانپ گیا تھا۔ اس لیے اس نے جہاز کو کھلے سمندر پر اڑانے کا حکم دیا۔ اب ایالطے کے پاس اس کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جیسے ہی ایندھن ختم ہوگا، جہاز کھلے سمندر پر گر جائے گا۔ اب ایسے میں کون زندہ بچتا ہے اور کون نہیں، یہ سب کی اپنی اپنی قسمت تھی۔ بیگال کے چالاک دماغ نے دوسری بار بھی مسافروں کی زندگیاں بچانے کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔
ایالطے سست روی سے جہاز کو کھلے سمندر پر لا رہا تھا۔ اب سامنے کے رخ پر مڈغاسکر تھا۔ اس نے پینل پر نظر ڈالی۔ جہاز میں جتنا ایندھن باقی بچا تھا وہ صرف 280 فضائی میل کے سفر کے لیے کافی تھا۔ اس ایندھن میں وہ بمشکل مڈغاسکر کی آدھی مسافت ہی طے کر پاتے۔ ایالطے کے لیے صورت حال نہایت پیچیدہ ہو گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہوا بازی میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے مگر ہائی جیکروں کی ضد کے باعث وہ ایندھن حاصل کرنے کا موقع کھو چکا تھا۔ دوسرا یہ کہ وقت بند مٹھی سے پھسلتی ریت کی طرح تیزی سے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے اپنے سامنے تباہی و بربادی اور موت کا وہ کھیل دیکھ رہا تھا، جس کے وقوع پذیر ہونے میں بہت زیادہ وقت باقی نہیں بچا تھا۔ اسے اب لگنے لگا تھا کہ شاید وہ سب اپنی زندگی کے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اسے اپنی نگاہوں کے سامنے موت بانہیں پھیلائے کھڑی نظر آ رہی تھی۔

اچانک اسے ایک جزیرہ نظر آیا۔ یہ بھی کوموروز کے متعدد جزیروں میں سے ہی ایک تھا۔ اگرچہ ہائی جیکروں نے جہاز کو بلندی پر لے جانے کا حکم دیا تھا لیکن اباطے نے انہیں بہلا دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ اب بھی جہاز کو اتنا نیچے اڑا رہا تھا کہ اگر اسے کسی قسم کی ایمرجنسی کے دوران کوئی ہموار پٹی نظر آ گئی تو وہ جہاز کو اتارنے کی اپنی آخری کوشش کر سکے۔

اسے یقین تھا کہ ایندھن ختم ہو یا وہ لینڈنگ کرے — دونوں صورت میں زندگیاں خطرے میں تھیں۔ اس نے بے بسی کی موت قبول کرنے کے بجائے مسافروں کی زندگیاں بچاتے ہوئے مر جانے کو ترجیح دی۔ اسی دوران اسے ایک جزیرے کا ساحل نظر آ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ جہاز کو نصف دائرے میں گھمانا شروع کر دیا۔ سولومن کاک پٹ میں ہی تھا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ جہاز دائیں جانب گھوم رہا ہے۔

"یہ کیا کر رہے ہو، جہاز کو کیوں گھمایا؟" اس نے چیخ کر پوچھا۔

"سامنے دیکھو۔ ہمارے پاس صرف تیس منٹ کا ایندھن باقی بچا ہے۔" اس نے پینل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "زندہ بچنے کے لیے ہمیں یہاں اترنا ہوگا۔ ممکن ہے یہاں سے مزید ایندھن مل جائے، پھر ہم آسٹریلیا چلے جائیں گے۔" اباطے نے ایک بار پھر سولومن کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ صورت حال سنگین ہو چکی ہے۔ ایندھن نہ ملا تو وہ آسٹریلیا کے بجائے موت کی آغوش میں جا سکتے ہیں لیکن وہ تو ہٹ دھرمی پر قائم تھے۔

"کوئی بات نہیں، تم جہاز اڑاؤ۔" سولومن نے حالات کی نزاکت کو سمجھنے کے بجائے اس طرح آرام سے جواب دیا جیسے وہ کسی ضدی بچے کی فضول خواہش کو پوری کرنے کے بجائے اسے بہلانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ہمارا ایندھن تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔" اس بار اباطے کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے چلاتے ہوئے کہا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں، تم جہاز اڑاؤ۔" سولومن نے ایک بار پھر اسی طرح سکون سے جواب دیا کہ جیسے فضا میں اڑتے ہوئے جہاز کا ایندھن ختم ہو جانا خطرے کی بات نہیں ہے۔

"ہم موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں، تم اپنا کام کرتے جاؤ۔" اس نے نہایت بے فکری سے سیٹی بجاتے ہوئے جواب دیا۔

"تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟" وہ زچ ہو کر بولا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ دنیا ہمارے ناموں اور چہروں کو پہچانے۔" سولومن نے خباثت سے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم تاریخ رقم کر رہے ہیں۔"

"لعنت ہو تم پر۔" اس نے یہ سن کر دل ہی دل میں کہا۔ "جانتے ہو کتنے لوگوں کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔ تمہاری اس خواہش میں کتنے بے گناہ لوگ مارے جائیں گے۔" اباطے نے ایک بار پھر پینل پر نظر ڈالی۔ ایندھن تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ وہ لینڈنگ کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی ضد چھوڑنے پر مجبور کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

"مرتے ہیں تو مرنے دو۔" اس نے نخوت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "مسٹر پائلٹ ... یہ جنگ ہے۔ ہماری پہچان کی جنگ اور جنگوں میں تو لوگ مارے ہی جاتے ہیں، چاہے وہ گناہ گار ہوں یا بے گناہ۔" سولومن نے انتہائی سفاک لہجے میں مسکراتے ہوئے بات کی اور وہ دانت کچکچا کر رہ گیا۔

چند لمحوں تک کاک پٹ میں مکمل خاموشی رہی۔ اباطے سوچ رہا تھا کہ اب جب کہ موت سامنے کھڑی ہوئی ہے، اس سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا لیکن اسے کچھ سجھائی نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے پینل پر نظر ڈالی۔ اب صرف چند لمحے کا ایندھن باقی بچا تھا۔

"ایندھن کسی بھی وقت ختم ہو جائے گا۔" اباطے نے چلاتے ہوئے سولومن سے کہا۔ وہ یہ سن کر مسکرا دیا۔

"ختم ... سب کچھ ختم ... اب موت آ رہی ہے۔" اچانک اباطے چلایا۔ اس کے جسم میں دوڑنے والا گرم لہو خوف کے مارے سرد ہوتا جا رہا تھا۔ "ہم سب مرنے والے ہیں۔" اس نے کھڑکی سے نیچے کی طرف جھانکتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ اس وقت وہ عین سمندر کے اوپر اور ساحل سے کچھ فاصلے پر پرواز کر رہے تھے۔

"ٹھیک ہے۔" سولومن نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔

"میں مسافروں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے بے بسی سے سولومن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کر لو ... بتا دو انہیں کہ اب آخری ورد دعا مانگ لیں اپنی مغفرت کی۔" موت اتنے قریب آ چکی تھی لیکن ہائی جیکر اب بھی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ اباطے کو یہ یقین ہونے لگا کہ وہ اجتماعی خودکشی کا منصوبہ بنا کر گھر سے نکلے تھے، شاید اسی لیے انہیں اپنے ساتھ دوسروں کی زندگیوں کا بھی کوئی احساس نہیں تھا۔

"خواتین و حضرات ... ہمارے جہاز کا ایندھن ختم ہو چکا ہے۔" سولومن کی اجازت ملتے ہی اباطے نے جلدی سے مائیک آن کیا۔ اب ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اسی دوران جہاز نے ایک جھٹکا لیا۔ دو میں سے ایک انجن خاموش ہو گیا۔ اباطے نے چونک کر پینل پر نظر ڈالی اور پھر کہنا شروع کیا۔ "جہاز کا ایک انجن بند ہو چکا ہے اور چند لمحوں کے بعد دوسرا انجن بھی بند ہو جائے گا۔ اس کے بعد جہاز سمندر کے اوپر گر پڑے گا۔ میں آپ لوگوں کی زندگیاں بچانے کے لیے سمندر پر کریش لینڈنگ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ براہ مہربانی کرسی کی پشت سیدھی کر لیں۔ نشست کے نیچے موجود لائف جیکٹ نکال کر پہن لیں اور حفاظتی بیلٹ کس کر باندھ لیں۔ عملے سے گزارش ہے کہ اس کام میں مسافروں کی مدد کریں۔"

اباطے کی گفتگو کے دوران ہی جہاز نے ایک اور زوردار جھٹکا لیا۔ اس کا دوسرا انجن بھی بند ہو چکا تھا۔ اباطے کے چہرے کی رنگت زرد پڑ چکی تھی لیکن وہ پھر بھی اپنے حواس قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک ماہر ہوا باز تھا لیکن دنیا کا کوئی بھی ہوا باز ایسے جہاز کو نہیں اڑا سکتا جس کا ایندھن دوران پرواز زمین سے ہزاروں فٹ کی اونچائی پر ختم ہو چکا ہو لیکن ... اباطے بغیر ایندھن کے جہاز کو اڑانے اور سمندر پر کریش لینڈنگ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

ہزاروں ٹن وزنی جہاز ہوا کے دوش پر تیر رہا تھا۔ جہاز اور اس کے مسافر موت سے بہت کم فاصلے پر موجود تھے۔ اباطے کو یقین تھا کہ اب کوئی معجزہ ہی ان سب لوگوں کی زندگیاں بچا سکتا ہے لیکن وہ ایک پائلٹ تھا۔ اس کی ذمے داری تھی کہ وہ اپنے جہاز پر سوار مسافروں کی زندگیاں بچانے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے، وہ ضرور کرے۔ اب وہ یہی کچھ کرنے جا رہا تھا۔

اباطے کے پاس مہلت نہیں تھی۔ ایندھن کے ساتھ ہی تفصیلی سوچ و بچار اور بحث و مباحثے کا وقت بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس کے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ جہاز سمندر کی سطح سے بہت اوپر تھا۔ وہ سمندر کی موجوں پر کریش لینڈنگ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ جتنا ممکن ہو سکے، جانی نقصان کے امکانات کو کم سے کم کر سکے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہائی جیکر جو چاہے کریں، وہ ان کی ایک نہیں سنے گا۔ بم پھٹے یا جہاز گرے ... موت دونوں صورتوں میں یقینی تھی۔ وہ سمندر پر اترنے کے لیے جہاز کو نیچے لا رہا تھا۔

جہاز کے اغوا کے بعد سے مسافر سہمے ہوئے تھے۔ انہیں خطرے کا احساس تھا۔ وہ ڈر رہے تھے کہ اگر ہائی جیکروں کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے یا اگر کسی ائرپورٹ پر جہاز کو ان سے چھڑانے کے لیے کمانڈو آپریشن کیا گیا تو نہ جانے موت کس کس کا مقدر بنے مگر اس کے باوجود ان میں زندہ بچ جانے کی ایک موہوم سی امید پھر بھی باقی تھی لیکن جب اباطے نے انہیں ایندھن ختم ہو جانے اور پھر سمندر کے اوپر کریش لینڈنگ کی اطلاع دی تو سب کے چہرے موت کے خوف سے پیلے پڑ چکے تھے۔ زندہ رہنے کی موہوم سی امید بھی دم توڑ چکی تھی۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب شاید ہی وہ بھی زمین پر پاؤں رکھ سکیں گے، اپنے پیاروں اور گھر بار کو دوبارہ دیکھ پائیں۔ موت کے خوف نے انہیں چیخنے چلانے اور زور زور سے رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ مسافروں کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ ان کے اعصاب ٹوٹ گئے تھے اور وہ ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے۔ جہاز کے اندر چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔

پائلٹ کے اعلان کے بعد عملے کے ارکان نے ہائی جیکروں کی دھمکی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ مسافروں کی مدد کر رہے تھے۔ معاون یونس نے بھی یہ اعلان سنا۔ بیکال اس کے سر پر کھڑا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یونس کھڑا ہوا تو اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے لیے دباؤ ڈالا لیکن اس نے یہ ہدایت نظر انداز کر دی۔ یونس نے بیکال کے ہاتھ کو زور سے جھٹکا۔ وہ ہوا باز تھا۔ جو کچھ ہونے جا رہا تھا، اس کے نتائج وہ سمجھ سکتا تھا۔ اس کے لیے اب زندگی اور موت کے بیچ کوئی خاص فرق نہیں رہا تھا۔ ہائی جیکر یونس کو کاک پٹ سے اس لیے نکال کر لائے تھے کہ وہ پائلٹ پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا چاہتے تھے۔ یونس یہ بات سمجھ چکا تھا۔ وہ پہلے تو خاموش بیٹھا ہوا تھا لیکن اسے لگا کہ اب خاموش بیٹھے رہنے کا وقت نہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مرنے سے بہتر ہے کہ کچھ کرتے ہوئے مرا جائے۔ بیکال بھی شاید خطرے کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے بھی پھر اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

یونس سرکوریا اور عملے کے ارکان ہائی جیکروں کی پروا کیے بغیر مسافروں کی مدد کر رہے تھے۔ ایک فلائٹ اسسٹنٹ اور تین خاتون فضائی میزبان بھی نہایت تیزی سے مسافروں کو کریش لینڈنگ کے لیے تیار کروا رہی تھیں۔ فضائی عملہ جانتا تھا کہ اس طرح کے حالات میں مسافروں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے وہ انہیں پُرسکون رہنے کی بھی تلقین کر رہے تھے۔ جہاز میں عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے لپٹ کر بدستور بلند آواز میں چلا رہے تھے۔ بیکال اور نور بھی پچھلی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ سولومن اب تک کاک پٹ میں تھا۔

جہاز مکمل طور پر خاموش تھا۔ اس کے دونوں انجن بند ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اب وہ صرف ہوا کے دباؤ سے فضا میں موجود تھا اور آہستہ آہستہ نیچے کی طرف گرتا جا رہا تھا۔ انجن بند ہونے کے بعد جہاز میں بجلی کا نظام معطل ہو چکا تھا۔ ائرکنڈیشننگ سسٹم بند ہو گیا تھا۔ جہاز کے زیادہ تر ایسے آلات جنہیں کام کرنے کے لیے بجلی درکار ہوتی ہے، کام چھوڑ چکے تھے۔ اباطے جہاز کو سیدھا رکھتے ہوئے نیچے لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بوئنگ جہاز کو نہیں بلکہ ایک بڑے گلائیڈر کو نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اباطے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے اس انتہائی اہم موڑ پر کھڑا ہوا تھا جہاں پر اس کی زندگی ختم بھی ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی سب سے تکلیف دہ اور بھیانک صورت حال سے دوچار تھا۔

اچانک اباطے کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ جزیرے کا رن وے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ اگرچہ اس وقت نہ تو جہاز میں ایندھن تھا اور نہ ہی اس کا نظام مکمل طور پر کام کر رہا تھا پھر بھی اس نے جہاز کا رخ رن وے کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اس بھیانک حالات کے باوجود رن وے پر لینڈنگ کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ ایک امکان تھا لیکن اس نے اسے رد نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب کریش لینڈنگ ہی اس جہاز کا مقدر ہے چاہے زمین پر ہو یا سمندر میں۔ تاہم اسے ایک بات سے تقویت مل رہی تھی کہ رن وے پر کریش لینڈنگ کے باعث جہاز میں آگ بھڑک اٹھنے کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ اس لیے کہ جہاز میں ایندھن تو تھا ہی نہیں۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ زندگیوں کو یقینی طور پر بچایا جا سکتا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ جہاز کا رخ جزیرے کی طرف موڑنا شروع کیا۔

سولومن اس کے برابر میں معاون پائلٹ کی نشست پر خاموش بیٹھا صورت حال کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" جیسے ہی اسے جہاز کے مڑنے کا احساس ہوا وہ چلایا۔

"میں رن وے کی طرف جا رہا ہوں۔" اباطے نے کہا۔ "اب کریش لینڈنگ کرنی ہے تو کیوں نہ قریب ترین موجود اس رن وے پر کی جائے۔"

"جہاز رن وے کی طرف مت موڑو۔" جہاز جیسے ہی مزید تھوڑا سا دائیں جانب رن وے کی طرف مڑا تو سولومن چلایا۔ "واپس چلو سمندر پر۔"

"یہ آخری کوشش ہے، ورنہ ہم سب مر سکتے ہیں۔" اباطے چلایا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"جہاز سمندر پر ہی رکھو۔"

"یہ خودکشی ہے۔" اباطے پھر چلایا۔

"جیسا کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کرو۔" سولومن نے غصے سے کہا۔ یہ سن کر اباطے ایک بار پھر جہاز کو سیدھا کرنے لگا۔ اب جہاز ساحل سے بیس میل کی دوری پر عین سمندر کے اوپر تھا۔ وہ بتدریج نیچے کی طرف گرتا چلا جا رہا تھا۔ مسافروں میں بدستور ہلچل مچی ہوئی تھی۔

اچانک اباطے کو کچھ فاصلے پر ساحلی پٹی نظر آئی۔ ساتھ ہی ایک بڑی سی عمارت بھی دکھائی دی۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس مقام پر جہاز کو سمندر پر اتارا جائے تو اسے بہت جلد انسانی مدد مل سکتی ہے۔ جس سے خطرناک ترین کریش لینڈنگ کے باوجود زیادہ سے زیادہ مسافروں کی جان بچ سکتی ہے۔ اباطے نے جس عمارت کو دیکھا تھا وہ جزیرے کے انتہائی سرے پر بنا ہوا ریزورٹ ہوٹل تھا۔ دن کا وقت تھا۔ دوسرے یہ کہ گرمیوں کی تعطیلات کے سبب یہاں چھٹی منانے والوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ جس وقت اباطے نے جہاز کو سمندر پر اتارنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ساحل پر موجود کچھ لوگ یہ دیکھ کر نہایت حیران تھے کہ ایک بہت بڑا جہاز سمندر کے اوپر اتنی نیچی پرواز کیوں کر رہا ہے۔ کئی منچلے نوجوانوں نے اپنے کیمروں سے اس کی تصاویر بھی لے ڈالیں۔ یہ سب اس بات سے تو انجان تھے کہ جہاز کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے لیکن ایک بات لوگوں کو کھٹک رہی تھی کہ بدستور نیچے آتا ہوا جہاز اسی رفتار سے نیچے گرتا رہا تو وہ بہت جلد سمندر کی سطح سے ٹکرا جائے گا۔ ساحل پر کھڑے لوگ حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس

کے ساتھ دم بخود کھڑے یہ سوچ رہے تھے کہ نہ جانے اب کیا ہونے والا ہے۔ قدرتی طور پر ساحل پر موجود تمام لوگوں کی نظریں جہاز پر جم گئیں۔ سیاح کچھ بھول بھال کر اپنی زندگی کے اس عجیب و غریب نظارے میں کھو چکے تھے۔

اباطے مسلسل جہاز پر قابو برقرار رکھنے اور اسے متوازن رکھنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح جہاز کو بحفاظت سمندر کے سینے پر اتار لے۔ اس کا پورا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید تناؤ تھا۔ اس کے بازو شل ہو رہے تھے۔

اچانک معاون پائلٹ یونس کاک پٹ میں داخل ہوا۔

"آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔" اس نے نہایت اعتماد سے کہا اور اپنی نشست پر پہنچا۔

"تم واپس جاؤ۔ انہیں تمہاری مدد نہیں چاہیے۔" اباطے کے بجائے سولومن نے جواب دیا لیکن یونس آگے بڑھا اور اس نے ہائی جیکر کو بازو سے پکڑ کر اپنی نشست سے اٹھایا۔ سولومن بھی شاید وقت کی نزاکت کو سمجھ چکا تھا یا پھر موت کو سامنے دیکھ کر بزدلی دکھا دینے والے یونس کے حملے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔ یونس نے فوراً اپنی نشست سنبھال لی۔

بوئنگ 767 اس وقت ہوا کے دباؤ اور اپنے وزن کے باعث فضا میں بدستور تیر رہا تھا۔ اس وقت اس کی رفتار 230 میل فی گھنٹہ تھی اور وہ سطح سمندر سے صرف ڈیڑھ سو فٹ کی اونچائی پر تھے۔ اباطے خاموش تھا۔ اس کی پوری کوشش کریش لینڈنگ پر مرکوز تھی۔ یونس کسی بھی قسم کی ہنگامی صورت حال میں اس کی معاونت کرنے کے لیے خود کو پوری طرح تیار کر چکا تھا۔

"یا خدا رحم کر۔" یونس نے اونچائی بتانے والے میٹر پر نظر ڈالی اور پھر سر اٹھا کر دعا کی۔ جہاز اب سمندر کی سطح سے صرف ایک سو فٹ کی اونچائی پر تھا۔ موت اور زندگی کے بیچ صرف دو چار لمحوں کا ہی فاصلہ باقی بچا تھا۔

سولومن بدستور کاک پٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جب یا کنٹرول پینل سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی تو اباطے نے اسے نہایت درشتی سے جھاڑ پلا دی۔ "خدا کے لیے اب تو انہیں [illegible] کرنے دو۔" وہ یہ سن کر سہم گیا اور پیچھے ہٹ گیا۔

یونس کے آ جانے سے اباطے کو نفسیاتی طور پر بڑی تقویت ملی تھی۔ یہ بہت کٹھن وقت تھا۔ ایسے میں یونس کا اس کے قریب موجود ہونا غنیمت تھا۔ جہاز بدستور نیچے گرتا چلا جا رہا تھا۔ اباطے نے چلا چلا کر یونس کو کچھ تکنیکی احکامات دیے۔ کافی کوششوں سے آخر وہ جہاز کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب جہاز بالکل سیدھا تھا اور ہموار رفتار سے نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ پانی کی سطح بہت قریب آ چکی تھی۔

آخر جہاز نے ایک کے بعد ایک، کئی جھٹکے لیے۔ سولومن لڑکھڑا کر فرش پر گر گیا اور کئی بار ادھر سے ادھر لڑھکا۔ آخر بہت تیز گڑگڑاہٹ گونجی اور پھر جدید بوئنگ طیارہ رن وے کے بجائے سمندر کے سینے پر کریش لینڈنگ کر گیا۔ جہاز کی نچلی سطح تیزی سے پانی سے ٹکرائی اور پھر جہاز اپنی ہی رو میں گھسٹتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ جہاز ٹکرانے سے پانی کی بہت اونچی اونچی لہریں اٹھیں۔ ان لہروں نے دونوں طرف سے چند لمحوں کے لیے جہاز کو اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا۔ جس وقت جہاز کریش لینڈنگ کر رہا تھا، اس وقت ساحل پر موجود سیاحوں کے کیمرے اس منظر کو اپنے اندر قید کر رہے تھے۔ وہاں موجود ہر شخص کے لیے یہ دل دہلا دینے والا خوفناک نظارہ تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، اسے وہ اپنی باقی ماندہ زندگی میں شاید ہی کبھی بھلا پائیں گے۔

جس وقت جہاز پانی کی سطح سے ٹکرایا، اس کی رفتار ایک سو پچاس میل فی گھنٹہ تھی۔ یہ اس سے کہیں زیادہ رفتار تھی جس پر عام حالات میں پائلٹ رن وے پر بوئنگ کی لینڈنگ کرتے ہیں۔ اس لینڈنگ میں آنے والے تیز جھٹکوں نے مسافروں کی بھی درگت بنا ڈالی تھی۔

دوسری طرف کریش لینڈنگ نے جہاز کو بھی شدید نقصان پہنچایا تھا۔ اس کا ایک انجن ٹوٹ کر علیحدہ ہو گیا تھا۔ ایک ونگ ٹوٹ گیا تھا۔ دُم بھی ٹوٹ چکی تھی۔ جہاز کے اندر بھی پانی داخل ہو گیا تھا۔ کریش لینڈنگ کے باعث خود اباطے بھی شدید زخمی ہوا۔ یونس بھی زخمی ہوا لیکن اس کی حالت کافی بہتر تھی۔ اباطے کے مقابلے میں وہ حواس میں تھا۔ جہاز میں آہستہ آہستہ پانی بھرنے لگا تھا۔

یونس نے ہمت کر کے اپنی سیٹ بیلٹ کھولی اور کھڑا ہو گیا۔ اباطے کا سر ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ یونس نے اس کی سیٹ بیلٹ کھولی اور اٹھا کر فرش پر لٹایا۔ اس کے سینے کو دبایا۔ دل کی دھڑکن تو تھی لیکن بہت ہی کم۔ اس نے نبض ٹٹولی، وہ بھی بہت ہی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اباطے کی جان بچانے کے لیے وہ

جو کچھ کر سکتا تھا، وہ کر رہا تھا۔

کاک پٹ کے دوسری طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ لوگ لائف جیکٹس پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایمرجنسی گیٹ کھول لیے۔ کچھ مسافر پانی میں کود گئے۔ کئیوں کی کوشش تھی کہ وہ ڈوبتے جہاز کے اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو جائیں تاکہ جب تک امداد پہنچے، تب تک زندگی بچنے کی کچھ امید تو باقی رہے۔ اس وقت عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی شخص یہ بات نہیں جانتا تھا کہ کتنے لوگ موت کی نیند سو چکے ہیں۔

اُدھر ساحل پر جہاز کی کریش لینڈنگ کو سیکڑوں لوگوں نے دیکھ لیا تھا۔ جن کے پاس مشینی انجن والے اسٹیمر تھے، وہ جہاز کی طرف دوڑے۔ دوسری طرف ہوٹل انتظامیہ نے بھی جزیرے کے ایئرپورٹ اور دیگر ذمے دار افسران کو بھی اس بارے میں مطلع کر دیا۔

سول ایوی ایشن کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ ایتھوپیا کا بوئنگ جہاز اغوا ہو چکا ہے۔ اس لیے جیسے ہی اس حادثے کی اطلاع جزیرے کے ایئرپورٹ پر پہنچی، انہوں نے امدادی کارروائیوں کے علاوہ فوری طور پر اس واقعے کی اطلاع تمام کنٹرول ٹاورز تک پہنچانا شروع کر دیں۔ بہت ہی کم وقت میں بدنصیب جہاز کے مسافروں کے لیے امدادی کارروائیاں شروع کی جا چکی تھیں۔ ہوٹل انتظامیہ نے ایک ایمرجنسی اسپتال بھی بنوایا ہوا تھا، وہاں بھی ہنگامی بنیادوں پر طبی امداد فراہم کرنے کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔

حادثے کے کئی گھنٹوں کے بعد جب تمام لاشیں نکال لی گئیں اور زندہ بچ جانے والوں کا شمار کیا گیا تب معلوم ہوا کہ 145 افراد ہلاک ہوئے جب کہ 46 خوش نصیب زندہ بچ گئے۔ مرنے والوں میں تینوں ہائی جیکر بھی شامل تھے۔ جن کی لاشوں کی شناخت پائلٹ اباطے اور یونس نے کی۔ اس خوفناک واقعے میں زندہ بچ جانے والوں میں پائلٹ، معاون پائلٹ اور عملے کے دیگر دو افراد بھی شامل تھے۔ کریش لینڈنگ کے باعث اباطے کو شدید جسمانی زخم پہنچے تھے، تاہم خوش نصیبی سے ساحل پر موجود ڈاکٹر اس کی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسرے دن شدید تباہی سے دوچار جہاز کو ٹگ بوٹ کے ذریعے کھینچ کر ساحل پر لایا گیا۔

یوں خوش گوار موسم میں سفر کا آغاز کرنے والی فلائٹ ٹو ٹین سکس ون نہ تو اپنی منزل آئیوری کوسٹ پہنچی اور نہ ہی ہائی جیکروں کی خواہش کے مطابق وہ آسٹریلیا پہنچ سکی۔ البتہ حادثے کے چند ماہ بعد اباطے اور یونس واپس اپنی ڈیوٹیوں پر پہنچ چکے تھے۔

سول ایوی ایشن کی دنیا میں ایندھن کے بغیر اڑتے جہاز کی سمندر کے اوپر کریش لینڈنگ کا یہ واقعہ نہایت منفرد ہوا۔ ہوابازی کے ماہرین کا کہنا تھا کہ اس طرح کی لینڈنگ میں زندہ بچ جانے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں تاہم اتنی بڑی تعداد میں مسافر زندہ بچ گئے تھے، اسے معجزہ ہی کہا جاتا ہے۔

اباطے نے جس انداز میں کریش لینڈنگ کی تھی، اس انداز کو بھی بہت ہی منفرد قرار دیا گیا۔ خطرناک حالات میں مسافروں کی زندگیاں بچانے کی جستجو اور فضا میں ایندھن ختم ہو جانے کے کافی دیر بعد تک جہاز کو اڑانے اور پھر اتارنے کا واقعہ نہایت حیرت انگیز قرار دیا گیا۔ اس حیرت انگیز کارنامے پر اباطے کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں، ہمت اور حاضر دماغی کا اعتراف کرتے ہوئے پائلٹوں کی عالمی تنظیم "گلڈز آف ائر پائلٹ اینڈ ائر نیوی گیٹرز" کی جانب سے 3 اکتوبر 1997ء کو اعلیٰ ترین ایوارڈ دیا گیا۔ یہ ایوارڈ اس کی ان کوششوں کا بھی اعتراف تھا جو اس نے مسافروں کی زندگیاں بچانے کے لیے کی تھیں۔

اس موقع پر منعقدہ تقریب سے تنظیم کے سربراہ کیپٹن کلائیو ایلٹن نے خطاب کرتے ہوئے کہا

"یہ جانبازی اور ہمت کی نادر مثال ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کوشش کے پیچھے اپنے جہاز پر سوار مسافروں کی زندگیاں بچانے کا جذبہ کارفرما تھا۔ یہ ایک پائلٹ کا وہ کارنامہ ہے، جس پر دنیا کے تمام پائلٹوں کو فخر ہے اور رہے گا۔"

ہائی جیکنگ کے اس خطرناک واقعے کو گزرے برسوں بیت چکے ہیں تاہم اب بھی سول ایوی ایشن کی تاریخ میں اس کا تذکرہ موجود ہے، جس میں یونس اباطے کی خدمات کا نہایت احترام سے ذکر کیا گیا ہے۔

یونس مرکوریا آج ایک تجربہ کار پائلٹ ہیں اور ایتھوپین ائیر لائن میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ محمود یونس بھی بدستور ہوابازی سے وابستہ ہیں تاہم ان کا کہنا ہے کہ "فلائٹ ٹو ٹین سکس ون میں جو تجربہ ہوا، اسے تادم مرگ نہیں بھول پائے گا۔"

■ ■
■ ■

امریکا او امریکا

الطاف شیخ / ترجمہ: ابراہیم جمالی

دوسرا حصہ

امریکا مواقع کی سرزمین ہے۔ اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ لوگ اس کی چکاچوند میں آنکھیں خیرہ کر لیتے ہیں اور یہ تک بھول جاتے ہیں کہ روشنی کے عقب میں اندھیرا بھی ہوتا ہے۔ الطاف شیخ کے سفرناموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ خود میں معلومات کا خزانہ لیے ہوتے ہیں۔ بہتر تجزیوں سے سجے ہوئے ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر سفرنامہ بھی انہی خوبیوں سے مزین ہے۔ روشن رخ کے علاوہ اندھیرے گوشے کا نظارہ بھی کرانے والی سفر کہانی ہے۔

سرزمین امریکا کے سفر کی ایک جداگانہ سفر کہانی

میرا یہ سفر اس لحاظ سے میرے سابقہ سفروں سے مختلف ہے کہ مجھے ان سفروں میں ڈیوٹی انجام دینا پڑتی تھی۔ اس لیے سفر کو شیڈول کے مطابق رکھنا ضروری تھا۔ جہاز چلانے کے دوران انجنوں میں پیدا ہونے والی خرابی دور کرنا اور موسم کے تغیر و تبدل کا مقابلہ کرتے ہوئے مقررہ اوقات میں ڈیوٹی انجام دینا لازمی تھا یعنی ہمارا زیادہ تر وقت جہاز کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا تھا اور سیر و تفریح کے مواقع کم ہی میسر ہوتے تھے لیکن یہ میرا "آزاد" سفر ہے۔ میں اس مرتبہ ڈیوٹی اور شیڈول کا پابند نہیں ہوں۔

ایک ایسا ملک جہاں 33 برس قبل تک جہاز لانے کے سلسلے میں میرا آنا جانا لگا رہا ہے، اسے دوبارہ دیکھنے آیا ہوں۔ اس دوران میں گویا کسی ہی ندی، دریا کے پُل اور ڈیلاور کے پلوں کے نیچے سے کافی پانی بہہ چکا ہے۔ سیاسی اور سماجی حتیٰ کہ ٹیکنیکی اور ٹیکنالوجی کے طور پر خاصی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ افغانستان سے روس کا انخلا، سوویت یونین کا منتشر ہونا اور اس کے نتیجے میں امریکا کا دنیا کی اکلوتی

سپر پاور کی حیثیت اختیار کرنا۔ نائن الیون کا حادثہ، افغانستان سے لڑائی، عراق سے جنگ، مسلمانوں کے لیے امیگریشن کی سختیاں، تیل کی مہنگائی اور بے روزگاری نے کافی اثرات چھوڑے ہیں اور ان تمام عوامل نے یہاں پیدا ہونے والی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ظاہری اور داخلی طور پر بھی نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ اس کا اثر نہ صرف مقامی لوگوں بلکہ غیر ملکی امیگرینٹس پر بھی پڑا ہے۔

پھیلاؤ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو امریکا ایک نہیں بلکہ کئی ممالک کا مجموعہ معلوم ہوگا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں اس ملک کے الگ حصے اور ریاستیں تھیں۔ کچھ فرنچوں کے حوالے اور کچھ پرتگال کا حصہ تھے۔ کہیں ہسپانوی اپنا تسلط جما چکے تھے اور کہیں انگریز موجود تھے۔ یہ تمام قومیں ایک عرصے تک باہم برسر پیکار رہیں۔ لڑائی جھگڑے اور خون خرابے کے بعد اب جاکر یہ سب ایک ہوئے ہیں۔ اور اب ملک بھی ایک ہوگیا ہے۔ ایک ہی حکومت، فوج اور سکہ ہے۔ کلچر بھی یکساں ہے۔ کچھ تو آئین پورے ملک میں ایک سے ہیں اور کوئی قانون مختلف ریاستوں میں قدرے تبدیل ہے۔

الاسکا اور ہوائی ریاستوں کو چھوڑ کر باقی 48 ریاستیں ایک ہی خطۂ ارضی پر واقع ہیں جس میں چار ٹائم زون ہیں۔ یعنی ایک ہی ملک USA میں چار گھنٹے کا فرق ہے۔ کراچی سے ڈھاکا تک کے فاصلے میں ایک گھنٹے کا فرق آتا ہے۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ براعظم شمالی امریکا کا یہ ملک USA، جسے ہم عام طور پر "امریکا" کہتے ہیں، دوسرے ملکوں سے کس قدر بڑا ہے۔ بحری جہاز کے ذریعے کراچی سے انڈیا کا پورا کنارہ عبور کرنے کے بعد کولمبو (سری لنکا) تک پہنچنے میں ہمیں دو دن لگتے تھے۔ اس کے مقابلے میں صرف امریکا (USA) کا مشرقی کنارہ عبور کرنے یا صرف جنوبی بندرگاہ ہوسٹن سے شمالی بندرگاہ بوسٹن تک پہنچنے میں چار دن لگ جاتے تھے۔ یہ ملک مشرقی شہر نیویارک سے مغربی شہر لاس اینجلس یا سان فرانسسکو تک تقریباً ساڑھے چار ہزار کلومیٹر عریض ہے۔ کار کے ذریعے یہ فاصلہ طے کرنے میں پانچ دن صرف ہوتے ہیں۔ میں نے اپنا سفر مشرقی کنارے کی ریاستوں تک محدود رکھا ہے۔ کوئی دوست مجھے فون کرکے اپنے پاس آنے کی دعوت دیتا تو میں نقشہ دیکھنے کے بعد وہ دعوت قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا تھا۔

امریکا کے لیے روانہ ہونے سے قبل ہمارے پشاور کے دوست ڈاکٹر رام چند کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں ڈائریکٹ اپنے بھائیوں کے پاس جانے کے بجائے پہلے کولوراڈو پہنچ کر چند دن ان کے پاس ٹھہروں اور اس کے بعد نیوجرسی جاؤں کیونکہ میں کراچی سے امریکا جانے کے لیے جس ہوائی کمپنی کے جہاز میں سفر کر رہا تھا، اس میں یہ سہولت تھی کہ میں کراچی سے روانہ ہوکر امریکا کی کسی بھی ریاست کے ائیرپورٹ پر اتر سکتا تھا لیکن میں نے نیویارک کے JFK ائیرپورٹ پر اترنے کا فیصلہ کیا جو کینیڈی کے نام پر ہے کیونکہ وہاں سے نیوجرسی ریاست قریب تھی جہاں کے ایک قصبہ نما شہر اوینل میں میرے بھتیجے مقیم تھے اور مجھے ابتدائی چند دن ان کے ہاں ٹھہرنا تھا۔

امریکا کا "جے ایف کینیڈی" ائیرپورٹ نیویارک ریاست کے بالکل انتہائی سرے میں واقع Queens کے علاقے میں ہے جو بروکلین سے جڑا ہوا ہے۔ کوئنس، بروکلین، مین ہٹن، اسٹیٹن آئی لینڈ اور برونکس جیسے مختصر جزائر مل کر نیویارک بناتے ہیں۔ جے ایف کینیڈی ائیرپورٹ سے نیوجرسی کا اہم شہر نیوآرک تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ نیوآرک کے قریب واقع قصبوں کے نام یہ ہیں۔ اوینل، ووڈبرج، راہ وے، لنڈن، کولونیا، Iselin وغیرہ۔

ائیرپورٹ پر اتر کر کار کے ذریعے کوئنس سے بروکلین اور پھر دریائے ہڈسن پر تعمیر شدہ پل "ویرازانو برج" سے گزر کر اسٹیٹن جزیرے پر پہنچا جاسکتا ہے۔ اسٹیٹن جزیرے سے پلوں اور کراسنگ کے ذریعے کئی سڑکیں نیوجرسی میں پہنچ تک پہنچاتی ہیں۔ ان میں آؤٹر برج کراسنگ اور Goethals پل بھی شامل ہیں۔ درمیان میں آنے والا سمندری حصہ نیوآرک خلیج کہلاتا ہے۔ یہاں سے گزرنے کے دوران مجھے ماضی کے وہ دن یاد آگئے جب میں جہاز چلاتا تھا۔ ہم اٹلانٹک سمندر کو عبور کرکے اسی نیوآرک خلیج میں آکر لنگر گراتے تھے۔ ایک جانب مین ہٹن کا علاقہ ہوتا اور وہیں سے آزادی کا مجسمہ نظر آتا تھا۔ دوسری طرف نیوجرسی کا اہم اور مشہور ائیرپورٹ نیوآرک ہوتا۔

ان ایام میں نیویارک قریب ہونے کے سبب نیوجرسی کی بندرگاہ نیوآرک کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی لیکن اب اس ائیرپورٹ پر ایک دوسرے کے پیچھے جہازوں کی آمدورفت کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے بلکہ اس سے پہلے ڈیڑھ گھنٹے کے سفر میں مجھے سر اور دماغ چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ چاروں طرف بلند و بالا عمارتیں، بل کھاتی سڑکیں اور ان راستوں سے نکلنے والے بے شمار برانچ Exit روڈ، مختلف سمتوں سے آنے والی سڑکوں کا ملنا اور ان پر ٹریفک کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ۔ بیسویں صدی اور اکیسویں صدی میں جو تمام عمارتیں امریکا کے لیے تیار کی گئیں، چمکتے دمکتے بجلی کی روشنی والے فیکٹریاں، چین اسٹورز، ہوٹلز، بیکریز، خوبصورت ریسٹورنٹس۔ یہ سب دیکھ کر پہلے پہل تو میں گھبرا گیا تھا کہ میں یہاں کیسے چل پھر سکوں گا۔ میری تو تربیت ہی دوسری ہوئی تھی۔ میں خود کو ایسا محسوس کرنے لگا جیسے کوئی بچا کھچا یا جنگلی ہو جیسے کسی گاؤں سے پہلی مرتبہ کراچی کے شہر میں آنے والا ہو میں آنکلا ہوں۔ میں اپنے بوڑھا ہونے تک یہی سوچتا رہا کہ آج سے 33 سال پہلے تک یہاں کے شہروں میں پہلے ہی دن تنہا گھومنے پھرنے کے لیے کیسے نکل کھڑا ہوتا تھا۔ آج کے امریکا کا ٹریفک، عمارتیں اور اوپر سے گزرنے والی سڑکیں دیکھ کر مجھ پر جو خوف طاری ہوا ہے، اس کا سبب امریکا کا مزید urbanized اور ماڈرن ہونا ہے یا میرا بوڑھا ہوجانا؟ دنیا کے شہر کس تیز رفتاری سے بڑھ رہے ہیں حتیٰ کہ ہمارے شہر کراچی، حیدرآباد، لاہور اور پشاور بھی۔

☆☆☆

میں جب پہلی مرتبہ 1969ء میں نیویارک میں کچھ عرصہ رہ کر پاکستان اپنے گھر پہنچا تو میرے والد صاحب اپنے تعلیمی دورے والے نیویارک کے بارے میں بتانے لگے۔ وہ پندرہ برس پہلے والا نیویارک مجھے اپنے وقت والے نیویارک کے مقابلے میں خاصا مختصر معلوم ہوا۔ 1972ء تک میری نیویارک آمدورفت رہی۔ اور اب 33 برس بعد کے اس نیویارک اور نیوآرک کو دیکھ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ میرے والا نیویارک بھی آج کے نیویارک کے مقابلے میں خاصا چھوٹا شہر تھا۔ ٹریفک کا ہجوم اور گاڑیوں کو قطار در قطار میلوں تک ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھ کر میں نے اپنے بھتیجے سے پوچھا تھا۔

"کچھ امریکن اپنے گھروں میں بھی موجود ہیں یا سب سڑکوں پر نکل آئے ہیں؟"

میری اس بات پر اس نے محض قہقہہ لگانے پر اکتفا کیا تھا۔

رام چند کو کولوراڈو سے اکثر فون آتا رہتا تھا اور ہر بار ان کا اصرار ہوتا کہ میں ان کے ہاں ضرور آؤں۔ میں نے امریکا کے نقشے پر نظر ڈالی تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ آئندہ اس کے آنے والے فون پر میں معذرت کرلوں گا۔ ایک دن اس کا فون آیا اور اس نے

شیطان

ایک عالی شان پلازا کے سامنے شیطان کھڑا زاروقطار رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ انسان بہت احسان فراموش مخلوق ہے۔ ایک راہ گیر نے شیطان کو آہ و زاری کرتے اور انسان کو برا بھلا کہتے دیکھا تو وہ رک گیا اور اس نے شیطان سے اس کی وجہ پوچھی۔ شیطان نے کہا۔ "کروڑوں روپے مالیت کا یہ پلازا دیکھ رہے ہو؟" حاجی خدا بخش نے یہ پلازا میرے مشوروں پر عمل کے نتیجے میں حاصل شدہ سرمائے سے تعمیر کیا مگر جب یہ پلازا مکمل ہوگیا تو میرا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس کی پیشانی پر سونے لفظوں میں "ھذا من فضل ربی" لکھوا دیا۔

راہ گیر نے "ھذا من فضل ربی" پر ایک نگاہ ڈالی با آواز بلند ماشاء اللہ کہا اور آگے چل دیا۔

(عطاء الحق قاسمی کی "ہنسنا رونا منع ہے" سے ایک مزاحیہ انتخاب... ولید بلال)

ایسی بات نہ ہوئی تو میں نے کہا۔ "یار! میں اتنی دور نہیں آسکتا۔"

"تم بھی کمال کرتے ہو۔ دور تو سان فرانسسکو اور لاس اینجلس ہیں۔ ہم تو صرف پانچ گھنٹے کی مسافت پر ہیں۔"

رام چند نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ یہ فاصلہ کراچی سے کنڈیارو یا دادو جتنا ہوگا۔ وہ بھی تو پانچ گھنٹے کی مسافت پر ہیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے ایکدم ہوش آگیا۔ نیویارک اور کولوراڈو کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ پورے پاکستان کو لپیٹ کر بیچ میں رکھ دیا جائے تو پھر بھی خاصی جگہ بچ جائے گی۔

"کیا مطلب! صرف پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔" میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"جی ہاں، صرف پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔" رام چند نے سکون سے جواب دیا۔ "میرا مطلب ہے بائی ائیر۔"

"نیویارک سے تمہارے پاس آنے سے بہتر ہے کہ میں آئندہ سال اسی کرائے میں کراچی سے کوالالمپور چلا جاؤں، فاصلہ اور ہوائی جہاز کا کرایہ وہی ہے۔ بلکہ ملائیشیا ائیر کمپنی تین دن ہوٹل میں رہائش مفت فراہم کرتی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے رام چند کو بتایا۔

سو امریکا فاصلوں کا ملک ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ وہ آپ کے قریب رہتا ہے تو وہ بھی کم از کم سو میل آپ سے دور

ہوگا۔ رینش تھا بروادائی نیوجرسی سے واشنگٹن، عرفان بھائی واشنگٹن سے بالٹیمور، فلاڈلفیا اور فلک شیر ورجینیا سے اٹلانٹک سٹی مجھے اس طرح لے جاتے تھے جیسے گلشن سے ایمپریس مارکیٹ یا قاسم آباد سے سندھ یونیورسٹی لے جارہے ہوں۔ یہ بات ضرور ہے کہ امریکا میں تقریباً ہر شخص کے پاس نئی گاڑی ہے، خواہ وہ قسطوں پر لی گئی ہو۔ بہترین سڑکیں ہیں جن پر سفر کرنے کے دوران تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹول ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں قانون کی عمل داری ہے، اس کے خوف سے ہی سہی، ہر شخص احتیاط اور سکون سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہے اور زیادہ تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ اب تو یہاں کئی ایسے FM ریڈیو اسٹیشن قائم ہوچکے ہیں جہاں سے ہر وقت ہندی اردو گانے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ سیکڑوں انگریزی ریڈیو اسٹیشن ایک طرف اور یہ دیسی اسٹیشن دوسری طرف۔ جہاں سے ہندی، اردو بھی گانوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی غزلیں سفر کے لطف کو دوبالا کردیتی ہیں۔

☆☆☆

ہمارا جہاز نیویارک کے JFK ایئرپورٹ پر صبح نو بجے پہنچا تھا۔ یہ فلائٹ یورپ اور اٹلانٹک سمندر کے اس جانب کے ملکوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔ انگلینڈ اور یورپ کے اہم اور معروف لوگ اسی وقت نیویارک پہنچ کر دن بھر دفاتر یا بزنس میٹنگز اٹینڈ کرنے کے بعد شام کو اسی جہاز میں یورپ، افریقہ اور ایشیا لوٹ جاتے ہیں۔ آتے ہوئے ہوائی جہاز رات بھر اٹلانٹک سمندر کے اوپر محو پرواز رہتا ہے اور اس دوران میں وہ اپنی نیند پوری کرلیتے ہیں۔ تاکہ صبح کو فریش حالت میں کام انجام دے سکیں۔

ہماری عقبی سیٹوں پر بیٹھی ایک ایشین فیملی کا بچہ مسلسل روئے جارہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار گزر رہی تھی کیونکہ ان کی نیند میں خلل پڑ رہا تھا۔ ایسے مواقع پر خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو ایسی دوا پلادیا کریں کہ طویل پرواز کے دوران انہیں نیند آجائے۔ اس طرح وہ خود اور دیگر مسافر سکون سے سفر کرسکتے ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جنہیں جہاز سے اتر کر آرام کرنے کے لیے اپنے گھر نہیں بلکہ سیدھا آفس کی طرف دوڑنا ہوتا ہے جہاں انہیں اہم میٹنگز میں شریک ہونا ہوتا ہے۔

مجھے شدت سے اس بات کا احساس اس لیے بھی ہوتا ہے کہ میں ایسے مرحلے سے گزر چکا ہوں۔ ایک مرتبہ مجھے کراچی آفس کی جانب سے جہاز کے ڈرائی ڈاکنگ کے لیے ہوائی جہاز کے ذریعے جاپان بھیجا گیا تھا۔ میری کراچی سے ٹوکیو کی فلائٹ شام کو تھی۔ میں دن بھر اپنے آفس میں کام کرتا رہا اور شام کو ایئرپورٹ پہنچا۔ میرا جہاز میں رات بھر سونے کا پروگرام تھا لیکن مون سون کی ہواؤں اور طوفان نے تھیلا (تھائی لینڈ) تک تمام مسافروں کی حالت خراب کردی تھی۔ اس کے بعد جب موسم اور جہاز میں کچھ سکون ہوا تو تھیلا سے سوار ہونے والی ایک فیملی کے ڈیڑھ دو سال کے جڑواں بچوں نے رو رو کر جہاز کو سر پر اٹھالیا تھا۔ مجھے پورے سفر میں نیند پوری کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ جب میں ٹوکیو ایئرپورٹ پر اترا تو میرے سر میں درد اور آنکھوں میں جلن ہورہی تھی۔ شدید خواہش ہورہی تھی کہ ہوٹل پہنچ کر چند گھنٹے آرام کروں لیکن پروگرام کے مطابق ایئرپورٹ پر مقامی آفس کا انچارج مجھے لینے کے لیے موجود تھا اور وہ مجھے سیدھا جہاز پر لے گیا۔ ظاہر ہے اس وقت صبح کے نو بج چکے تھے۔ جہاز کے افسران، جاپانی شپ یارڈ کے کارندے آٹھ بجے ہی جہاز پر پہنچ چکے تھے۔ کئی اہم امور پر مشورہ کرنا تھا اور کام کا آغاز کرنے سے پہلے اس پر بحث کرکے آخری فیصلہ کرنا تھا۔ ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ ایسے حالات، ایک دو گھنٹے آرام کرنے کا بھی موقع نہیں دیتے ہیں۔ پورا دن جہاز کے انجنوں پر جاری کام کو چیک کرنے اور اہم مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے گزرا۔ اس دوران میں رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ تھیلا سے جہاز میں سوار ہونے والی خاتون نے ہم جیسے مسافروں کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ کاش وہ جہاز میں سوار ہوتے ہی اپنے جڑواں بچوں کو کوئی دوا پلادیتیں۔ میڈیکل سائنس نے کافی ترقی کرلی ہے۔ بچوں کو نشہ آور دوا پلانے کے بجائے ایسی دوائیں ضرور ایجاد ہوچکی ہوں گی جن کے چند قطرے بچے کو پرسکون گہری نیند سلاسکتے ہوں۔ جہاز سے اترنے کے بعد اس خاتون نے گھر پہنچ کر آرام کیا ہوگا اور پھر کا کھانا خود تیار کرنے کے بجائے ہوٹل سے منگوا کر کھایا ہوگا لیکن وہ ہمیں دن بھر کے لیے درد سر دے گئی تھی۔

☆☆☆

ہمارا جہاز دبئی سے ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر سے روانہ ہوا تھا۔ لیکن پائلٹ نے راستے میں اس تاخیر کا ازالہ کردیا تھا۔ ہماری فلائٹ نے نیویارک کے JFK ایئرپورٹ پر بالکل درست وقت پر لینڈ کیا۔ دبئی میں پرواز کی تاخیر سے مسافر خاصے پریشان اور بے چین ہوگئے تھے۔ کیونکہ نیویارک پہنچ کر انہیں جو طے شدہ میٹنگز اٹینڈ کرنی تھیں یا کاروباری

معاملات طے کرنے تھے، ان کا کیا ہوتا۔ تاخیر اس لیے ہوئی کہ اس کا ایک سبب تھا۔ سات افراد پر مشتمل ایک پاکستانی فیملی کراچی سے سفر کررہی تھی۔ ان میں ایک خاتون اپنے چار بچوں اور ساس سسر کے ساتھ تھی۔ خاتون کے دس سالہ بچے نے الٹیاں کرنی شروع کردی تھیں۔ دراصل اسے "ایئر سکنیس" کا عارضہ تھا۔ اس پر کراچی سے دبئی کے درمیان موسم کی خرابی نے اس کی طبیعت مزید بگاڑ دی تھی۔ وہ بے چارہ پورے سفر میں الٹیاں کرتا رہا حتیٰ کہ اس نے جہاز میں ملنے والا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

دبئی پہنچ کر ہمیں جہاز تبدیل کرنا تھا۔ وہاں سے دوسرا جہاز ہمیں نیویارک لے جاتا۔ دبئی میں جہاز سے اترنے اور دوسرے جہاز میں سوار ہونے کے لیے صرف آدھا گھنٹا دیا گیا تھا۔ بہرحال وہ بچوں والی فیملی بھی ہماری طرح نہایت افراتفری کے عالم میں دوسرے جہاز پر سوار ہوئی۔ پریشانی کے عالم میں ایک جہاز سے دوسرے جہاز میں سوار ہونے کے لیے بھاگ دوڑ کے دوران..... وہ بچہ خاصی نقاہت محسوس کرنے لگا تھا۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ جہاز کا ایئرکنڈیشنر ابھی تک آن نہیں ہوا تھا۔ جہاں پہلے بیٹھے ہوئے مسافر گھٹن محسوس کررہے تھے، وہاں ہم نئے داخل ہونے والے لوگ بھی بے چینی اور الجھن کا شکار ہوگئے۔ بچے کو مزید چکر آنے لگے۔ اگر گرمی اور گھٹن نہ ہوتی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔

اسی دوران میں بچے کی پریشان ماں نے قریب سے گزرنے والی ایئرہوسٹس سے کہا "سر درد کی کوئی گولی مل سکے گی؟"

"کیوں؟" ایئرہوسٹس نے گولی لاکر دینے یا کوئی جواب دینے کے بجائے الٹا عجیب سا سوال کیا۔

"پچھلے سفر میں میرے بچے کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔" خاتون نے بتایا "اسے ابکائیاں آرہی ہیں اور اس کے سر میں بھی درد ہورہا ہے۔ کوئی ایسی ٹیبلٹ لادیں جس سے اس کی طبیعت بحال ہوجائے۔"

ایئرہوسٹس کے دماغ میں نہ جانے کیا آیا، شاید وہ خود کو ضرورت سے زیادہ اسمارٹ سمجھتی تھی۔ اس نے وہیں تفتیش شروع کردی۔

"آپ کا بچہ کب سے بیمار ہے؟" اس نے بچے کی ماں سے پوچھا۔ وہ گھریلو خاتون یہ سمجھی کہ ایئرہوسٹس اس سے ہمدردی کا اظہار کررہی ہے اور وہ بچے کی بیماری کے متعلق دریافت کرکے اس کے مطابق دوا لادے گی۔ حالانکہ ایئرہوسٹس کو شبہ ہوا تھا کہ بچہ شدید بیمار ہے اور سفر کرنے کے لائق نہیں ہے۔ وہ اپنے سوال سے اس خیال کی تصدیق چاہتی تھی۔

"یہ سر میں درد کی شکایت کررہا ہے۔" خاتون نے بتایا "اس کے علاوہ یہ کراچی سے دبئی تک کے سفر کے دوران مسلسل الٹیاں کرتا رہا ہے۔"

یکایک ایئرہوسٹس کا رویہ بدل گیا اور اس نے تیوری پر بل ڈال کر قدرے سخت لہجے میں کہا "پھر آپ ایسے بیمار بچے کو ساتھ لے کر لمبے سفر پر کیوں نکلی ہیں۔ میں ڈاکٹر کو بلواتی ہوں۔"

خاتون ضرورت سے زیادہ سادہ مزاج تھی۔ وہ اب بھی اسے اپنا ہمدرد سمجھ کر کہتی رہی "ڈاکٹر سے کہیے گا کہ اس کے لیے ایسی دوا لائے جس کے کھانے سے اس کی الٹیاں بند ہوجاتی ہیں۔ میں ہمیشہ اس کے لیے ٹیبلٹس ساتھ لے کر چلتی ہوں لیکن اس مرتبہ بھول گئی۔"

ایئرہوسٹس اسے گھورتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ ان کی سیٹیں میرے بالکل عقب میں تھیں۔ ایئرہوسٹس کے جاتے ہی میں نے ایکدم پلٹ کر جلدی جلدی اردو میں خاتون سے کہا "آپ بچے کی بیماری کا زیادہ ذکر نہ کریں۔ یہ بدمعاش ایئرہوسٹس آپ کو بچے سمیت جہاز سے اتروا دے گی۔"

دراصل بچہ کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہرگز نہیں تھا۔ میں نے اسے کراچی ایئرپورٹ پر بھاگتے دوڑتے اور شرارتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس پر ایئرسکنیس کا اثر تھا جو بڑوں کو بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بچہ خوف زدہ بھی ہوگیا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ نفسیاتی طور پر بیمار ہوگیا تھا۔ ایسے واقعات بحری اور ہوائی جہاز کے سفر کے دوران عموماً پیش آتے رہتے ہیں۔ اس کی معلومات ہم سے زیادہ اس "ادھیڑ عمر" اور فربہ ایئرہوسٹس کو ہونی چاہیے تھی لیکن ایئرہوسٹس [illegible] کا نیا ایڈیشن معلوم ہوتی تھی۔ اسے اس کیس سے خطرے کی بو آرہی تھی۔ کوئی دوسرا نہیں صرف یہ خطرہ کہ بچہ کسی اہم بیماری میں مبتلا ہے اور اسے اس اہم اور طویل سفر میں اپنے ساتھ رکھنا جوکھم سے کم نہیں۔

ویسے تو ہر فضائی سفر اہم ہوتا ہے لیکن وہ سفر، جس میں اٹلانٹک جیسا طویل سمندر عبور کرنا ہو، وہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ انسانی جان کو ہر صورت میں تحفظ فراہم کرنے کے لیے بین الاقوامی قانون کے مطابق جہاز کو اپنا روٹ اور شیڈول تبدیل کرکے قریبی ایئرپورٹ پر لینڈ کرنا ہے تاکہ مسافر کی جان

بچائی جا سکے۔ اس صورت میں ہوائی کمپنی کو خواہ کتنا ہی نقصان برداشت کرنا پڑے لیکن اسے ہر حال میں بیمار مسافر کی جان بچانی ہے۔ شاید اس ائر ہوسٹس کے دماغ میں بھی اسی قسم کے خیالات آ رہے تھے کہ بچہ شدید بیمار ہے اور دوران سفر کہیں اس کی موت واقع نہ ہو جائے۔ اس صورت حال میں اس کی فضائی کمپنی مشکلات کا شکار ہو سکتی تھی۔

اس سلسلے میں ائر ہوسٹس کو بھی قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ہنگامی حالات کو پرکھنے اور اس سے عملے اور جہاز کمپنی کے مالکان کو ضرور آگاہ کرنا چاہیے تاکہ ہوائی جہاز اور اس کے مالکان کسی بڑے نقصان سے محفوظ رہیں۔ یہی سبب ہے کہ کئی ہوائی کمپنیاں پورے مہینوں کی حاملہ خواتین کو اپنے جہاز میں سفر کرنے کے لیے ٹکٹ نہیں دیتیں تاکہ فلائٹ کے دوران کسی ایمرجنسی کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ اگر کسی جہاز میں ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو ہوائی جہاز کو کسی قریبی ائرپورٹ پر اتارنا پڑتا ہے لیکن جہاں دور دور تک کوئی ہوائی اڈا نہ ہو۔ چاروں طرف اتھاہ سمندر ہو، ایسے میں ہوائی جہاز اور بحری جہاز چلانے والے عملے کی پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جہاز کا سیکنڈ اور پھر چیف انجینئر بننے کے دوران میری ہمیشہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ کام کا ماہر اور بہتر صحت والا عملہ رکھا جائے تاکہ وہ اپنے اور دیگر جہازی ساتھیوں کے لیے کسی قسم کا مسئلہ پیدا نہ کرے۔ اٹلانٹک اور پیسفک سمندر میں سفر کرنے کے دوران میری ہمیشہ یہی خواہش ہوتی تھی کہ ایک بھی ایسے انجینئر اور خلاصی کو اپنے ساتھ شامل نہ کیا جائے جو ذہنی طور پر سفر کے لیے تیار نہ ہو یا وہ بیمار ہو۔ طویل اور خطرناک سفر میں ایسے لوگ یقیناً مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ ایسے تو کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ ایک صحت مند انسان کو یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس پر کب اور کیسی بیماری حملہ آور ہو سکتی ہے۔ بہرحال جانتے بوجھتے اس قسم کا خطرہ ہرگز مول نہیں لیا جا سکتا کیونکہ جہاز پر نہ تو آپریشن تھیٹر مکمل اور نہ ایسے سفر میں سیکڑوں میل تک کوئی بندرگاہ ہوتی ہے۔

بہرحال یہاں اس ہوائی جہاز میں ایک ماں بہتر دوا حاصل کرنے کے لیے اپنے بچے کی بیماری شدومد کے ساتھ بیان کر رہی تھی اور ہوائی جہاز کی ائر ہوسٹس بھی اسی شدومد کے ساتھ پائلٹ اور متعلقہ عملے کو آگاہ کر کے اس بچے کو سفر کرنے سے رکوانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسرے الفاظ میں بچے کے ساتھ ماں، دیگر بچوں اور ممکن تھا کہ ساس سسر کو بھی دبئی میں اتار دیا جاتا۔ ظاہر ہے، صرف بچے کو نہیں اتارا جا سکتا تھا۔

اس دوران میں، میں نے مختصر الفاظ میں کراچی سے ان کو بتایا کہ بچہ زیادہ بیمار نہیں ہے تھا اور اس کا بار بار ذکر نہ کریں ورنہ فیملی کے تمام افراد کو جہاز سے اتار دیا جائے گا لیکن وہ میری بات سمجھ نہ سکے اور میں انہیں تفصیل سے سمجھانے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ اس دوران میں وہاں جہاز اور گراؤنڈ کے عملے کے کئی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ دوسرے مسافر بھی سخت پریشان تھے۔ زیادہ تر لوگوں کی خواہش تھی کہ اب جہاز کو روانہ ہونا چاہیے، خواہ اس فیملی کو اتار دیا جائے۔ ان کا جہاز سے اتارا جانا بھی جلدی والا کام نہ تھا۔ ان کا سامان لوٹانے کے لیے پورے جہاز کا سامان کھنگالنا پڑتا۔ اس دوران ــــ پائلٹ بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی فیملی کے تمام افراد کی سفری دستاویزات طلب کیں۔ جہاز راں کمپنی کا ڈاکٹر بھی وہاں پہنچ گیا لیکن وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ بچہ کس سیریس بیماری میں مبتلا ہے۔ اس نے اپنی مدد کے لیے دو اسپیشلسٹ وہاں بلوا لیے تاکہ وہ بچے کا جنرل چیک اپ کر کے اپنی رائے دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک عرب اور ایک مصری ڈاکٹر الیکٹرانک مشین کے ساتھ آ گئے۔ انہوں نے بچے کا بلڈ پریشر اور دیگر ٹیسٹ لیے۔

میں نے پہلے آنے والے ڈاکٹر سے کہا "میں اس فیملی کے ساتھ کراچی سے سفر کر رہا ہوں۔ میری رائے کے مطابق بچہ نفسیاتی طور پر اپ سیٹ ہے اور اسے موسم خراب ہونے کے سبب الرجی ہو رہی ہے۔ اب یہ آئندہ کے سفر کے خیال سے نفسیاتی طور پر خوف زدہ ہے۔ آپ اپنا، اس فیملی اور ہم مسافروں کا وقت ضائع نہ کریں، جہاز کو پرواز کرنے کی اجازت دیں۔"

"میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا "اب یہ اسپیشلسٹ اپنی رائے دیں تو پھر اس کے مطابق فیصلہ کرنے میں تاخیر نہیں کی جائے گی۔"

بہرحال بلڈ پریشر، ٹمپریچر اور جو کچھ بھی ڈاکٹروں نے چیک کیا، سب نارمل نکلا۔ ایک تو مثبت رپورٹ اور ان کی مکمل سیٹ پر براجمان امریکن ڈاکٹر کی مداخلت پر فلائٹ کو پروگرام کے مطابق ٹیک آف کرنے کے لیے "اوکے" کیا گیا۔ جس ائر ہوسٹس نے یہ سارا کھڑاگ پھیلایا تھا، نہ تو اس نے سرد روی کی تلافی کی اور نہ ہی بچے کی ماں نے اس بارے میں کچھ کہا۔ وہ بے چاری گویا حالات سے سمجھوتا

کر کے خاموش رہی۔ سرد روی کی گولیاں تو ایک طرف، اس خاندان کو پردیس میں اترنا پڑ جاتا۔ اگر اپنا وطن کراچی ہوتا تو وہاں ایک دو دن ٹھہر کر بعد میں سفر کرنا آسان ہوتا لیکن دبئی جیسے اجنبی اور مہنگے ملک میں اتنے لوگوں کا کسی ہوٹل میں ٹھہرنا کسی عذاب سے کم نہ ہوتا۔ پھر دوبارہ انہیں نہ جانے کب امریکا جانے کے لیے اتنی سیٹیں دستیاب ہوتیں۔

میں یہ بتانا بھول گیا کہ پہلے ڈاکٹر نے آتے ہی انہیں جہاز سے اترنے کی وارننگ دی تھی۔ اس پر بزرگ (جو بچے کا نانا تھا) نے دبئی میں اتارے جانے پر احتجاج کیا تھا۔ وہاں موجود پائلٹ نے سخت الفاظ میں کہا تھا۔

"میں آپ لوگوں کی وجہ سے اپنے تین سو مسافروں کو پریشان نہیں کر سکتا اور ایمرجنسی کی صورت میں ہرگز اٹلانٹک سمندر کراس نہیں کروں گا۔"

بہرحال خوشی کی بات یہ ہے کہ بعد میں خیریت رہی۔ جہاز تمام مسافروں کو لے کر اپنے سفر پر روانہ ہوا اور بالکل درست وقت پر نیویارک کے JFK ائرپورٹ پر پہنچا۔ راستے میں امریکن گورا ڈاکٹر بار بار بچے کی خیریت دریافت کرتا رہا۔ اس نے بچے کو الٹی بند کرنے یا شاید نیند کی گولی دی تھی کیونکہ پھر وہ سفر کے دوران سوتا رہا تھا۔

میں JFK ائرپورٹ پر اترتے ہی تیز تیز امیگریشن بلڈنگ کی جانب بڑھا کیونکہ امریکا میں مقیم میرے بھانجے نے آگاہ کیا تھا کہ یہاں لمبی قطار لگتی ہے اور ہر مسافر سے اس قدر تفصیلی پوچھ گچھ کی جاتی ہے کہ اس میں کئی گھنٹے بھی صرف ہو سکتے ہیں اس لیے جس قدر جلد ممکن ہو سکے جہاز سے اترتے ہی قطار میں کھڑا ہونا چاہیے۔ اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس مرتبہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہاں مسافر بھی خاصی تعداد میں موجود تھے جو ہمارے علاوہ دیگر دو جہازوں سے اترے تھے۔ امیگریشن پر موجود اہلکاروں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اس لیے جلد ہی میرا نمبر آ گیا۔ پولیس والے پوچھ گچھ کے لیے بعض مسافروں کو مختلف کمروں میں لے جا رہے تھے لیکن میری اس قسم کی چیکنگ نہیں کی گئی۔ مجھ سے تین مختلف چند سوال پوچھے گئے کہ میری رہائش کہاں ہوگی، یہاں میری آمد کا مقصد کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے امریکا کے امیگریشن کے حوالے سے جو سخت باتیں سنی تھیں، میرا ان سے واسطہ نہیں پڑا۔ ممکن ہے مجھے میری عمر کا ایڈوانٹیج دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ میرے پاسپورٹ پر کینیڈا، جاپان اور سویڈن جیسے ملکوں کے

قرآنی پیش گوئیاں

قرآن پاک میں بہت سی پیش گوئیاں کی گئیں اور جو حرف کے ساتھ ساتھ پوری ثابت ہو رہی ہیں۔ لیکن اختصار کی وجہ سے صرف ایک کے متعلق آپ کی توجہ مبذول کروائی جاتی ہے۔ حوالے کے طور پر سورۂ روم کی پہلی پانچ آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

"الف لام میم۔ رومی قریب کے ملک میں مغلوب ہو گئے، وہ ہار جانے کے بعد عنقریب غالب آ جائیں گے چند برس کے اندر ہی۔ اللہ کا حکم ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور اس روز خوش ہوں گے اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی مدد سے۔ وہ مدد فرماتا ہے جس کی چاہتا ہے۔ اور وہی سب پر غالب ہے اور رحم فرمانے والا ہے۔"

حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں روم کی سلاطین اور ایرانی سلاطین دو بڑی عظیم الشان طاقتیں تھیں۔ اچانک ان کے درمیان ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ مسلمان رومیوں (عیسائیوں) کے حق میں تھے کہ وہ کامیاب ہوں۔ کیونکہ وہ ایک الہامی مذہب کے پیروکار تھے۔ اس کے برعکس قریش کہ ایرانیوں کے حق میں تھے کیونکہ وہ بھی ان کی طرح مشرک و آتش پرست تھے۔ انتہائی کم ایرانیوں نے رومیوں کو عبرتناک شکست دی اور ان کے بہت بڑے علاقے پر قابض ہو گئے۔ اس پر عرب کے بت پرست خوشی سے بغلیں بجانے لگے انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ عنقریب ہم بھی تمہیں ذلت آمیز شکست سے دوچار کریں گے اور دین اسلام کو خطۂ عرب سے مٹا کر دم لیں گے۔ اس پر سورۂ روم نازل ہوئی۔ جس کی پہلی پانچ آیات میں بتایا گیا کہ ایرانیوں کی کامیابی عارضی ہے اور چند سال (بضع سنین) کے بعد رومی دوبارہ چھا جائیں گے۔ اور پھر (9) سال بعد ایسا ہی ہوا۔ عربی زبان میں (بضع) کا لفظ 3 سے لیکر 10 کے عدد کیلئے بولا جاتا ہے اور یہ واقعہ 9 سال بعد ظہور پذیر ہوا۔ یہ حالات تھے جب قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ چنانچہ اس ضمن میں مشہور مؤرخ گبن یوں رقمطراز ہے۔

"جس وقت قرآن پاک میں یہ پیشن گوئی کی گئی تھی۔ اس وقت اس کا پورا ہونا ناممکن تھا۔ کیونکہ ہرقل کے عہد حکومت کے پہلے بارہ سالوں میں ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ رومی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔"

حوالہ: تاریخ زوال روما ان امپائر جلد پنجم صفحہ 519

لیکن جس روز رومیوں کو ایرانیوں پر فتح ہوئی اسی روز جنگ بدر میں مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے خلاف عظیم فتح نصیب ہوئی۔ قرآن پاک کے ان الفاظ پر غور فرمائیں۔ "اس روز خوش ہوں گے اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی مدد سے" اس میں دو خوشخبریاں تھیں ایک تو رومیوں کی ایرانیوں پر کامیاب ہونے کی کیونکہ مسلمان اس وقت رومیوں کی فتح کے حق میں تھے۔ دوسری مسلمانوں کی جنگ بدر میں کامیابی کی بھی پیشن گوئی تھی اور یہ جنگ بدر ...... کے 9 سال پہلے کی گئی تھی۔

مرسلہ: عبدالرحمن، فیصل آباد

Multiple وینے لگے ہوئے تھے۔ شاید اسی لیے انہوں نے جلد ہی میری اور مجھ سے اپنی جان چھڑالی تھی۔

میں نے سوچا تھا کہ ان سے تین مہینے کے ویزا کی درخواست کروں گا اور بعد میں اس میں توسیع کرالوں گا لیکن مجھ سے پوچھے بغیر میرے پاسپورٹ پر چھ ماہ کا ویزا لگا دیا گیا۔ میں اس بات کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں کہ کسی بھی ملک کے سفارت خانے سے ویزا ملنے کے باوجود وہ ملک اس کا ذمے دار نہیں رہتا مثلاً اسلام آباد میں قائم امریکا کے سفارت خانے نے میرے پاسپورٹ پر پانچ سال کا Multiple Visa لگا دیا تھا لیکن امریکا کے ائرپورٹ پر پہنچ کر وہاں کے امیگریشن عملے پر منحصر ہے کہ وہ مجھے یہاں کتنے عرصے تک رہنے کی اجازت دیتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض وجوہات کی بنا پر وہ مجھے ایک دن کے لیے بھی اپنے ملک میں رہنے کی اجازت نہ دیں اور وہیں سے کھڑے کھڑے واپس روانہ کردیا جائے۔ وہ اپنے اس فیصلے کی وجوہات بیان کرنے کے پابند نہیں ہیں۔

ہماری پرواز کے دو مسافروں کو بھی امریکا میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ انہیں دوسری فلائٹ سے اپنے ملک واپس جانے کا کہا گیا کیونکہ ان سے جو سوالات پوچھے گئے تھے، انہوں نے ان کے جوابات جھوٹ کی بنیاد پر دیے تھے۔ انہوں نے کچھ معلومات چھپانے کی کوشش کی اور اس طرح وہ گرفت میں آ گئے۔ بہرحال واپس بھجوائے جانے والے اور تفتیش کے لیے مختلف کمروں میں لے جائے جانے والے تمام مسافر نوجوان تھے۔ اہم بات یہ کہ وہاں پاکستانیوں کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں برتا جارہا تھا جو عام تاثر ہے کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ خاص طور پر اہانت آمیز رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ سختی سے چیکنگ ضرور کی جارہی تھی لیکن ان میں انڈیا، سنگاپور اور دیگر ملکوں کے مسافر بھی شامل تھے۔

واپس جانے والوں میں ایک شخص حیدرآباد سندھ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اسٹوڈنٹ ویزا پر امریکا میں رہائش پذیر تھا۔ اب وہ ایک مہینا پاکستان میں گزار کر لوٹا تھا لیکن اس مرتبہ امیگریشن نے اسے ملک میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کردیا کیونکہ ان کے پاس ثبوت موجود تھا کہ یہ شخص طالب علم نہیں ہے اور کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر اسٹوڈنٹ ویزا پر امریکا میں غیر قانونی طور پر ملازمت کرتا ہے اور یونیورسٹی سے زیادہ تر غیر حاضر رہتا ہے۔

امیگریشن کے بعد میں اپنا سامان اٹھا کر کسٹم چیکنگ والے حصے میں پہنچا۔ دروازے پر موجود کسٹم آفیسر کسی کسی مسافر کو کسٹم سیکشن میں بھیج رہا تھا۔ وہاں موجود کئی کسٹم آفیسرز مسافروں کے بیگ کھول کر چیک کررہے تھے۔ زیادہ تر مسافروں کو باہر جانے کا اشارہ کیا جارہا تھا۔ خوش قسمتی سے میں بھی ان میں شامل تھا۔ دوسری صورت میں مجھے بھی اپنا بیگ کھولنے پڑتے۔ بیگ کھولنا آسان لیکن اسے دوبارہ بند کرنا خاصا مشکل کام ہے۔

بہرحال دنیا کے بڑے ائرپورٹ سے باہر آنے کے بعد ہر ایک مسافر کو آزادی کا احساس اور خوشی ہوتی ہے۔ نیویارک شہر تک پہنچنے کے لیے ٹرین اور ٹیکسیاں موجود تھیں لیکن مجھے سامنے ہی میرا بھانجا نظر آ گیا۔ وہ مجھے اپنی کار میں بٹھا کر نیوجرسی کے لیے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

جے ایف کے انتہائی وسیع و عریض ائرپورٹ ہے۔ اس کے نو ٹرمنل ہیں اور ہر ٹرمنل ہمارے جناح ٹرمنل سے تقریباً چار گنا بڑا ہے۔ یہاں متعلقہ ہوائی اڈے تک پہنچنے کے لیے ہر قسم کی سہولت موجود ہے۔ آپ بس اور ٹیکسی کے علاوہ ائرپورٹ تک آنے والی خاص گاڑی "جے ایف کے ائرٹرین" کے ذریعے بھی شہر سے بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔ کوالالمپور، لندن اور نیویارک جیسے ہوائی اڈوں پر یہ سہولت بڑی نعمت ہے۔ ہم جیسے غریب ملکوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے اس قسم کی سواری بہت سستی ہے۔ جہاں ٹیکسی کا کرایہ سو ڈالر سے بھی زیادہ بنتا ہے، وہاں اس ائرٹرین کا ٹکٹ صرف پانچ ڈالر میں خرید کر آپ ہاورڈ بیچ اور جمیکا اسٹیشن تک پہنچ سکتے ہیں۔ آپ ایک مرتبہ جمیکا اسٹیشن تک پہنچ گئے تو وہاں سے کئی ٹرینیں (سب وے گاڑیاں) مڈ ٹاؤن اور لوور مین ہٹن تک جاتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ٹرین ائرپورٹ کے اندر ایک سے دوسرے ٹرمنل کے درمیان مفت سروس فراہم کرتی ہے۔ اگر آپ کسی غلط ٹرمنل پر پہنچ گئے ہیں تو ٹیکسی کے لیے پریشان ہونے کے بجائے اس ٹرین کے ذریعے چند منٹوں میں اپنی مطلوبہ جگہ یعنی ٹرمنل تک پہنچ سکتے ہیں۔

11 ستمبر 2001ء کے حملے کے بعد، جے ایف کے پہلا ائرپورٹ تھا جسے فوراً بند کردیا گیا تھا۔

جے ایف کے دنیا کا مصروف ترین ائرپورٹ ہے ظاہر ہے یہاں کچھ نہ کچھ حادثے بھی ضرور ہوئے ہوں گے۔ اس وقت مجھے 1990ء میں پیش آنے والا ایک فضائی حادثہ یاد آرہا ہے جو اس ائرپورٹ پر جنوبی امریکا کے بوئنگ 707 کو تباہ کر گیا تھا۔ یہ بدنصیب جہاز ایندھن کے ختم ہونے کے باعث نیویارک کے ایک چھوٹے سے ٹاؤن Coveneck میں کریش ہوگیا تھا۔ اس جہاز میں کریو سمیت 158 مسافر سوار تھے۔ ان میں سے 73 افراد موقع ہی پر ہلاک ہوگئے تھے۔ 85 افراد شدید زخمی ہوئے تھے۔

یہ ہوائی جہاز ساؤتھ امریکا کے ملک کولمبیا کے شہر Bogata سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا تھا۔ گو کہ جہاز وقت پر نیویارک پہنچا تھا لیکن اس دن نیویارک کی فضا پر شدید دھند چھائی ہوئی تھی اس لیے جہازوں کو لینڈ کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ وہاں پہنچنے والے جہازوں کو فضا میں رہنے کی ہدایت کی گئی۔ وقفے وقفے سے جہازوں کو رن وے پر لینڈ کرنے کی اجازت دی جارہی تھی۔ مذکورہ بدنصیب جہاز بھی اس Holding Pattern میں شامل تھا جنہیں فضا میں چکر لگاتے ہوئے اپنی باری کا انتظار کرنا تھا۔ مذکورہ جہاز کو نیویارک کے اوپر چکر لگاتے ہوئے کافی وقت گزر گیا لیکن اب تک اس کی باری نہیں آئی تھی۔ اس ہولڈنگ کے دوران جہاز کے Reserve ٹینک میں موجود ایندھن ختم ہوتا رہا۔ یہ ایندھن اتنی مقدار میں ضرور تھا کہ جہاز نیویارک کے بجائے امریکا کے دوسرے شہر بوسٹن پہنچ کر آرام سے لینڈ کرسکتا تھا۔ اس کے بعد مسافروں کو بائی روڈ نیویارک لایا جاسکتا تھا۔ یہ ایک عام بات ہے۔ ایسی ایمرجنسی کی صورت میں ایسا ہوتا رہا ہے لیکن اس بدنصیب جہاز کے لیے ایسا نہ کیا گیا۔ ائرپورٹ ٹریفک کنٹرول والے یہی سوچتے رہے کہ دوسرے جہازوں کی طرح اس جہاز میں اب بھی کافی مقدار میں ایندھن موجود ہوگا۔ دوسری جانب جہاز کا پائلٹ یہ سوچتا رہا کہ بس تھوڑی ہی دیر میں اسے لینڈ کرنے کی اجازت مل جائے گی۔ اس طرح ہوائی جہاز کو نیویارک کے اوپر چکر لگاتے ہوئے 77 منٹ ہوگئے۔ اب جہاز میں اتنا ایندھن بھی باقی نہیں رہا تھا کہ اسے بوسٹن لے جایا جاسکے۔ ٹکنیکی زبان کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ وہ جہاز کا عملہ ہسپانوی تھا۔ وہ اپنے تئیں ایمرجنسی کی وارننگ دیتے رہے لیکن وہ "ایمرجنسی" کے بجائے انگریزی کا لفظ "Priority" دہراتے رہے۔ گویا وہ ائرپورٹ پر جلدی اترنے کو ترجیح دے رہے تھے۔

ہسپانوی ڈکشنری کے مطابق "پرایرٹی" کا مطلب "ایمرجنسی" ہے جبکہ انگریزی زبان میں یہ لفظ مختلف معانی رکھتا ہے۔ آخرکار ائرپورٹ والوں کے دریافت کرنے پر

غزل

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

خلق کہتی ہے جسے دل تیرے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں
کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

شوکت علی خان فانی بدایونی

جہاز والوں نے انہیں آگاہ کیا کہ اب جہاز میں صرف پانچ منٹ کا ایندھن بچا ہے۔ یہ انتہائی خطرناک صورت حال تھی۔ ائرپورٹ والوں نے "بادی" والے جہاز کو چھوڑ کر اسے لینڈ کرنے کا موقع دیا۔

پائلٹ نے جہاز کی بلندی کم کی لیکن اسے 500 فٹ سے بھی نیچے Wind Shear مل گیا اور جہاز حد سے زیادہ نیچے آ گیا۔ ائرپورٹ والوں نے پائلٹ کو صرف 1500 فٹ والی Wind Shear سے آگاہ کیا تھا اور اس سے نیچے کی معلومات نہیں دی۔ اس کے نتیجے میں پائلٹ، ائرپورٹ والوں کی اپروچ کھو بیٹھا۔ اس نے رن وے پر لینڈ کرنے کے لیے دوسری Approach کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران میں جہاز کا ایندھن بالکل ختم ہو گیا۔ اسی وقت جہاز کا انجن نمبر چار خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد باقی تین انجن بھی یکے بعد دیگرے بند ہو گئے۔ الیکٹرک پاور کے بند ہوتے ہی جہاز میں تاریکی چھا گئی۔ جے ایف کے ائرپورٹ سے پندرہ میل دور لانگ آئی لینڈ کے مقام پر جہاز ایک پہاڑی سے ٹکرا گیا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

حادثے کے بعد جہاز میں Explosion نہیں ہوئی کیونکہ اس میں پیٹرول کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اس طرح 85 مسافر بچ گئے۔ دوسری صورت میں دھماکے سے تمام لوگ بھسم ہو جاتے۔ رات کی تاریکی اور خراب موسم کے باعث زخمیوں کی تلاش میں بہت مشکل پیش آئی تھی۔

بدقسمت جہاز کے مالکان نے ائرپورٹ ٹریفک کنٹرول والوں کو قصوروار ٹھہرا کر جے ایف کے ائرپورٹ پر کیس دائر کر دیا تھا۔ کیس کئی مہینوں تک عدالت میں چلتا رہا۔ آخرکار اس بات پر تصفیہ ہوا کہ ائرپورٹ والے، مسافروں کو مقررہ معاوضے کا چالیس فی صد ادا کریں گے۔ باقی نقصان ہوائی جہاز کی کمپنی برداشت کرے گی۔

اس کے علاوہ کچھ دوسرے حادثے بھی اس ائرپورٹ سے وابستہ ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور امریکن ائرلائنز کے ایک جہاز کو پیش آیا جو 12 نومبر 2001ء کو وقوع پذیر ہوا۔

امریکا کا یہ جہاز (ائربس A300-600 جیٹ) جے ایف کے ائرپورٹ سے ٹیک آف کرنے کے بعد نیویارک کے علاقے کوئنس میں کریش ہو گیا تھا۔ یہ حادثہ گیارہ ستمبر کے فوراً بعد پیش آیا تھا اس لیے پورے امریکا میں کہرام مچ گیا کہ اس کے پیچھے بھی یقیناً اسامہ بن لادن جیسے شخص کا ہاتھ ہے جس نے جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی اسے زمین سے دشمن ائرکرافٹ گن یا راکٹ کا نشانہ بنایا ہے۔ کچھ چشم دید گواہان کے بیانات بھی سامنے آئے کہ انہوں نے دیکھا، جہاز میں پہلے شعلے لپکتے ہوئے نظر آئے اور اس کے بعد وہ پھٹ گیا۔ اس کے ٹکڑے دور دور تک پھیل گئے تھے۔

بہرحال تین سال بعد یعنی 26 اکتوبر 2004ء کو تفتیش مکمل کر کے خبر جاری کی گئی کہ یہ حادثہ Rudder کے حد سے زیادہ استعمال کے سبب پیش آیا۔ (Rudder سے بحری اور ہوائی جہاز کی سمت تبدیل کی جاتی ہے)

دراصل ہوائی جہاز کی تیزی Turbulence کے سبب کو حل کرنے کے لیے "کو پائلٹ" نے روڈر کو مستقل جوڑے رکھا جس کے نتیجے میں انجن کے اپنی جگہ سے کھسکنے کے سبب ایندھن ٹینک سے پیٹرول کا رساؤ شروع ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جہاز شعلوں میں گھر گیا۔ جہاز میں سوار 260 افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ پایا تھا۔ اس کے علاوہ جہاز کے جلتے ہوئے ٹکڑوں کی زد میں آ کر زمین پر موجود پانچ افراد بھی لقمۂ اجل بن گئے تھے۔

جہاز کمپنی نے جہاز تیار کرنے والی کمپنی پر کیس دائر کیا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ جہاز کی تیاری کے دوران ناقص میٹریل استعمال کیا گیا تھا۔ جہاز تیار کرنے والی کمپنی نے اس بات کو رد کرتے ہوئے جوابی موقف پیش کیا کہ ہوائی جہاز کے پائلٹ اور کو پائلٹ تربیت یافتہ نہ تھے۔ انہیں روڈر کے Characteristics کی درست معلومات نہیں تھی۔

بہرحال یہ کیس تاحال کورٹ میں چل رہا ہے۔ کبھی نہ کبھی دن اس کا فیصلہ بھی سامنے آ جائے گا لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ جب تک یہ حقیقت سامنے نہیں آئی، تقریباً تین برس تک اسے مسلمانوں کی جانب سے کی گئی دہشت گردی قرار دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں کئی راہ گیر بے گناہ مسلمان تشدد کا نشانہ بنے اور آج تک انہیں شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ سب یہاں کے میڈیا کا کمال ہے۔

میں جب واشنگٹن میں مقیم تھا تو میرے مشاہدے میں آیا کہ کئی برمی اور بنگالی رفیوجی ملائیشیا میں غیر قانونی طور پر آئے تھے۔ جب وہ گرفتار کیے گئے تو وہاں کے پولیس اور ڈی میں کام کرنے والے انہی لوگوں کو پاکستانی قرار دے کر صفحۂ اول پر اس طرح شہ سرخیوں میں خبر کو شائع کیا کہ مقامی لوگوں کی نظر میں ہم تمام پاکستان مجرم سمجھے گئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد گرفتار شدگان بنگالی اور

برمی رفیوجی نے بھی خود کو پاکستانی ظاہر کیا۔ اس کے پیچھے یہ منصوبہ کارفرما تھا کہ "چلو، ملائیشیا سے نکالے گئے تو پاکستان ہی بھجوا دیا جائے گا۔" کیونکہ اس زمانے میں پاکستان کے معاشی حالات بگڑ رہے تھے اور بہرحال بہتر تھے۔ ظاہر ہے اس "واردات" کے بعد ہمارے سفارت خانے کے ذمے داران کورٹ اور پولیس اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان میں کوئی بھی پاکستانی نہیں ہے۔ پھر پریس کانفرنس ہوئی۔ میڈیا کو آگاہ کیا گیا۔ اس کے تیسرے یا چوتھے دن اس خبر کی تردید شائع کی گئی اور وہ بھی اندرونی صفحات پر غیر نمایاں انداز میں، جس کی کوئی خاص اہمیت نہ ہونے کے سبب اسے کسی نے پڑھنے کی زحمت نہ کی۔

سو یہاں امریکا میں بھی اسی طرح مسلمان، خاص طور پر عرب اور پاکستانی مفت میں خوار ہوتے ہیں۔ خواہ ان کا کوئی قصور ہو یا نہ ہو۔ ایک جانے بوجھے اور طے شدہ پلان کے تحت کسی بھی پیش آنے والے ناخوشگوار واقعے کو فوراً مسلمانوں سے منسوب کر کے اور انہیں اس کا ذمے دار ٹھہرا کر نفرت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں تشدد کے واقعات بھی پیش آتے ہیں۔

☆☆☆

میں یہاں امریکا کے سابق صدر کینیڈی کے متعلق چند سطریں تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ ہماری جوانی کے دنوں میں ہم طلبا میں خاصے مشہور اور ہماری پسندیدہ شخصیت تھے۔

آج کل یعنی گزشتہ پچیس، تیس برسوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر امریکی صدر عتاب میں ہے۔ دنیا بھر میں اس پر لعن طعن ہوتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک کے لوگ امریکا میں رہنے کے خواہش مند بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی امریکا کے عوام اور وہاں کی حکومت کو گالیاں بھی دیتے ہیں۔ ان ساٹھ کے ابتدائی برسوں میں کینیڈی امریکا کے پینتیسویں صدر منتخب ہوئے تو وہ اپنی دلچسپ شخصیت اور خوبصورت شکل و صورت کے سبب نوجوان طبقے میں اس طرح پاپولر تھے جیسے دس برس بعد ذوالفقار علی بھٹو کو پسند کیا گیا۔

کینیڈی ہماری نسل اکیڈمی کے کیڈٹوں کی پسندیدہ شخصیت شاید اس لیے بھی تھے کہ وہ ایک باصلاحیت نیول افسر تھے۔ ان کی بہادری اور ہمت کے کارناموں سے سب ہی واقف ہوں گے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ان کی حاضر دماغی، بہادری اور جرأت کے اس کارنامے نے دنیا بھر کے لوگوں کو بہت متاثر کیا تھا۔ وہ 1943ء میں ایک چھوٹے جہاز کے کمانڈنگ افسر تھے۔ اس دوران میں ایک بڑے جاپانی Destroyer جہاز نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں کینیڈی کا جہاز غرق ہو گیا۔ وہ خود بھی شدید زخمی ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ انتہائی سرد، تاریک اور طوفانی رات میں اپنے زندہ بچ جانے والے ساتھیوں کو موت کے منہ سے نکال کر سلامتی کے ساتھ کنارے پر لے آئے تھے۔

امریکا کے یہ صدر کینیڈی (پورا نام جان فٹز جیرالڈ کینیڈی) مصنف بھی تھے۔ انہیں اپنی ایک کتاب Profiles in Courage پر پلٹزر پرائز بھی ملا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1956ء میں شائع ہوئی تھی۔ ہماری میرین اکیڈمی چٹاگانگ کی لائبریری میں اس کا تیسرا ایڈیشن موجود تھا جسے کیڈٹ بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اس سے قبل مسٹر کینیڈی نے 1940ء میں ہارورڈ کالج سے گریجویشن کرنے کے دوران Why England Slept کا تھیسز لکھا جو بے حد دلچسپ ثابت ہوا۔ یہ اپنے وقت کی بیسٹ سیلر کتاب تھی۔

کینیڈی امریکا کے سب سے کم عمر صدر تھے۔ دنیا کے لوگ ان کے لیے محبت اور ہمدردی کا جذبہ شاید اس لیے بھی رکھتے ہیں کہ وہ صدارت کے دوران قتل کر دیے گئے تھے۔ ان کے قاتلوں کے بارے میں آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ مرحوم بھٹو کی طرح ان کی تقریروں کے بعض جملے تو جوانوں میں بہت مقبول ہوئے۔ ان کی Inaugural تقریر کا یہ جملہ مجھے آج بھی یاد ہے جو ہمیں بے حد پسند آیا تھا۔ ہم اسے اکثر دہراتے رہتے تھے۔

"Ask not what your Country can do for you, ask what you can do for your Country."

☆☆☆

کینیڈی کے والدین آئرلینڈ سے امریکا آئے تھے۔ وہ 1917ء میں میساچوسٹس ریاست کے شہر بروکلین میں پیدا ہوئے۔ وہ آٹھ بہن بھائی تھے۔ وہ انٹرنیشنل ریلیشن میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد نیوی میں بھرتی ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد وہ بوسٹن کے علاقے سے ڈیموکریٹ کانگریس میں منتخب ہوئے۔ 1953ء میں سینیٹ میں داخل ہوئے۔ اسی برس انہوں نے جیکولین سے شادی کر لی۔ 1961ء میں ہونے والے الیکشن میں ری پبلک کے نمائندے رچرڈ نکسن کو شکست دے کر ملک کے پینتیسویں صدر بنے۔

کینیڈی کے صدارتی دور میں روس بھی طاقت کے لحاظ سے نمایاں تھا۔ اس زمانے میں امریکا دنیا کی واحد سپر پاور نہیں تھا۔ بعض معاملات میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روس، امریکا سے زیادہ طاقتور اور خطرناک ہے۔ کینیڈی کے دور میں روس اپنے حامی ملک کیوبا میں نیوکلیئر میزائل نصب کرنا چاہتا تھا۔ کیوبا جزیرہ، امریکا خاص طور پر اس کی ریاست فلوریڈا کے بالکل قریب ہے۔ پوری دنیا تجسس میں مبتلا ہوگئی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ امریکا کی کم بختی اس کے سر پر پہنچ گئی ہے۔ دنیا کا خیال تھا کہ امریکا کا کم عمر صدر کینیڈی، جسے صدر بنے ایک سال بھی نہیں ہوا، اب روس کی منت سماجت کرنے لگے گا۔ دوسری صورت میں دنیا نیوکلیئر جنگ کا شکار ہو جائے گی۔ لیکن کینیڈی نے نہایت جرأت مندی کے ساتھ روس کو دوٹوک انداز میں دھمکی دی اور اسے اپنی "کھال" میں رہنے کی تاکید کی۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ روس اگلے چوبیس گھنٹے کے اندر اپنے میزائل اور دیگر آلات اٹھا کر واپس چلا گیا۔ اس دوران ان کی "سیاتوس" نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ روس صرف ظاہری طور پر بھبکیاں دے رہا ہے۔ اصل میں وہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے اور عنقریب زمین بوس ہو جائے گا۔ بہرحال یہ بات تحسین کی بنا ہی تھی کہ کینیڈی کی دھمکی سن کر روس آئے بھاگا ہو جائے گا اور امریکا کے کس بل نکال کر دم لے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ ایک مرتبہ پھر کینیڈی کی واہ واہ ہوئی اور ان کی توقیر میں اضافہ ہوگیا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے ہدف کی طرف بڑھنے لگے، جو یہ تھا۔

"A world of Law and free Choice, banishing the world of war and coercion."

بہرحال بعد میں روس کھل کر امریکا کے سامنے نہ آیا۔ یونائیٹڈ نیشن کی اسمبلی میٹنگز میں خروشیف اپنے جوتے سے میز بجاتا رہا۔ کیوبا کا فیدل کاسترو دھمکے دیتے سے رجتا رہا لیکن کیوبا کی یہ محض بھبکیاں تھیں۔ بہرحال روس نے اس بات کی کسر اس امریکا ویت نام جنگ میں نکالی اور اس نے بالواسطہ طور پر امریکا کو شدید نقصان پہنچایا اور اسے دنیا میں ہزیمت اٹھانا پڑی۔ امریکا نے روس کو افغانستان میں شکست سے ہمکنار کر کے گویا ویت نام کا بدلہ لے لیا تھا۔

☆☆☆

22 نومبر 1963ء کو کینیڈی اپنی بیوی کے ساتھ تقریری دورے پر ٹیکساس ریاست کے شہر ڈلاس سے نکلی موٹر کیڈ میں گزر رہے تھے اس دوران انہیں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ اپنی بیوی کی بانہوں میں جا گرے۔

امریکا کے اس صدر کینیڈی نے اپنی زندگی میں کئی معاملات پر دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ سماوی جانب سے خلا میں راکٹ چھوڑنے کا پروگرام بھی انہوں نے شروع کرایا تھا۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی کئی باتوں نے امریکن عوام کے ساتھ دنیا کو بھی حیرت میں ڈال دیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ دنیا کی اس قدر اہم شخصیت کے قتل کا معما اب تک حل نہیں ہو سکا۔ نہ یہ معلوم کیا جاسکا ہے کہ اس قتل کے پیچھے کیا اسباب اور محرکات تھے۔ اصل قاتل وہی تھا جسے پس سامنے لائی تھی یا کوئی دوسرا تھا؟

22 نومبر 1963ء، جمعہ کے دن ساڑھے بارہ بجے کینیڈی کو کھلی موٹر کار میں گولی ماری گئی۔ اسی شام ساڑھے سات بجے ڈلاس شہر میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اوسوالڈ نامی شخص کو ایک پولیس مین کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ رات ساڑھے گیارہ بجے اسی شخص پر الزام لگایا گیا کہ اس نے صدر کینیڈی کو قتل کیا ہے۔ ٹھیک ساڑھے چار گھنٹے کے بعد اوسوالڈ کو صدر کے قتل کا ملزم نامزد کیا گیا۔ وہ پولیس ہی کی کسٹڈی میں تھا کہ دو دن بعد جیک روبی نامی شخص نے اسے لاک اپ میں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

کینیڈی کے مرنے کے بعد وائس پریذیڈنٹ لنڈن جانسن ملک کے صدر بنے۔ انہوں نے اوسوالڈ کی ہلاکت کے پانچ روز بعد اس کے قتل کی تحقیق کے لیے ایک کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی (وارن کمیشن) نے جو رپورٹ پیش کی کہ اوسوالڈ صدر کا قاتل تھا اور یہ اس کا انفرادی فعل تھا۔ یعنی اس کے پیچھے کسی گروپ یا گروہ کا ہاتھ نہیں ہے۔ بہرحال ان دنوں بھی نقادوں نے اس قتل کے متعلق کئی نظریے پیش کیں اور اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ کینیڈی کا قاتل ایک عام آدمی اوسوالڈ تھا۔ اوسوالڈ خود بھی یہی کہتا رہا کہ وہ صدر کینیڈی کا قاتل نہیں ہے۔ اس نے کینیڈی پر گولی نہیں چلائی۔

اوسوالڈ کے قتل کے بعد بھی کورٹ میں اس کا جرم اور بے گناہی ثابت نہیں ہو سکی۔ کئی ایسے لوگ جو جرائم کی دنیا اور تفتیش کے امور پر اختیار رکھتے ہیں، وہ یہی سمجھتے ہیں بلکہ انہیں یقین ہے کہ اصل قاتل کو تحفظ فراہم کرنے اور اسے قانونی گرفت سے بچانے کے لیے اوسوالڈ کو قربانی کا بکرا بنایا گیا۔

کینیڈی کے قاتل کو بے نقاب کرنے کے لیے کئی کہانیاں، افسانے اور ناول لکھے گئے اور فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔ ان میں جن پر صدر کے قتل کا شبہ ظاہر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔ امریکا کی سی آئی اے، مافیا، روس کی خفیہ ایجنسی کے جی بی، کیوبا کے فیدل کاسترو، وائس پریذیڈنٹ لنڈن جانسن اور امریکی فوجی جرنیل وغیرہ۔

کینیڈی کی تدفین آرلنگٹن قومی قبرستان میں کی گئی۔ امریکی عوام، کینیڈی، ابراہام لنکن، جارج واشنگٹن اور فرینکلن روزویلٹ کو بہترین صدور تسلیم کرتے ہیں۔ کینیڈی کی یاد میں نیویارک کے ہوائی اڈے "Idlewild" کا نام تبدیل کر کے "جان ایف کینیڈی" ائرپورٹ رکھا گیا۔

☆☆☆

صدر کینیڈی سے وابستہ حیرت انگیز اور چونکانے والی باتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کی نوجوان اور خوبصورت بیوی جیکولین نے شوہر کے قتل کے بعد نہ صرف شادی کی بلکہ ایک نئے جیون ساتھی کے طور پر جس شخص کا انتخاب کیا وہ ان سے 28 سال بڑا اور غیر ملکی تھا۔ وہ یونان سے تعلق رکھنے والا ایک جہاز راں کمپنی کا مالک تھا۔ جیکولین، شوہر کی ناگہانی موت پر انتہائی دل گرفتہ، غمگین اور اپنے چہرے پر سیاہ نقاب لگائے غم واندوہ کی تصویر نظر آتی تھیں۔ انہوں نے یک دوسری شادی کا اعلان کر کے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ میڈیا کو ایک چٹ پٹا موضوع مل گیا جو مہینوں تک استعمال ہوتا رہا۔ ہم اور ہمارے جیسے رسالوں نے بھی اپنے کالم اس کے لیے وقف کر دیے تھے۔ میرے خیال کے مطابق آج کے لوگوں نے شہزادی ڈیانا کے بارے میں اس قدر ذوق سے اور ایک طویل عرصے تک نہیں پڑھا ہوگا۔ جتنا 1961ء میں کینیڈی کے الیکشن، قتل، جیکی (جیکولین) کی دوسری شادی، اوناسس کے بوڑھے شوہر کی موت، اس کی چھوڑی ہوئی ملکیت پر بوڑھے شوہر اوناسس کی پہلی بیوی کے ساتھ تنازعہ اور جیکولین کی موت تک ہم نے پڑھا تھا۔ کینیڈی اور ان کی فیملی، جیکولین اور جہازوں کے یونانی سوداگر اوناسس کے متعلق جتنی کتابیں اور مضامین شائع ہوئے، آج کے دور میں شاید ہی کسی کے بارے میں اتنی تعداد میں شائع ہوئے ہوں۔ ان ایام میں انٹرنیٹ اور ٹی وی بھی اس قدر پاپولر نہیں ہوئے تھے اس لیے ہم "Bay Watch" اور "سانس بھی کبھی بہو تھی" جیسے پروگراموں سے دل بہلانے کے بجائے کینیڈی، جیکولین، اوناسس جیسے لوگوں کی ذاتی باتیں اور اسکینڈلز پڑھ کر خوش ہوتے تھے۔

جیکولین فرنچ تھیں۔ ان کے پڑدادا یا ترددادا 1815ء میں فرانس سے ہجرت کر کے فلاڈیلفیا میں آباد ہو گئے تھے۔ جیکولین خود بھی انگریزی کے علاوہ فرنچ اور ہسپانوی زبانوں میں ماہر تھیں۔ وہ 1952ء میں 23 برس کی عمر میں واشنگٹن ٹائمز کی فوٹوگرافر کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ ایک ڈنر پارٹی میں ان کی ملاقات کینیڈی سے ہوگئی۔ اس وقت کینیڈی کی عمر 35 برس تھی۔ ایک سال کی ملاقاتوں کے بعد 1953ء میں انہوں نے شادی کر لی۔ پورے دس سال کے بعد کینیڈی قتل ہو گئے۔ اس وقت جیکولین 34 برس کی ہو چکی تھیں۔ پانچ سال بعد انہوں نے مسٹر اوناسس سے شادی کرنے کا اعلان کیا۔

1968ء میں ظاہری طور پر یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی لیکن چند ہی برسوں کے بعد ان کی ملکیت اور دیگر معاملات کے جھگڑے اخبارات کی زینت بننے لگے۔ جب اوناسس کو پیرس میں جیکولین کے بجائے کسی خوبصورت ماڈل یا ایکٹریس کے ساتھ ڈنر کرتے ہوئے دیکھا گیا اور ادھر نیویارک میں جیکولین کو اپنی ہم جولیوں کے ساتھ دیکھا گیا تو کئی لوگوں کو تشویش ہوئی۔ اخباری نمائندوں کے زیادہ اصرار اور سوالات کی بھرمار کے جواب میں آخرکار مسٹر اوناسس نے ایک بیان جاری کیا۔ اس کے نتیجے میں ایک حد تک افواہوں میں کمی آگئی لیکن یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ بہرحال انہوں نے جو کہا وہ آج بھی میری ڈائری میں درج ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی بوڑھے نے لاجواب فلاسفی بیان کی ہے اور خوب ادبی جملے ادا کیے ہیں۔

"Jackie is a Little bird that needs its freedom as well as its Security and she gets them both from me."

اس نے مزید کہا۔

"She can do exactly as she pleases-visit international fashion show and travel and go out with friends to the theatre or anypalace. And I, of course, will do exactly as I Please. I never Quastion her and She never Question me."

ان دنوں میں جیکی (جیکولین) ہمیں بہت اچھی لگتی تھیں لیکن ہماری ہمدردیاں اپنے "صاحب" مسٹر اوناسس سے تھیں کیونکہ ہمارے کئی کلاس میٹ اس کے یونانی جہازوں پر ملازمت کرتے تھے اور اوناسس اپنے ملازمین کا بہت خیال

دکھتا تھا۔

مسز اوناسز اور جیکی کے درمیان فاصلے بڑھتے چلے گئے، ان کے درمیان طلاق تو نہیں ہوئی لیکن آخر تک مفاہمت بھی نہ ہو سکی۔ اختلافات اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ مسٹر اوناسز شدید خواہش رکھتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد جیکی کے ہاتھ کچھ نہ آئے۔ یونان کے قانون کے مطابق بعد از مرگ اس کی ملکیت کا چوتھائی حصہ جیکی کو ملنا تھا۔ وہ یہ کوشش کرتا رہا کہ ایسا نہ ہو۔ اس سلسلے میں اس نے پارلیمنٹ کے ممبران کو درخواست کی کہ وہ ایسا قانون پاس کریں جس کے مطابق بیوہ عورت کو مرحوم شوہر کی ملکیت سے کچھ نہ ملے۔ لیکن ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ ایسا کوئی قانون پاس نہیں کر سکتی تھی جو بس ایک شخص کی خواہش اور جذبے کی تکمیل کرتا ہے۔

جب پیرس میں مسٹر اوناسز کا انتقال ہوا تو اس کے ساتھ اس کی یونانی بیٹی کرسٹینا تھی۔ جیکی نیویارک میں مقیم تھی۔ اوناسز کی ملکیت کے سلسلے میں کیس چلا اور آخر کار فریقین کے درمیان مصالحت ہوئی اور اس کے مطابق جیکی کو بیس ملین ڈالرز ملے جبکہ قانونی فارمولے کے تحت ان کا حصہ 125 ملین ڈالرز سے بھی زیادہ بنتا تھا۔

جیکی نے زندگی کے آخری ایام امریکا ہی میں گزارے اور 19 مئی 1994ء کو وفات پائی۔ اسے ان کے پہلے شوہر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

مسٹر اوناسز کا پورا نام "ارسٹاٹل سا کریٹس اوناسز" تھا۔ وہ 15 جنوری 1900ء میں سلطنت عثمانیہ کے شہر Smyrna میں پیدا ہوا۔ اب یہ ترکی کا شہر ازمیر ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکوں نے یونانیوں کو مار بھگایا۔ اوناسز کی فیملی بھی اپنا تمام مال متاع چھوڑ کر یونان پہنچی۔ 1920ء میں مسٹر اوناسز نے ارجنٹائن (جنوبی امریکا) پہنچ کر اپنا خاندانی کام تمباکو کا کاروبار سنبھالا۔ 1925ء میں اسے یونان اور ارجنٹائن کا پاسپورٹ ملا۔ 1950ء میں اس نے پہلا بحری جہاز خریدا۔ اس سے اسے اس قدر فائدہ حاصل ہوا کہ جلد ہی اس نے یکے بعد دیگرے کئی جہاز خرید لیے۔ اس کے علاوہ دنیا کے کئی ملکوں میں ہوٹل کا بزنس بھی شروع کیا۔ یونان کی مشہور فضائی کمپنی "اولمپک ائر لائنز" کا مالک بھی اوناسز تھا۔ اس کی پہلی یونانی بیوی سے ایک بیٹی کرسٹینا ہے، جس کی عمر 56 برس ہے۔

☆☆☆

ہم کس امریکا کی بات کر رہے ہیں؟

اگر آپ کے سامنے دنیا کا گولا (Globe) موجود ہے تو اسے گھما کر دیکھیے۔ آپ کو پہلی ہی نظر میں محسوس ہوگا کہ اس دھرتی کے "گولے" پر نصف سے زیادہ پانی ہی پانی یعنی سمندر ہے۔ زمین کا حصہ نسبتاً کم ہے اور یہ خشک زمینی حصہ بھی یکجا ہونے کے بجائے چھ سات ٹکڑوں پر مشتمل ہے جو براعظم یا ارض یا جغرافیائی خطہ کہلاتا ہے۔ اس میں ایک مختصر سا زمینی خطہ جزیرے جیسے یعنی جنوبی نصف کرہ میں "آسٹریلیا" کے نام سے ہے۔ جہاں ہم رہتے ہیں وہاں ایک ساتھ تین جغرافیائی خطے (براعظم) ہیں جو ایشیا، یورپ، افریقا کہلاتے ہیں۔ یہ معمولی اور پتلی خشک زمینی پٹیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ پھر کافی فاصلے پر شمالی امریکا اور جنوبی امریکا کے براعظم ہیں جو پاناما، کوسٹاریکا، نکاراگوا جیسے پانچ، چھ ملکوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور یہ سبھی امریکا کے ملک کہلاتے ہیں۔

شمالی امریکا کے براعظم میں کینیڈا، یو ایس اے اور میکسیکو شامل ہیں۔ جنوبی امریکی براعظم میں چلی، ارجنٹائن، بولیویا، برازیل، پیرو، کولمبیا، وینزویلا جیسے ملک ہیں۔ ان تمام ملکوں کے باشندے "امریکی" کہلانے میں حق بجانب ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں ایرانی، سعودی، تھائی اور جاپانی خود کو "ایشیائی" کہلواتے ہیں۔ اسی طرح SANA: سندھ کے باسیوں کی ایسوسی ایشن ہے، جس کا پورا نام "سندھ ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکا" ہے۔ اس میں صرف یو ایس اے یعنی یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا کے ممبر نہیں ہیں بلکہ کینیڈا کے لوگ بھی شامل ہیں کیونکہ کینیڈا بھی براعظم امریکا ہی کا حصہ ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ ہمارا زیادہ تر واسطہ یو ایس اے سے پڑتا ہے۔ اس لیے ہم امریکا کا مطلب یو ایس اے لیتے ہیں اور ہمارے لیے یونائیٹڈ اسٹیٹس کے معنی امریکا ہے۔

ایک اور اہم بات، براعظم افریقا، ایشیا اور یورپ ایک دوسرے کے قریب اور جڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے صدیوں سے اونٹ، گھوڑوں اور پیدل قافلوں کی صورت میں ایک سے دوسرے براعظم تک آمدورفت جاری رہی ہے۔ ہم لوگوں کو امریکا کی خبر ہی نہیں تھی۔ امریکا کے ایک جانب دنیا کا سب سے بڑا اور خطرناک سمندر اٹلانٹک اور دوسری طرف بھی وسیع و عریض سمندر پیسفک ہے۔ تب یورپ، ایشیا اور افریقا کے لوگ امریکا پہنچتے تو کس طرح؟

امریکا باقی براعظموں کی طرح نہ تو خشکی کے راستے سے

جڑا ہوا تھا اور نہ ہی اس زمانے میں ایسے جہاز موجود تھے جو کئی دنوں کا سمندری سفر کر کے وہاں تک پہنچے۔ یورپین پہلی مرتبہ انڈیا اور چین بھی خشکی کے راستے پہنچے تھے۔ پھر ایک طویل عرصے کے بعد ان کے جہاز کیپ آف گڈ ہوپ سے گزر کر بحر ہند میں آئے اور اس کے بعد منزلیں طے کرتے انڈیا کی بندرگاہوں کوچین، سورت وغیرہ تک آ نکلے۔

پانچ، چھ سو برس پہلے تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ دنیا صرف یورپ، ایشیا اور افریقا تک محدود ہے۔ اگر کوئی جاپان کا جیالا اور ایڈونچر پسند ملاح اپنا بادبانی جہاز پیسفک سمندر میں لے جاتا تو دو تین دنوں ہی میں واپس لوٹ آتا اور آئندہ ایسے ایڈونچر سے تائب ہو جاتا کیونکہ سمندری "بیابان" میں اسے کسی منزل اور دوسری سرزمین کا نام و نشان نہ ملتا اور نہ ہی ظالم سمندر اسے کوئی امید دلاتا تھا۔ یہی حال اٹلانٹک کی جانب تھا۔ یورپ اور افریقا سے کوئی مغرب کا رخ کرتا تو جلد ہی واپس آ جاتا۔

پھر کولمبس نے امریکا دریافت کر لیا۔

کرسٹوفر کولمبس 1492ء میں یورپ سے روانہ ہوا اور آٹھ برس بعد 1500ء میں واپس لوٹا۔ اس کے پاس ایک نئی دنیا دریافت کرنے کی خبر تھی۔ وہ کیریبین سمندر کے جزائر، جنوبی امریکا اور شمالی امریکا کے براعظم تھے۔ اس وقت کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یورپ، ایشیا اور افریقا کہیں سے کہیں جا پہنچے تھے لیکن کسی کو بھی امریکا کی خبر نہ تھی۔ وہاں صرف مقامی باشندے تھے اور جنگل ہی جنگل تھا۔ جس زمانے میں کولمبس محو سفر تھا، تب ہندوستان پر لودھی گھرانے کی حکومت تھی۔ سکندر لودھی 1489ء سے 1517ء تک دہلی کا حکمران رہا۔ اس کے بعد ابراہیم لودھی تخت نشین ہوا۔ مغلوں کا دور حکومت 1526ء سے شروع ہوا۔ یعنی جب بابر تخت شاہی پر براجمان ہوا تو اس وقت یہ سننے میں آیا کہ سمندر کا دوسرا کنارہ بھی ہے۔ جہاں سمندر ختم ہوتا ہے وہاں دوسری دھرتی ہے۔ جنگل ہیں، پہاڑ ہیں، میٹھے پانی کے دریا اور جانور ہیں جبکہ اس سے قبل ہند، سندھ اور چین میں حتیٰ کہ یورپ میں بھی یہ سمجھا جاتا تھا کہ کل دھرتی فقط ایشیا، یورپ اور افریقا براعظم پر مشتمل ہے۔ میڈیٹرینین سمندر کو دھرتی کا وسط تصور کیا جاتا تھا۔ اس سمندر کا یہ نام اسی خیال کے تحت پڑا۔

"میڈیٹرینین" کا مطلب ہے "دھرتی کا وسط"

لطف کی بات یہ کہ سندھی اور سنسکرت میں بھی اس سمندر کا نام یہی معنی رکھتا ہے۔ بھوچ سمندر — یعنی بھوں "دھرتی" کے درمیان میں واقع سمندر!

ایک یا دو صدی قبل قطب نما ایجاد ہوئی۔ اس سے پہلے انگلینڈ حتیٰ کہ یورپ میں بھی رہنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ ہماری جانب یعنی ایشیا میں ہندوستان ہو یا سری لنکا، ملایا (ملائیشیا) ہو یا انڈونیشیا، یہاں سیر و تفریح کے مواقع موجود تھے ہی اس کے علاوہ ہمارے ہاں پھل، سبزیاں، مسالے اور دیگر کھانے پینے کی اشیا کی پیداوار وافر تھی۔ ہاتھی، گھوڑے، سونا، چاندی، ہیرے جواہرات، ہاتھی دانت — ایسی کون سی قیمتی چیز تھی جو ہمارے ہاں موجود نہ تھی۔ ایشیا اور افریقا گویا مالا مال تھے۔

یورپ کی جانب انتہائی سرد موسم ہونے کے سبب وہاں رہنا جنجال سے کم نہ تھا۔ فصل اور اناج کی کمیابی کے باعث لوگ بھوکوں مر رہے تھے۔ پھر جیسے ہی ٹیکنالوجی یورپین کے ہاتھ لگی اور وہ جہاز تیار کرنے لگے۔ اس کے فوراً بعد اپنے ملک سے نکل کر لوٹ مار کی غرض سے چاروں طرف پھیل گئے۔ وہ جہاں بھی پہنچے، ان کے پاس ایک ہی بہانہ تھا کہ وہ عیسائیت کی تبلیغ کرنے آئے ہیں۔ کہیں انہوں نے خود کو معالج ظاہر کیا اور درخواست کی کہ انہیں مقامی لوگوں کا علاج کرنے کی اجازت دی جائے لیکن ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ ان کی سرزمین پر قبضہ کر کے وہاں سے قیمتی مال و متاع لوٹ کر اپنے وطن یورپ بھیجا جائے۔ یورپین کی دوڑ زیادہ تر برصغیر اور انڈونیشیا کی جانب تھی۔ یہ علاقہ ایسٹ انڈیز کہلاتا تھا۔

☆☆☆

آج سے پانچ سو سال پہلے تک دنیا بھر کے Navigational چارٹ اور نقشے تھے ہی نہیں۔ بڑی کوششوں اور جدوجہد کے بعد یہی ایک بحری راستہ تلاش کیا جا سکا تھا، جس پر سفر کر کے جہاز ایسٹ انڈیز پہنچ سکتے تھے۔ اس میں بھی یہ قباحت تھی کہ افریقا کے گرد گھوم کر جانا پڑتا تھا۔

1492ء میں اسپین کی ملکہ ازابیلا نے تین جہاز کولمبس کے حوالے کیے اور اسے دور دراز کے ملکوں میں لوٹ مار کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس سلسلے میں یہ معاہدہ طے ہوا تھا کہ اخراجات منہا کرنے کے بعد لوٹ کے مال میں دس فی صد کولمبس کا حصہ ہوگا۔ اسے افریقا کا چکر کاٹ کر ایسٹ انڈیز (ملایا، انڈونیشیا) کی طرف جانا تھا لیکن اس نے "عقل" استعمال کرتے ہوئے یہ حساب لگایا کہ اگر وہ مشرق کی سمت سفر کا آغاز کرنے کے بجائے مغرب کی جانب رخ کرے تو اس طرح چند ہزار میلوں کے بعد جلد ہی ایسٹ

انڈیز پہنچ جائے گا۔ یہ نہ صرف کولمبس کا خیال تھا بلکہ اس زمانے کے ہر یورپی نیوی گیٹر کا خواب تھا کہ ایسے راستے تلاش کیے جائیں، جن کی مدد سے جلد اور دوسروں سے پہلے منزل پر پہنچا جاسکے۔

70 دن کے سفر کے بعد کولمبس جس مقام پر پہنچا وہ کیریبین سمندر کے جزائر "باہاما" تھے۔ اس کے بعد کولمبس کے مرنے (1504ء) تک یہاں اس کی آمد و رفت جاری رہی۔ اس کے بعد وہ دوسرے لوگ بھی ان جزائر پر آتے رہے۔ چالیس سال کے دوران اسپینی جہاز رانوں نے کیریبین سمندر کے ان جزائر، جنوبی امریکا اور سینٹرل امریکا میں اپنی حکومت قائم کرلی۔

کیریبین سمندر کے "باہاما" جزائر میں ٹرینیڈاڈ، کیوبا، ٹوباگو وغیرہ شامل ہیں۔ کولمبس اپنے کم از کم دو سفروں کے دوران انہیں ایسٹ انڈیز ہی سمجھتا رہا جو اب ویسٹ انڈیز کہلاتے ہیں۔ جہاں کے کرکٹ پلیئرز دنیا بھر میں مشہور ہیں۔

اسپین کے بعد دوسرے نمبر پر پرتگالیوں نے امریکا پر دھاوا بول دیا۔ ان دونوں کا اثر نہ صرف پورے جنوبی امریکا اور سینٹرل امریکا پر رہا بلکہ شمالی امریکا میں بھی پورے میکسیکو پر رہا جسے آج ہم یو ایس اے کہتے ہیں۔ اس کی جنوبی ریاستیں ٹیکساس، فلوریڈا اور لوزیانا تک میں اسپینی اور پرتگالیوں کا اثر و نفوذ رہا۔ یہاں آج تک اسپینی اور دوسرے نمبر پر پرتگالی زبان بولی جاتی ہے۔ دونوں زبانیں خاصی ملتی جلتی ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں پنجابی اور سرائیکی یا سندھی اور میمنوں کی زبانیں ملتی جلتی ہیں۔

امریکا کے معاملے میں انگریزوں اور فرنچوں کے کان بعد میں کھڑے ہوئے۔ ان کا قبضہ زیادہ تر شمالی حصے پر رہا۔ جسے آج کل ہم یونائیٹڈ اسٹیٹس اور کینیڈا کہتے ہیں۔ کینیڈا کی سرکاری زبانیں انگریزی اور فرنچ ہیں۔ یو ایس اے کی سرکاری زبان گو کہ انگلش ہے لیکن طالب علم آپشنل سبجیکٹ اسپینش زبان میں لیتے ہیں۔ ہمارے پاکستانی دوستوں کے بچے بھی ایک دوسرے سے انگریزی کے علاوہ اسپینش زبان بولتے ہیں کیونکہ انہیں اے لیول کے امتحانات میں اسپینش زبان لکھنی پڑتی ہے۔ وہ جن اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں وہاں اسپینش بولنے والے بچوں کی تعداد زیادہ ہے۔ وہ ہاف ٹائم میں ایک دوسرے سے اسپینش زبان بولتے ہیں۔

سوائے ایک چھوٹے ملک سرینام کے پورے جنوبی امریکا اور سینٹرل امریکا کے ملکوں میں اسپینی زبان بولی جاتی ہے۔ ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی سوئیڈن میں میرے کلاس فیلوز میں جنوبی اور شمالی امریکا کے ہر ملک کے طلبا شامل تھے۔ صرف یو ایس اے سے آنے والا اسٹوڈنٹ انگریزی بولتا تھا۔ اس کے علاوہ برازیل، وینزویلا، کولمبیا، ارجنٹائن اور یوراگوئے، کوسٹاریکا، نکاراگوا، پاناما، ہنڈراس، میکسیکو اور گوئٹے مالا کے طالب علم اسپینش زبان بولتے تھے۔ ان میں کچھ لوگ پرتگالی بھی بولتے تھے۔

ساؤتھ امریکا خاص طور پر برازیل میں ہسپانوی مسلمان بھی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ ان میں سے بعض کے لیے کہا جاتا ہے کہ اسپین پر مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد قرطبہ اور اندلس کے کئی مسلمان اس طرف چلے آئے تھے۔

بہرحال یورپین لوگوں کو جوں جوں اس نئی دنیا (براعظم امریکا) کی خبر ہوتی گئی وہ جتھوں کی صورت میں یہاں پہنچنے لگے۔ بعض لوگوں کو حکومتوں نے Sponsor کیا، یعنی حکومت انہیں جہاز تیار کرکے اور اسے سفری سامان سے بھر کر روانہ کرتی تھی اور کئی لوگوں کو بڑے تاجروں اور بیوپاریوں نے بھیجا۔ سب سے پہلے بستیاں اور ٹریڈنگ پوسٹیں قائم ہوتی رہیں پھر جلد ہی قبضے اور Colonization کا آغاز ہوگیا۔

امریکا میں پہلی کامیاب کالونی تقریباً ایک سو سال بعد 1607ء میں انگریزوں نے جیمس ٹاؤن میں قائم کی۔ یہ شہر آج کی ریاست ورجینیا میں شامل ہے۔ اس کے چند برس بعد چرچ آف انگلینڈ کے مذہبی شدت پسندوں کے مظالم سے جان بچا کر انگریز پروٹسٹنٹ عیسائی امریکا آگئے اور انہوں نے 1620ء میں پلے ماؤتھ کالونی قائم کی جو آج کل میساچوسٹس ریاست میں واقع ہے۔ ویسے تو امریکا میں یورپ کے کئی ملکوں کے لوگ آئے لیکن کالونی قائم کرکے قبضہ کرنے میں انگریزوں کا کوئی ثانی نہیں۔ جس طرح متحدہ ہندوستان میں گو کہ پہلے پرتگالی وغیرہ آئے۔ انگریز آخر میں وارد ہوئے لیکن انہوں نے ایسا طریقہ اپنایا کہ اونٹ خیمے کے اندر اور عرب خیمے سے باہر کی مثال قائم کردی۔

امریکا میں بھی بالکل ایسا ہی ہوا۔

1733ء تک انگریزوں نے اٹلانٹک سمندر کے کنارے کے نیو ہیمپشائر سے جارجیا تک 13 کالونیاں قائم کرلی۔ فرنچوں کا قبضہ ایک جانب کینیڈا پر رہا اور دوسرا یو ایس اے کی موجودہ ریاست لوزیانا پر — اس میں پورا دریائے مسی سی پی بھی شامل ہے۔

یہ فرانس اور انگلینڈ والے اب بڑے مہذب بنتے ہیں

اور دنیا کو گائیڈ کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ یہ لوگ (قومیں) دوسری جنگ عظیم میں ایک دوسرے کے ساتھی بنے اور متحد ہو کر جرمنوں کا مقابلہ کیا۔ جبکہ یہی قومیں شمالی امریکا کی سرزمین پر قبضہ کرنے کے لیے "اینٹ کتے" کا بیر رکھتی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں انگریزوں اور فرنچوں کے درمیان نارتھ امریکا کو ہڑپ کرنے کے لیے کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخری جنگ سات سال جاری رہی اور 1763ء میں ختم ہوئی۔ اس دوران میں کینیڈا اور مسی سی پی کا تمام مشرقی حصہ انگریزوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔

بہرحال جنگوں کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد دوبارہ انگریزوں کی کالونیوں کا اپنے ہی ملک انگلینڈ کے ساتھ ٹیکس کے سلسلے میں لڑائی کا آغاز ہوگیا۔ ان کی آپس میں جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ یہاں ان کے ذکر سے طوالت کا اندیشہ ہے اور قارئین بوریت محسوس کریں گے۔ بس یوں سمجھیے کہ سب اپنے اپنے حصوں پر قابض ہو کر بیٹھ گئے اور Civilized ہو کر چالاکی کرتے ہوئے دنیا کو بھاشن دینے لگے۔ یہاں کے اصلی باشندے ریڈ انڈینز وغیرہ وغیرہ بیچارے انگریزوں کی آمد سے قبل اپنی دھرتی پر سکون سے زندگی گزار رہے تھے۔ وہ بے چارے آج تک مفلسی اور کسمپرسی کے حالات میں زندہ ہیں۔ امریکا کے یہ اصلی باشندے اپنی ہی سرزمین پر اپنے ہی ملک میں دربدر ہیں۔

☆☆☆

انگلینڈ اور یورپ سے امریکا آنے والے لوگوں پر ان کی "آبائی حکومتیں" خاص طور پر انگلینڈ اپنا کنٹرول رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں لڑ جھگڑ کر اور خونریزی کے بعد انہوں نے ایک دوسرے سے جان چھڑائی اور آخرکار امریکا والوں کو آزادی نصیب ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی انقلاب کی آخری جنگ 1781ء میں ورجینیا ریاست کے شہر یارک ٹاؤن میں برپا ہوئی۔ اس جنگ میں امریکن اور فرنچوں نے مل کر انگریزوں کی ایسی پٹائی کی کہ انگلینڈ والوں کو شکست تسلیم کرنی ہی پڑی۔ امریکا کے بعض حصوں میں یہ لڑائی مزید دو سال تک جاری رہی۔ اس کے بعد سرکاری طور پر 1783ء میں "پیرس معاہدے" کے تحت اختتام پذیر ہوئی۔ اس میثاق کے مطابق انگلینڈ نے امریکا میں رہنے والوں کی آزادی کو تسلیم کیا۔

اس جنگ کے ہیرو امریکا کی مشہور شخصیت جارج واشنگٹن تھے جو بعد میں امریکا کے پہلے صدر بنے۔ ایک اور شخص جس نے اس آزادی کا نوشتہ لکھا اور آئین مرتب کرنے میں مدد کی وہ تھا، تھامس جیفرسن اور آگے چل کر امریکا کا تیسرا صدر منتخب ہوا۔ دریائے مسی سی پی کے بائیں جانب کا حصہ فرانس کے قبضے میں تھا۔ صدر تھامس جیفرسن نے رقم ادا کرکے وہ تمام علاقہ خرید کر امریکا (یو ایس اے) میں شامل کرلیا۔ یہ زمین تقریباً دو ملین مربع کلومیٹر تھی۔ ادھر فرانس والوں کو کون سا ذاتی نقصان ہوا تھا۔ یہ ان کے باپ دادا کی جاگیر تو تھی نہیں۔ جن ریڈ انڈینز کی سرزمین تھی، ان میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس "سودے" میں مداخلت کرتے۔ مزید المیہ یہ ہوا کہ ان کی تعداد گھٹتے گھٹتے اب جا کر محض "اقلیت" کے طور پر باقی رہی ہے۔

فرانس اور انگلینڈ والوں کا کوئی اپنے ہی لوگوں پر بس نہ چل سکا جو امریکا جیسی دور دراز کی سرزمین پر رہنے لگے تھے۔ لیکن ان ہی ایام میں وہ ایشیا، افریقا اور مڈل ایسٹ میں مزے لوٹ رہے تھے۔ ٹھیک اسی سال، یعنی 1801ء میں جب تھامس جیفرسن امریکا کا صدر بنا تو فرانس نے مصر پر قبضہ کرلیا۔ ادھر انگریز جنرل لیک دہلی میں داخل ہوا۔ اس دوران میں مغل حکومت محض بہری گڑیا کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ جسے پچاس برس بعد 1857ء میں ہمیشہ کے لیے خاموش کروا دیا گیا۔ اس سے قبل 1839ء میں انگریزوں نے عدن پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس پوری صدی میں چاروں طرف لوٹ مار اور قبضے جاری رہے۔ تمام یورپی لوٹ کے مال پر عیش کرنے لگے۔ مگر اگلی صدی میں ہٹلر نے سر اٹھالیا اور ادھر مشرق بعید سے جاپانی تمام تر بدمعاشی کے ساتھ میدان میں اترے تو سب بیکار ہوگئے۔ اس دوران میں ہمارے ہاں کے رہنماؤں نے بھی تحریک آزادی کے لیے سخت عملی مرتب کی جس نے آگے چل کر انگریزوں کو اپنے "گھر" کی راہ دکھائی۔

اس طرف امریکا میں یورپین اور انگریزوں نے زمینوں پر ضرور قبضہ کرلیا تھا لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ ان زمینوں پر کام کون کرے؟ گنے، تمباکو اور کپاس جیسی فصل کے لیے محنت کون کرے؟ گھنے جنگلات کی کٹائی کس طرح ہو؟ امریکا کے اصل باشندے نہ تو اتنی تعداد میں تھے اور نہ ہی ان میں اتنی ہمت تھی کہ ایسے مشقت والے کام انجام دے پاتے۔ پھر انہیں اس مسئلے کا حل افریقا میں نظر آیا۔ اس کے بعد افریقا سے غلاموں کی کھیپ امریکا لائی جاتی رہی۔ اس انسانی المیے پر کئی دلخراش کہانیاں، کتب اور فلمیں موجود ہیں کہ کس طرح

افریقا کے شہروں، قصبوں اور جنگلوں سے سیاہ فام نوجوانوں کو جانوروں کی طرح جہازوں میں بھر کر امریکا لایا گیا۔ اس کے لیے نشے اور تشدد سے بھرپور کام لیا گیا اور سفر کے دوران انہیں بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ امریکا میں ان سیاہ فام غلاموں سے انتہائی سخت مشقت لی گئی۔ آج امریکا میں جو کالے نظر آتے ہیں، ان میں زیادہ تر ان غلاموں کی اولاد ہیں۔

امریکا (یو ایس اے) کی مختلف ریاستوں میں دیگر معاملات پر تو اتفاق ہو گیا لیکن غلاموں کی تجارت کو ختم کرنے پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ ابراہام لنکن انسانی خرید و فروخت کے سخت مخالف تھے۔ جب وہ 1860ء میں امریکا کے صدر منتخب ہوئے تو گیارہ ریاستوں نے "یونین" سے الگ ہو کر ایک الگ ملک Confedrate States of America کے قیام کا اعلان کیا۔ ان ریاستوں میں ساؤتھ کیرولینا، مسی سپی، فلوریڈا، الاباما، جارجیا، لوئیزیانا، ٹیکساس، ورجینیا، ارکنساس، ٹینیسی، اور نارتھ کیرولینا شامل تھیں۔ بس جناب! پھر کیا تھا۔ سول جنگ کا آغاز ہو گیا اور یہ دو سال جاری رہی۔ اس جنگ کے لیے کہا جاتا ہے۔

"This Civilwar was the most traumatic episode in American history."

بہر حال اس جنگ کے بعد غلامی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اور یہ فیصلہ بھی کیا گیا۔

"This Country is a not a Collection of semi-independent States but an Indivisible Whole."

ان تمام باتوں کا فیصلہ ہونے کے بعد 1865ء میں اس ملک کے صدر ابراہام لنکن، جو غلامی سے سخت نفرت کرتے تھے، کو ایک تھیٹر میں قتل کر دیا گیا۔

☆☆☆

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا (یو ایس اے) کی ترقی حیرت انگیز ہے۔ دیکھا جائے تو آج سے پانچ سو سال پہلے تک یورپ اور ایشیا کے کئی ملک خوشحال اور ترقی یافتہ تھے۔ امریکا ویران بیابان اور گھنے جنگلوں پر مشتمل ایک خطہ تھا۔ جہاں ایک میل بھی پختہ سڑک نہیں تھی اور نہ ہی کوئی سائیکل، ریڑھا، اسکول اور دواخانہ تھا۔

اس حساب سے یہ ملک سیاست، تاریخ اور کلچر کے لحاظ سے محض دو سو یا سوا دو سو سال پرانا ہے۔ شاہ لطیف کی وفات 1752ء میں ہوئی اور اس کے کئی سال بعد امریکا (یو ایس اے) وجود میں آیا۔ یعنی اس زمانے میں غلام شاہ کلہوڑا "حیدر آباد"، نیویارک اور واشنگٹن سے بڑا اور ماڈرن شہر تھا۔ حیدر آباد کی مثال کو ایک طرف رکھیے، میرِ محترم میاں محمد کے آباد کیے ہوئے چھوٹے سے قصبے نما شہر "مرتضیٰ آباد" کی بندرگاہ بھی نیویارک کی بندرگاہ سے زیادہ بڑی اور مصروف تھی۔ یہاں سے رات دن مسقط اور بحرین کے لیے بڑے روانہ ہوتے تھے۔ یاد رہے "مرتضیٰ آباد" کو بعد میں "الاہرانا" نام دیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا نے انتہائی تیز رفتاری سے ترقی کی۔ یورپ اور انگلینڈ کے ماہر تاجروں، سائنس دانوں، افریقا کے طاقتور اور محنت کش کالوں نے اس ملک کو محض دو سو برس میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

امریکا کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو کہ اس ملک میں آباد یورپ اور افریقا کے مختلف ملکوں سے بھانت بھانت کے لوگوں نے ایک نیا ملک یو ایس اے تو بنا لیا اور اس پر اپنی آزاد حکومت ... قائم کی جسے آزادی 1783ء میں ملی۔

1789ء میں اس ملک کے پہلے صدر جارج واشنگٹن بنے۔

سچ تو یہ ہے کہ ابتدائی سو برس تک امریکا صرف انگریز کلچر ہی سے استفادہ حاصل کرتا رہا۔ امریکا نے صحیح معنوں میں ترقی کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر سے کیا۔ اس دوران میں انگریزی کلچر کے ساتھ انڈسٹریل انقلاب بھی آیا۔ سب سے پہلے 1869ء میں ٹرانس کانٹی نینٹل ریل روڈ مکمل کو پہنچا۔ سن 1900ء تک امریکا میں ریل کا فاصلہ پورے یورپ کی ٹرین سے بڑھ گیا تھا۔ بھاپ کا انجن، اس کے بعد پیٹرول اور ڈیزل کے انجن ایجاد ہوئے اور امریکا میں پیٹرول انڈسٹری خوشحال ہو گئی۔ اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کے مالک جان راک فیلر کا شمار امریکا کے امیر ترین لوگوں میں ہونے لگا۔ اینڈریو کارنیگی اسکاٹ لینڈ کا ایک غریب اور محنت کش شخص تھا۔ وہ اسٹیل کے کارخانوں کا بادشاہ بن گیا۔ ٹیکساس، لوزیانا اور جنوب کی دیگر ریاستیں ٹیکسٹائل کے حوالے سے بہت آگے نکل گئیں۔ گوشت پیک کرنے کے کارخانے شکاگو جیسے شہروں میں قائم ہو گئے۔ الیکٹرک بلب، گراموفون، وائرلیس، ٹرانزسٹرز اور موشن پکچرز کی ایجادات نے امریکا کی ترقی کو گویا پَر لگا دیے۔

امریکا میں تعلیم یافتہ لوگ تھے، ڈاکٹر اور سائنٹسٹ تھے۔ اسپتال اور یونیورسٹیاں قائم ہو چکی تھیں۔ محنت کش مزدور تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ خام مال بے حساب تھا۔ وہ اس سے بہتر چیز تیار کر کے ایکسپورٹ کرنے لگے۔ انہوں نے جاپانیوں سے بہت پہلے انجنوں کے ذریعے چلنے والے بحری جہاز تیار کر لیے تھے۔ آرکیٹکٹ لوئس سلیوان نے اسٹیل اور لوہے کے فریم تیار کر کے کثیر المنزلہ عمارتیں کھڑی کر دیں۔ کاریں اور ریل گاڑیاں تیار کر لیں۔

جاپانیوں اور جرمنوں کو بھی خبر نہ ہو سکی کہ امریکا نے خاموشی سے ایٹم بم جیسی خوفناک اور خطرناک چیزیں تیار کر لی ہیں۔ وہ بھی سمجھتے رہے کہ امریکی جاہل وڈیروں کی طرح ہیں، جن کے پاس زرخیز زمینیں ہیں اور وہ زمینداری سے خوب دولت کما رہے ہیں لیکن تعلیم اور عقل کے معاملے میں کورے ہیں۔ سو پرل ہاربر پر جاپانیوں نے خودکش حملہ کرنے والے کامی کازی پائلٹوں کے اس کارنامے پر خود اپنی پیٹھ تھپکتے ہوئے گویا اپنے آپ کو داد دی۔ ان کے بہادر سپاہیوں نے امریکا پر حملہ کر کے انہیں سرخرو کر دیا تھا۔ وہ اس بات پر بہت مسرور تھے۔ ایسے میں امریکا نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے ہیروشیما اور ناگاساکی کو محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً عبرت کا نشان بنا دیا تو جاپانیوں کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔

☆☆☆

شمالی امریکا کے خطے پر نظر ڈالی جائے تو یونائیٹڈ اسٹیٹس کے جنوب میں میکسیکو ہے اور شمال میں کینیڈا۔ اس کے بائیں طرف یعنی مغرب میں الاسکا ہے جو جزیرہ مغرب میں جا کر روس کی دوسری سرزمین سے ملتا ہے۔ درمیان میں "بیرنگ" (Bering) سمندر کا کچھ حصہ ہے جو سال کے نو مہینے برف کی چادر اوڑھے رہتا ہے۔

الاسکا، روس (USSR) کا حصہ تھا۔ 1867ء میں امریکا والوں نے یہ سرزمین خرید کر اسے امریکا کی انچاسویں (49) ریاست قرار دیا۔ اس زمانے میں پیٹرول اور گیس کی اہمیت کی کچھ خاص خبر نہیں تھی۔ نہ ہی ان ایام میں ایسے انجن ایجاد ہوئے تھے جن میں پیٹرول اور ڈیزل کا استعمال ہوتا۔ الاسکا انتہائی شمال میں واقع ہونے کے سبب وہاں نہایت قلیل آبادی تھی اور وہاں کے لوگ "ایسکیموز" کہلاتے تھے۔ وہ برفانی ریچھ کا شکار کر کے اس کی کھال جنوبی علاقوں میں فروخت کرنے سے اتنی رقم حاصل کر لیتے تھے جس سے ان کی سال بھر کی "دال روٹی" کا انتظام ہو جاتا تھا۔

پورے الاسکا میں برف چھائی رہنے کی وجہ سے وہاں نہ تو کوئی فصل ہو سکتی تھی اور نہ ہی مویشیوں کے لیے چراگاہ وغیرہ کا انتظام ہو سکتا تھا۔ وہ ایک طرح سے برفانی بیابان تھا۔ ایسی سرزمین خریدنے پر امریکا راضی ہو گیا اور اس وقت کے صدر اینڈریو جانسن کو اس خریداری پر کئی برسوں تک اچھی بھلی عوام بے وقوف قرار دیتی رہی۔ اس جانب روس بھی اس بات پر خوش تھے کہ انہوں نے بے کار زمین امریکا کو فروخت کر کے اس کے عوض "مناسب" مالیت کے ڈالرز اینٹھ لیے ہیں۔

اس وقت الاسکا کی زمین کی خریداری کو گھاٹے کا سودا اور اپنے صدر کا غلط فیصلہ قرار دیا گیا۔ ایک حد تک اس پر تنقید بھی کی گئی لیکن پھر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ الاسکا، جہاں برف کے ٹیلے نظر آتے ہیں، اس کے نیچے یعنی زیرِ زمین تیل کی ندیاں موجود ہیں۔ آج اسی الاسکا نے یو ایس اے کو خوشحال کر دیا ہے۔ امریکی فی الحال اپنے الاسکا میں موجود تیل کے ذخائر کو استعمال نہیں کر رہے۔ مڈل ایسٹ سے خرید کر اپنی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ جب دوسروں کا تیل ختم ہو جائے گا تو الاسکا سے تیل برآمد کر کے آرام سے استعمال کریں گے۔

اس جزیرے کے علاوہ امریکا میں مزید کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس کی سرحدیں 1848ء سے وہی مقرر ہیں۔ البتہ 1890ء کی دہائی میں ملک کی سرحدوں کو توسیع دینے کا جنون پیدا ہوا۔ شمالی یورپ کے ملکوں کو دیکھ کر امریکا نے ایشیا، افریقا اور لاطینی امریکا کے ملکوں کے باشندوں کو "تہذیب یافتہ" بنانے کی ذمے داری اپنے سر لینے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں امریکی اخبارات نے کیوبا کے عوام پر ڈھائے جانے والے مظالم کی خبریں شائع کرنا شروع کر دیں۔ جزیرۂ کیوبا ان دنوں اسپین کے قبضے میں تھا۔ امریکا کی اس "حرکت" پر اسپین آگ بگولا ہو گیا کہ کل کے کنگلے اس پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں جو اسپین سے جا کر یو ایس اے میں آباد ہوئے۔ 1898ء میں اسپین اور یو ایس اے کے درمیان جنگ کا آغاز ہو گیا۔ جب جنگ کا خاتمہ ہوا تو اسپین کے زیرِ قبضہ کئی علاقے یو ایس اے کے حوالے ہو گئے۔ کیوبا، فلپائن، پورٹو ریکو اور گوام جزیرہ ... ان کے علاوہ ہوائی جزائر بھی یو ایس اے کے قبضے میں آ گئے۔

یاد رہے کہ جنگ سے قبل فلپائن، اسپین کے قبضے میں تھا۔ جس طرح ملایا، سنگاپور وغیرہ انگریزوں کے حوالے تھے اور انڈونیشیا پرتگال قابض تھے۔ فلپائن کے لوگ "ٹگالوگ" زبان بولتے تھے لیکن اسپین کے قبضے میں رہنے کے سبب

اسپینش بھی سیکھ گئے تھے۔ جس طرح انڈونیشیا کے لوگ ڈچ زبان بھی بولتے ہیں۔ امریکا کے قبضے میں آنے کے بعد فلپائن میں انگریزی زبان بولی جانے لگی۔

امریکا کے لوگ کیوبا وغیرہ پر قبضے کر کے خوش نہیں تھے کیونکہ انہوں نے خود فرانس اور انگلینڈ سے آزادی حاصل کی تھی۔ 1902ء یعنی چار سال بعد امریکی فوجیوں کو کیوبا سے واپس بلوالیا گیا۔ فلپائن کے باشندے دوبارہ اسپین سے اختلاط نہیں چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ فلپائن کو امریکا (یو ایس اے) کی اکیاون ویں ریاست قرار دیا جائے۔ جس طرح یو ایس اے والوں نے ہوائی جزائر کو پچاسویں ریاست قرار دے کر اپنے قبضے میں رکھا تھا لیکن یو ایس اے اس پر آمادہ نہ تھا۔ ظاہر ہے ہوائی جزائر پر عوام کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ وسیع سبزہ میں اور خوشگوار موسم اور دوسری جانب فلپائن کے عوام بے حد تھے۔ ایک طرف غربت، قدرتی آفات، سیلاب، طوفان اور زلزلے۔ دوسری جانب یہ خدشہ کہ اگر فلپائن کو یو ایس اے کا حصہ بنالیا گیا تو وہاں کے لوگ بے تحاشہ یو ایس اے پہنچ جائیں گے۔ جہاں ہر شخص کو فلپائن کے مقابلے میں بہتر اور خوشحال مستقبل نظر آتا تھا۔

آخرکار یو ایس اے فلپائن سے بھی دستبردار ہوگیا۔ انہیں 1907ء میں ایک لیجسلیٹو حکومت بنانے کی اجازت دی گئی۔ 1946ء میں فلپائن کو مکمل خودمختاری مل گئی۔ 1959ء میں ہوائی جزائر کو یو ایس اے کی ریاست کا درجہ دیا گیا۔ "ہوائی" پیسفک سمندر کے بالکل وسط میں جزیروں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سب سے بڑا جزیرہ "ہونولولو" ہے۔

اپریل 1961ء میں روس نے خلا میں راکٹ روانہ کیے۔ ان میں سے ایک میں انسان کو بھی روانہ کیا گیا تھا۔ وہ راکٹ میں سوار ہو کر کرۂ ارض کے گرد Orbit کا ایک چکر لگا آیا تھا۔ اس وقت کے امریکی صدر جان کینیڈی نے اپنی قوم سے وعدہ کیا کہ ساٹھ کی دہائی ختم ہونے سے قبل امریکا چاند پر انسان کو پہنچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ کینیڈی کا یہ وعدہ جولائی 1969ء میں پورا ہوا جب ایسٹروناٹ نیل آرمسٹرانگ اپولو دوم کے ذریعے چاند پر پہنچا۔

کینیڈی کے قتل کے بعد لنڈن جانسن امریکا کے صدر بنے جو اس سے قبل وائس پریذیڈنٹ تھے۔ وہ چھ برس تک یو ایس اے کے صدر رہے اور اپنے صدارتی دور میں ویت نام کی جنگ میں پھنس گئے۔ 1968ء تک امریکا کے پانچ لاکھ سپاہی ایک دور دراز کے چھوٹے ملک میں بغیر کسی بہتر نتائج کے حصول کے لڑتے رہے۔ عوام کو اس جنگ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جس میں ان کے بچے مارے جارہے تھے۔ جبکہ سیاست داں یہی موقف اپناتے رہے کہ ویتنام کے ساتھ ساتھ اس کے "بڑوں" چین اور روس کو بھی سبق سکھا جائے۔ کثیر دولت اور جانیں گنوانے کے باوجود امریکا کو اس جنگ سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ ملک کے اندر جنگ کی عوامی مخالفت، ہڑتالوں اور جلوسوں نے حاکموں کو الجھا کر رکھ دیا۔ لنڈن جانسن کی شہرت کو خاصا نقصان پہنچا۔

1968ء میں جیسے ہی رچرڈ نکسن صدر بنے، انہوں نے فوری طور پر ویتنام کی جنگ سے اپنے لوگوں کو باہر نکالنا شروع کر دیا۔ یو ایس اے جیسے طاقتور ملک نے اس جنگ سے جان چھڑا کر سکون کی سانس لی۔ یہی سبب ہے کہ اب عراق اور افغانستان کی جنگ میں ہاتھ ڈالنے سے قبل اسے بہت سوچ بچار کرنی پڑی کہ کہیں دوبارہ ویت نام والی غلطی نہ اٹھانی پڑ جائے۔

رچرڈ نکسن نے ایک اہم ذمہ داری کا یہ کام انجام دیا کہ انہوں نے امریکا اور چین کے تعلقات بہتر بنائے۔ ایک طویل عرصے سے چین اور امریکا ایک دوسرے کے لیے نفرتیں پھیلا رہے تھے۔ نکسن نے اس نفرت کا خاتمہ کیا۔ اس کام کے لیے پاکستان نے بھرپور رول ادا کیا تھا۔ پاکستان کے ذریعے امریکی نمائندے بھیجے اور چین نے ان کا خیرمقدم کیا۔ ملاقات اور دوستی ہوئی۔

جہاں رچرڈ نکسن کو چین سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا کریڈٹ ملا۔ وہیں ان کے دامن پر واٹر گیٹ اسکینڈل کا داغ بھی لگا۔ صدارت کے Campaign کے دوران واشنگٹن کے واٹر گیٹ ہوٹل میں قائم ڈیموکریٹک پارٹی ہیڈکوارٹر میں پانچ "دہشت گرد" گھس آئے جو پکڑے گئے۔ اخباری نمائندوں کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں نکسن کے دوبارہ عہدۂ صدارت کے انتخاب والی کمیٹی نے کام سونپا تھا۔ نکسن نے اس کا اعتراف نہ کر کے اپنا کیس خراب کر دیا۔ کیونکہ بعد میں ریکارڈ شدہ گفتگو کے ٹیپ نے سارا راز کھول دیا تھا۔ 1974ء میں نکسن کو صدارت کا عہدہ چھوڑنا پڑا۔ یہ امریکا کی تاریخ کے پہلے صدر ہیں جنہوں نے صدارت سے استعفیٰ دیا تھا۔

جاری ہے

میں نے شیلف صاف کرنے کے لیے کتابیں ہٹائیں تو اوپر سے چند ڈائریاں فرش پر گر پڑیں۔ ان میں سے جب میں نے ایک ڈائری کی ورق گردانی کی تو اس میں ایک جگہ 17 اگست 1965ء لکھا دکھائی دیا۔ اس کے آگے ایک نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے ذہن پر زور ڈالا تو دماغ میں بہت سے مناظر گھومنے لگے۔ یاد آیا کہ یہ اس زمانے کی ڈائری ہے جب میں چین امریکن میں اسٹیوارڈس تھی اور دنیا بائیس برس کا ایک لڑکا تھا جسے میں فیڈل کاسترو کے کمیونسٹ کیوبا سے بچا کر امریکا لانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ دماغ میں سوچ کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور بہت سے مناظر بن اور بگڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک منظر یہ تھا کہ طیارے کے بورڈنگ کلرک نے جب مجھے مسافروں کی فہرست تھمائی تو میں نے اس پر سرسری نظر دوڑائی۔ اس میں چودہ مسافروں کا نام ٹائپ کیا گیا تھا جنہیں کیوبا سے نیویارک تک کا سفر کرنا تھا۔ اس فہرست کو دیکھ کر چونک گئی۔ اس لیے آخر میں ایک نام ہاتھ سے لکھا ہوا تھا "ڈانول برنیف۔"

"یہ کون ہے اور اس کا نام فہرست کے آخر میں شامل کیوں کیا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

سرحد عبور کرنے والے ایک مسافر کی ایک دلچسپ داستان

ظلم وجبر سے اپنے ایک ملک سے وہ فرار ہونا چاہتا تھا جس نے فرار ہونے کے لیے ہوائی جہاز کا انتخاب کیا۔ کسی مسافر طیارے سے بغیر کاغذات کے سوار ہونا کسی صورت ممکن نہیں تھا مگر نا ممکن بات ہی مگر اس کی قسمت تھا ... تھانے پولیس کا افسر ہو ایئر طیارے میں تھا وہ تلاش کرتا رہا پھر بھی وہ فرار مقصود تک پہنچ ہی گیا

خوابناکے سے فرار

سہیل ادریس

"یہ ہوانا کی سیکرٹ سروس کا ایک ایجنٹ ہے جو اس طیارے میں سفر کرنے والا ہے۔ اس کا نام ہنگامی طور پر لسٹ میں شامل کیا گیا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ایک باغی لڑکا ان لوگوں سے منحرف ہو گیا ہے، انہیں شبہ ہے کہ اس نے اس طیارے میں پناہ لے لی ہے۔ اپنے اطمینان کے لیے وہ سفر کے دوران اس طیارے کو چیک کرتا رہے گا۔" گلوریا جوزف نے بتایا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی احتجاج کرتی طیارے کی سیڑھیوں پر قدموں کی دھمک سنائی دی۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ نیلی وردی پہنے ایک چاق و چوبند شخص سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ جب وہ زینے کی لینڈنگ تک پہنچا تو اس نے اپنی سرد و سفاک نگاہ مجھ پر جما دی۔ چند ثانیوں تک میرا جائزہ لینے کے بعد اس کے پتلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھری۔

"کیا تم خوف زدہ ہو؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

اس کی سبز آنکھیں ایسی تھیں جیسے وہ میرے جسم کے پار دیکھ رہا ہو۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

"نن... نہیں تو۔" میں نے جواب دیا لیکن میری آواز میں نہ جانے کیوں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

"میری سیٹ کا نمبر بائیس ہے۔" وہ بولا۔ "مجھے وہاں بٹھا دو اچھی لڑکی۔"

وکی کو میں نے ٹوائلٹ میں چھپایا ہوا تھا جب کہ بائیس نمبر کی سیٹ ٹوائلٹ کے بالکل نزدیک تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اناطول کو ہنگامی طور پر وہی سیٹ دے دی جائے گی۔ "تمہارا وہاں بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"میں وہاں بیٹھ کر سارے مسافروں پر نگاہ رکھ سکوں گا۔" اناطول نے کمال جرأت سے کہا۔ "اس کے علاوہ وہاں سے زمینی مناظر بھی واضح دکھائی دیتے ہیں۔"

"وہاں بیٹھنے میں ایک قباحت یہ ہے کہ طیارے کو جب جھٹکے لگتے ہیں تو عقبی نشست پر بیٹھے مسافروں کے معدے اُلٹ کر ان کے منہ میں آ جاتے ہیں۔"

میری اس دلیل سے اناطول متاثر ہوا اور اس نے میری بتائی ہوئی سیٹ پر بیٹھنا منظور کر لیا۔ وہ اپنی وردی کی بنا پر سارے مسافروں سے ممتاز اور منفرد نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ لڑکا وکی ایک گھنٹا پہلے میرے طیارے میں آیا تھا۔ مسافروں کو اچھی طرح سے جانچ پڑتال کے بعد لاؤنج میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی تھی۔ میں مسافروں کا استقبال کرنے کے لیے چند منٹ پیشتر ہی طیارے میں چلی گئی تھی۔ جب میں نے اپنا میک اپ درست کرنے کے لیے پرس میں سے ننھا سا آئینہ نکالا اور اس میں اپنا جائزہ لیا تھا تو مجھے اس میں ایک لڑکے کی صورت دکھائی دی تھی۔ میں سرعت انداز سے مڑی تو اس لڑکے نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ "مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے مادام، میں تمہارا دوست ہوں اور پناہ لینے کی خاطر طیارے میں داخل ہوا ہوں۔"

اس کی سہمی ہوئی صورت اور لاچارگی دیکھ کر مجھے ترس آ گیا۔ میں جانتی تھی کہ اگر وہ منحرف ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے پھانسی کے پھندے تک جانے سے نہیں بچا سکتی۔ کمیونسٹ دنیا میں سب منحرفوں کا ایک ہی حل ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ زینوں پر قدموں کی دھمک سنائی دی تو میں نے جان لیا کہ وہ فوجی بوٹ ہیں۔ میں دوڑتی ہوئی گئی اور میں نے وارڈ روب کھول کر اسٹیوارڈ کا لباس نکال کر اس کی طرف اُچھالا کہ وہ اسے پہن لے۔

اس نے بھی غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اسے اپنے لباس پر ہی پہن لیا۔ میں نے اسے پچھلی نشست پر بٹھا لیا اور اپنے ہاتھ میں موجود لسٹ سے تھما دی اور اس سے کہا کہ وہ اسے زور سے پڑھے جیسے ہم مسافروں کو اور سامان کو چیک کر رہے ہیں۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ دو فوجی طیارے میں داخل ہوئے اور ان میں سے ایک نے گونج دار آواز میں کہا۔ "ہمارا ایک قیدی فرار ہو گیا ہے، ہم اس کی تلاش میں ہیں۔"

"تم مجھے ڈسٹرب کرنے آئے ہو۔ میں مسافروں کی لسٹ چیک کر رہی ہوں۔ یہ وکی ہے۔ میرا ساتھی۔" میں نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

میرے حاکمانہ رویے سے وہ قدرے متاثر ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہم طیارے کی تلاشی لیں گے اور تم کو ڈسٹرب نہیں کریں گے۔"

"اس بات کا خیال رکھنا کہ کیبن میں میری ساتھی اسٹیوارڈس بیمار تھی سو رہی ہے اسے بخار ہو گیا ہے۔ تمہاری ہنگامہ آرائی سے اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔"

"او کے۔ ہم اس کا خیال رکھیں گے۔" ان میں سے ایک نے یقین دہانی کرائی۔

وہ دس منٹ تک طیارے کے ہر گوشے کی تلاشی لیتے رہے لیکن وہ مفرور لڑکا انہیں نظر نہ آیا۔ اس لیے کہ ایک تو وہ بے حد کم روشنی میں بیٹھا ہوا تھا، دوسرے یہ کہ اس کے جسم پر پین امریکن ائر لائن کی وردی تھی۔ چنانچہ ان کے گمان میں نہیں تھا کہ جس کی انہیں تلاش ہے وہ ان کے سامنے ہی بیٹھا ہے۔

وہ معذرت کر کے طیارے سے اُتر گئے۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ دوسرے طیارے کی طرف جا رہے تھے جو دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ میرا دل اب بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے اس لڑکے سے کہا۔ "میں تمہیں وکی کہوں گی۔ تم جلدی سے ٹوائلٹ میں چھپ جاؤ، اس لیے کہ ایک منٹ کے بعد طیارے کے مسافر آنے والے ہوں گے۔"

وکی نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ٹوائلٹ میں چلا گیا۔ چند ہی لمحوں بعد مسافر طیارے میں داخل ہونے لگے اور ان کے ساتھ سیکرٹ سروس کا انسپکٹر اناطول بھی آ کر میرے سر پر سوار ہو گیا۔ سر کے بجائے یہ کہنا چاہیے کہ دل و دماغ پر سوار ہو گیا۔

دو منٹ بعد طیارے کے پنکھے گھومنے لگے۔ میں سوئچ دبا کر لائٹ آف کرنے ہی والی تھی کہ میں نے ایک مسافر کو اپنی نشست سے اُٹھتے دیکھا۔ وہ بے حد مضطرب تھا اور اس کے چہرے سے کرب جھلک رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ "آپ کو کیا پریشانی ہے؟ کیا میں کچھ مدد کر سکتی ہوں؟"

"مجھے متلی ہو رہی ہے۔ میں ٹوائلٹ جانا چاہتا ہوں۔"

"طیارہ پرواز کرنے والا ہے۔ اب آپ اپنی سیٹ نہ چھوڑیں۔ میں آپ کو قے روکنے کی گولی دیتی ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

پھر میں نے ایک شیشی سے گولی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی اور پانی کا گلاس بھی دیا۔ اس نے گولی نگل کر پانی پی لیا اور فرماں بردار بچوں کی طرح سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گئی کہ وکی کا ٹوائلٹ میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ اگر کوئی اور اس طرف جانے لگا تو میں اسے کیسے روکوں گی؟

میں نے مائک ہاتھ میں سنبھال کر کہا۔ "معزز خواتین و حضرات! یہ پین امریکن فلائٹ تھری زیرو تھری ہے۔ براہِ کرم اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لیجیے اور سگرٹ بجھا دیجیے۔ کوئی بھی اپنی سیٹ سے اُٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ طیارے کے ضابطے میں شامل ہے۔ امید ہے کہ آپ سب اس کی پیروی کریں گے۔"

میں نے ایک ہلکا بلب جلتا رہنے دیا اور سب لائٹیں آف کر دیں۔ اس کے بعد میں طیارے کے پچھلے حصے میں گئی اور میں نے آواز دبا کر کہا۔ "وکی ٹوائلٹ سے نکل آؤ اور سب سے آخری نشست کے نیچے لیٹ جاؤ۔"

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ٹوائلٹ سے نکل کر سیٹ کے نیچے جا چھپا۔ میں نے مسافروں کے استعمال کا ایک کمبل اس پر ڈال دیا اور اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ دراصل میں اس سے پہلے ایسے کسی جھمیلے میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ اس لڑکے کی بے کسی اور بے چارگی دیکھ کر مجھے اس پر ترس آ گیا تھا۔ لیکن تحیر انگیز بات یہ تھی کہ اسے بچاتے ہوئے خود کو بھی بچانا تھا۔

اچانک وہی مسافر پھر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا جس نے اس سے پہلے قے اور متلی کی شکایت کی تھی۔ میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچی اور ملائمت سے بولی۔ "کیا آپ کی حالت درست نہیں ہوئی؟"

"تمہاری دی ہوئی گولی فائدے مند ثابت ہوئی۔ میرا معدہ اب ٹھیک ہے۔"

"پھر کیا بات ہے، آپ اچانک کھڑے کیوں ہو گئے؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل میں اپنے مصنوعی دانت ٹوائلٹ میں رکھ کر بھول گیا ہوں۔" اس نے قدرے مسکرا کر کہا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے اوپری چار دانت اپنی جگہ سے غائب ہیں اور ایک خلا سا نظر آ رہا ہے۔

"آپ زحمت نہ کریں، میں لاتی ہوں۔" میں نے اخلاق سے دانت نکال کر کہا۔

اس نے میری گزارش کو در خور اعتنا نہ سمجھا اور مسافروں کی قطار سے نکل آیا۔ اب اسے روکنا خلاف از تہذیب ہوتا، ناچار میں ایک طرف ہو گئی۔ وہ ٹوائلٹ میں داخل ہوا اور اپنے مصنوعی دانت لے کر واپس آ رہا تھا کہ اچانک عقبی نشستوں کے درمیان ٹھہر گیا۔ میں سرعت انداز سے اس کی طرف لپکی۔

وہ فرش پر پڑے کمبل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں روشنی کم تھی اس لیے اسے یہ محسوس نہیں ہوا کہ کوئی اس میں لپٹا ہوا

بیٹا ہے۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا جیسے سینہ توڑ کر باہر آجائے گا۔ "یہ... یہ کمبل۔" اس نے اشارہ کیا۔

"گر گیا ہے۔" میں نے بات بنائی۔

"میں اٹھائے دیتا ہوں۔" اس نے کہا اور کمبل اٹھانے کو جھکا۔

میں نے اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اس کا بازو تھام کر اسے نشست کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ ایک بوڑھا شخص تھا، چنانچہ اس نے مزاحمت نہیں کی اور خاموشی سے اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے ایک بار پھر پسینا آ گیا۔ وکی غیر محفوظ مقام پر بیٹھا تھا اور اس بوڑھے کی طرح کوئی اور بھی اس کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔ گویا اسے وہاں سے منتقل کرنا ضروری تھا، مگر کہاں؟

اس کے لیے وہی کیبن مناسب تھا جہاں مارتھا لیٹی ہوئی تھی۔ اگر وہ وہاں چلا جاتا تو ممکن ہے محفوظ رہتا، اس لیے کہ سب کو معلوم تھا کہ وہاں ایک اسٹیوارڈس اپنی بیماری کی وجہ سے آرام کر رہی ہے۔ لہٰذا اس کے کیبن کو کھول کر کون جھانکتا؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وکی اتنے مسافروں کی موجودگی میں اس کیبن کی طرف کیسے جاتا؟

اس کا ایک ہی حل اس وقت میرے دماغ میں آ رہا تھا کہ میں لائٹ آف کر دوں مگر کیسے؟ ہاں ایک ترکیب مجھے سجھائی دی۔ میں اس پر عمل کرنے جا رہی تھی کہ دفعتاً مجھے ایک گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ گھنٹی سیکرٹ سروس کے انسپکٹر اعوان نے بجائی تھی۔ میں سراپا تبسم بن کر اس کی نشست کی طرف گئی تو اس نے میرا بازو تھام کر کہا۔ "میں تم سے ایک ذاتی سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے؟" میں نے اپنے لبوں پر ایک کاروباری مسکراہٹ سجائی۔

"تم ائیر لائن میں کب سے کام کر رہی ہو؟"

میں کوئی بچی نہیں تھی کہ اس کے سوال کا مطلب نہ سمجھ پاتی۔ وہ یہ سوال اس لیے کر رہا تھا کہ میری عمر کے متعلق کوئی اندازہ لگا سکے۔

"جناب! مجھے اس ائیر لائن پر کام کرتے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ اب تو صحیح طرح سے یاد بھی نہیں رہا۔"

"ہاہاہا... مجھے بھی یہی اندازہ تھا۔" اس نے مجھے چبھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم مجھ سے اس قدر ڈری ہوئی کیوں ہو؟ میں کوئی بھالو تھوڑا ہی ہوں کہ تمہیں کھا جاؤں گا۔"

"میں سمجھی نہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ میں کیا کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں بہرحال ایک انسپکٹر ہوں اور لوگوں کے چہروں کو پڑھ سکتا ہوں۔ مجھے اس کی تربیت دی گئی ہے۔ نہ جانے تم مجھ سے کیا چھپا رہی ہو؟"

"میں چھپا نہیں رہی ہوں، بلکہ تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس لیے کہ تم اس طیارے کے خاص مسافر ہو۔ کم از کم مجھ سے تو یہی کہا گیا ہے۔ اگر میں تمہیں خاص توجہ دے رہی ہوں تو تم نے اس کا غلط مطلب اخذ کیا ہے۔"

"تم چرب زبان اور ذہین لڑکی ہو۔ تم نے لفظوں میں مجھے مطمئن تو کر دیا ہے لیکن میں اب بھی تمہاری طرف سے شک و شبہات کا شکار ہوں۔" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"یہ میری بدقسمتی ہے۔" میں نے لہجے میں تاسف پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"طیارے میں کولر کس طرف لگا ہوا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"عقبی حصے میں۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"میں ایک گلاس پانی پینا چاہتا ہوں۔"

"ٹھہرو، میں لاتی ہوں۔" میں نے مستعدی سے کہا۔ اس لیے کہ وہاں سے مارتھا کا کیبن نزدیک تھا اور وہ اس کا دروازہ کھول کر جھانک سکتا تھا۔

"میں اپنی ٹانگوں میں خون رواں رکھنا چاہتا ہوں، اس لیے..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا تو خون خشک ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس شیطان صفت شخص کو کیسے روکوں؟

اچانک طیارہ ایک ائیر پاکٹ میں چلا گیا تو اسے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ تیزی سے پیچھے گرا۔ سارے مسافروں کے منہ سے اضطراری چیخیں نکل گئیں۔ اعوان جلدی سے بیٹھ گیا۔

میں طیارے کے عقبی حصے کی طرف چلی گئی اور میں نے سرگوشی میں کہا۔ "وکی! تمہارے دائیں جانب عورتوں کا کیبن ہے۔ میں طیارے میں تاریکی کرنے جا رہی ہوں۔ تم اس کا دروازہ کھول کر اندر چلے جانا۔"

وکی نے اپنے چہرے سے پڑا ہوا کمبل سرکا دیا۔ اُف اس

کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی بے چارگی اور یاسیت دیکھ کر میرا دل کٹ گیا۔ اگر میں اسے نہ بچا سکی تو میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا اور سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں پلٹ کر سوئچ بورڈ کی طرف گئی اور میں نے اسے آف کر دیا تو طیارے میں تاریکی پھیل گئی۔ سب مسافر چیخنے لگے۔ کسی نے استفسار کیا کہ کیا بات ہے، طیارے میں تاریکی کیوں ہے؟

''اوہ! معاف کیجیے گا خواتین و حضرات۔ میں نے غلطی سے دوسرے سوئچ پر انگلی رکھ دی۔ میں مائک دبا کر آپ لوگوں کو بتانا چاہتی تھی کہ اب ڈنر کا وقت ہو گیا ہے، لہٰذا اس کی تیاری کر لیجیے۔'' میں ان سے معافی تو طلب کر رہی تھی، لیکن میرے کان دروازے کی طرف تھے جب وکی اسے بند کرتا تو لامحالہ اس کی آواز سنائی دیتی۔

وہ کمرے میں چلا گیا تو میں نے دروازہ بند ہونے کی نہایت خفیف سی آواز سنی۔

کسی نے میرا بازو تھام لیا اور درندوں کی طرح غرا کر کہا۔ ''جلدی سے لائٹ جلاؤ۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کر دیا تو روشنی پھیل گئی۔ اداطول میرا ہاتھ تھامے ہوئے مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔ جیسے مجھے کچا کھانے کا ارادہ رکھتا ہو۔

''تم نے یہ حرکت کس لیے کی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''محض غلطی سے ایسا ہوا ہے۔ اس لیے کہ دونوں سوئچ ایک دوسرے کے برابر لگے ہوئے ہیں۔'' میں نے سوئچ بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے مائک تھام کر کہا۔ ''معزز مہمانانِ گرامی! ڈنر کا وقت ہو گیا ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد آپ کی خدمت میں لذیذ کھانے پیش کرنے کا شرف حاصل کروں گی۔ اس کے بعد کاک ٹیل دی جائے گی۔''

یہ اعلان کر کے میں اداطول کی طرف گئی اور میں نے پوچھا۔ ''تم کاک ٹیل لینا پسند کرو گے؟''

''اس شرط کے ساتھ کہ اگر تم بھی میرا ساتھ دو۔''

''اس وقت میں یہ شرط پوری کرنے سے قاصر ہوں۔'' میں نے معذرت کی۔ ''اس لیے کہ میں ڈیوٹی پر ہوں۔''

''ایسی صورت میں مجھے بھی کاک ٹیل نہیں پینا چاہیے اس لیے کہ ڈیوٹی پر تو میں بھی ہوں۔'' اس نے تفاخر سے کہا۔

میں نے اپنے شانے بے پروائی سے اُچکائے اور ریفریجریٹر میں سے شراب کی ٹرے نکالی اور مسافروں میں جام تقسیم کرنے لگی۔ اس کے بعد میں نے کچن سے پلیٹیں اُٹھائیں اور ان میں کھانا نکال کر مسافروں میں تقسیم کیا۔ اداطول کی پلیٹ پر میں نے خصوصی توجہ دی اور اسے خصوصی اہتمام سے سجایا۔

جب میں نے کیپٹن کو کھانا دیا تو اس نے طیارے کے کنٹرول پر اپنے معاون کو بٹھایا اور ٹیری کیمز کے ساتھ بیٹھ کر کھانے لگا۔ پہلے خیال آیا کہ کیپٹن کو صورتِ حال بتانے کا یہ اچھا موقع ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ اطلانٹا پہنچ کر ہی سب کچھ بتاؤں گی۔

کیوبا 1961ء تک امریکا کے تسلط میں تھا مگر اس کے بعد وہاں آزادی کی تحریک چلی اور کمیونسٹ حکومت قائم ہو گئی جس کا سربراہ فیڈل کاسترو تھا۔ اس عرصے میں دونوں ملکوں میں بے پناہ کشیدگی رہی کیونکہ روس کیوبا کی اعانت کر رہا تھا۔ اس نے کیوبا کی سرحدوں پر میزائل لگا دیے تھے۔ ایک بار تو اس کے جہاز بھی مدد کے لیے چل پڑے تھے لیکن صدر کینیڈی نے جب عالمی جنگ کی دھمکی دی تو روس بھیگی بلی بن گیا۔

بہرحال وہاں سے فرار ہونے والوں کو پناہ دینا امریکا کی پالیسی میں شامل تھا۔ ہماری فلائٹ 303 ہوانا سے اطلانٹا پھر شکاگو اور اس کے بعد نیویارک جا رہی تھی۔

سب مسافر کھانے میں مصروف ہو گئے تو میں مارتھا کے کیبن میں گئی۔ وکی اس کے برابر میں لیٹا تھا۔ جب میں نے مارتھا کا کمبل ہٹایا تو اس کی آنکھ کھل گئی تو اس نے دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالی اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اوہ ڈنر کا وقت ہو گیا۔ میں کب سے سو رہی ہوں۔ سارا کام تم نے اکیلے ہی کر ڈالا۔''

''تمہاری طبیعت خراب ہے اس لیے تم لیٹی رہو تو بہتر ہے۔'' میں نے اسے دھکیل کر سونے کی تلقین کی۔

''میں کہاں تک آرام کروں۔ دو گھنٹے گزر گئے ہیں۔ اب تو اطلانٹا ائرپورٹ آنے والا ہو گا؟''

''ہاں۔''

میں نے اس کا کمبل درست کیا اور کیبن سے نکل آئی۔ مسافر کھانا کھا چکے تھے۔ اس لیے میں نے پلیٹیں اُٹھانا شروع کر دیں۔ جب میں اداطول کے پاس پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اور کسی گہری

سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''جناب! کیا آپ کو کھانا پسند نہیں آیا؟'' میں نے سراپا اخلاق بن کر پوچھا۔

''آں... نہیں... کھانا تو ٹھیک لگ رہا ہے، لیکن کھانے کا موڈ نہیں ہے۔'' اس نے خوابیدہ لہجے میں کہا۔ ''میں اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہوں کہ وہ لڑکا آخر کہاں جا سکتا ہے؟''

''کیا میں ٹرے لے جاؤں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ اور اسے رکھ کر میرے پاس آؤ۔''

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے رپورٹ دی گئی تھی کہ جب وہ افسر طیارے کو چیک کرنے آئے تھے تو تم ایک مرد اسٹیوارڈ کے ساتھ مسافروں کی فہرست جانچ پڑتال کر رہی تھیں۔ اس طیارے میں تمہارے علاوہ دوسری اسٹیوارڈس مارتھا ہے جو تمہارے بیان کے مطابق فلو زدہ ہے اور آرام کر رہی ہے۔ اب رہ گیا وہ مرد اسٹیوارڈ، وہ کہاں ہے۔ وہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ تمہارے ذہن کی پیداوار ہے۔ یہ سارا ڈراما تم نے رچایا ہے۔ وہ ایک مصنوعی اسٹیوارڈ تھا جسے تم نے کہیں چھپا دیا ہے۔ بولو وہ اس وقت کہاں ہے؟'' اس نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

میں جب خاموش رہی تو اس نے میرا بازو تھام لیا اور اپنی انگلیاں میرے بازو میں چبھونے لگا۔ میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹایا اور کرب سے کہا۔ ''چھوڑیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے کام کرنے دیں۔''

''گویا تم انکار کر رہی ہو کہ وہ اس طیارے پر ہی ہے۔'' اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''بہرحال وقت نہیں گزرا۔ کیپٹن اس طیارے کا رخ موڑ کر واپس ہوانا جا سکتا ہے۔ اسے بھی سزا دی جائے گی کہ دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ یہ سیاسی معاملات ہیں اور اس کی سزا بھی ہوتی ہے۔''

وہ اپنی قطار سے نکل کر کیپٹن کے کیبن کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا کہ اسے وہاں جانے سے روک سکوں۔ لیکن اس نے اپنا ہاتھ جھٹک دیا اور میں ایک طرف جا پڑی۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور اس کا بازو دوبارہ پکڑ لیا۔ جسے اس نے ایک بار پھر جھٹک دیا۔

مسافر حیران کن نظروں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی توانائی مجتمع کی اور ان سے اپیل کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔ میں نے اس لڑکے کو پناہ دی ہے، ورنہ یہ لوگ اسے ہلاک کر دیتے۔ آپ سب میری مدد کیجیے۔''

وہ سب امریکی تھے اور کمیونزم کے فلسفے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اس کی تواضع گھونسوں اور لاتوں سے کی۔ اس کے بعد سب نے مل کر اسے نشست پر گرایا اور ہاتھ پیر باندھ دیے۔ دفعتاً سامنے والے اسکرین پر یہ الفاظ روشن ہو گئے۔ ''اپنی بیلٹ کس لیجیے۔ اب ہم لینڈ کرنے والے ہیں۔''

میں نے ایک کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اطلانٹا ائرپورٹ کے رن وے کی بتیاں روشن تھیں۔ تھوڑی دیر بعد طیارے کے پہیوں نے رن وے کو چھو لیا۔ اس کے بعد کیپٹن کے کیبن کا دروازہ کھلا اور اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مس جولیا! یہ کیا ہنگامہ برپا ہوا تھا؟ میں نے دھینگا مشتی کی آوازیں سنی تھیں؟''

''جناب! میں یہ اطلاع دینا آپ کو فرض سمجھتی ہوں کہ میں نے طیارے میں ایک مفرور لڑکے کو پناہ دے رکھی ہے۔ وہ منحرف ہے۔''

اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ بہت مختصر ہے اور اسی داستان کا ایک حصہ ہے۔ اداطول نے اپنی جگہ سے کسی بھیڑیے کی طرح غرا کر کہا۔ ''وہ میرے ملک کا شہری ہے اس لیے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اسے واپس کر دیا جائے۔''

کیپٹن نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اطلانٹا کی انتظامیہ کے ایک افسر نے اس پر افسوس کا اظہار کیا اور اسے بتایا کہ طیارہ ائرپورٹ پر اتر گیا تو اب اس کا فیصلہ اطلانٹا کی شہری انتظامیہ کرے گی۔ اگر اس لڑکے کے کاغذات درست ہوئے تو ہم اسے سیاسی پناہ دے دیں گے۔ اصول اور ضابطہ یہی ہے۔

پھر اس نے شب بخیر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

اس لڑکے وکی نے طیارے سے اُترنے سے پہلے میرے ہاتھ پر بوسہ دیا اور کہا۔ ''مادام! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ آپ نے مجھے نئی زندگی عطا کی ہے۔''

میں نے اپنی ڈائری ایک طرف رکھی اور میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

سراب

راوی۔ شہباز ملک

تحریر: [illegible]

[illegible]

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کینیڈا بھیج دیا جائے تاکہ میں بھی اپنے بھائی کی طرح [illegible] جانا چاہتا تھا۔ میرے انکار کو انہوں نے انا کا مسئلہ بنالیا۔ وہ بہت مشکل دور تھا۔ [illegible] لیکن اس سے پہلے کہ [illegible] سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے کاروبار شروع کیا۔ [illegible] دوست ملے اور زندگی ایک ڈھب سے گزرنے لگی لیکن ایک روز میری [illegible] ایک گولی [illegible] نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ [illegible] ٹکراؤ ہوگیا تھا پھر یہ ٹکراؤ [illegible] میں بدل گیا۔ دشمنی اور انتقام کا ایک سلسلہ شروع ہوا [illegible] لوگوں نے مجھ سے یہ پرسکون زندگی بھی چھین لی۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ان جیسے لوگ میرے دشمن ہو بیٹھے تھے تو دوسری طرف [illegible] جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ [illegible] میں قسمت کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا [illegible] فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ [illegible] مجھے بے ہوش کردیا۔ [illegible] عبداللہ [illegible] شہلا [illegible] فتح خان [illegible] پستول [illegible] پاکستان [illegible] شہلا کی تلاش میں نکلے۔ اس نے بتایا کہ اس سے ہوٹل میں آکر ملوں۔ میں اس سے ملنے پہنچا تھا بائیک کھڑی کر رہا تھا کہ نال کی چبھن محسوس ہوئی اور آواز آئی "اُدھر سے چلو اس سے پہلے کہ یہ نکل جائے۔" (اب آگے پڑھیں)

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بائیک اسٹارٹ تھی اور میرا جسم سن تھا۔ میں نے سوچا ۔ بھی نہیں تھا کہ میں اس وقت جب میں کامیابی کے قریب

تھا مجھے فتح خان کی منحوس آواز سننے کو ملے گی اور وہ مجھ پر حاوی ہو جائے گا۔ پستول کی نال میرے عین گردے پر تھی اور ایک ہی فائر مجھے ہمیشہ کی نیند سلانے کے لیے کافی ہوتا ممکن تھا کہ پستول پر سائلنسر بھی ہوتا اور اس ہجوم اور شور میں کسی کو پتا بھی نہیں چلتا اور میرے گرنے سے پہلے فتح خان یہاں سے جا چکا ہوتا۔ میں نے جب اس کی آواز سنی تو ایک لمحے کو میں مرنے کو تیار بھی ہو گیا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے فتح خان مجھے مارنے آیا ہے کیونکہ میں نے اسے مرشد جیسے آدمی کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن جب اس نے یہاں سے نکلنے کو کہا تو میں پرسکون ہو گیا تھا۔ میں نے بائیک کا انجن بند کر دیا۔

"فتح خان اس حرکت کا مقصد؟"

"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔"

"اس کے لیے تمہیں یہ حرکت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تم مجھ سے دوسرے طریقے سے بھی رابطہ کر سکتے تھے۔"

"ہم بہتر سمجھتا ہے کہ کیا ضرورت ہے اور کیا نہیں ہے۔" اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔ اور پستول دبایا۔ "اب تم ادھر سے چلتا ہے یا تمہارا لاش یہاں چھوڑ جائے۔"

"تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"کسی جگہ نہیں لے جارہا۔ بس کچھ بات کرنا ہے اور اس کے لیے سکون اور تنہائی کا ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پاس ہی پارک ہے وہاں چلتے ہیں۔" خلاف توقع وہ مان گیا۔ "ٹھیک ہے ادھر ہی چلو۔"

میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ میں فتح خان کے سامنے کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ وہ بہت تیز تھا اور یقیناً مجھے شوٹ کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا۔ "تم مرشد کی قید سے کس طرح نکلے؟"

وہ ہنسا۔ "کوئی مائی کا لال فتح خان کو اس کا مرضی کے بغیر قید نہیں کر سکتا ہے۔"

"تم میرے پاس بھی کئی دن رہے ہو۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"میں نے کہا نا میری مرضی سے۔" وہ بولا۔ "کیا تم مجھ کو مرنے سے روک سکتا ہے؟"

"اچھا تو تم قید حیات سے بھاگ جانے کی بات کر رہے ہو۔ ویسے تم مجھے خودکشی کرنے والے نظر تو نہیں آتے۔"

"اگر مجھے کوئی راستہ نظر نہ آئے تو میں خودکشی بھی کر سکتا ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور مجھے لگا کہ اگر کبھی ایسا موقع آیا تو وہ واقعی خودکشی کر لے گا۔ میں نے بائیک جناح سپر مارکیٹ سے نکال لی تھی اور اب ہم اس کے نزدیک واقع ایک چھوٹے سے پارک کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے پارک کے دروازے پر بائیک روکی تو اس نے پیچھے سے ہاتھ مار کر میری تلاشی لی اور بہت آرام سے میرا پستول نکال لیا لیکن اس نے اسی پر اطمینان محسوس نہیں کیا تھا بلکہ اس نے میری پوری تلاشی لی۔ پھر مطمئن ہو کر بائیک سے اتر آیا۔ میں نے اتر کر بائیک اسٹینڈ پر کھڑی کی اور اس سے پوچھا۔

"فتح خان تم نے بہت غلط موقع پر مداخلت کی ہے۔"

وہ سردی کی مناسبت سے گرم پینٹ شرٹ اور بھاری جیکٹ میں تھا اس نے مسکرا کر کہا۔ "اس کے برخلاف میرا خیال ہے میں نے بالکل ٹھیک موقع پر مداخلت کیا ہے۔ اندر چلو۔"

وہ مجھے پارک میں لے جارہا تھا، اس کا مطلب تھا اس کا ارادہ واقعی کچھ گفتگو کرنے کا تھا۔ ہم ایک ایسے گوشے میں آئے جہاں دور تک کوئی نہیں تھا ویسے بھی پارک میں صرف دو موٹی خواتین واک وے پر تیز تیز چل رہی تھیں اور اپنا وزن گھٹانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ ناکام کوشش یوں تھی کہ ان کے ہاتھ میں چپس کے بڑے پیک اور انرجی ڈرنک کے ٹن تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ شہلا کا کوئی چکر تھا یا فتح خان نے مجھے یوں اتفاقاً دریافت کر لیا تھا جیسے انڈیا کی دریافت کے ارادے سے نکلنے والے کولمبس نے امریکا دریافت کر لیا تھا۔ اگر اس نے مجھے اتفاقاً دریافت کیا تھا تو میں اسے شہلا کے بارے میں اپنے عزائم کی بھنک بھی نہیں لگنے دیتا۔ ہم جہاں آئے وہاں دو بینچیں آمنے سامنے تھیں۔ فتح خان نے مجھے ایک بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوسری پر خود بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے اطمینان سے انکشاف کیا۔

"میرے کو معلوم تھا تم شہلا کے پیچھے ضرور آئے گا۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ تو یہ وجہ تھی کہ شہلا نے تصاویر کا سن کر بھی بے تابی نہیں دکھائی تھی۔ کیونکہ فتح خان اس سے رابطے میں تھا اور اس نے شہلا کو بتا دیا تھا کہ تصاویر اس کے پاس ہیں۔ وہ جان گئی کہ میں اسے بے وقوف بنا رہا ہوں۔ میں نے فتح خان سے پوچھا۔ "پھر وہ میرے بلاوے پر کیوں آئی؟"

فتح خان نے اپنے چوڑے دانتوں کی نمائش کی۔ "ایسے میں نے کہا تھا وہ میرا حکم نہیں ٹال سکتا۔"

"یعنی وہ تمہارے کہنے پر یہاں چلی آئی جب کہ اسے

معلوم تھا کہ میں اسے دھوکا دے کر بلا رہا ہوں اور لازمی بات ہے میرے عزائم بھی درست نہیں ہوں گے۔"

"وہ تیار نہیں تھا لیکن میں نے اسے حکم دیا۔ دوسری صورت میں اس کا تصویر میرے پاس ہے وہ جانتا ہے میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"فتح خان کسی عورت کو بلیک میل کرنے کا یہ نہایت گھٹیا طریقہ ہے اور مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" میں نے پر ملامت لہجے میں کہا۔

"ہونی بھی نہیں چاہیے۔" اس نے آرام سے کہا۔ "تم ہمارا والد صاحب نہیں ہے جو ہم کو اچھی بری بات سکھائے۔"

"میرے خیال میں تو خود ان میں بھی اچھی بری بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی ورنہ تم کچھ تو سدھرے ہوتے۔" خلاف توقع فتح خان برا مانے بغیر مسکرایا۔ "تم نے ٹھیک کہا میں نے تمام برا کام والد صاحب سے سیکھا ہے۔"

"یقیناً سیکھا ہوگا لیکن میں تمہارے خاندانی معاملات پر بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں یہ بتاؤ کہ تم مجھے کیا بات کرنے کے لیے اغوا کرکے لائے ہو۔"

"شہباز خان میں تم سے ایک معاہدہ کرنا چاہتا ہے؟"

"کیسا معاہدہ؟... اس بینک لاکر کے بارے میں جس میں پروفیسر کا بلیک میلنگ اسٹف ہے۔"

"اس پر لعنت ہو۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "یہ عورت ہم کو پہلے بھی پاگل بنانے کا کوشش کیا لیکن فتح خان اپنا چکروں میں نہیں آتا ہے۔"

"یعنی تمہیں لاکر یا اس کے سامان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں لاکر تک رسائی میں۔"

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بھی اس تک رسائی حاصل کرسکتا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔ "پر ادھر بینک میں گھسنا اتنا آسان بھی نہیں ہے اگر بینک والوں کو پتا چل گیا تو ممکن ہے وہ پولیس کی مدد حاصل کرلے اور ممکن ہے پولیس آکر لاکر کھلوا لے۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"اگر یہ دھمکی ہے تب بھی تم کو غور کرنا چاہیے اس پر۔" اس نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

ظاہر ہے وہ دشمن تھا اور دشمن سے ادنیٰ اچھی توقع نہیں کرسکتا..... وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میں بھی لاکر کے چکر میں ہوں اور اسے بریف کیس کا صرف بہانہ کررہا ہوں۔ اگر وہ ایسا سمجھ رہا تھا تو میرے خیال میں کوئی انہونی نہیں تھا اس طرح اس کی توجہ بریف کیس کی اہمیت کی طرف نہیں جاتی۔ میں نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے میں سمجھ گیا اب بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں وہ ہیرے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "جو برت شا نے کہیں پہاڑوں میں چھپا رکھے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ ہیرے حاصل کرنے میں میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"تم برت شا کو آمادہ کرسکتے ہو کہ وہ مجھے اس جگہ تک لے جائے۔"

"برت شا تمہارے قبضے میں ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے اب اس کا ہوش و حواس کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے تو وہ کس طرح ان ہیروں تک رہنمائی کرسکتا ہے؟"

"مجھے شبہ ہے وہ اداکاری کررہا ہے۔"

"شبہ ہے یعنی تم نے اس کی مکاری جاننے کے لیے ہر ممکن حربہ آزما کر دیکھ لیا ہے؟"

"تقریباً۔" فتح خان کا لہجہ سپاٹ ہوگیا۔ "ایک بار تو وہ مر ہی گیا ہوتا لیکن زندگی تھی اس لیے بچ گیا۔"

"فتح خان اگر وہ تمہاری کوشش کے باوجود بتانے کو تیار نہیں تو میں کس طرح اس سے یہ بات معلوم کرسکتا ہوں۔"

"تم نہیں کرسکتے لیکن برت شا کی بیٹی تو کرسکتی ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"ایمن شاہ۔" میں چونکا۔ "تم اس کے بارے میں جانتے ہو وہ کہاں ہے؟"

اس گفتگو کے دوران فتح خان کا ایک ہاتھ مستقل اپنی جیکٹ کی جیب میں تھا اور اس کا ابھار میری طرف اشارہ کررہا تھا۔ فتح خان میری طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا وہ پھر مسکرایا۔ "تم اس سے اتنا انجان نہیں ہے جتنا بنتا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارا اس سے رابطہ ہے اور وہ لڑکی تم کو چاہتا بھی ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کئی برسوں سے میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ چاہنے والی بات فضول ہے۔ میں نے تم سے بچا کر اس کی مدد کی تھی اور وہ شکر گزار

تھی۔"

اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ "اگر تم اسے بتائے گا کہ تم اس کے باپ کے بارے میں جانتا ہے تو وہ دوڑا دوڑا آئے گا۔ پھر اس کے باپ کو جب اس کا صورت دکھائی دے گا تو اس خنزیر کا دماغ ٹھکانے پر آجائے گا اور وہ ہم کو فوراً ہیروں کا پتا دے گا۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے برت شا کو پاس سے دیکھا ہوا ہے۔ ہیرے اس کے لیے دولت نہیں ہیں بلکہ یہ اس کے پاس کسی کی امانت ہیں اور وہ ہر قیمت پر اس امانت کو اس کے مالکوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ تم نے اسے سمجھا ہی نہیں۔ وہ اپنا کا مارا انگریز ہے جس کے لیے اپنی زبان اور عہد ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو بہت پہلے تمہارے سامنے ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔"

"ابھی تک وہ اپنے اوپر برداشت کررہا ہے جب معاملہ اس کی بیٹی کا آئے گا تو وہ ضرور بتائے گا۔"

"میرے خیال میں تو یہ ممکن نہیں ہے اور اگر تم مجھ سے توقع کررہے ہو کہ میں ایمن کو بلاؤں گا اور وہ چلی آئے گی تو تمہاری دونوں توقعات احمقانہ ہیں۔"

"ہم احمقانہ بات اور کام کرتا ہے۔" وہ اچانک کھڑا ہوگیا۔ "شہباز خان ایک بات تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اگر تم بینک لاکر کا چیز لینا چاہتا ہے تو تمہیں میرا مدد کرنا ہوگا ورنہ تم بھی اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکے گا۔ تم جانتا ہے میں کیا کرسکتا ہے۔"

"کیا کرو گے تم؟ اس بارے میں پولیس کو بتا دو گے؟" میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہم کیا کرے گا یہ تم جلد دیکھ لے گا۔"

"یہ بتاؤ تمہیں شہلا کی پروا نہیں ہے۔ وہ اب تک میرے ساتھیوں کے قبضے میں جا چکی ہوگی۔"

"بے شک جائے اب اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا اور الٹے قدموں پارک کے دوسرے دروازے کی طرف جانے لگا۔ "شہباز خان اپنی جگہ سے اس وقت تک مت ہلنا جب تک ہم یہاں سے نکل نہ جائے۔"

مجھے حیرت ہوئی تھی۔ "میں تمہارے قابو میں ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر جارہے ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "شہباز خان یہ میری طرف سے دشمنی ختم ہونے کا ثبوت ہے۔" وہ رک گیا۔ "پر یاد رکھنا اب معاملہ تم پر ہے۔ اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو پرانا حساب دوبارہ کھل سکتا ہے۔"

میں ہنسا۔ "تم گن پوائنٹ پر دشمنی ختم کررہے ہو۔"

"تم چاہو تو ایسا ہی سمجھو وہ ہیرے میرے لیے بہت اہم ہیں اور اب میں ان سب چکروں سے نکل جانا چاہتا ہوں جب تک یہاں رہوں گا میرا اور تمہارا سامنا ہوتا رہے گا۔" اس نے کہتے ہوئے اپنی جیکٹ سے میرا پستول نکال کر اس میں سے میگزین نکالا اور اسے جھاڑیوں کی طرف اچھال دیا پھر پستول اس سے مخالف سمت میں اچھال دیا۔ شکر ہے اس کی یہ کارروائی کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ دونوں موٹی خواتین دور تھیں اور شاید اب پارک سے جارہی تھیں۔ یہ کام کرتے ہی فتح خان پھرتی سے دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا اور جب تک میں پستول میں میگزین ڈال کر دروازے تک پہنچا ایک گاڑی دور جا چکی تھی اور صرف اس کی بریک لائٹس نظر آرہی تھیں۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر واپس آیا۔ فتح خان نے مجھے یہیں لانے کا سوچا تھا لیکن میں نے خود کو پیش کرکے اس کی مشکل آسان کردی۔ اب میں بائیک لے کر اس کے پیچھے جاتا تو مجھے بہت طویل چکر کاٹ کر جانا پڑتا اور پارک سے نکلنا ممکن نہیں تھا یہاں بائیکس روکنے کے لیے مخصوص رکاوٹیں بنائی گئی تھیں۔ میں نے نکلنے سے پہلے موبائل پر شیر کا نمبر ملایا اور وہ میری آواز سنتے ہی چلایا۔

"شوبی کہاں ہے یار؟"

"پھنس گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کام ہوگیا؟"

"بہت آسانی سے ہم نے اسے روکا اور گاڑی میں ڈال لیا کسی نے نہیں دیکھا۔ ایاز اور وسیم اسے لے گئے ہیں۔ میں تجھے تلاش کررہا ہوں۔"

"تو اب گھر روانہ ہو جا میں پیچھے آرہا ہوں اور دیکھ تعاقب کا بہت خیال رکھنا۔ دشمن بھی ہوشیار ہے۔"

"مرشد؟" وہ فکرمند ہوگیا۔

"نہیں فتح خان۔" میں نے کہا اور کال کاٹ کر ایاز کا نمبر ملایا۔

"آپ کہاں رہ گئے تھے جناب؟" اس نے بھی میری آواز سنتے ہی سوال کیا۔

"پھنس گیا تھا۔" میں نے اسے بھی وہی جواب دیا۔ "اب ٹھیک ہوں تم سناؤ؟"

"ہم اسے لے جارہے ہیں۔" اس نے مختصراً بتایا۔

"تعاقب کا مکمل خیال رکھنا اگر ضرورت پڑے تو ادھر ادھر چکر لگاتے رہنا اس کے پیچھے فتح خان تھا۔"

معلوم تھا کہ میں اسے دھوکا دے کر بلا رہا ہوں اور لازمی بات ہے میرے عزائم بھی درست نہیں ہوں گے۔"

"وہ تیار نہیں تھا لیکن میں نے اسے حکم دیا۔ دوسری صورت میں اس کا تصویر میرے پاس ہے وہ جانتا ہے میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"فتح خان کسی عورت کو بلیک میل کرنے کا یہ نہایت گھٹیا طریقہ ہے اور مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" میں نے پُرملامت لہجے میں کہا۔

"ہونی بھی نہیں چاہیے۔" اس نے آرام سے کہا۔ "تم ہمارا والد صاحب نہیں ہے جو ہم کو اچھی بری بات سکھائے۔"

"میرے خیال میں تو خود ان میں بھی اچھی بری بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی ورنہ تم کچھ تو سدھرے ہوتے۔"

خلافِ توقع فتح خان برا مانے بغیر مسکرایا۔ "تم نے ٹھیک کہا میں نے تمام برا کام والد صاحب سے سیکھا ہے۔"

"یقیناً سیکھا ہوگا لیکن میں تمہارے خاندانی معاملات پر بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں یہ بتاؤ کہ تم مجھے کیا بات کرنے کے لیے اغوا کرکے لائے ہو۔"

"شہباز خان میں تم سے ایک معاہدہ کرنا چاہتا ہے؟"

"کیسا معاہدہ؟... اس بینک لاکر کے بارے میں جس میں پروفیسر کا بلیک میجک اسٹف ہے۔"

"اس پر لعنت ہو۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "یہ عورت ہم کو پہلے بھی پاگل بنانے کا کوشش کیا لیکن فتح خان ان چکروں میں نہیں آتا ہے۔"

"یعنی تمہیں لاکر یا اس کے سامان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں لاکر تک رسائی میں۔"

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بھی اس تک رسائی حاصل کرسکتا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔ "پر ادھر بینک میں گھسنا اتنا آسان بھی نہیں ہے اگر بینک والوں کو پتا چل گیا تو ممکن ہے وہ پولیس کی مدد حاصل کرلے اور ممکن ہے پولیس آکر لاکر کھلوا لے۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"اگر یہ دھمکی ہے تب بھی تم کو غور کرنا چاہیے اس پر۔" اس نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

ظاہر ہے وہ دشمن تھا اور دشمن سے زیادہ اچھی توقع نہیں کرسکتا...۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میں بھی لاکر کے چکر میں ہوں اور اپنے بریف کیس کا صرف بہانہ کر رہا ہوں۔ اگر وہ ایسا سمجھ رہا تھا تو میرے خیال میں کوئی حرج نہیں تھا اس طرح اس کی توجہ بریف کیس کی اہمیت کی طرف نہیں جاتی۔ میں نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے میں سمجھ گیا اب بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں وہ ہیرے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "جو برٹ شا نے کہیں پہاڑوں میں چھپا رکھے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ ہیرے حاصل کرنے میں میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"تم برٹ شا کو آمادہ کرسکتے ہو کہ وہ مجھے اس جگہ تک لے جائے۔"

"برٹ شا تمہارے قبضے میں ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے اب اس کا ہوش و حواس کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے تو وہ کس طرح ان ہیروں تک رہنمائی کرسکتا ہے؟"

"مجھے شبہ ہے وہ مکاری کر رہا ہے۔"

"شبہ ہے یعنی تم نے اس کی مکاری جاننے کے لیے ہر ممکن حربہ آزما کر دیکھ لیا ہے؟"

"تقریباً۔" فتح خان کا لہجہ سپاٹ ہوگیا۔ "ایک بار وہ مرنے لگا ہوتا لیکن زندگی تھی اس لیے بچ گیا۔"

"فتح خان اگر وہ تمہاری کوشش کے باوجود مکاری ترک کرنے کو تیار نہیں تو میں کس طرح اس سے یہ بات معلوم کرسکتا ہوں۔"

"تم نہیں کرسکتے لیکن برٹ شا کی بیٹی تو کرسکتی ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"ایمن شا۔" میں چونکا۔ "تم اس کے بارے میں جانتے ہو وہ کہاں ہے؟"

اس گفتگو کے دوران فتح خان کا ایک ہاتھ مستقل اپنی جیکٹ کی جیب میں تھا اور اس کا ابھار میری طرف اشارہ کر رہا تھا۔ فتح خان میری طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا وہ مسکرایا۔ "تم اس سے اتنا انجان نہیں ہے جتنا بنتا ہے۔ ہم جانتا ہوں تمہارا اس سے رابطہ ہے اور وہ لڑکی تم کو چاہتا بھی ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کئی برسوں سے میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور دوسرے چاہنے والی بات فضول ہے۔ میں نے تم سے بچا کر اس کی مدد کی تھی اور وہ شکرگزار

تھی۔"

اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ "اگر تم اسے بتائے گا کہ تم اس کے باپ کے بارے میں جانتا ہے تو وہ دوڑا دوڑا آئے گا۔ پھر اس کے باپ کو جب اس کا صورت دکھائی دے گا تو اس کا تجزیہ کا دماغ ٹھکانے پر آجائے گا اور وہ ہم کو فوراً ہیروں کا پتا دے گا۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے برٹ شا کو پاس سے دیکھا ہوا ہے۔ ہیرے اس کے لیے دولت نہیں ہیں بلکہ یہ اس کے پاس کسی کی امانت ہیں اور وہ ہر قیمت پر اس امانت کو اس کے مالکوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ تم نے اسے سمجھا ہی نہیں۔ وہ ایک عام انگریز ہے جس کے لیے اپنی زبان اور عہد ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو بہت پہلے تمہارے سامنے ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔"

"ابھی تک وہ اپنے اوپر برداشت کر رہا ہے جب معاملہ اس کی بیٹی کا آئے گا تو وہ ضرور بتائے گا۔"

"میرے خیال میں تو یہ ممکن نہیں ہے اور اگر تم مجھ سے توقع کر رہے ہو کہ میں ایمن کو بلاؤں گا اور وہ چلی آئے گی تو تمہاری دونوں توقعات احمقانہ ہیں۔"

"ہم احمقانہ بات اور کام کرتا ہے۔" وہ اچانک کھڑا ہوگیا۔ "شہباز خان ایک بات تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اگر تم بینک لاکر کا چیز لینا چاہتا ہے تو تمہیں میرا مدد کرنا ہوگا ورنہ تم بھی اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکے گا۔ تم جانتا ہے میں کیا کرسکتا ہے۔"

"کیا کرو گے تم؟ اس بارے میں پولیس کو بتا دو گے؟" میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہم کیا کرے گا یہ تم جلد دیکھ لے گا۔"

"یہ بتاؤ تمہیں شہلا کی پروا نہیں ہے۔ وہ اب تک میرے ساتھیوں کے قبضے میں جا چکی ہوگی۔"

"بے شک جائے اب اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہا اور الٹے قدموں پارک کے دوسرے دروازے کی طرف جانے لگا۔ "شہباز خان اپنی جگہ سے اس وقت تک مت ہلنا جب تک ہم یہاں سے نکل نہ جائے۔"

مجھے حیرت ہوئی تھی۔ "میں تمہارے قابو میں ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "شہباز خان یہ میری طرف سے دشمنی ختم ہونے کا ثبوت ہے۔" وہ رک گیا۔ "پر یاد رکھنا اب معاملہ تم پر ہے۔ اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو پرانا حساب دوبارہ کھل سکتا ہے۔"

"میں ہنسا۔ "تم کس پوائنٹ پر دشمنی ختم کر رہے ہو۔"

"تم چاہو تو ایسا ہی سمجھو وہ ہیرے میرے لیے بہت اہم ہیں اور اب میں ان سب چکروں سے نکل جانا چاہتا ہوں جب تک یہاں رہوں گا میرا اور تمہارا سامنا ہوتا رہے گا۔"

اس نے کہتے ہوئے اپنی جیکٹ سے میرا پستول نکال کر اس میں سے میگزین نکالا اور اسے جھاڑیوں کی طرف اچھال دیا پھر پستول اس سے مخالف سمت میں اچھال دیا۔ شکر ہے اس کی یہ کارروائی کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ دونوں سوئی خواتین دور تھیں اور شاید اب پارک سے جا رہی تھیں۔ یہ کام کرتے ہی فتح خان پھرتی سے دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا اور جب تک میں پستول میں میگزین ڈال کر دروازے تک پہنچا ایک گاڑی دور جا چکی تھی اور صرف اس کی بریک لائٹس نظر آرہی تھیں۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر واپس آیا۔ فتح خان نے مجھے یہیں لانے کا سوچا تھا لیکن میں نے خود ہی چیلنج کرکے اس کی مشکل آسان کردی۔ اب میں بائیک لے کر اس کے پیچھے جاتا تو مجھے بہت طویل چکر کاٹ کر جانا پڑتا اور پارک سے نکلنا ممکن نہیں تھا یہاں بائیکس روکنے کے لیے مخصوص رکاوٹیں بنائی گئی تھیں۔ میں نے نکلنے سے پہلے موبائل پر سفیر کا نمبر ملایا اور وہ میری آواز سنتے ہی چلایا۔

"شوبی کہاں ہے یار؟"

"پھنس گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کام ہوگیا؟"

"بہت آسانی سے ہم نے اسے روکا اور گاڑی میں ڈال لیا کسی نے نہیں دیکھا۔ ایاز اور وسیم اسے لے گئے ہیں۔ میں تجھے تلاش کر رہا ہوں۔"

"تو اب گھر روانہ ہو جا میں پیچھے آرہا ہوں اور دیکھ تعاقب کا بہت خیال رکھنا۔ دشمن بھی ہوشیار ہے۔"

"مرشد؟" وہ فکرمند ہوگیا۔

"نہیں فتح خان۔" میں نے کہا اور کال کاٹ کر ایاز کا نمبر ملایا۔

"آپ کہاں رہ گئے تھے جناب؟" اس نے بھی میری آواز سنتے ہی سوال کیا۔

"پھنس گیا تھا۔" میں نے اسے بھی وہی جواب دیا۔ "اب ٹھیک ہوں تم سناؤ؟"

"ہم اسے لے جا رہے ہیں۔" اس نے مختصراً بتایا۔

"تعاقب کا مکمل خیال رکھنا اگر ضرورت پڑے تو ادھر ادھر چکراتے رہنا۔ اس کے پیچھے فتح خان تھا۔"

"اوہ۔" وہ تشویش سے بولا۔ "پھر تو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"شاید اب کوئی پیچھے نہ ہو لیکن تم لوگ یہ سوچ کر اطمینان کرو کہ کوئی تعاقب کر رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" اس نے کہا تھا۔ میں نے وسیم کو اس مکان کا پتا سمجھا دیا تھا اور پھر وہ علاقہ اس کا دیکھا ہوا تھا اس لیے امید تھی کہ اسے مکان تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ایاز مکان کی چابیوں کے دو سیٹ اور بنوا لایا تھا اس لیے کوئی بھی آسانی سے جا سکتا تھا۔ ایاز سے بات کر کے میں کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ راستے ہی میں میں نے عبداللہ کو کال کر کے اس سے کہا کہ وہ شہلا کی کوٹھی سے اپنا آدمی واپس بلوا لے۔ میں پہنچا تو سنیر پہلے ہی موجود تھا اور گیٹ پر بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی لپکا۔

"سواری آ گئی جناب کی....؟"

"بس یار میں نے کوئی پنگا نہیں لیا تھا۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ضرور پنگا آپ کو لینے آیا ہوگا۔" وہ سخت طیش میں تھا۔

"ہاں تو یہ کہہ سکتا ہے میں نے نکلنے کے لیے بائیک اسٹارٹ کی تھی کہ فتح خان پیچھے آ کر بیٹھ گیا نہ جانے کب اور کیسے اس نے مجھے تاڑ لیا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا اور اس کے بعد کی کہانی میں نے اسے وہیں کھڑے کھڑے سنا دی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خواتین کو اس کا علم ہو اور وہ بلا وجہ کے اندیشوں میں دبلی ہوں۔ "اندر اب اس کا ذکر مت کرنا۔"

ہم اندر آئے تو وہ سب لاؤنج میں موجود تھے۔ ہمیں ہنستے مسکراتے دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی تھی۔ سعدیہ نے بے تابی سے کہا۔ "وسیم کہاں ہیں؟"

"تمہارے حکم کا غلام فی الحال کام کر رہا ہے۔" میں نے کہا تو وہ جھینپ گئی۔

"توبہ ہے شوبی بھائی کیسی باتیں کر رہے ہیں وہ میرے شوہر ہیں۔"

"بس یہی کہہ کر تم لڑکیاں ان کو سر پر چڑھا لیتی ہو اور آخر میں پاؤں کی جوتی بن کر رہ جاتی ہو۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ "یاد رکھو شوہر قابو میں رکھو اور اپنی اوقات میں رکھو، کیوں مونا میں نے ٹھیک کہا نا۔"

"جی شوبی۔" اس نے مسخری سے تائید کی۔

سنیر نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا....

"بکواس نہ کر کل کو تیری بھی شادی ہوگی اور میں یہی پٹی تیری بیوی کو بھی پڑھا سکتا ہوں۔"

"شوق سے پڑھانا۔" میں نے قالین پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "وہ تیری بیوی کی طرح نہیں ہے بہت سادہ سی لڑکی ہے۔"

"شوبی۔" مونا نے احتجاج کیا۔ "میں بھی گھریلو لڑکی ہوں۔"

"تم ابھی تک بیٹھی ہوئی ہو نہ چائے نہ پانی اور اس پر یہ دعویٰ کہ گھریلو لڑکی ہو۔" میں نے کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

"سوری شوبی ابھی لائی۔"

لیکن سعدیہ اس سے پہلے جا چکی تھی۔ جیتو جاننے کے لیے بے چین تھا کہ کیا ہوا ہے کیونکہ اس مہم میں میرا کوئی کردار نہیں تھا اس لیے میں نے سنیر کی طرف اشارہ کر دیا۔ "اس سے پوچھو۔"

"کیا بتاؤں کیا خاتون تھیں۔" سنیر نے سرد آہ بھرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا کیونکہ مونا لاؤنج سے جا چکی تھی۔ "ہم نے آگے سے گاڑی روکی اور ایاز نے پیچھے سے راستہ بند کر دیا اس کے بعد اسے ہینڈز اپ کر کے ایاز والی گاڑی کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اسی کی شال سے باندھنے پڑے تھے کیونکہ کسی کو رسی لے جانے کا خیال نہیں آیا۔"

"اور اسی وجہ سے تجھ پر اس کی خوبیاں آشکارا ہوئیں۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں شال تلے اس نے حشر سامان قسم کا لباس پہن رکھا ہوگا۔"

"ایسا ویسا حشر سامان۔" سنیر نے دوسری سرد آہ بھری۔ "ہم تینوں ہی ساکت رہ گئے تھے۔"

اسی لمحے مونا پانی لے کر اندر آئی اور اس نے آخری جملہ سن لیا تھا۔ "کیوں ساکت رہ گئے؟" اس نے مجھے گلاس تھمایا۔

"یہ اپنے میاں سے پوچھو۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم بتاتا ہے۔" جیتو نے نادان دوست کا کردار ادا کرتے ہوئے کہا۔ "سنیر بھائی، وسیم بھائی اور ایاز بھائی شہلا کو دیکھ کر ساکت رہ گیا تھا۔"

اس پر مونا نے کاٹ دار انداز میں سنیر کی طرف دیکھا اور ایسے ہی کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔ "کیوں ساکت..... رہ گئے تھے کیا پہلے کوئی عورت نہیں دیکھی ہے؟"

سنیر بوکھلا گیا تھا۔ "یہ بات نہیں ہے یہ جیتو بکواس کر رہا ہے۔"

"ہم بکواس نہیں کرتا ہے۔" وہ برا مان کر بولا۔ "ابھی آپ شوبی بھائی کو بتا رہا تھا کہ آپ نے ایسا خاتون نہیں دیکھا ہے۔"

مونا بری طرح سے پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے رخصت ہوئی... اور جیتو نے بھی ہوشیاری دکھائی اور اس کے ساتھ ہی نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب سنیر کا عتاب اس پر آئے گا۔ جیتو کے ہاتھ سے نکلنے پر اس نے جھنجلا کر میری طرف دیکھا۔ "انڈیا سے لانے کے لیے بھی ایک نمونہ ملا تھا سالا بن کر بھی دشمنی سے باز نہیں آیا۔"

"نہیں سعدیہ بھی تو آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اس بے چارے کا کیا قصور ہے آپ نے بھی سب تو فرمایا تھا۔"

"اب کئی دن تک اس کا منہ سیدھا نہیں ہوگا۔"

میں نے اسے ڈانٹا۔ "یار تو کیسا شوہر ہے آدمی تو آدم خور شیرنی کو قابو کر لیتا ہے اور تو ایک ایسی عورت سے ڈر ڈر کر جی رہا ہے جو تجھ سے محبت کرتی ہے۔"

سنیر سوچ میں پڑ گیا۔ "کہہ تو ٹھیک رہا ہے اور میں کون سا اس سے بے وفائی کرنے جا رہا ہوں۔"

"اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں بس اسے گاڑی میں ڈالا اور لے گئے۔ اس کی گاڑی کو کسی نے ہاتھ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی پولیس کو اس پر ہمارا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"

"لیکن یار ہمارا تو پلان تھا کہ ہم فتح خان کے آدمی بن کر اسے دھمکائیں گے لیکن فتح خان تو خود اس کے پیچھے تھا۔"

"اب اس سے کھل کر بات کریں گے۔" سنیر بولا۔

میرے موبائل کی بیل بجی تو میں بولتے ہوئے رک گیا۔ وسیم کی کال تھی اس نے کہا۔ "ہم پہنچ گئے ہیں اور اسے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے لیکن ایک مسئلہ ہے یہاں سردی سے بچنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"ایاز کو واپس بھیجو ہم بھی اس کے ساتھ آ رہے ہیں اور چیزیں بھی لیتے ہوئے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"وہ والا سامان بھی؟" وسیم کا اشارہ گولہ بارود کی طرف تھا۔

"وہ بھی لے آئیں گے۔"

"میں ایاز کو بھیجتا ہوں لیکن کھانے کو بھی لیتے آئیے گا۔"

ان لوگوں نے کھانا بنا لیا تھا۔ اسے انہوں نے پیک کر دیا۔ اس کے علاوہ کمبل، تکیے، پانی کی بوتلیں اور بعض ضروری اشیا ساتھ رکھ لیں۔ گولہ بارود والا بکس بہت بھاری تھا لیکن کسی نہ کسی طرح اسے ایاز والی جیپ کے پچھلے حصے میں لوڈ کر دیا گیا۔ جب تک ایاز آیا ہم کھانا تقریباً کھا چکے تھے۔ وہ بھی شریک ہو گیا کیونکہ لے جاتے ہوئے کھانا ٹھنڈا ہی ہو جاتا۔ کھانے کے دوران مجھے ایک خیال آیا تھا۔ جب وہ دونوں برتن اٹھا کر لے جانے لگیں تو میں نے سنیر اور ایاز سے کہا۔

"ابھی ہم چلے جائیں گے تو یہ دونوں اکیلی ہو جائیں گی؟"

"اکیلی کیوں ہیں؟" سنیر نے کہا۔ "جیتو ہوگا اور ایاز بھی رک جائے گا۔"

"میرا خیال ہے آپ رک جائیں۔" ایاز نے جلدی سے سنیر سے کہا۔ "میں شہباز صاحب کے ساتھ جاتا ہوں۔"

مجھے یہ خیال اس لیے آیا کہ آج ہی میرا فتح خان جیسے عیار سے ٹکراؤ ہوا تھا اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا وہ اس جگہ تک رسائی بھی حاصل کر سکتا تھا۔ اسے ہر قیمت پر وہ ہیرے درکار تھے جن کے بارے میں صرف ہریش جانتا تھا اور وہ اذیت سے بچنے کے لیے پاگل بن گیا تھا۔ اب فتح خان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ ایمن کی مدد سے اس کے باپ کو مجبور کرے۔ وہ پہلے بھی یہ کام کر چکا تھا اور اسے امید تھی کہ اس بار بھی وہ اپنا کام نکلوا لے گا۔ لیکن ایمن کو یہاں لانے میں اسے میری مدد درکار تھی اور مجھے اس کام پر مجبور کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ میرے کسی ساتھی کو قابو کر لیتا اور اس کی مدد سے مجھے مجبور کرتا۔ جیسے جیسے میں سوچ رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ فتح خان کا اصل مقصد یہی تھا۔ وہ میرا ٹھکانہ جاننا چاہتا تھا۔ لیکن آتے ہوئے میں نے تعاقب کا پورا خیال رکھا تھا۔ میں کئی ویران سڑکوں سے گزرا تھا جہاں دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔ غور و فکر کرتے ہوئے اچانک ہی ایک خیال الہام کی طرح ذہن میں آیا اور میں نے کہا۔

"سب ہوشیار ہو جاؤ.... ہتھیار نکال لو شاید دشمن یہاں آ چکا ہے۔"

انہوں نے سوال جواب میں وقت ضائع نہیں کیا تھا کہ مجھے کیوں اور کیسے پتا چلا انہوں نے اسلحہ نکال لیا تھا۔ مونا اور سعدیہ کے پاس بھی پستول تھے۔ میں نے جیتو سے کہا وہ چھت پر جائے اور آس پاس دیکھ کر موبائل فون پر اطلاع دے۔ وہ چھت پر ہی رک کر نگرانی کرے۔ ایاز اور سنیر کو آگے اور پیچھے کے لان کی نگرانی پر معمور کر کے میں ایک چھوٹی لیکن تیز روشنی والی ٹارچ کے ساتھ پورچ میں آیا جہاں بائیک

ہوئی تھی اور میں نے ٹارچ کی روشنی میں اس کے ان حصوں کا معائنہ شروع کر دیا جو عام طور سے نظر نہیں آتے ہیں۔ جہاں عام نظر کی رسائی ممکن نہیں تھی وہاں میں نے ہاتھ پھیر کر دیکھا۔

آخر پچھلے دروازے کے اندر والے حصے میں ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے ایک ہلکا سا ابھار محسوس ہوا اور اسے ہلانے کی کوشش کی تو وہ [illegible] سے چپکا ہوا [illegible] میں نے [illegible] دیکھا اور پھر انگلیوں سے حرکت کر کے اسے بڑی مشکل سے دروازے سے الگ کیا۔ یہ بہت طاقت ور مقناطیس تھا۔ سامنے آتے ہی میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ یہ [illegible] تھا جو [illegible] کی مدد سے کسی کی رہنمائی کر رہا تھا۔ [illegible] اندر آیا جہاں [illegible] موبائل پر [illegible] رپورٹ دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"جیتو بتا رہا ہے کچھ گڑبڑ ہے۔"

میں نے موبائل لیا۔ "کیا ہوا جیتو؟"

"شوبی بھائی... ادھر گلی کے کونے پر ایک گاڑی کھڑی ہے اس میں دو افراد موجود ہیں۔"

"[illegible]"

"پچھلی گلی میں بھی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی موجود ہے [illegible] نظر آتا ہے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "ہم دونوں طرف سے [illegible] ہوشیار رہو اور [illegible] میں [illegible] بھیج رہا ہوں۔"

[illegible] میں نے صغیر کو اندر بلایا اور اسے [illegible] "[illegible]" [illegible] پیچھے دیکھا [illegible] آ چکے ہیں۔

[illegible] "[illegible] پتا چل گیا۔ اب ہم [illegible]"

"[illegible]"

"پہلے ہم پچھلی گلی والوں [illegible] اور [illegible]"

[illegible]

[illegible]

گیا تھا یعنی اچھل پڑا تھا۔

"ٹھیک ہے۔"

میں نے سوچا اور فوری ایک پلان تشکیل دے [illegible] "ہمیں [illegible] کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"آپ جو کہیں گے میں اسے کچھ دوں گی۔" وہ بولی۔

"میں تو بغیر [illegible] ہوں۔" تیجو نے کہا تو وہ [illegible]

"آپ مجھ سے بات نہ کریں۔"

"چند لمحوں میں [illegible]" میں نے [illegible] اپنی بات سمجھائی۔ [illegible] ایک [illegible] کی [illegible] ہے اور مجھے [illegible] سامنے ایک مشکوک کار میں دو [illegible] نظر آنے والے [illegible] موجود ہیں۔ [illegible] ہونے والی [illegible] تھا [illegible] سے ساتھ [illegible] موجود تھی۔ [illegible] تھا [illegible] میں اور جیتو [illegible] میں آنے کے لیے [illegible] تھے۔ [illegible] سمجھ رہی تھی کہ اسے [illegible] تھا۔ [illegible] بات کچھ [illegible] تھا۔ جیتو [illegible]

"[illegible] بہت ہوشیار ہے [illegible] سمجھتا ہے۔"

میں نے [illegible] کی طرف دیکھا۔ "[illegible]"

[illegible]

[illegible]

"[illegible] لیا [illegible]"

[illegible]

"وہ کب نہیں ہوتا بابی اب تو دو تین دن فائرنگ کی آواز نہ سنوں تو زندگی پھیکی اور بے رونق لگنے لگتی ہے۔"

"تم کو عادت ہوگئی ہے۔"

"بس یہی سمجھ لو۔" میں نے پستول پر سائلنسر چڑھایا اور جج کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ایاز اوپر تھا اور سامنے والی کار کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے اس سے موبائل پر رابطہ کیا۔ "کوئی سرگرمی؟"

"نہیں جناب خاموشی ہے۔"

"جیسے ہی پولیس کی آمد ہو خبردار کرنا۔"

"آپ بے فکر رہیں جناب۔" اس نے جواب دیا۔ سنیر کو میں نے مکان کے اندر رہنے کو کہا تھا کہ اگر کسی طرح دشمن اندر آنے میں کامیاب ہو جائے تو عورتوں کی حفاظت کے لیے کوئی نہ کوئی ہو۔ میں اور جج عقبی دروازے کے ساتھ تھے اور براؤن ہمارے ساتھ تشریف فرما تھا۔ اگرچہ اس کا رویہ نہایت دوستانہ تھا اور اس نے مجھے دیکھ کر دم ہلا کر خیر سگالی کے جذبے کا اظہار کیا تھا لیکن وہ میری فرشتی لات اسی طرح فراموش کر چکا تھا جیسے ہم امریکا کی دی ہوئی چوٹیں اور عزت افزائی فراموش کر دیتے ہیں۔ بہر حال میرا اب اس سے وہ سلوک کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں تھا جو امریکا آئے دن ہمارے ساتھ کرتا ہے۔ سیاست ایک بڑا دلچسپ موضوع ہے اور پاکستانی آج تک فیصلہ نہیں کر سکے کہ ان کو زیادہ دکھ اندرونی سیاست نے دیے ہیں یا بیرونی سیاست نے۔ شاید دونوں طرف سے دکھوں کا تناسب برابر ہے۔ جج نے میرے غور و فکر میں خلل ڈالا۔

"شوبی یہ لوگ کب آئے گا؟"

"کون لوگ؟" میں نے بے خیالی میں پوچھا۔

"پولیس اور کون؟"

"یار ہماری پولیس تو قتل کی اطلاع پا کر بھی پورے سکون سے آتی ہے یہاں تو صرف دو مبینہ ڈاکوؤں کی اطلاع ہے اور ممکن ہے وہ چیک کر رہے ہوں کہ ان کے حصے دار ہیں یا کوئی اور ان سے بالا بالا کارروائی کر رہا ہے۔"

جج حیران ہوا تھا۔ "پولیس بھی ڈاکو سے ملا ہوتا ہے۔ قصوں میں تو دونوں دشمن ہوتا ہے۔"

"یہ خود دار سوائے قصوں کے ہر جگہ پولیس اور ڈاکو ساتھی ہوتے ہیں۔" میں نے حقیقت حال بیان کی۔ "ایک حالیہ اخباری رپورٹ کے مطابق سترفی صد ڈاکے پولیس کے ایما پر اور بعض اوقات عملی تعاون سے پڑتے ہیں۔ اور کچھ وارداتوں میں تو خود پولیس اہلکار ڈاکوؤں کے گیٹ اپ میں

کام کر جاتے ہیں۔ یعنی کر ڈاکوؤں کا بھیس...

ہم اتنی آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے کہ ہمیں خود بھی مشکل سے سنائی دے رہی تھی آواز باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ابھی تک پولیس کی آمد کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ شبلا کو ضرور اسی کارروائی کی طرح کیوں نہ ہم آپس میں موبائل اور ہینڈ فری کی مدد سے منسلک ہو جائیں اس طرح ہم دشمن سے بہت موثر طریقے سے نمٹ سکتے تھے۔ میں نے جج کو اس مشن کے ساتھ روانہ کیا۔ موبائل سب کے پاس تھے اس نے ہینڈ فری پہنچائے اور مجھے بھی ایک ہینڈ فری لا دیا کیونکہ میرے موبائل کا ہینڈ فری تیج خان نے کھینچ کر توڑ دیا تھا۔ ہینڈ فری لگا کر میں نے سب کو کانفرنس میں لیا۔ فوراً ہی ایاز نے کہا۔

"پچھلی گلی سے پولیس کار کی روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔"

"ہوشیار ہو جاؤ۔" میں نے جج سے کہا اور اس نے براؤن کو تھپکی دی تو وہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ جیسے ہی ایاز نے بتایا کہ پولیس کار گلی میں داخل ہو کر مشکوک کار کے پاس رکی ہے۔ میں نے عقبی دروازہ کھولا اور براؤن باہر نکل گیا۔ فوراً ہی اس کے غرانے اور کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ میں اور جج ایک ساتھ نکلے۔ میرا پستول پوری طرح تیار تھا۔ پچھلی گلی زیادہ روشن نہیں تھی اور مجھے وہ شخص فوراً نظر آ گیا جس پر براؤن غرا رہا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں موجود پستول کا رخ براؤن کی طرف تھا۔

وہ فائر کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کیونکہ آواز پورے محلے کو متوجہ کر لیتی اور وہ یہاں صرف نگرانی کر رہا تھا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو سمجھ گیا کہ پکڑا گیا ہے اس نے پستول کا رخ میری طرف کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے پہلے میرے پستول سے بے آواز شعلہ لپکا اور اس کے پستول والے بازو میں اتر گیا۔ اس نے کراہ کر بازو تھاما۔ پستول چھوٹ گیا تھا۔ عین اسی لمحے گلی کے سرے سے کوئی بھاگا جج اس کے پیچھے لپکا۔ میں نے عقب سے پکار کر کہا۔ "ہوشیاری سے وہ بھی مسلح ہوگا۔"

زخمی ہونے والا نوجوان تھا اور شاید تیج خان کی طرح پٹھان تھا۔ گورا چٹا اور تیکھے نقوش والا۔ مجھے افسوس ہوا میں نے اس کا پستول اٹھا لیا اسے براؤن نے گھیر رکھا تھا۔ میں نے نوجوان سے کہا۔ "ہاتھ اوپر کر و اس سے پہلے میں تمہارے دوسرے بازو پر بھی گولی مار دوں۔"

میرے لہجے سے اس نے جان لیا کہ میں ایسا ہی کر

گا۔ اس نے بادل ناخواستہ حکم کی تعمیل کی۔ میں نے اس کی تلاشی لی اور ایک عدد گراری والا چاقو برآمد کیا۔ پستول اس کے پاس ایک ہی تھا۔ میں نے ایاز سے پوچھا۔ "آگے کی کیا صورت حال ہے؟"

اس نے رپورٹ دی۔ "پولیس نے ان دونوں کو گاڑی سے اتار لیا ہے اور پوچھ گچھ کر رہی ہے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ انہیں گرفتار کر کے لے جائے گی۔"

"یہاں ایک پکڑا گیا ہے اور دوسرا بھاگ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "جج اس کے پیچھے گیا ہے۔"

اسی لمحے جج آ گیا۔ "وہ بھاگ گیا ہے۔ اس نے ایک گاڑی کھڑی کی تھی اس میں نکل گیا ہے۔"

اس پر زخمی نوجوان کے منہ سے مادری زبان میں ناگفتنی نکل گئی تھی اور یہ یقیناً خاص گالیاں تھیں کیونکہ پشتو مجھے بھی آتی ہے۔ میں اور جج اسے گھیر کر اندر لے آئے۔ وہ زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا گولی بس گوشت پھاڑتی نکل گئی اور ہڈی بچ گئی تھی۔ سنیر نے اس کے زخم کا معائنہ کیا اور پھر مدد بھر کی مدد سے صاف کر کے اوپر سے مرہم کی پٹی رکھ کر کپڑا لپیٹ دیا تھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیوں کر رہے ہیں۔ اچانک ایاز نے کہا۔ "پولیس واپس جا رہی ہے جناب۔"

"تم نیچے آ جاؤ۔" میں نے کہا اور اچانک زخمی کی کنپٹی پر گھونسا مارا اور وہ ڈھلک گیا۔ سعدیہ اور موہنا اچھل پڑے تھے۔

"یہ کیا کیا؟"

"وہی جو دشمن کے ساتھ کرنا چاہیے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔"

"نکلیں گے کیسے سامنے تو دشمن موجود ہے۔"

"نکل سکتے ہیں۔" میں نے کہا اور سگنل دینے والے آلے کو زمین پر گرا کر جوتے سے کچل دیا۔ اب وہ ناکارہ ہو گیا تھا۔ "سب تیار ہو جاؤ۔ اپنا سامان گاڑیوں میں رکھو۔"

ان لوگوں کا ذاتی سامان تھوڑا ہی تھا۔ وہ ایاز کی جیپ کے پچھلے حصے میں قیدی کے ساتھ آ گیا۔ میں نے اسے بھی مکان پر لے جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس سے پہلے ہمیں سعدیہ اور موہنا کو عبداللہ والی کوٹھی پر چھوڑنا تھا۔ گاڑیاں چار تھیں۔ ایک بائیک سمیت ان سب کو لے جانا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ ڈرائیو کرنے والے چار افراد تھے یعنی سنیر، ایاز، موہنا اور میں۔ میں بائیک نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ اس سے مجھے ابھی کام لینا تھا اس لیے سنیر کی منی بس چھوڑ کر

جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ دس منٹ میں سارا سامان بار کیا گیا اور اس دوران میں کوٹھی کی تمام بیرونی روشنیاں بجھا دی گئی۔ میں نے بائیک پر جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک گاڑی سنیر اور ایک ایاز چلاتا۔ تیسری کے لیے موہنا کا انتخاب کیا گیا وہ اسلام آباد میں ڈرائیونگ کا تجربہ رکھتی تھی۔ سنیر نے کوٹھی کے تمام دروازوں کو تالے لگا دیے۔ چابیاں اس کے پاس تھیں۔ اب وہ سب روانگی کے لیے تیار تھے۔

میں نے گیٹ کھولا اور یکے بعد دیگرے تینوں گاڑیاں نکل ان کے نکلتے ہی میں نے بائیک باہر کی اور گیٹ بند کر کے تالا لگا دیا۔ اس وقت تک گاڑیاں گلی کے کونے پر پہنچ گئی تھیں۔ مشکوک گاڑی موجود تھی۔ امکان یہی تھا کہ پولیس تک منا کر کے واپس چلی گئی تھی۔ جب میں باہر آیا تو اس گاڑی میں موجود افراد بھی روانگی کی تیاری میں دکھائی دیے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہوئیں اور وہ گھوم کر ان کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ جیسے ہی وہ گلی سے نکلی میں نے بائیک اسٹارٹ کی۔ بائیک اور میں ابھی تک کیاری کی بیلوں کی آڑ میں تھے۔ یہ سارا علاقہ سیدھی گلیوں والا ہے۔ یہاں ہر گلی دو طرف سڑک پر نکلتی ہے اور کوئی راستہ بند نہیں ہے۔ میں مخالف سمت میں روانہ ہوا اور اندازے سے گھوم کر ان کے پیچھے لگا۔ اس وقت تک تمام گاڑیاں خاصی آگے جا چکی تھیں۔ سنیر نے اضطراب سے کہا۔ "شوبی کہاں ہے یار؟"

"پیچھے ہوں... تم لوگوں نے نظر رکھی ہے کوئی اور تو نہیں ہے؟"

"نہیں بس یہی پیچھے آ رہے ہیں۔"

میں نے بائیک کو ریس دی اور ایک منٹ سے بھی پہلے اس پیچ خان کے آدمیوں کی گاڑی کو جا لیا تھا جو سب سے پیچھے تھی۔ میں نے اس طرح پستول نکالا کہ اگر وہ عقبی آئینے میں دیکھ رہے ہوں تب بھی ان کو نظر نہ آئے۔ میں نے ہیڈ لائٹ آف رکھی تھی۔ سڑک پر اسٹریٹ لائٹ کی روشنی تھی لیکن ہیڈ لائٹ روشن نہ ہونے سے ان کی توجہ عقب کی طرف نہیں جاتی اور اس وقت تو وہ آگے جانے والی گاڑیوں کو اپنی نظر میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چاروں گاڑیاں خاصی رفتار سے جا رہی تھیں۔

میں نے بائیک کو ایکسی لیٹر دیا اور گاڑی کے قریب جانے لگا۔ یہاں سڑک پر ٹریفک کم تھا اور مجھے امید تھی کہ کسی حادثے کی صورت میں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ گاڑی کے نزدیک آتے ہی میں نے پستول سامنے کیا اور اس کے دائیں عقبی ٹائر کا نشانہ لے کر یکے بعد دیگرے کئی گولیاں چلائیں۔

شاید پہلی ہی کارگر رہی تھی لیکن باقی بھی نشانے پر لگیں اور ٹائر کا حشر نشر ہو گیا تھا۔ گاڑی کچھ دیر تو سیدھی دوڑتی رہی پھر یک دم گھومی اور کنارے کے ساتھ فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ میں بائیک لہرا کر اس کے برابر سے نکل گیا تھا اور بیک مرر میں مجھے گاڑی الٹتی نظر آئی۔ اس کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹے سے زیادہ تھی اور یہ رفتار زیادہ ہوتی ہے اسی وجہ سے ٹائر پھٹنے کے بعد گاڑی ڈرائیور کے قابو میں نہیں آئی تھی۔

"کام ہو گیا۔" میں نے ایاز اور سفیر کو بتایا۔ "اور تو کوئی نظر نہیں آرہا ہے؟"

"نہیں اور کوئی نہیں ہے۔" ایاز نے جواب دیا۔ وہ سب سے آگے تھا کیونکہ عبداللہ کی کوٹھی کا علم اسے تھا۔ میں نے موبائل نکال کر ان لوگوں سے کال منقطع کی اور وسیم کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ میں نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں..... سب ٹھیک ہے وہ چلانے لگی تھی مجبوراً اس کا منہ بھی بند کرنا پڑا۔ آپ ابھی تک آئے نہیں؟"

"ہاں یار چکر ہو گیا تھا۔ فتح خان نے میری بائیک میں سگنل ڈیوائس لگا دی تھی اور اس کے آدمی کوٹھی تک آ گئے تھے۔ ان کو چکر دے کر نکلے ہیں ان کو عبداللہ کی کوٹھی پر چھوڑ کر پھر تمہارے پاس آتے ہیں۔"

"ٹھیک آپ پوری تسلی سے آئیں یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"تمہارے اور شیلا کے لیے کھانا لانا ہے اور سوائے لڑکیوں کے باقی سب وہیں آ جائیں گے۔"

"سامان سارا لے لیا ہے؟"

"ہاں فکر مت کرو سامان سارا ہے۔" میں نے جواب دیا اور کال کاٹ دی۔ اب ہم عبداللہ کی کوٹھی سے کچھ دور تھے۔ اس لیے میں نے عبداللہ کو کال کی۔ "عبداللہ تیار ہو جاؤ پورا لشکر آرہا ہے تمہاری طرف۔"

وہ خوش ہو گیا تھا۔ "سچ میں جناب؟"

"ہاں یار سچ مچ آرہے ہیں۔ آکر ساری بات بتاتا ہوں بس کچھ ہی دور ہیں۔"

جب ہم عبداللہ کی کوٹھی پر پہنچے تو اس کا گیٹ پہلے ہی کھول دیا گیا تھا اور عبداللہ خود دروازے پر موجود تھا۔ ہم بنا رکے اندر گھستے چلے گئے اور پیچھے ہی میری بائیک اندر آئی عقب سے گیٹ بند ہو گیا۔ جب تک میں ہیلمٹ اتار کر آگے آتا عبداللہ اور ایاز گلے مل رہے تھے۔ پھر سفیر اور بیجو گلے ملے۔ آخر میں وہ میرے گلے لگا اور اس نے شکوہ کیا۔ "جناب میں تو سمجھا کہ آپ میری کسی خطا پر ناراض ہو گئے ہیں۔"

"ایسا ہو سکتا ہے یار۔" میں نے کہا۔ "میں صرف اس لیے یہاں سے دور ہوا تھا کہ یہ جگہ ہماری بنیادی پناہ گاہ ہے۔ اور دیکھو آج میری احتیاط کام آ گئی۔ دشمن نے ہماری عارضی پناہ گاہ تلاش کر لی اور ہم بلا تکلف وہاں سے نکل آئے۔ دشمن یہاں آ جائے تو ہماری مشکلات بڑھ سکتی ہیں۔"

"اوہ۔" عبداللہ بولا پھر سعدیہ اور مونا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "آپ دونوں یقیناً مونا اور سعدیہ بی بی ہیں۔"

"اور آپ عبداللہ بھائی ہیں۔" مونا بولی۔

"مونا اور سعدیہ، عبداللہ ہمارا نہایت مخلص ساتھی ہے۔ یہ تو ہمارے ساتھ آنے کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا کیونکہ یہ یہاں سے ہماری زیادہ مدد کر سکتا ہے۔"

"باتیں ہوتی رہیں گی آپ اندر آئیں۔" عبداللہ نے کہا اور ہمیں اندر لے آیا۔ وسیع نشست گاہ میں خوش گوار حرارت تھی۔ عبداللہ نے کھانے کا پوچھا لیکن ہم کھا کر آئے تھے اس لیے اس نے چائے اور کافی کا کہہ دیا۔ میں نے عبداللہ کو فتح خان سے ٹکراؤ اور پھر اس کی چالاکی بتایا۔ عبداللہ تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"ممکن ہے اس نے ایسی مزید کوئی ڈیوائس پلانٹ کی ہو۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "ایسا ہو سکتا ہے۔"

"میں ابھی چیک کرتا ہوں۔" عبداللہ نے کہا۔ کہیں گیا اور ایک منٹ بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک لمبا گول بڑی ٹارچ نما آلہ تھا۔ "آئیں میرے ساتھ۔"

میں، سفیر اور ایاز اس کے ساتھ پورچ میں آئے جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس نے آلے سے باری باری تینوں گاڑیوں اور بائیک کو چیک کیا لیکن آلے نے کوئی سگنل نہیں دیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ "شکر ہے مزید کوئی ڈیوائس نہیں ہے۔"

"یہ درست کام کر رہا ہے؟"

"بالکل جناب یہ دیکھئے۔" اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈیوائس نکال کر اسے ایاز کی جیب کے اندرونی حصے میں لگا دیا اور جب آلہ آن کر کے اس سے چیک کیا تو وہ سگنل دینے لگا تھا۔ میں نے اس سے آلہ لے کر دیکھا۔

"یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔"

"یہ صرف فکس سگنل ڈیوائس کا پتا نہیں چلاتا ہے بلکہ

اگر کوئی مائیکروفون بگ کر دے تو یہ اس کا پتا بھی چلا سکتا ہے یوں سمجھ لیں کہ یہ دس میٹر کے دائرے میں تمام ریڈیائی اصلات کا پتا چلا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اسلحے کا سراغ بھی لگا سکتا ہے۔"

"عبداللہ ہمیں اس کی ضرورت ہے یہ کہاں سے ملے گا؟"

"میرے پاس ایسا ایک اور ہے وہ آپ لے جائیں یہ ضروری ہے۔ آج کل جنگ اصل میں آلات سے لڑی جاتی ہے۔" اس نے کہا۔ "اب آپ نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو آپ کو اس قسم کے مزید آلات سے لیس ہونا پڑے گا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

"سوچیں مت جناب..... میرے پاس ایسے آلات کا ایک سیٹ موجود ہے اور باقی کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔"

عبداللہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس قسم کے آلات جو ہمیں باخبر رکھتے ہیں ان کی موجودگی میں ہم مشکل معرکہ بھی آسانی سے سر کر سکتے تھے جیسے صرف موبائل فون کی مدد سے ہم نے فتح خان کے آدمیوں پر کتنی آسانی سے قابو پا لیا کیونکہ ہمارا آپس میں رابطہ تھا اور ہم بہترین طریقے سے حرکت میں آئے تھے۔ اس طرح کے مزید آلات کی مدد سے ہم خود کو خطرات سے محفوظ رکھتے ہوئے دشمن پر آسانی سے قابو پا سکتے تھے۔ فتح خان کا ساتھی ایاز کی جیپ کے عقبی حصے میں بے ہوش اور بندھا پڑا تھا۔ میں نے پہلے سوچا تھا کہ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا لیکن پھر میں نے اسے فی الحال عبداللہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ عبداللہ کے دو آدمی اسے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر تہہ خانے میں لے گئے جہاں قیدیوں کو رکھنے کا معقول انتظام تھا۔ عبداللہ نے اس کے زخم کی مرہم پٹی کرنے کو بھی کہا تھا۔ ہم اندر آئے تو چائے اور کافی آ چکی تھی۔ عبداللہ نے پوچھا نہیں تھا کہ کون کیا پینا پسند کرے گا اس نے خیر سے دونوں چیزیں منگوائی تھیں اور اب مونا اور سعدیہ سرو کر رہی تھیں۔ اگرچہ خیر نے سرو کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے اسے چلتا کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"پہلے تمہیں ایک باس کی تھی اب یہ دو باس ہیں۔"

خیر مسکرایا۔ "ہمارا تو کام حکم کی تعمیل کرنا ہے جناب ایک دو باس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

مونا نے مجھے گھورا۔ "ہم کہاں سے باس ہو گئے۔"

"آپ باس ہی ہیں۔" عبداللہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "شہباز صاحب نے بتایا ہے اب آپ یہاں رہیں گی اور آپ جب تک یہاں ہیں یہاں کے تمام معاملات آپ کی مرضی سے چلیں گے۔ اس کوٹھی کے دو حصے ہیں ایک حصہ ہم ملازموں والا ہے وہاں ہمارے کمرے ہیں اور دوسرا حصہ مالکوں کے لیے مخصوص ہے۔"

"ہم میں کوئی مالک اور ملازم نہیں ہے۔" میں نے اختلاف کیا۔ "ہاں عورت ہونے کے ناطے یہ یہاں کی باس ہو سکتی ہیں۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔" عبداللہ مسکرایا۔ "ورنہ جب آپ آئے تھے تو کیا میں نے آپ سے یہ بات کی تھی۔"

"کوٹھی کے حفاظتی انتظامات کی نوعیت کیا ہے؟"

"یہاں ہر وقت آٹھ گارڈز ہیں ان میں سے چار ہر وقت ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ ایک گیٹ پر اور دو کوٹھی کے اوپر اور پچھلے حصے میں ہوتے ہیں ایک کنٹرول روم میں کیمروں کی نگرانی کرتا ہے۔ اگر اسے کسی ضرورت سے ہٹنا پڑے تو وہ چوتھے کو بلا لیتا ہے۔ تمام گارڈز کا ریڈیو سے آپس میں مستقل رابطہ رہتا ہے۔ دیواروں پر کرنٹ وائرز ہیں اور ان کے ساتھ الارمنگ وائرز بھی ہے جو کٹ جائے تو الارم بجنے لگتا ہے۔"

"گڈ تم نے حفاظتی انتظامات پہلے سے بہتر کر لیے ہیں۔" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

"آدمی کم ہیں لیکن بہترین تربیت یافتہ اور اعتماد کے ہیں۔"

"میرے خیال میں اتنے آدمی بہت ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہاں سعدیہ اور مونا کے ساتھ بیجو رہے گا۔"

"ہم آپ کے ساتھ جائے گا۔" بیجو نے فوراً کہا۔

"یار تم ان کے منے بھائی ہو۔" سفیر بولا۔ "ان کا دل بہلانا اور ان سے کھانے بنوا کر کھانا۔"

"نہیں....."

"یار بات تو سن لیا کرو۔" میں نے کہا۔ "تمہارا شناختی کارڈ نہیں ہے۔ عبداللہ تمہارا آئی ڈی بنوائے گا اور پھر ہم سب کے پاسپورٹ بھی بنوانے ہیں۔"

"یہ کام تو بہت آسان ہے۔" عبداللہ نے کہا۔ "چار دن میں آپ سب کے پاسپورٹ بن سکتے ہیں۔"

"ہمارے پاس صرف سفیر اور مونا کا پاسپورٹ ہے۔ وسیم کا غائب ہے، میرے پاس ہے لیکن اس پر سفر کرنے کا مطلب جیل جانا بھی ہو سکتا ہے اس لیے مجھے بھی دوسرا پاسپورٹ درکار ہے۔ سعدیہ اور بیجو کا بنوانا ہے۔ لیکن شناختی کارڈ صرف بیجو کا بنوانا ہے۔"

عبداللہ نے ایک کاغذ لیا اور اس پر یہ ساری تفصیلات

درج کر لیں۔ وسیم کا کارڈ اس کے پاس تھا۔ میں نے فون کر کے اس کا نمبر بھی عبداللہ کو لکھوا دیا۔ رات کے بارہ بجنے کے قریب تھے۔ عبداللہ نے صوفہ اور مسہری کے لیے کمرے کھلوا دیے تھے۔ وہ اپنا سامان رکھنے چلی گئیں۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ''ایسا کر تو بھی آج رات یہاں رک جا۔''

''وہ کس خوشی میں؟''

''نیا ماحول ہے سونا گھبرا نے نہیں۔''

''تب ایسا کرو وسیم کو بھی کال کر کے بلا لے اور چند دن رک جا ہم خود جا کر تیرا نکاح پڑھا کر رخصتی کر کے لے آتے ہیں سب یہاں فلمی خوشی رہیں گے راجا صاحب کے خرچ پر۔'' سفیر بھنا گیا تھا۔

میں ہنس دیا۔ ''تپتا کیوں ہے یار؟''

''جناب نے بات ہی ایسی کی ہے۔''

بیچ رکنے کے لیے تیار نہیں تھا اسے بڑی مشکل سے روکا۔ میں چاہتا تھا کہ آئی ڈی کارڈ بننے تک وہ مکمل میدان سے ذرا دور رہے کیونکہ اگر وہ پولیس کے چکر میں آتا تو کوئی شناختی چیز نہ ہونے کی وجہ سے وہ مشکل میں بھی پڑ سکتا تھا۔ ایک بجے ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو اسلام آباد کی سڑکیں مکمل ویران ہو چکی تھیں۔ شکر ہے دھند نہیں تھی ورنہ روڈ و کر ڈرائیونگ کرنا پڑتی۔ ہم آدھے گھنٹے میں مکان پر پہنچ گئے تھے۔ میں نے وسیم کو پہلے ہی بتا دیا تھا۔ سفیر کی لینڈ کروزر، سفاری اور میری بائیک وہیں چھوڑ دی گئی۔ ایاز کی جیپ میں ہم وہاں سے نکلے تھے۔ چابی اسفیر کی کوٹھی میں تھی۔ اسے ہم بعد میں بھی لا سکتے تھے۔

وسیم دروازے پر منتظر تھا۔ اندر صرف ایک گاڑی کی گنجائش تھی اسی وجہ سے صرف ایک گاڑی لائے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ مکان غیر آباد ہونے کا تاثر برقرار رہے تا کہ کم سے کم لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ وسیم کا بھوک سے برا حال تھا اس لیے اس نے سب سے پہلے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے ٹفن تھما دیا اور وہ باورچی خانے کی طرف لپکا جہاں چولہے موجود تھے۔ میں، سفیر اور ایاز سامان اتار کر اندر لانے لگے۔ پہلے صرف کمبل اور تکیے لانے کا ارادہ تھا لیکن اب ہم بہت کچھ لے آئے تھے۔ مکان میں قالینوں کے نیچے ویز انڈر لے تھا اس کی وجہ سے بستر اور بیڈنگ کی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہم نے سارا سامان ایک کمرے میں سیٹ کیا۔ سفیر نے مشک بندی کی تھی اور ایک گیس ہیٹر بھی لے آیا تھا۔ مکان مکمل طور پر سرد تھا۔ رات گزارنے کے لیے گیس ہیٹر ضروری تھا۔ ایاز نے جا کر شہلا والے کمرے میں جھانکا۔ اس کے دروازے کے باہر کنڈی تھی اسے بند کر کے شہلا کو قید کیا جا سکتا تھا ورنہ باقی کمروں میں جدید لاک تھے اندر سے بغیر چابی کے بھی بند کیے جا سکتے ہیں۔ ایاز آیا تو قدرے فکر مند تھا۔

''کیا ہوا کچھ مسئلہ ہوا ہے؟'' سفیر نے پوچھا۔

''نہیں جناب لیکن اس عورت کو دیکھ کر مجھے ایک خیال آیا ہے کہ فتح خان نے کچھ زیادہ ہی آسانی سے اسے ہمارے حوالے نہیں کر دیا ہے؟''

میں چونکا تھا۔ شاید یہ بات میرے ذہن میں آئی لیکن میں نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ ''تمہارا مطلب ہے اس میں بھی اس کی کوئی چال ہو سکتی ہے؟''

''بالکل ہو سکتی ہے کیا ویسا ہی آلہ اس کے لباس کہیں چھپایا نہیں جا سکتا ہے؟''

''میرے خدا یہ تو سوچا ہی نہ تھا۔'' میں نے کہا۔ ''بالکل ہو سکتا ہے اور وہ اتنا چھوٹا سا آلہ ہے کہ لباس میں آسانی سے چھپایا جا سکتا ہے تم لوگوں نے اس کی تلاشی لی۔''

''نہیں سرسری سی لی تھی۔'' ایاز نے کہا۔ ''کوئی ہتھیار دیکھنے کے لیے لیکن اس کے پاس سے کچھ نہیں نکلا۔''

میں نے ہاتھ پر مکا مارا۔ ''اس سے ثابت ہوتا ہے۔ چال ہے۔ ہمیں اس کی تلاشی لینی ہو گی۔''

سفیر نے سوال کیا۔ ''یہ کار خیر کون انجام دے گا؟''

''ایاز۔'' میں نے ایاز کی طرف دیکھا تو وہ بدکا۔

''مجھے معاف رکھیں جناب میں نے آج تک عورت کو اس طرح ہاتھ نہیں لگایا ہے۔''

''تم نے صرف تلاشی لینی ہے۔''

''تو آپ خود لے لیں۔''

سفیر نے بھی صاف انکار کر دیا اور جب وسیم کھانا گرم کر کے لایا تو اس نے بھی انکار کر دیا۔ میں بھنا گیا۔ ''جیسے تم لوگوں کو کوئی غلط حرکت کرنے کو کہہ رہا ہوں۔''

وسیم نے کھاتے ہوئے کہا۔ ''شہباز صاحب سچی بات ہے مجھے اس سے ڈر لگتا ہے وہ بڑی خطرناک عورت ہے۔ ابھی جب میں اس کا منہ بند کرنے گیا تھا تو اس نے گالیاں دیں اور ایسی باتیں کیں کہ اس موسم میں مجھے پسینہ آ گیا۔''

''میں شادی شدہ ہوں۔'' سفیر بولا۔ ''ایسے آدمی کو عورتوں سے دور رہنا چاہیے۔''

ایاز پہلے ہی صاف انکار کر چکا تھا۔ مجھے لگا ہم فضول بحث کر کے وقت ضائع کر رہے تھے۔ اس قسم کی ڈیوائس کے سگنل کی حد محدود ہوتی ہے اور جب اس کا ریسیور ایک کلومیٹر دور ہوتا ہے تب ہی وہ اس کا سگنل پکڑ سکتا ہے۔ لیکن یہ میرا اندازہ تھا جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔ میں عبداللہ سے سگنل پکڑنے والا آلہ لانا بھی بھول گیا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔''

''سنبھل کے دیکھنا یار۔'' سفیر نے شرارت سے کہا۔ ''دیکھنے کی چیز ہے۔''

میں نے اسے گھورا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ جب زرین ملی تو یہ سب یہاں نہیں تھے ورنہ میرا امیج سے ریکارڈ لگتا۔ میں شہلا والے کمرے میں آیا۔ یہاں بھی سردی تھی اگرچہ باہر جیسی تو نہیں تھی لیکن پھر بھی اچھی خاصی تھی۔ اس میں بھی وہ بند شال کے بیٹھی تھی۔ اس کی شال سے ایاز اور وسیم نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے تھے اور منہ بھی بند کیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شعلے سے بھڑکے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ میں نے اس کا منہ کھولا تو اس سے کیا نکلے گا اس لیے میں نے اس کا منہ کھولنے سے گریز کیا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری تلاشی لینے جا رہا ہوں اس لیے کچھ غلط مت سمجھنا۔''

اس نے ناک سے آواز نکالی۔ شاید وہ منہ کھولنے کو کہہ رہی تھی میں نے سوچا اور اسے خبردار کیا۔ ''ٹھیک ہے میں تمہارا منہ کھول رہا ہوں لیکن اگر تم نے ایک بھی فضول بات کی تو میں منہ دوبارہ بند کر دوں گا۔''

اس نے سر ہلا کر یقین دلایا کہ وہ کوئی غلط بات نہیں کرے گی۔ میں نے اس کے منہ سے کپڑا اتار دیا اس نے چند گہری سانسیں لیں اور بولی۔ ''شہباز مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی؟''

میں چونکا۔ ''کیسی امید؟''

''یہی تم اتنی آسانی سے فتح خان کی چال میں آ جاؤ گے۔''

''جب میں نے تمہیں کال کی تو وہ تمہارے گھر میں تھا؟''

''ہاں اور میرے سر پر بھی سوار تھا۔ یہ جناح سپر میں ملنے والا پروگرام اسی کا تھا۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں تم سے ملنے جاؤں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے چارے کی طرح استعمال کر رہا ہے اور میں ماری جاؤں گی۔''

''تم جانتی ہو اس نے میری بائیک میں ایک سگنل دینے والا آلہ لگا دیا تھا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں جانتی ہوں۔''

''مجھے شبہ ہے ایسا ہی آلہ تمہارے لباس میں ہے۔''

''تو تلاش کر لو۔'' اس نے چیلنج دینے والے انداز میں کہا۔ ''چاہو تو لباس اتار کر تلاش کر لو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''عزت اور حرمت کا مفہوم تم بہت پہلے بھول چکی ہو۔''

ساڑی پہننے کے لحاظ سے مشکل لباس ہے لیکن تلاشی کے لحاظ سے مشکل ترین ہے اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا تھا۔ اس کے جسم کی مکمل تلاشی ایک کٹھن ترین مرحلہ ثابت ہوا تھا۔ وہ مسکراتی رہی اور میں اس سے نظریں چرا تا رہا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ مکمل ہوا تھا۔ مجھے بھی وسیم کی طرح پسینہ آ گیا تھا۔ جب میں پیچھے ہٹا تو اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''بس تلاش کر لیا؟''

''سوری۔'' میں نے معذرت کی۔

''ذرا میرے ہاتھ کھولنا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں صرف تمہیں دکھانا چاہتی ہوں کہ تم احمق انسان ہو۔''

میں نے سوچا اور اس کے ہاتھ کھول دیے۔ اس نے اپنے مختصر سے بلاؤز میں ہاتھ ڈالا اور وہ سکی سی ایک سگنل ڈیوائس نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دی جو اس کے جسم کی گرمی سے گرم ہو رہی تھی۔ میرے ہوش اڑ گئے تھے۔

''یہ تمہارے پاس تھی؟''

''ہاں فتح خان نے مجھے دی تھی۔''

میں نے خود کو سخت احمق محسوس کیا تھا۔ مارے جھجک کے میں نے اس کے جسم کے مخصوص حصوں کی ٹھیک سے تلاشی نہیں لی تھی۔ وہ مسکرائی۔ ''اب بولو ہونا احمق۔''

میں نے ڈیوائس کو دیوار پر دے مارا کیونکہ فرش پر دبیز قالین تھا۔ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اب یہ یقیناً ناکارہ ہو گئی تھی۔ ''تم نے ٹھیک کہا میں واقعی احمق ہوں۔''

''لیکن تم فکر مت کرو میں نے اسے تمہارے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوتے ہی ناکارہ کر دیا تھا۔''

میں چونکا۔ ''وہ کیسے؟''

''میں نے اسے گریبان سے نکال کر منہ میں رکھ لیا اور اس وقت تک رکھا جب تک تھوک اس کے اندر سرکٹ تک نہیں چلا گیا۔ مجھے پتا سا کرنٹ لگا اور یہ ناکارہ ہو گئی۔ یقین

کرنے کے لیے تم چیک کر سکتے ہو۔"

میں نے تکیے سے ہو جانے والی ڈیوائس دیکھی وہ واقعی اندر سے نم ہو رہی تھی۔ "جب اسے ناکارہ بنا دیا تھا تو پھر اپنے پاس کیوں رکھا؟"

"صرف تمھیں یقین دلانے کے لیے کہ میں فتح خان کے ساتھ نہیں ہوں اس کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ پہلے بھی تم نے مجھے اس کے چنگل سے نکالا تھا۔"

ممکن ہے وہ سچ کہہ رہی ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ کوئی چکر ہو۔ "جب تک تمہاری تصویریں فتح خان کے پاس ہیں تم اس سے کس طرح بغاوت کر سکتی ہو؟ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ تم نے اسے دھوکا دیا ہے تو وہ ان تصویروں کی ہزاروں کاپیاں بنا کر شہر بھر میں بانٹ دے گا۔"

"میں مجبور ہوں یہ رسک لینے پر۔ مجھے یقین ہے وہ کبھی میری جان نہیں چھوڑے گا۔"

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"تم مجھے اس سے بچاؤ میں لاکر تک رسائی میں تمہاری مدد کروں گی۔" اس کا لہجہ سرگوشی آمیز ہو گیا تھا۔ "یقین کرو میں نے سارا پلان بنا لیا ہے اور فتح خان کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ میں ڈاکوؤں کی طرح بینک میں گھس کر لاکر کھولوں گی۔"

میں چونکا۔ "تب تمہارا کیا پلان ہے؟"

"یہ میں تمھیں اسی صورت میں بتا سکتی ہوں جب تم فتح خان سے میری جان چھڑا دو گے۔"

"فتح خان سے تمہاری جان صرف ایک صورت میں چھوٹ سکتی ہے کہ تمہاری تصویریں تمھیں واپس مل جائیں۔ میں اس سے تصویریں کیسے نکلوا سکتا ہوں۔"

"وہ اس وقت تم سے کوئی بات منوانے کے لیے مرا جا رہا ہے، اگر تم اس سے کہو کہ وہ میری تصویریں واپس کر دے تو وہ کر دے گا۔ ویسے بھی اسے مجھ سے یا اس بینک لاکر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا لیکن اس سے پوچھا۔ "یہ بات تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"اس نے لاکر کے بارے میں کبھی زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی بلکہ وہ اس کے بارے میں بات بھی نہیں کرتا ہے، اگر میں بات کروں تو جواب دیتا ہے اور بس۔"

"تب وہ تمہاری کوٹھی میں کس لیے براجمان ہے؟"

شہلا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہو وہ کس لیے میرے پاس رکا ہوا ہے۔"

"کیا اس وقت بھی وہ تمہاری کوٹھی میں ہے؟"

"نہیں جب اس نے مجھے تمہاری طرف بھیجا تھا تو اس کے فوراً بعد وہ کوٹھی سے چلا گیا تھا۔"

"کیسے چلا گیا کیونکہ میرا آدمی تمہاری کوٹھی کی نگرانی کر رہا تھا اور اس نے سوائے تمہارے چوکیدار، ملازمہ اور تمہارے کسی کو نہیں دیکھا۔"

"فتح خان بہت چالاک ہے، اس نے جان لیا تھا کہ تمہارا آدمی کہاں سے کوٹھی کی نگرانی کر رہا ہے اس نے آنے جانے کے لیے کوٹھی کے پیچھے والا حصہ چن لیا۔ وہیں سے دیوار پھلانگ کر وہ اور اس کے ساتھی آتے جاتے تھے۔"

میں نے خود کو ایک بار پھر احمق محسوس کیا تھا۔ فتح خان جیسے چالاک آدمی کے سامنے میں نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "کیا یہ بھی فتح خان کی چال نہیں ہو سکتی؟"

"کون سی چال؟"

"یہی کہ تم اس کی ہدایت کے مطابق میرا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔" اس نے تسلیم کیا۔ "میں تمھیں کسی طرح یقین نہیں دلا سکتی ...... ہاں تم اپنے طور پر جس طرح چاہے اطمینان کر لو۔"

"ممکن ہے فتح خان نے تمھیں بھی ڈبل کراس کیا ہو۔ وہ اپنے سائے پر بھی بھروسا کرنے والا شخص نہیں ہے۔ اس نے ڈیوائس دینے کے بعد بھی تعاقب کے لیے اپنے آدمی بھیجے ہوں۔"

"وہ ایسا کر سکتا ہے اس کے پاس کئی خطرناک لوگ ہیں۔" اس نے تسلیم کیا۔ "لیکن یہ دیکھنا تمہارے آدمی کا کام تھا۔"

ایاز اور وسیم کو یقین تھا کہ کسی نے ان کا تعاقب نہیں کیا ہے۔ میں نے اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن ابھی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں اگر تم نے سچ بولا ہے تم اس کے فائدے سے محروم نہیں رہو گی لیکن اگر تم نے ذرا بھی جھوٹ بولا ہے تو یقین کرو تمھیں اس کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑے گا۔"

"میں نے ذرا بھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ اور منہ کھول دیا تھا۔ اس دوران میں اس نے پاؤں بھی کھول لیے۔ "دوسرے تم جس جگہ ہو یہاں دور دور تک کوئی تمہاری آواز و فریاد سننے والا نہیں

اس لیے مہربانی کر کے چپ کر کے بیٹھنا ورنہ بلاوجہ تمہارا منہ پھر بند کرنا پڑے گا۔"

"میں آواز نہیں نکالوں گی۔" اس نے یقین دلایا۔ "لیکن پلیز سردی بہت ہے مجھے کچھ اوڑھنے کو دو اور مجھے بھوک بھی لگی ہے۔"

"تمھیں سب ملے گا بہ شرطیکہ تم بھی تعاون کرو۔" میں نے کہا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ تینوں میرے منتظر تھے۔ میں نے مناسب الفاظ میں ان کو شہلا کی کہانی سے آگاہ کیا۔ سفیر نے سنتے ہی کہا۔

"فراڈ کر رہی ہے یہ عورت۔"

"لیکن ہو سکتا ہے سچ کہہ رہی ہو۔" وسیم بولا۔ "شہباز صاحب نے دیکھ لیا تھا کہ سگنل ڈیوائس اندر سے بھی گیلی ہے۔"

"ممکن ہے یہ کام اس نے ابھی کیا ہو اور اب ہمیں بے وقوف بنا رہی ہو۔" سفیر نے دلیل دی۔

"تیری بات قابل غور ہے۔ اب ہمیں ہوشیار رہنا ہو گا اگر فتح خان کے آدمی یہاں تک آ چکے ہیں تو ہمیں یہاں سے فرار ہونا پڑے گا۔"

"مجھے یقین ہے کوئی پیچھے نہیں آیا تھا۔" ایاز نے کہا۔ "لیکن اگر ڈیوائس نے کام کیا ہے تو وہ لوگ یہاں بھی آ سکتے ہیں۔"

"تم اور وسیم جا کر اوپر سے آس پاس کا معائنہ کرو۔" میں نے ایاز سے کہا۔ "ہمارے پاس ایک عدد نائٹ وژن گلاس بھی ہے۔"

"ہاں ہے۔" وسیم بولا۔ "میں ساتھ لے آیا تھا۔"

"اس کی مدد سے دیکھو کیونکہ باہر اس وقت مکمل تاریکی ہے۔"

اس علاقے میں ابھی نئی نئی آبادی ہوئی تھی اور سڑکیں بن گئی تھیں لیکن ابھی اندر اسٹریٹ لائٹس نہیں لگی تھیں۔ مکان کے آس پاس تو مکمل اندھیرا تھا۔ میں نے جا کر کچن میں بچا ہوا کھانا نکالا۔ اس دوران میں سفیر دودھ گرم کر رہا تھا۔ یہ سامان کے ساتھ آیا تھا۔ ہم کھانے پینے کا پورا سامان لائے تھے اور عجلت میں وہاں سے نکلنا پڑا تو یہ سارا سامان بھی ساتھ لے آئے تھے۔ میں نے منرل واٹر کی ایک چھوٹی بوتل بھی لے لی تھی۔ یہ چیزیں لے کر شہلا والے کمرے میں آیا۔ اس کے ساتھ بھی باتھ روم اٹیچ تھا اور وہ باتھ روم میں تھی۔ میں نے دروازہ بجایا تو اس نے اندر سے کہا۔

"ایک منٹ بس آ رہی ہوں۔" وہ جلد نکل آئی۔ "کب سے بند تھی اس سردی میں ...... شکر ہے تم نے کھول دیا۔"

"یہ کھانا کھاؤ جب تک میں کمبل لاتا ہوں۔" میں نے برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بہت بھوکی تھی اس لیے کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔ میں اسے کھاتا چھوڑ کر باہر آیا تو وسیم اور ایاز آ چکے تھے۔

"آس پاس دور دور تک سوائے چند آوارہ کتوں کے اور کوئی نہیں ہے۔" وسیم نے بتایا۔

"مجھے تو آس پاس کے گھر بھی آباد نہیں لگ رہے ہیں چند ایک میں روشنیاں ہیں بس۔" ایاز نے کہا۔

"یہ اچھی بات ہے جتنی کم آبادی ہو گی ہمارے لیے اور بھی آسانی ہو گی۔ اسٹیٹ والے نے چالاکی سے کام لیا اور تیار گھروں کو بھی آباد کہہ دیا اس طرح اس نے مکان کی ویلیو بڑھا لی۔"

"لیکن اس کرائے میں برا نہیں ہے۔" وسیم نے دودھ نوشی کرتے ہوئے کہا۔ اسے بچپن سے سونے سے پہلے دودھ پینے کی عادت تھی۔ اکثر میں اور سوہا مل کر اس کا مذاق اُڑاتے تھے کہ بابا کے سونے کا ٹائم ہو گیا ہے اب اس کا فیڈر لایا جائے۔

"ہمارے لحاظ سے تو بہت اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ سفیر نے کمرے میں ہیٹر لگا کر آن کر دیا تھا۔ گیس کا کنکشن موجود تھا۔ دس منٹ میں کمرا معقول حد تک گرم ہو گیا تھا۔ سب نے اپنے اپنے سونے کی جگہیں منتخب کر لی تھیں اور طے پایا کہ باری باری سب جاگ کر پہرہ دیں گے۔ پہلا نام سفیر کا نکلا تھا۔ کمبل خاصے تھے ان میں سے ایک بھاری کمبل اور تکیہ لے کر میں شہلا والے کمرے میں آیا۔ وہ کھانا کھا کر خود میں سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی لیکن اب اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ کمبل دیکھ کر وہ اچھل اٹھی۔ میں نے تکیہ اور کمبل اس کی طرف اچھال دیا اور برتن اٹھا لیے البتہ پانی کی بوتل وہیں چھوڑ دی تھی۔

"شکریہ میں سردی سے مر رہی ہوں۔"

"لیکن ایسا لباس پہننے سے باز نہیں آؤ گی۔"

"مجھے عادت ہے اور اگر میری شال ہوتی تو واقعی سردی نہیں لگتی۔" اس نے جواب دیا اور کمبل لے لیا۔

"گڈ نائٹ۔" میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ سفیر کو جاگنا تھا اس لیے اب وہ کافی بنا رہا تھا۔ تین گھنٹے بعد وہ ایاز کو جگا دیتا اور اس کے تین گھنٹے بعد میری باری تھی۔ میں کمبل میں

گھسا اور فوراً ہی سو گیا تھا۔ بھاگ دوڑ اور اعصابی کشیدگی نے تھکا دیا تھا۔ خلاف توقع کسی نے مجھے نہیں جگایا اور میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ ہیٹر نے ایسی گرمی پیدا کر دی تھی کہ رات کو سردی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر سفیر یا کسی اور نے ایک بالٹی میں پانی بھی لا کر رکھ دیا تھا تا کہ کمرے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ جمع نہ ہو۔ ہیٹر جلنے سے کمرے کی آکسیجن کاربن ڈائی آکسائیڈ میں بدل جاتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے کمرے میں پانی سے بھری کوئی چیز رکھنا پڑتی ہے۔ پانی کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کر لیتا ہے۔ یوں دم گھٹنے والی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ہے۔ سفیر ناشتا بنا رہا تھا اسے اور ایاز کو کھانے بنانے کا تجربہ تھا۔ واش روم سے آ کر میں نے سب سے پہلے عبداللہ کو کال کی۔

''شہباز صاحب کیسے ہیں؟''

''فائن۔'' میں نے کہا۔ ''رات سب ٹھیک رہا تھا؟''

''ایک دم جناب، میں نے اپنے آدمیوں کو چوکنا کر دیا تھا اور سڑک والا کیمرا خاص طور سے دیکھا تھا لیکن نہ تو کوئی مشکوک فرد نظر آیا اور نہ ہی کوئی گاڑی یہاں سے گزری۔''

''یہ اچھا ہوا۔'' میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''ممکن ہے آج میں کسی وقت چکر لگاؤں تو راجا صاحب سے بات کروں گا۔''

''کل رات بات ہو چکی تھی اور راجا صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ آرام کر رہے تھے۔''

''کیا ہوا انہیں؟''

''معلوم نہیں۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔ ''بیگم صاحب نے بتایا نہیں لیکن انہوں نے عجلت میں حکیم صاحب کو واپس بلا لیا ہے۔ میں نے کل ہی ان کو ہیلی کاپٹر سے بھیجا ہے۔''

مجھے تشویش ہوئی تھی حکیم صاحب کے جانے کا مطلب تھا کہ راجا کی بیماری عام نوعیت کی نہیں ہے۔ ''ٹھیک ہے، میں آنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے اس نوجوان سے پوچھ گچھ بھی کرنا ہے۔''

''میں اسے تیار رکھوں گا۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''جب آپ آئیں گے تو وہ فوراً آپ کے سوالوں کا جواب دے گا۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور پھر سفیر کو ناشتے کی ٹرے لاتے دیکھ کر فون بند کر دیا۔ ناشتے میں سکے ہوئے توس اور تلے اور ابلے ہوئے انڈے تھے۔ ایاز حلوہ پوری بھی لے آیا تھا۔ میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ وسیم اور سفیر ناشتا کر چکے تھے۔ ایاز نہا رہا تھا وہ آ کر میرے ساتھ شامل ہو گیا۔ سردی سے اس کا برا حال تھا کیونکہ یہاں گیزر نہیں تھا اور اسے روز نہانے کی عادت تھی۔ ناشتا کرنے کے بعد مجھے شہلا کا خیال آیا۔

''اس کے لیے کچھ بچایا ہے یا سب ختم کر دیا ہے۔''

''یہ تھوڑا بہت۔'' سفیر نے بتایا۔ ''لیکن میرا خیال ہے وہ ناشتا ہلکا کرتی ہو گی اس لیے گزارا ہو جائے گا۔''

وہ کپ چائے پی کر میں نے شہلا کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ بدستور کمبل میں لپٹی سو رہی تھی اور میں نے آس پاس دیکھا تو لاحول پڑھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ساڑی اتار کر رہی تھی اور بکھری ساڑی کے دوسرے لوازمات موجود تھے نہیں میں لے جانے کی کوشش نہیں کی اور ناشتے کی ٹرے قالین پر رکھ کر اسے آواز دی۔ ''اٹھ کر ناشتا کر لو ورنہ دیر کی تو چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

گرم چائے کا سنتے ہی کمبل سے اس کا بازو نمودار ہوا۔ شانے تک اس پر بلاؤز کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ''پلیز یہ چائے دے دو۔''

''بہتر ہو گا خود لے لو اور جامے میں آ جاؤ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ اسی پر تمہاری زندگی اور آزادی کا دارومدار ہو گا۔'' میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ اس وقت مجھے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ میں مرشد کے خلاف حرکت میں آنا چاہتا تھا اور فتح خان ایک بار پھر راہ کا روڑا بن گیا تھا۔ شہلا میرے پاس بے کار نہیں تھی کیونکہ اب میں اس سے کچھ اگلوا نہیں سکتا تھا وہ پہلے ہی تعاون کر رہی تھی اور اس میں کوئی چال بھی تھی تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ ایاز، سفیر اور وقار گولا بارود والا بکس اندر لا رہے تھے۔ یہ خاصا وزنی تھا۔ تیسرے بیڈ روم میں رکھا گیا تھا۔ اسلحے والا بکس تی الحال عبداللہ کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن ہمارے پاس ہر طرح کا اسلحہ اور ایمونیشن وافر مقدار میں موجود تھا اور ضرورت پڑنے پر ہم کسی فوج کا بھی مقابلہ کر سکتے تھے۔ یہ کام نمٹا کے بعد میں نے ان کو اپنا خیال بتایا۔

''میں شہلا سے بات کرنے جا رہا ہوں اس کے پاس لاکر تک رسائی کا کوئی ایسا پلان ہے جس میں شاید زبردستی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''کیا فتح خان کو اس پلان کا علم نہیں ہو گا؟'' وسیم نے پوچھا۔

''شہلا کا کہنا ہے کہ اس نے فتح خان کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔''

''اور وہ ہو گیا؟'' سفیر نے طنز کیا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ وہ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔''

''ابھی اس سے سب انٹرویو کریں گے تو حقیقت سامنے آ جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگ اس سے جاذب نظر رکھو گے اور میں نرمی سے بات کروں گا۔''

سفیر نے برا سا منہ بنایا۔ ''یعنی تم ہمیں ولن بنا کر خود ہیرو بن جاؤ گے؟''

میں ہنس دیا۔ ''جب کہہ رہا تھا کہ اس سے بات کرو تو اس وقت کیوں نہیں گئے تھے؟''

''بس بعض اوقات عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔''

''شادی کے بعد عقل کو ایسی ہی بری بری سوجھتی ہے۔'' وسیم نے جملہ کسا تو سفیر نے اسے گھورا۔

''جناب بھول رہے ہیں آپ بھی شادی شدہ ہیں۔''

''نکاح شدہ۔'' وسیم نے سرد آہ بھر کر تصحیح کی۔

''میرا خیال ہے تم دونوں رہنے دو میں اور ایاز جاتے ہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ایاز تمہیں خواتین کو ڈرانے دھمکانے کا کوئی تجربہ ہے؟''

''بالکل بھی نہیں جناب۔'' اس نے کہا۔ ''میں کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''تم بھی بچھو یاد لگتا ہے اس کام کے لیے مجھے فتح خان کے کسی آدمی کی خدمات حاصل کرنا پڑے گی۔''

میں شہلا کے کمرے میں آیا تو وہ ناشتا کر چکی تھی اور ساڑی بھی پہن لی تھی۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ ''مجھے رات کو کپڑے اتار کر سونے کی عادت ہے۔''

''یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''بہرحال یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے اب ذرا کام کی بات ہو جائے۔''

اس نے ہاتھ سے اپنے شولڈر کٹ ریشمی بال سنوارے۔ ''کہو میں سن رہی ہوں۔''

''تم نے لاکر تک رسائی کا کیا پلان بنایا ہے؟''

''میں نے کہا نا میں تمہیں اس وقت بتاؤں گی جب تم فتح خان سے وہ تصویریں مجھے واپس دلا دو گے۔''

''فتح خان میری پہنچ سے باہر ہے۔''

''تب میں کیا کر سکتی ہوں۔''

''شہلا..... میرا اصل نشانہ مرشد ہے اور میں اس کے پیچھے بہت سنجیدہ ہو چکا ہوں لیکن تم اور فتح خان بار بار میرے راستے میں آ جاتے ہو۔''

''میں نے کبھی تمہارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔''

''تم اس لاکر کے چکر میں ہو جس میں میرا ایر ہیڈ کیس موجود ہے۔''

''اسی لاکر میں میری تصویروں کے نیگیٹو بھی ہیں۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''ہاں تم فتح خان کے بارے میں کہہ سکتے ہو کہ وہ مستقل تمہاری راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے۔''

''اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو تو یہ معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ فتح خان سے تمہاری تصویریں واپس دلانے کی پوری کوشش کروں گا۔ حالانکہ اب فتح خان مجھ سے دشمنی ختم کرنے پر بھی آمادہ ہے۔ ایک بار قبضے میں آنے کے باوجود اس نے مجھے چھوڑ دیا۔''

''یہ اس کی چالاکی ہے وہ تمہارے تمام ساتھیوں تک رسائی چاہتا ہے میں نے خود سنا ہے وہ تمہاری ساتھی عورتیں قبضے میں لینا چاہتا ہے تا کہ تم سے اپنی بات منوا سکے۔''

میں جانتا تھا وہ درست کہہ رہی تھی لیکن میں نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔ ''تم فتح خان کو چھوڑو اپنی بات کرو۔''

''میں کیا بات کروں؟''

''تم مجھے بینک لاکر تک رسائی کا پلان بتاؤ۔''

''تا کہ تم لاکر خالی کر دو اور میرے ہاتھ کچھ نہ آئے؟'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''کیا صورت سے میں تم کو اتنی احمق نظر آتی ہوں؟''

''نہیں تمہاری چالاکی اور مکاری میں مجھے کبھی شبہ نہیں رہا..... اگر تم نے ایک اچھا پلان بنا لیا ہے تو مجھے بتا دینے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اس پر عمل درآمد کے لیے تمہارا سامنے ہونا ضروری ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں تم نے ٹھیک کہا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''اس لیے تم اگر مجھے مطمئن کرنے کے لیے اپنا پلان بتا بھی دو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''تم اسی انداز میں کام کر کے خود کامیابی حاصل کر سکتے ہو۔''

''جب مجھے ایک تیار پلان مل رہا ہے تو میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس پر عمل کیوں نہیں کروں گا۔''

''یہی بات ہے مجھے تم پر یا کسی پر اعتماد نہیں ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''حالانکہ اعتماد تو مجھے نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تم نے

ہمیشہ مجھے دھوکا دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "بہرحال یہ ماضی کی بات ہو چکی ہے اب مجھے ہر صورت اس معاملے کو حل کرنا ہے اور اگر تم فتح خان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں میری مدد چاہتی ہو تو تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔ ورنہ میں مجبور ہو جاؤں گا۔"

"کس بات پر مجبور ہو جاؤ گے؟"

"تمہیں فتح خان کے حوالے کرنے پر۔"

وہ چونکی۔ "تم مجھے اس کے حوالے کر دو گے؟"

"مجبوری ہے میں یہاں رکھ کر تمہارا اچار ڈالنے سے تو رہا۔ میرے ساتھیوں کی ایک تجویز اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ تمہیں گولی مار کر اسی جگہ دفن کر دیا جائے۔ لاکر والا کام ہم خود بھی کر سکتے ہیں۔"

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "تم مذاق کر رہے ہو تم لوگ اتنے بے رحم نہیں ہو سکتے؟"

"یہ تمہارا خیال ہے۔" میں کھڑا ہو گیا۔ "تمہارے پاس سوچنے کے لیے آج کا دن ہے۔"

میں باہر آیا ایاز کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"کچھ سامان لانا ہے۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے مجھے عبداللہ کی کوٹھی کے پاس اتار دینا۔"

"وہاں کیوں جا رہے ہو؟" سنیر نے پوچھا۔

"فتح خان کے آدمی سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔" میں نے کہا۔ "شہلا تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں ہے میں نے اسے آج تک سوچنے کی مہلت دی ہے۔ آج اسے کھانے پینے کو کچھ مت دینا اور اگر شور کرے تو باندھ کر ڈال دینا۔"

ایاز کی جیپ سے سارا سامان اتار دیا گیا تھا۔ ہم روانہ ہوئے تو میں نے اس سے راستے میں پوچھا۔ "پاتنگ کی دوسری نمبر پلیٹس کہاں ہیں؟"

"پاتنگ کے اوزاروں والے خانے میں..... دوسری گاڑیوں کی نمبر پلیٹس ان میں موجود ہیں۔ کسی وقت بھی تبدیل کی جا سکتی ہیں۔"

ایاز نے مجھے ایک ایسی جگہ اتار دیا جہاں سے میں عبداللہ کی کوٹھی تک جانے کے لیے ٹیکسی لے سکتا تھا۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے میں نے ایک سیلون سے اپنے بے ہنگم ہو جانے والے بال بنوانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے باربر سے کہا کہ وہ سر پر موئی مشین پھیر دے۔ پھر میں نے بڑی مونچھ پر بھی مشین پھروا دی۔ باربر نے احتیاط سے قلموں کے آس پاس کے بالوں کو ایک مخصوص شکل دی اور جب میں نے آئینے میں دیکھا تو خود کو خاصا مختلف پایا تھا۔ میرے دشمن جس سرگرمی سے میری تلاش میں تھے تو ضروری ہو گیا تھا کہ میں بار بار حلیہ بدلتا رہوں۔ ٹیکسی کر کے میں عبداللہ کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہنچنے سے پہلے..... موبائل پر اطلاع کر دی تھی کہ میں آ رہا ہوں۔

موتا اور سعدیہ کو بھی پتا چل گیا تھا اور وہ باہر لان میں میری منتظر تھیں۔ اور بیتا ابھی سو رہا تھا۔ وہ میرا حلیہ دیکھ کر کھلکھلا ہوئی تھیں۔ کچھ دیر ان کے ساتھ گپ شپ کر کے میں اندر عبداللہ کے پاس آیا۔ "زخمی نوجوان کیسا ہے؟"

"زخم تو ٹھیک ہے لیکن کچھ دوسری ٹریٹ منٹ کی ہے۔" عبداللہ مسکرایا۔ "اس نے زبان کھولی ہے۔ اپنا نام حماد بتاتا ہے اور اس کا تعلق فتح خان کے علاقے سے ہے۔ یہاں مجرمانہ سرگرمیوں میں اس کا ساتھ دے رہا ہے۔"

"آؤ ذرا اس سے ملاقات کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور ہم کچن والے راستے سے اتر کر تہ خانے میں آئے جہاں حماد کمرے میں قید نہیں تھا بلکہ عبداللہ نے اسے ایک طرف دیوار کے ساتھ دونوں ہاتھ فولادی زنجیروں میں جکڑ کر یوں کھڑا کیا ہوا تھا کہ جب وہ تھک جاتا تو ہاتھوں کے بل جھول جاتا اور جب ہاتھوں پر ناقابل برداشت دباؤ آتا تو مجبور کھڑا ہو جاتا۔ خاص طور سے زخم والے ہاتھ پر۔ اس کلائیوں سے کھال چھل گئی تھی اور وہ کھڑا ہوا جھول رہا تھا عبداللہ کو دیکھتے ہی وہ بلبلا یا تھا۔

"خدا کے لیے ہم کو کھول دو۔"

"بکومت۔" عبداللہ نے غرا کر کہا۔ "کیا تم خدا کے لیے یہ سب کرتے ہو؟"

میں اس کے پاس آیا اور اس کے بال مٹھی میں لے لیے۔ "اگر تم شرافت سے کچھ سوالوں کے جواب دو تو تم کو کھولا جا سکتا ہے۔"

"پوچھو ہم کو جو معلوم ہے وہ بتائے گا۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "پانی ملے گا۔"

ایسا لگ رہا تھا جیسے عبداللہ نے اس کا کھانا پانی بھی بند کر رکھا تھا۔ یہ بہت موثر حربہ ہوتا ہے۔ بھوک اور پیاس آدمی کی مزاحمت کو بہت جلد ختم کر دیتی ہیں۔ میں نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ "فتح خان کہاں ہے؟"

"ہم کو نہیں معلوم..... ہم کہیں اور رہتا ہے جب سے کام ہو تو ہم کو بلواتا ہے۔"

"کیسے بلواتا ہے؟"

"فون کر کے..... موبائل پر فون کرتا ہے۔"

"تمہارے پاس سے کوئی موبائل فون نہیں نکلا۔"

"جب ہم کسی کام سے جاتا ہے تو موبائل چھوڑ کر جاتا ہے۔"

"تم فتح خان کے لیے کیا کام کرتے ہو؟"

"جو وہ کہتا ہے۔ کسی کو اٹھانا، مارنا پیٹنا اور جو وہ کہے۔"

"اس کوٹھی کے باہر تم کیا کر رہے تھے؟"

"ہم کو کہا تھا کہ ادھر نگرانی کرنا ہے اور جو شاہ نواز کہے وہ کرنا ہے۔"

"شاہ نواز کون ہے؟"

"وہ فتح خان کا قریبی آدمی ہے، آگے والی سڑک پر گاڑی میں بیٹھا تھا۔"

میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "تم نے ہمیں کوئی کام کی بات نہیں بتائی ہے اس لیے نہ تو تمہیں کھولا جائے گا اور نہ کھانا پانی ملے گا۔ تم یونہی کھڑے رہو گے اور اسی طرح مر جاؤ گے۔"

میں اور عبداللہ جانے کے لیے مڑے تو اس نے چلا کر کہا۔ "رکو..... میں ایک چیز بتا سکتا ہوں، مجھے فتح خان کا موبائل نمبر یاد ہے۔"

عبداللہ نے موبائل نکالا اور کہا۔ "بتاؤ۔"

اس نے نمبر بتایا جو عبداللہ نے اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے ابھی تمہیں کھول دیا جائے گا اور پانی بھی مل جائے گا لیکن اگر یہ نمبر غلط نکلا تو....."

"یہ اسی کا نمبر ہے مجھے اسی نمبر سے کال آتا ہے۔"

میں اور عبداللہ باہر آئے۔ اپنے آدمیوں کو حماد کے بارے میں ہدایات دے کر عبداللہ میرے ساتھ کنٹرول روم میں آیا جہاں منیر بیٹھا مانیٹرز کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "کیسے ہیں شہباز صاحب؟"

"فائن تم سناؤ۔"

"ٹھیک ہوں کوئی خدمت سر؟"

"یار کافی لے آؤ۔" عبداللہ نے کہا تو وہ چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ عبداللہ کچھ فکر مند تھا اور بہ ظاہر معمول پر رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہمارے جانے کے بعد کوئی اہم بات سامنے آئی؟"

"نہیں ہر چیز معمول پر رہی ہے جناب۔" اس نے کہا۔ "آج میں نے بیٹے کے آئی ڈی کارڈ کے لیے بات کر لی ہے۔ امید ہے آنے والے دس پندرہ دن میں بن جائے گا۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے؟"

عبداللہ چونکا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا کہ کوئی مسئلہ ہے۔"

"یار آدمی اتنے عرصے دشمنوں کے ساتھ رہے تو اسے بھی جان جاتا ہے تم تو دوست اور ساتھی ہو۔"

اس نے اعتراف کرنے کے انداز میں سر ہلایا۔ "مجھے کچھ پریشانی ہے بگی بیگ صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے راجا صاحب کے محل تک آنے کا بندوبست کیا جائے۔"

میں چونکا "مجھ سے پوچھے بغیر؟"

"میں نے بھی یہی کہا تھا لیکن بیگ صاحب نے حکم دیا ہے کہ میں انتظام کروں آپ سے راجا صاحب خود بات کر لیں گے۔"

"تو تم نے انتظام کر لیا ہے؟"

"ملازم آدمی کو حکم تو ماننا پڑتا ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "وہی بگی کا پیر ہارڈ کیا ہے جو حکیم صاحب کو دے کر گیا تھا۔"

"اب راجا صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میرا خیال ہے بہتر ہے حکیم صاحب نے ان کا علاج شروع کر دیا ہوگا۔ پہلے میں ان حکیموں کا قائل نہیں تھا لیکن پہلے آپ کا ہاتھ اور پھر حکیم کو جس طرح موت کے منہ سے واپس کھینچ لیا اس سے میں قائل ہو گیا ہوں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ راجا عمر دراز مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ اس وقت میں یہاں کئی معاملات میں پھنسا ہوا تھا۔ ابھی مجھے مرشد سے پہلے فتح خان اور پھر شہلا والے معاملے سے بھی نمٹنا تھا۔ اگر سے بریف کیس حاصل کرنا تھا میں یہاں سے نہیں جا سکتا تھا۔ مگر دوسری طرف راجا عمر دراز کو صاف جواب دینا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ آخر میں نے گہری سانس لی۔

"عبداللہ راجا صاحب کو کال ملاؤ۔"

اس نے انٹرنیٹ سے منسلک سیلا ئیٹ فون اٹھایا اور راجا عمر دراز کے محل کال کرنے لگا۔ کال ظاہر ہے بیگ نے ریسیو کی تھی۔ عبداللہ نے کہا۔ "شہباز صاحب یہاں موجود ہیں راجا صاحب سے بات کرنا چاہیں گے۔"

دوسری طرف سے سن کر عبداللہ نے کال کاٹ دی اور میری طرف دیکھا۔ "راجا صاحب دس منٹ بعد ملیں گے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''عبداللہ کیا بات ہے کیا بیگ صاحب نے ہمارے بارے میں اور کچھ بھی کہا ہے؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن مجھے آپ سے یہ کہنا بھی عجیب لگ رہا ہے۔''

''تم فکر مت کرو۔ راجا صاحب میرے محسن بھی ہیں، ان کی پشت پناہی ہمیشہ میرے کام آئی ہے۔ میرا ہاتھ ان کی وجہ سے بچا اور سب سے بڑھ کر حسن کی جان بچ گئی۔ عبداللہ میں احسان فراموش انسان نہیں ہوں اور یہ سب نہ ہوتا تب بھی راجا صاحب میں کچھ ایسی باتیں ہیں جن کی وجہ سے میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ اس لیے تم اس بات کو بالکل بھی دل پر مت لو۔ میں راجا صاحب کی بات سن سکتا ہوں لیکن مجھے کیا کرنا ہے اس کا فیصلہ میں اپنے حالات دیکھ کر ہی کروں گا۔''

عبداللہ نے گویا سکون کا سانس لیا۔ ''یہی میں بھی چاہتا ہوں آپ جو چاہیں وہی کریں۔''

دس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی اور عبداللہ نے کال ریسیو کی اور پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ دوسری طرف راجا عمر دراز تھا میرے سلام کا جواب دے کر اس نے شفقت بھرے انداز میں کہا۔ ''شہباز میرے بیٹے کیسے ہو؟''

اس سے پہلے راجا عمر دراز نے کبھی مجھ سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ ''اللہ کا شکر ہے راجا صاحب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اب بہتر ہے، شہباز میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''راجا صاحب میں یہاں کچھ اہم معاملات میں الجھا ہوا ہوں ان سے فارغ ہوتے ہی آپ کے پاس حاضری دیتا ہوں۔''

''نہیں بیٹے میں تم سے ابھی ملنا چاہتا ہوں، یہ بہت ضروری ہے۔''

میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''راجا صاحب آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ دشمن مجھے ایک لمحے کو سانس لینے کی مہلت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھیوں اور پیاروں کے درپے ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ حکم دیتے ہیں تو میں ابھی آنے کے لیے تیار ہوں۔''

''بیٹے میرا یعنی راجا عمر دراز کا حکم نہیں ایک بوڑھے باپ کی التجا ہے جب وہ کمزور ہوتا ہے تو اسے اپنے بیٹے کے بازوؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو یوں سمجھ لو کہ مجھے تمہارے مضبوط بازوؤں کی ضرورت ہے۔''

''اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو میں حاضر ہوں۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے۔'' وہ خوش ہو گیا۔ ''میں چاہتا ہوں تم جلد از جلد آجاؤ میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں تیار ہوں اب یہ عبداللہ پر ہے کہ مجھے کب روانہ کرتا ہے۔''

''اس نے انتظامات کر لیے ہیں۔'' راجا عمر دراز نے کہا۔ ''اگر تم ابھی آ سکتے ہو تو آجاؤ ورنہ کل آجاؤ۔''

''یہ تو آپ کو عبداللہ بتا سکتا ہے۔'' میں نے کہا اور فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے فون لے کر... راجا عمر دراز سے بات کی اور پھر فون رکھ کر میری طرف متوجہ ہوا۔

''ابھی دن ہے اور بہ ظاہر موسم بھی صاف ہے۔ آپ اگلے دو گھنٹے میں راجا صاحب کے پاس موجود ہوں گے۔ آپ کو لے جانے والا ہیلی کاپٹر وہیں رہے گا اور صبح آپ کو واپس لا سکتا ہے۔''

''تب میں ابھی جانا پسند کروں گا۔'' میں نے کہا۔

یہ سنتے ہی عبداللہ نے موبائل اٹھا کر پائلٹ سے رابطہ کیا۔ ''میں عبداللہ بات کر رہا ہوں، اس وقت پرواز کے لیے حالات کیسے ہیں... ہاں روٹ اور منزل وہی ہے... ٹھیک ہے۔'' اس نے کال کاٹ کر مجھ سے کہا۔ ''وہ ابھی دس منٹ میں کنفرم کر دے گا۔''

میں نے اس سے فتح خان کا سیل نمبر مانگا اور اسے اپنے موبائل سے ملایا۔ اجنبی نمبر دیکھ کر اس نے کال کاٹ دی تو میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔ اس بار اس نے کال ریسیو کر لی۔ ''کون بول رہا ہے؟''

''وہ جس کے پیچھے تم ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔''

''شہباز خان۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تمہیں میرا نمبر حماد نے دیا ہوگا۔''

''تم نے ٹھیک جانا... اس نے صرف نمبر ہی نہیں اور بھی بہت کچھ بتایا ہے اور وہ سب ہم نے ریکارڈ کر لیا ہے۔''

''شوق سے ریکارڈ کر لو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔''

''نہیں فتح خان فرق تو پڑے گا اگر میں نے ریکارڈ شدہ باتوں کے ساتھ تمہارے آدمی کو مرشد کے حوالے کر دیا تو۔''

اس بار وہ چپ ہو گیا تھا پھر اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھیوں سے دور رہو اور اپنے معاملات جس طرح چاہے نمٹاتے رہو۔ اب تمہاری

طرف سے کسی کارروائی کا مطلب کھلی دشمنی ہوگا۔''

''شہباز خان میں نے تم سے صرف مدد مانگی تھی۔''

''تم اگر کہتے کہ میں تمہارے ساتھ چل کر اس داوئی میں ہیرے تلاش کروں تو خدا کی قسم میں تمہارے ساتھ چلتا اگر فوری نہیں تو اپنے معاملات نمٹا کر ضرور چلتا لیکن تم نے مجھ سے جو چاہا تھا وہ میں کبھی بھی نہیں کر سکتا۔ فتح خان عورتوں کے سہارے آگے بڑھنے سے بہتر ہے آدمی مر جائے۔ یہ ناممکن ہے۔''

''ٹھیک ہے میں اب تمہارے کسی آدمی کو نہیں چھیڑوں گا تم حماد کو چھوڑ دو۔''

''وہ میرے پاس بالکل ٹھیک ہے اور میں اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہوں اگر تم شہلا کی تصاویر میرے حوالے کر دو۔ تمہارے پاس کل شام تک کی مہلت ہے اس کے بعد میں حماد کو اس کی گفتگو کی ریکارڈنگ سمیت مرشد کے حوالے کر دوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

عبداللہ کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ ''جناب یہ آپ کا مستقل نمبر ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''تب بہتر ہوگا آپ اسے دوبارہ استعمال نہ کریں بلکہ سم بدل لیں۔ آپ بھول رہے ہیں کچھ عرصے پہلے ڈیوڈ شانے آپ لوگوں کو موبائل فون کی مدد سے ٹریس کیا تھا اور اس وقت فتح خان اس کے ساتھ تھا تو ممکن ہے وہ ڈیوائس اب بھی اس کے پاس ہو۔''

عبداللہ کی بات قابلِ غور تھی۔ میں نے فوری سم تبدیل کر لی اور یہ کرنے کے بعد سفیر وسیم اور ایاز کے نمبروں پر باری باری مس کال بھی دے دی۔ یہ طے تھا کہ کوئی اگر کسی وجہ سے سم تبدیل کرے گا تو وہ تبدیل کی جانے والی سم سے سب کو مس کال دے گا۔ ساری سموں کے نمبرز سب کے موبائلز میں محفوظ تھے۔ اس دوران میں پائلٹ عبداللہ کو اوکے کی رپورٹ دے چکا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''جناب ہمارے پاس تین گھنٹے ہیں شمالی علاقے میں موسم صاف ہے۔''

میں سوچ رہا تھا کہ میں نے راجا کی بات مانتے میں تھوڑی زیادہ ہی جلدی کی تھی مجھے سفیر اور وسیم سے پوچھنا چاہیے تھا۔ میں نے عبداللہ کو رکنے کو کہا اور وسیم کا نمبر ملایا۔ اسے راجا سے ملاقات کے بارے میں بتایا۔

''تمہارا کیا خیال ہے اگر میں ابھی جا کر کل واپس آجاؤں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

''آنے والے وقت کے بارے میں تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن میرا خیال ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا یہاں کے معاملات دیکھنے کے لیے ہم ہیں۔''

میں نے سفیر سے بھی بات کی اور اس نے بھی مخالفت نہیں کی تھی۔ کچھ عرصے سے اکیلے رہ رہ کر مجھے خود فیصلے کرنے کی عادت پڑ گئی تھی اور اسی وجہ سے میں بے اختیار بھی فیصلہ کر جاتا تھا حالانکہ اب میں ساتھیوں کے ہمراہ تھا اور کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے ان کو اعتماد میں لینا چاہیے۔ شکر ہے مجھے بروقت خیال آگیا۔ فون بند کر کے میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''میں تیار ہوں۔''

''بس تو ہم نکلتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن بہتر ہوگا آپ مزید کوئی گرم چیز اور دستانے لے لیں۔ وہاں سردی بہت زیادہ ہے اور درجہ حرارت منفی میں چل رہا ہے۔''

عبداللہ کے پاس ایک ہائی آلٹی چیوڈ جیکٹ، جوتے اور دستانے تھے۔ وہ اس نے مجھے دے دیے۔ میں تیار ہو کر مونا اور سعدیہ کے پاس آیا۔ وہ اپنے کمرے میں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''باتیں۔'' مونا نے منہ بسور کر کہا۔ ''اور کیا ہے یہاں کرنے کو؟''

''کرنے کو تم بہت کچھ کر سکتی ہو، یوں سمجھ لو یہ کوٹھی تمہارے چند اور ہے اگر تم اس کا فرنیچر اور آرائش بدلنے کا کہو گی تو یہ بھی ہو جائے گا۔''

سعدیہ نے میرے لباس سے بھانپ لیا تھا اس نے کہا۔ ''شوبی بھائی آپ کہیں جا رہے ہیں؟''

''ہاں راجا عمر دراز سے ملنے اس کے محل جا رہا ہوں۔''

مونا پریشان ہو گئی تھی۔ ''وہ تو بہت دور ہے اور راستے بھی اس موسم میں خراب ہو جاتے ہیں۔''

''میں ہائی آلٹر جا رہا ہوں۔ ہیلی کاپٹر چارٹرڈ کرایا ہے اور وہ مجھے کل صبح واپس بھی لے آئے گا۔'' میں نے کہا لیکن مونا کی فکر کم نہیں ہوئی۔

''اس موسم میں ہیلی کاپٹر کی پرواز ٹھیک نہیں ہوتی ہے۔''

''اب تو جدید ہیلی کاپٹر آگئے ہیں جو ہر موسم میں پرواز کر سکتے ہیں۔ اسی ہیلی کاپٹر سے حکیم تاؤس آیا اور گیا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''تب ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے؟'' مونا نے مطالبہ کیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے انکار کر دیا۔ ''میں بھی صرف ایک رات وہاں رکوں گا اور کل مجھے واپس آجانا ہے۔ دوسرے وقت بالکل نہیں ہے مجھے سورج غروب ہونے سے قبل راجا عمر دراز کے محل میں پہنچنا ہے۔''

''راجا بہت متاثر کن شخصیت کا مالک ہے۔'' سعدیہ نے کہا تو میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''آتی کا ذہمی اردو......''

وہ شرما کر ہنسی۔ ''میں نے کوشش کرکے سیکھی ہے۔ اب میں سے لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھ رہی ہوں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ اوکے گرتز اجازت ہے۔''

وہ مجھے باہر تک چھوڑنے آئی تھی۔ عبداللہ ایک سیاہ شیشوں والی چھوٹے سائز کی جیپ میں منتظر تھا۔ اس نے وہ مسلح گارڈز بھی لے لیے تھے۔ وہ پچھلے حصے میں بیٹھے تھے۔ میں نے راستے میں ایاز سے رابطہ کیا۔ اسے اپنی روانگی کے بارے میں بتایا اور کہا۔ ''تم کسی کے ساتھ جا کر سفارت لے آؤ لیکن پوری ہوشیاری سے جانا ممکن ہے وہ جیپ میں کوئی ٹریپ لگا گئے ہوں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' میں عبداللہ صاحب سے چیک کرنے والے آلات لے جاؤں گا۔''

میں نے عبداللہ کو کوٹھی میں کھڑی جیپ کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ''میں ایاز کو روک لیتا ہوں آپ کو چھوڑ کر میں خود جاؤں گا میرے پاس چیک کرنے والے آلات بھی ہیں۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔''

دوپہر کا وقت ہو گیا تھا اور ایک بج رہا تھا۔ سردیوں کی وجہ سے دن چھوٹے ہوتے ہیں پائلٹ نے آنے اور جانے کے وقت کا حساب کرکے کہا تھا تاکہ اگر راستے میں کہیں خراب موسم سے واسطہ پڑے تو ہم دن کی روشنی میں واپس آسکیں۔ پائلٹ اپنے ہیلی کاپٹر کے ساتھ تیار تھا یہ کسی قدر بھاری جسم کا اور ادھیڑ عمر شخص تھا۔ یقیناً اس کے پاس فلائنگ کا تجربہ تھا اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''مجھے کیپٹن فراز کہتے ہیں سر۔''

''شہباز ملک۔'' میں نے کہا۔ ''تم پرواز کے لیے تیار ہو؟''

''بالکل جناب۔'' اس نے کہا۔ ''ہمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لگے گا۔''

عبداللہ سے ہاتھ ملا کر میں ہیلی کاپٹر میں سوار ہوا۔ فراز نے ایک ہیڈ فون میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ پہن لیں کیونکہ انجن کا شور دماغ خراب کر دیتا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہیلی کاپٹر اتنا شور کیوں کرتا ہے؟''

''اس کا انجن باڈی کے اندر ہوتا ہے سر۔'' اس نے بتایا اور بٹنوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ ''اس لیے کتنی ہی کوشش کر لی جائے اندر شور ضرور ہوتا ہے۔''

اس نے اسٹارٹ دبایا تو پنکھے گردش میں آگئے تھے۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اس نے جوابی ہاتھ ہلایا اور اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا جو کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ پنکھوں کی گردش میں تیزی آئی تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے ہیلی کاپٹر اوپر اٹھ گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم خاصی بلندی پر تھے۔ کیپٹن فراز ریڈیو پر ائیر ٹریفک کنٹرولر کو اپنی منزل کے بارے میں بتا رہا تھا اور ان سے ہدایات لے رہا تھا۔ میں بھی سن رہا تھا لیکن یہ تکنیکی گفتگو میرے سر پر سے گزر رہی تھی۔ اپنے کام کرکے فراز نے مائک بند کر دیا اور مجھ سے کہا۔

''سر میں نے لنچ لے لیا تھا اگر آپ کو بھوک لگے تو پیچھے بکس میں سب کچھ موجود ہے۔''

مجھے بھوک لگ رہی تھی لیکن اتنی خاص نہیں تھی۔ ''شکریہ کیپٹن فی الحال ضرورت نہیں ہے۔''

''تب آپ کافی لے لیں۔''

بکس میں ایک چھوٹے تھرمس میں کافی اور ساتھ میں سینڈوچ کپ بھی تھے۔ میں نے اپنے اور فراز کے لیے کافی نکالی۔ اس وقت ہم مارگلہ عبور کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ دور مری کی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں اور ان سے پرے ایبٹ آباد کی پہاڑیاں تھیں۔ شمال کی پرپیچ پہاڑوں میں ہیلی کاپٹر کی سیدھی پرواز ممکن نہیں تھی اس لیے ہم پہاڑوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے گزر رہے تھے یہاں بلندی پر موسم کسی وقت بھی خراب ہو سکتا تھا اس لیے پہاڑوں کے درمیان پرواز محفوظ تھی۔ لیکن اس وجہ سے سفر طویل ہو جاتا ہے۔ جو فاصلہ ہیلی کاپٹر ایک گھنٹے میں طے کر سکتا تھا اسے طے کرنے میں ڈیڑھ گھنٹا لگ جاتا۔ اب کشمیر کی برف پوش چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔

''سر ایک گھنٹے کے سفر کے بعد آپ کو نانگا پربت کی جھلک نظر آئے گی لیکن ہم وہاں سے بہت دور سے گزریں گے۔''

''میں نے اس چوٹی کو پاس سے دیکھا ہے اور اس کے رائے فیس پر ہائی کنگ بھی کی ہے لیکن بس چودہ ہزار فٹ تک گیا تھا۔''

''اوہ آپ ہائیکر بھی ہیں۔'' اس نے جوش سے کہا۔ ''میں کچھ عرصے پہلے تک۔ ابھی تو رزم فرم چلاتا ہوں جوڑیا دو تر شمالی علاقے کے لیے ٹور پیکج تیار کرتی ہے۔''

کیپٹن فراز خوش ہو گیا تھا کیونکہ میں اس کا ہم پیشہ نکل آیا تھا۔ وہ بھی سیاحوں کو لے کر شمالی علاقے جاتا تھا۔ وہ بتانے لگا کہ اب تک کہاں کہاں گیا تھا۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد بہت دور نانگا پربت کی ایک جھلک دکھائی دی۔ اگر پاکستان کے شمال میں ایک بھی چوٹی نہ ہوتی سوائے نانگا پربت کے تب بھی ہم اس پر فخر کر سکتے تھے۔ کہنے کو یہ دنیا کی نویں بلند ترین چوٹی ہے لیکن جب کسی کوہ پیما سے پوچھا جائے تو وہ نانگا پربت کو سب سے بلند اور سب سے مشکل چوٹی قرار دیتا ہے۔ کم سے کم ایک درجن مشہور ترین کوہ پیما اس کی برف میں دفن ہیں۔ جیسے ہی نانگا پربت نظروں سے اوجھل ہوئی کیپٹن فراز نے کہا۔

''ہم منزل پر پہنچنے والے ہیں سر۔''

میں نے نیچے دیکھا اور اس وادی کو پہچان لیا جہاں میں برسوں پہلے آیا تھا اور اس کے ایک کی طرح گھومتے دوسرے سرے پر راجا عمر دراز کا محل تھا۔ اب ہیلی کاپٹر اس کی پہاڑیوں سے الگ کر اتر رہا تھا۔ کیپٹن فراز یہاں سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا کیونکہ وہ دو بار پہلے بھی آیا تھا اس لیے اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ چند منٹ بعد ہم راجا عمر دراز کے محل کے ہیلی پیڈ کے اوپر تھے۔ نیچے سیکریٹری بیگ خود استقبال کے لیے موجود تھا اور اس نے ہاتھ سے لینڈ کرنے کا اشارہ کیا۔ جب ہیلی کاپٹر نیچے آیا تو اس کے پنکھوں کی ہوا سے بیگ کا لبادہ پھڑ پھڑانے لگا تھا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ ہوا کا بے پناہ زور اس کے دبلے پتلے جسم کو اٹھا کر پھینک بھی سکتا تھا۔ جیسے ہی ہیلی کاپٹر زمین سے لگا میں نیچے اتر آیا۔ یہاں بے پناہ سردی تھی اور محل میں ہر چیز برف سے ڈھکی ہوئی تھی شاید چند گھنٹے پہلے ہی برف باری ہوئی تھی۔

''کیا حال ہیں بیگ صاحب؟'' میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ حسبِ معمول سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''آئیے میرے ساتھ۔''

''پائلٹ بھی یہیں رکے گا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''مجھے معلوم ہے آپ اس کی فکر نہ کریں۔'' اس نے جواب دیا تو مجبوراً میں اس کے ساتھ اندر آ گیا۔ باہر بے پناہ سردی تھی لیکن اندر موسم کسی قدر بہتر تھا۔ میں نے راستے میں راجا عمر دراز کی طبیعت خرابی کے بارے میں پوچھا تو وہ حسبِ معمول ٹال گیا۔ وہ مجھے مہمان خانے میں لایا تھا۔ ''ابھی راجا صاحب قیلولہ کر رہے ہیں وہ شام کو آپ سے ملاقات کریں گے۔''

میں پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا اس لیے مجھے غصہ نہیں آیا تھا۔ بیگ کا راجا عمر دراز کے معاملات میں وہی کردار تھا جو بیوروکریسی کا اس ملک کے بارے میں ہے یعنی وہ ہر چیز کو ایک مخصوص نظر سے دیکھتے اور فیصلہ کرتے ہیں۔ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں یہ اپنے اندر کوئی تبدیلی نہیں لاتے...... شکر ہے اس نے جانے سے پہلے کھانے کا پوچھ لیا۔

''اگر جلد مل سکے۔''

''تب آپ تازہ دم ہو کر طعام گاہ میں آجائیں۔''

مجھے جس کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا اس کے ساتھ ایک شاندار واش روم بھی تھا اور اس میں پہاڑی چشموں کی خوشبو لیے گرم پانی آرہا تھا۔ میں نے ہاتھ دھو کر بلکہ تازہ دم ہو گیا اور جب مہمان خانے کے کھانے کے کمرے میں پہنچا تو وہاں کھانا لگایا جا رہا تھا۔ کئی طرح کی ڈشیں تھیں اور سب بہترین تھیں اس لیے میں نے سب کے ساتھ انصاف کیا تھا۔ کھانے کے دوران میں مجھے خیال آیا کہ بیگ نے کیا عبداللہ کو اطلاع کر دی ہوگی کہ میں خیر و عافیت سے یہاں پہنچ گیا ہوں۔ اس کا امکان کم ہی تھا کہ بیگ عبداللہ کو اطلاع کرنے کی زحمت کرے کیونکہ اس کے خیال میں وہ ایک معمولی ملازم ہی تو ہے۔ میں نے خدمت پر موجود خادم سے کہا۔

''بیگ صاحب کو اطلاع دو میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''جی جناب۔'' اس نے ادب سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ جب میں کھانا ختم کر چکا تھا تب اس کی واپسی ہوئی۔ ''وہ کہہ رہے ہیں آپ کھانا کھا کر میرے پاس آسکتے ہیں۔''

ہاتھ دھو کر میں اسی خادم کے ساتھ روانہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اب یہاں زیادہ تر مرد تھے اور عورتیں خال خال نظر آرہی تھیں شاید گیگی ملازمہ والے واقعے کے بعد راجا عمر دراز نے جوان اور حسین عورتوں کو محل میں خدمت سے فارغ کر دیا تھا۔ فتح خان نے ایک ایسی ہی ملازمہ کے ذریعے مجھے محل سے نکال لیا تھا۔ بیگ اپنے لیے مخصوص حصے میں تھا یہ شاید اس کا دفتر بھی تھا۔ مجھے اس کے پاس ایک چھوٹا لیکن جدید کمپیوٹر دیکھ کر حیرت ہوئی وہ اس پر کچھ کر رہا تھا۔ اس نے

مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"شہباز صاحب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"مجھے اسلام آباد میں عبداللہ سے بات کرنی ہے۔"

"ضرور جناب۔" اس نے کہا اور میرے ساتھ آنے والے خادم کو اپنی زبان میں کوئی حکم دیا۔ "آپ اس کے ساتھ چلے جائیں۔"

میں خادم کے ساتھ اسی دفتر کے ایک حصے میں آیا جہاں ویسا ہی کنٹرول روم تھا جیسا کہ میں نے عبداللہ کی کوٹھی میں دیکھا تھا فرق صرف یہ تھا کہ یہاں کوئی ایک درجن مانیٹرز تھے اور ان کے سامنے دو نوجوان بیٹھے نگرانی کر رہے تھے۔ یہ مانیٹر محل کے اندر اور باہر کے مختلف مناظر دکھا رہے تھے۔ یقیناً کیمروں کی تعداد ان مانیٹرز کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی کیونکہ ان پر خود بہ خود دوسرے کیمروں کے مناظر بھی آرہے تھے۔ خادم نے ایک نوجوان سے کچھ کہا اور وہ چونک کر جلدی سے اٹھا اور اس نے ادب سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں سر؟" وہ لہجے سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔

"مجھے اسلام آباد عبداللہ سے بات کرنی ہے۔"

یہاں بھی سیٹلائیٹ فون کا مکمل سسٹم موجود تھا۔ اگرچہ یہ چاہتے تو انٹرنیٹ کی مدد سے کہیں سستا رابطہ کر سکتے تھے لیکن راز داری کے نقطہ نظر سے انہوں نے نہایت مہنگا سیٹلائٹ فون لے رکھا تھا۔ نوجوان نے مجھے کال ملا کر دی اور دوسری طرف عبداللہ نے ریسیو کی۔ "میں شہباز بات کر رہا ہوں۔"

"جی جناب مجھے پتا چل گیا تھا کہ آپ پہنچ گئے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں نے بھی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ وہاں سب ٹھیک ہے؟"

"جی جناب.... میں ایاز کے ساتھ جا کر کوٹھی سے گاڑی لے آیا ہوں۔"

"یہ اچھا کیا۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں خادم کے ساتھ ہی واپس آیا کیونکہ وہ مجھے جن راستوں سے گزار کر لایا تھا وہ مجھے یاد بھی نہیں تھے اگر اکیلا آتا تو شاید بھٹک جاتا۔ اب جب تک راجا عمر دراز کی طرف سے طلبی کا پروانہ نہیں آتا میرے پاس سوائے آرام کرنے کے اور کچھ نہیں تھا اس لیے میں لیٹ گیا اور کچھ دیر میں سو بھی گیا تھا۔ میں دو گھنٹے سویا تھا کہ اچانک میری نیند اچاٹ ہو گئی۔ کوئی دروازے پر ہلکی ہی لیکن مسلسل دستک دے رہا تھا۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔ "آجاؤ۔"

دروازہ کھلا بیگ اندر داخل ہوا اور بولا۔ "آپ کو راجا صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

"مجھے ایک منٹ دیں۔" میں نے واش روم کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ منہ پر پانی کے چھپاکے مار کر میں خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔ میں بیگ کے ساتھ روانہ ہوا۔ اب مہمان خانہ باقی محل سے الگ کر دیا گیا تھا اور ہم ایک چھوٹی سی سرنگ سے گزر کر اصل محل میں داخل ہوئے اس کے داخلی دروازے پر ایک سپاہی ٹائپ شخص موجود تھا اور اس نے مجھے غور سے دیکھا تھا لیکن بیگ کے ساتھ کی وجہ سے کچھ کہا نہیں تھا۔ میں نے ذرا آگے نکل کر کہا۔ "کیا یہ ہر شخص کو آپ کے ساتھ دیکھ کر اسی طرح جانے کی اجازت دے دیتا ہے؟"

"نہیں میں اسے چند مخصوص اشارے کرتا ہوں جن سے یہ جان لیتا ہے کہ آنے والے شخص پر اچانک قابو پانا ہے، اس کی تلاشی لینی ہے یا اسے بغیر روکے جانے دینا ہے۔"

"یہ اچھا انتظام ہے۔"

چند منٹ بعد ہم راجا عمر دراز کے اس مخصوص کمرے میں تھے جو اس نے غور و فکر کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور اس میں سوائے ایک کرسی کے اور کچھ نہیں تھا۔ شمال کی طرف بڑی سی کھڑکی کھلی رہتی تھی اور راجا عمر دراز آتش دان کے سامنے بیٹھ کر بیک وقت گرم اور سرد ہوا کی لہروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوچ بچار کرتا تھا۔ لیکن اس وقت کمرے کی حالت مختلف تھی۔ شمال کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پٹ بند تھے اور ایک کرسی کے بجائے یہاں بیڈ روم کا مکمل فرنیچر تھا۔ راجا عمر دراز ایک بیڈ پر نیم دراز ایک کتاب ہاتھ میں لیے موجود تھا۔ بیگ نے اندر جانے سے پہلے مخصوص انداز میں دستک دی تھی اور جواب میں راجا نے اسے اندر آنے کی اجازت مرحمت فرما دی تھی۔ خاصا شاہانہ قسم کا ماحول تھا، بالکل باادب باملاحظہ قسم کا۔ مجھے دیکھ کر راجا عمر دراز نے کتاب سرہانے رکھ دی اور آہستہ سے سیدھا ہونے لگا لیکن اس سے پہلے وہ کھڑا ہوتا میں نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔ "نہیں آپ لیٹے رہیں۔"

"میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں بیٹے کہ تم میرے کہنے سے چلے آئے۔"

"راجا صاحب مجھے شرمندہ مت کریں آپ دنیا کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جو مجھے جب پکاریں میں ضرور آؤں گا۔"

"بیٹھو۔" راجا عمر دراز نے بیڈ کے ساتھ رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "تم کیا لینا پسند کرو گے؟"

"کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر آپ اصرار کریں گے تو آپ کے محل کی مخصوص گرین ٹی لے لوں گا۔"

راجا عمر دراز نے بیگ کی طرف دیکھا وہ فقرہ آشنا فوراً کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد راجا میری طرف متوجہ ہوا۔ "میں تمہارے بعد واپس آیا تھا۔"

"جی مجھے علم ہے اور میں آتے ہی مختلف چکروں میں اس طرح الجھ گیا کہ آپ کی خیر خیریت بھی نہیں معلوم کر سکا تھا۔"

"تم نے درست فیصلہ کیا تھا۔" اس نے سرد آہ بھری۔ "میں عمر رسیدہ ہونے کے باوجود جذباتی ہو گیا تھا۔"

"آپ کا اشارہ وادی کی طرف نہ جانے والے فیصلے کی طرف ہے؟"

"ہاں کیونکہ میں جانتا تھا اگر میں تمہارے بغیر گیا تو ناکامی میرا مقدر بنے گی اس کے باوجود مجھے وہاں کی کشش نے کھینچ لیا۔"

"راجا صاحب اگر میں اکیلا ہوتا تو آپ کے ساتھ ضرور جاتا لیکن میں اپنے ساتھیوں کو انڈیا میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ڈیوڈ شا سمیت بے شمار دشمن وہاں ہمارے تعاقب میں تھے۔"

"میں تمہاری مجبوری سمجھ گیا ہوں اور میں تمہیں اس کے لیے الزام بھی نہیں دے رہا تم نے حالات کے لحاظ سے بالکل درست فیصلہ کیا تھا۔"

"خدا کا شکر ہے میں اپنے تمام ساتھیوں کو بہ حفاظت لانے میں کامیاب رہا۔"

جب تک گرین ٹی آئی میں نے راجا عمر دراز کو اپنے سفر کی مختصر روداد سنائی۔ وہ غور سے سنتا رہا یہ سارے وہ حالات تھے جو اس کے پراسرار طور پر غائب ہو جانے کے بعد پیش آئے تھے۔ جب میں نے نیپال کے سفر اور چین کی سرحد پر گرفتاری کا ذکر کیا تو وہ چونک گیا تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں پھر [illegible] کی طرف سے [illegible] حملہ اور اس کی تباہی کے بعد ہمارا بھارتی کشمیر میں سفر تھا۔ ابھی میں اس سفر کے بارے میں بتا رہا تھا کہ ایک نو عمر اور حسین لڑکی گرین ٹی چاندی کی تھالی میں سجا کر لے آئی۔ گویا اپنے حصے کی حد تک راجا عمر دراز کی حسین ملازماؤں والی پالیسی جاری تھی۔ جب تک اس نے ہمیں گرین ٹی سرو کی میں رکا رہا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بقیہ حصہ سنایا۔

"پاکستان آنے کے بعد تم پر کیا گزری؟"

میں نے اس کو یہاں کے حالات بھی سنائے اور جب ڈاکٹر توفیق کے چنگل میں ڈیوڈ شا کا ذکر آیا تو راجا عمر دراز چونک گیا تھا۔ "اس نے تم سے بھی رابطہ کیا تھا؟"

اس کی بات پر غور کرتے ہوئے میں نے سوال کیا۔ "تو کیا اس نے آپ سے بھی رابطہ کیا تھا؟"

راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔ "ہاں اس نے رابطہ کیا تھا اور مجھے ایک پیش کش بھی کی تھی۔"

"وادی کی طرف ایک مشترکہ مہم لے جانے کی پیش کش؟"

"ہاں کیونکہ تمہارے بغیر وادی میں داخلہ ممکن نہیں ہے اور اس کے خیال میں تم میرے قابو میں ہو اس لیے اس نے مجھے پیش کش کی کہ اگر تم ساتھ ہو تو وہ وادی تک جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا بلکہ اس نے کہا ہے کہ وہ بھارتی حکومت سے تمام ضروری اجازت بھی حاصل کر لے گا۔"

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت تو آپ کو بھی نہیں ہے۔"

"ہاں مجھے اس کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن میں نے اسے انکار نہیں کیا ہے، میں نے اس سے کہا ہے کہ میں اس بارے میں سوچوں گا۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا ہے۔" میں نے کہا اور اپنی داستان کا بقیہ حصہ سنانے لگا۔ راجا عمر دراز کو یہ سن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی کہ جان لیوا اور یقینی موت سمجھے جانے والے ایبولا وائرس نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

"حکیم تاؤس نے تم پر جو دوائیں آزمائی ہیں ان کا تعلق صرف تمہارے ہاتھ کی صحت سے نہیں ہے بلکہ ان میں اور بھی خصوصیات ہیں۔"

"میں محسوس کرتا ہوں۔ کتنی ہی شدید چوٹ کیوں نہ ہو میرا زخم حیرت انگیز طور پر بہت جلدی ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ یہ صرف دواؤں کی کرامات نہیں بلکہ تمہاری اپنی قوت مدافعت بھی بہت مضبوط ہے۔ حکیم تاؤس کا کہنا ہے کہ تمہارا ہاتھ تقریباً مردہ ہو چکا تھا اور وہ بھی شاید اسے بچا نہیں سکتا تھا لیکن دوران علاج تم نے اپنی قوت ارادی کو پوری طرح استعمال کیا اور اپنا ہاتھ بچانے میں کامیاب ہو گئے۔"

"یہ صرف اللہ کا کرم ہے۔" میں نے کہا اور موضوع بدل دیا۔ "ڈیوڈ شا کا کہنا ہے کہ اس سفر کے دوران وہ اور آپ ایک موقع پر آمنے سامنے آ گئے تھے؟"

"یہ درست ہے اور ہماری پارٹیوں کا ٹکراؤ بھی ہوا

تھا۔ جس میں ہمارے سارے ساتھی مارے گئے تھے۔ صرف میں اور ڈیوڈ شا زندہ بچے تھے۔ ہماری تھوڑا کی بھی تباہ ہو گئی تھی۔ اس وقت ہم وادی کے قریب تھے۔ اگر وادی میں اترنے کا راستہ نہیں ملتا تو ہم مارے جاتے اور بچ بچ ایک موقع آیا تھا جب ہمیں مرنے کا یقین بھی ہو گیا تھا۔"

"کیا رانا دیاس کو علم تھا کہ آپ وادی کی طرف جا رہے ہیں؟"

راجا عمر دراز مسکرایا۔ "اسی نے تو سارا بندوبست کرا کر دیا تھا۔ اس نے تمہیں بتایا ہوگا کہ میری گاڑی کس جگہ خالی حالت میں ملی ہے؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی بتایا تھا۔"

"اسی نے آدمیوں کا بندوبست کیا تھا۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ دونوں عمر رسیدہ دوستوں نے بچوں والی حرکت کی تھی۔ اول تو راجا عمر دراز کو اس طرح جانا تھا تو ہم سے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہم اسے روکنے کے مجاز نہیں تھے۔ دوسرے جب راجا عمر دراز کو جانا تھا تو داری واپسی کا بندوبست کر جاتا۔ رانا دیاس کے لیے نہایت آسان تھا ہمیں قانونی طریقے سے واپس پاکستان پہنچا دیتا۔ ہم اس طرح دشواریوں میں پڑ کر واپس نہ آتے اور نہ ہمیں ہر قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑتا۔ راجا عمر دراز نے میرے تاثرات سے بھانپ لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ لیکن اس وقت مجھے یہ سب ٹھیک لگ رہا تھا اور میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں تم لوگوں کو مشکل میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "راجا صاحب میری مشکلات ... اب بھی کم نہیں ہوئی ہیں۔ مجھے بیک وقت دو دشمنوں کا سامنا ہے۔ ایک مرشد اور اس کے ساتھی اور دوسرا فتح خان اور ڈیوڈ شا کا مشترکہ گروپ ہے۔ فتح خان اگرچہ انکار کرتا ہے لیکن مجھے خاصی حد تک یقین ہے کہ اصل میں وہ ڈیوڈ شا کا ایجنٹ ہے۔"

"یہ بات سو فی صد درست ہے۔"

"اب فتح خان میرے پیچھے ہے اور میں نے آپ کی اسلام آباد والی کوٹھی سے دور ہونے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو یہ جگہ فتح خان اور اس کے ذریعے ڈیوڈ شا کی نظر میں آ جاتی۔"

فتح خان کا نام آتے ہی راجا عمر دراز کی بھنویں تن گئی تھیں۔ وہ اس کا مجرم تھا اور اب اس کے دشمن کا ساتھی بن کر مزید مجرم بن گیا تھا۔ "وہ دو ٹکے کا آدمی ہے جسے ڈیوڈ شا نے

سرچ چڑھا دیا ہے۔"

مجھے اس کی بات سے اختلاف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ فتح خان ایک نچلے درجے کا مجرم تھا اور وہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا مگر اس کی ذہانت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا ...... دوسرے جرائم پیشہ افراد کے برخلاف اس نے موقع ملنے پر کچھ سیکھنے سے گریز نہیں کیا۔ اس نے زبانیں بھی سیکھیں اور جدید ہتھیاروں اور آلات کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں۔ شیر میں رو کر اس کی صلاحیتیں مزید نکھر کر سامنے آ گئیں۔ ڈیوڈ شا نے اسے بلاوجہ منتخب نہیں کیا تھا۔ اس نے خود کو اس کا اہل ثابت کیا تھا۔ پھر اس کے بعض معاملات ایسے تھے جن میں اس کی ثابت قدمی حیرت انگیز تھی۔ اس بات کو ایک دہائی سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا جب برٹ شا اس کے قبضے میں آیا اور صرف برٹ شا جانتا ہے کہ اس نے ہیرے کہاں چھپائے۔ فتح خان ابھی تک اسے قید میں رکھ کر اس امید میں ہے کہ یہ ہیرے بالآخر اس کے قبضے میں آ جائیں گے جن کی بین الاقوامی منڈی میں قیمت کوئی پچیس کروڑ ڈالرز بنتی ہے۔ یہ بات راجا عمر دراز کے علم میں نہیں تھی۔ میں نے اسے یا کسی اور کو ان ہیروں یا برٹ شا کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اگرچہ دوسروں سے اس بات کو چھپانے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن میرے خیال میں بتانا بھی ضروری نہیں تھا۔

حد یہ کہ ایمن کو بھی نہیں بتایا تھا۔ اگر اسے پتا چل جاتا کہ اس کا باپ زندہ اور فتح خان کی قید میں ہے تو وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر یہاں آ جاتی اور مجھے پھر اپنے دشمنوں کو چھوڑ کر اس کا ساتھ دینا پڑتا جو موجودہ حالات میں ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے مجھے برٹ شا سے کوئی ہمدردی نہیں تھی اس نے جو بویا تھا وہی کاٹ رہا تھا۔ اسے ہیرے افغانستان سے ملے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ ان ہیروں کی مدد سے اسلحے کی کوئی بہت بڑی کھیپ حاصل کی گئی تھی۔ یہ اسلحہ یقیناً اس تباہ حال ملک کی مزید بربادی میں استعمال ہو رہا تھا، گویا برٹ شا استعماری طاقتوں کا ایجنٹ بن کر یہاں آیا تھا اور اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا تھا۔ البتہ ایمن سے مجھے ہمدردی تھی اس کا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں تھا بلکہ وہ اپنے باپ کی میراث سے بھی محروم کر دی گئی تھی۔ ڈیوڈ شا کو یقیناً اس کے کزن کا کردار دیا گیا تھا اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے اعزاز اور جاگیر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ شاید شا خاندان نسل در نسل استعماری طاقتوں کا ایجنٹ چلا آ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" راجا عمر دراز نے پوچھا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اگرچہ اس کی صحت ٹھیک لگ

رہی تھی۔ چہرہ ویسا ہی سرخی مائل اور بھرا ہوا تھا۔ جسم میں بھی مضبوطی نظر آ رہی تھی لیکن اس کے باوجود مجھے لگا وہ بیمار ہے یا اسے کوئی مسئلہ ہے۔

"کچھ نہیں آپ بتائیے آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟"

"میں ویسے تو ٹھیک ہوں۔" راجا عمر دراز نے کہا۔ "لیکن ڈاکٹرز نے مجھے کینسر بتایا ہے۔"

اس کے الفاظ دھماکے کی طرح مجھے لگے تھے میں نے بے یقینی سے کہا۔ "آپ... آپ نے کینسر ہی کہا ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میرے پھیپھڑوں میں کینسر کی رسولی پرورش پا رہی ہے۔"

"میرے خدا!" میں نے کہا۔ "کب پتا چلا۔"

"ابھی ایک ہفتہ پہلے... میرا ٹیسٹ گیا تھا اسلام آباد اور رپورٹ آئی ہے، ایک ڈاکٹر یہاں میری دیکھ بھال کر رہا ہے۔"

"تو آپ نے اسی وجہ سے حکیم قاؤس کو فوراً واپس بلایا ہے؟"

"ہاں میرا علاج وہی کر سکتا ہے۔ ویسے ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ رسولی دوسرے اسٹیج پر ہے اور اپنی جڑیں بھی پھیلا رہی ہے اگر میں برطانیہ یا سنگاپور جا کر آپریشن کروالوں تو نوے فی صد امکان ہے کہ مجھے اس سے نجات مل جائے گی۔"

"تب آپ کو فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسی سال کی عمر میں صرف اس لیے اپنے جسم کی کاٹ پیٹ کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ابھی میں چند سال مزید جی سکتا ہوں۔"

"یہ فیصلہ خطرناک ہو سکتا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ حکیم قاؤس بہت اچھا حکیم ہے اور اس کے پاس دوائیاں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ وہ شاید مجھے کچھ عرصے زندہ رکھنے میں کامیاب ہو جائے لیکن وہ مجھے کینسر سے نہیں بچا سکتا۔"

"پھر اس فیصلے کی وجہ؟.... میں جانتا ہوں آپ کوئی فیصلہ بنا سوچے سمجھے نہیں کرتے۔"

اس نے گہری سانس لی۔ "شہباز نہ جانے کیوں میرے اندر سے کوئی کہہ رہا ہے کہ میرا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "ایسی بیماری کا سن کر اس قسم کے خیالات کا آنا فطری بات ہے۔"

"نہیں بیماری کا تو مجھے ابھی پتا چلا ہے یہ خیال تو مجھے

واپسی کے بعد ہی سے آ رہا ہے۔"

"ڈاکٹرز نے ابھی ڈائیگنوس کیا ہے آپ کے جسم نے پہلے جان لیا تھا۔ اس نے آپ کو خیال کی صورت میں خبردار کر دیا۔"

"شاید ایسا ہی ہو لیکن اس کے باوجود میں کینسر سے نجات حاصل کرنے کے لیے آپریشن کرانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے اس طرح سے بھی میں کینسر سے نجات حاصل نہیں کر سکوں گا۔"

"پھر کیا صورت رہ جاتی ہے؟"

راجا عمر دراز اس بار جواب دینے سے پہلے خاصی دیر تک سوچتا رہا تھا اور میں اپنی گرین ٹی ختم کر رہا تھا۔ یہ بہت نفیس قسم کا کپ تھا جس میں ڈالی جانے والی گرم چیز دیر تک گرم رہتی تھی اور باہر اس کا اثر نہیں آتا تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا۔ آخر اس نے کہا۔ "شہباز مجھے لگتا ہے میں ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہوں اگر میں وادی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

جب وہ سوچ رہا تھا تو میرے دل میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ وہ وادی کی بات کرے گا اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ میں نے بے دلی سے کہا۔ "یہ صرف ایک خیال ہے وادی تک پہنچ کر آپ کس طرح بچ سکتے ہیں؟"

"یہ خیال ہی ہے۔" راجا عمر دراز نے کہا۔ "لیکن میرے اندر کی آواز کہتی ہے کہ اگر میں وادی کی طرف گیا تو بچ جاؤں گا۔"

"راجا صاحب آپ کمزور ہو رہے ہیں اور آپ کے جسم میں ایک خوفناک مرض بھی جگہ بنا چکا ہے کیا آپ اس حالت میں وادی تک کا مشکل سفر کر سکیں گے؟"

"کیوں نہیں کر سکوں گا۔ یہ کینسر کوئی نیا تھوڑی ہے ڈاکٹر کا کہنا ہے میرے جسم میں ایک سال سے پرورش پا رہا ہے یعنی میں اس کے ساتھ ہی وادی تک گیا تھا۔"

"فرق جانے اور نہ جانے کا ہے، اس وقت آپ کو علم ہی نہیں تھا کہ آپ کے جسم میں کینسر ہے لیکن اب آپ جان گئے ہیں۔"

"جان بچانے کے لیے آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔" اس کا لہجہ کمزور ہو گیا تھا۔

میں نے سوچا اور بولا "راجا صاحب زندگی کی پروا آپ نے کبھی نہیں کی ہے اس لیے میں ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ آپ صرف جان بچانے کے لیے اس وادی تک جانا

چاہتے ہیں۔"

"شاید یہ بات درست ہے یا شاید نہیں ہے۔" انہوں نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ "شاید درست یہ ہے کہ میں بہر حال ایک بار اس وادی میں اترنا چاہتا ہوں، چاہے اس کی قیمت مجھے جان کی صورت میں ادا کرنی پڑے۔"

"ڈیوڈ شا نے بتایا کہ آپ دونوں کو برف والا آدمی وادی میں لے گیا تھا اور اگر وہ واپس نہ آتا تو آپ دونوں کا بچنا محال تھا؟"

"یہ بالکل درست ہے ہم سردی اور بھوک سے مرنے والے تھے۔"

"آپ نے مجھے اس سفر کے بارے میں نہیں بتایا؟"

اس سے پہلے راجا عمر دراز جواب میں کچھ کہتا دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یہ مخصوص دستک تھی جو بیگ دیتا تھا۔ راجا عمر دراز نے بلند آواز سے کہا۔ "آجاؤ۔"

بیگ اندر آیا اور اس نے دھیمے لہجے میں اور مقامی زبان میں کچھ کہا راجا عمر دراز نے سر ہلایا اور جواب میں کچھ کہا بیگ ذرا جھکا اور باہر چلا گیا اس کے جانے کے بعد راجا عمر دراز نے کہا۔ "کھانے کا وقت قریب ہے اور اس سے پہلے حکیم تاؤس میرا علاج کرتا ہے۔"

میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا کھانے کی میز پر آپ سے ملاقات ہوگی؟"

"بالکل میں کھانا تمہارے ساتھ کھاؤں گا اور اس کے بعد میں تم کو اپنے سفر کے بارے میں بتاؤں گا۔"

درحقیقت مجھے راجا عمر دراز کے سفر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے صرف اس کا دل رکھنے کے لیے پوچھ لیا تھا اور وہ بیماری کی حالت میں بھی مجھے اپنے سفر کی داستان سنانے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اتنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا مقصد مجھے وادی کے سفر پر آمادہ کرنے کی کوشش تھی۔ مگر فی الحال میں بالکل بھی دستیاب نہیں تھا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ یہ بات کس طرح مناسب پیرائے میں راجا عمر دراز سے کہہ دوں۔ بہر حال میں اسے صاف انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں باہر آیا تو بیگ راہداری میں موجود تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "مجھے راجا صاحب کی بیماری کا جان کر افسوس ہوا ہے۔"

"ہاں مرض ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے لیکن وہ اس کا علاج کرانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔" بیگ نے دبے لہجے میں کہا۔ "میں نے اور ان کے خاندان والوں نے زور دیا ہے۔"

میں چونکا۔ "راجا صاحب کے خاندان والے؟"

"آپ نہیں جانتے ان کے دو بیٹے ہیں، ایک جرمنی میں ہوتے ہیں اور دوسرے صاحبزادے فرانس میں ہوتے ہیں۔ ان کی ایک شادی شدہ صاحبزادی ہیں۔ یہ تمام خود ...... بچوں کے بچوں والے ہیں۔"

"یہاں محل میں کوئی نہیں ہے؟"

"صرف راجا صاحب کی ایک بیوہ بھتیجی ہیں۔ ان کی بیوی کا تیس سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔"

"کیا راجا صاحب کی بیماری کا سن کر کوئی نہیں آرہا ہے؟"

"ان کے تینوں بچے آرہے ہیں اور شاید وہ ان کو علاج کے لیے باہر جانے پر مجبور کر دیں۔"

بیگ کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی راجا عمر دراز کے وادی کے سفر کا مخالف تھا اور چاہتا تھا کہ وہ امریکا یا سنگاپور جا کر اپنے کینسر کا علاج کرالے۔ میں نے کہا۔ "میری راجا صاحب سے جو بات ہوئی ہے اس سے لگ رہا ہے کہ ان کو اپنے کینسر کے مروجہ علاج سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

بیگ نے سر ہلایا۔ "وہ حکیم سے علاج کرا رہے ہیں جب کہ حکیم کے پاس وہ مخصوص جڑی بوٹی باقی نہیں رہا ہے جسے وہ دواؤں میں ڈالتا ہے تو ان کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔"

یہ انکشاف تھا۔ "اس کا مطلب ہے حکیم تاؤس اب معمولی دواؤں سے راجا صاحب کا علاج کر رہا ہے۔"

بیگ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ان سے بہتری تو آسکتی ہے لیکن مرض کا علاج ممکن نہیں ہے۔"

کیونکہ بیگ نے وادی تک سفر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ راجا نے اسے اعتماد میں نہیں لیا تھا اور اس صورت میں اسے بتانا مناسب نہیں لگا تھا۔ بیگ مجھے محل کے ایک حصے میں لایا۔ یہاں بڑی خوب صورت نشست گاہ تھی جس کے ایک طرف کی پوری دیوار شیشے کی تھی اور نیم دائرے کی صورت میں شیشے لکڑی کے فریم میں جڑے ہوئے تھے۔ سامنے برف پوش پہاڑوں کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بیگ مجھے یہاں بیٹھنے کے لیے لایا تھا اور شاید ڈنر لگنے تک مجھے یہیں رہنا پڑتا لیکن وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"شہباز صاحب میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں جس کا علم ابھی راجا صاحب کو نہیں ہے۔ یہ بات صرف میرے اور آپ کے درمیان میں رہے گی۔"

"اگر آپ کو افشائے راز کا خوف ہے تو آپ بلاجھجک

اسے خود تک محدود رکھ سکتے ہیں۔"

"افشائے راز کا خوف نہیں ہے لیکن راجا صاحب کے علم میں نہیں آنی چاہیے۔" اس نے کہا اور پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ "درحقیقت ڈاکٹرز نے ان کو جواب دے دیا ہے۔ کینسر ابتدائی اسٹیج پر ہے لیکن جسم کے ان حصوں تک رسائی حاصل کر چکا ہے جہاں سے اسے نکالنا ممکن نہیں ہے آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

مجھے ایک بار پھر دھچکا لگا تھا۔ راجا عمر دراز کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اسے تصویر کے اس رخ کا علم نہیں ہے اور ڈاکٹرز نے اسے پوری بات نہیں بتائی ہے۔ ممکن ہے اس کام میں بیگ کے ساتھ راجا عمر دراز کے بچے بھی شامل ہوں۔ میں نے سر ہلایا۔ "اس کا مطلب ہے ڈاکٹرز نے وقت دے دیا ہے؟"

"بالکل ڈاکٹرز کے مطابق اگر علاج پر توجہ دی جائے تو راجا صاحب ایک سال تک مزید زندہ رہ سکتے ہیں۔"

"یہ بات راجا صاحب کو کیوں نہیں بتائی گئی؟"

"درحقیقت مجھے بھی آج ہی پتا چلا ہے۔ ابتدائی رپورٹ میں نتیجہ حوصلہ افزا تھا اور علاج ممکن دکھائی دے رہا تھا لیکن حتمی رپورٹ میں واضح ہو گیا ہے۔"

"کیا اس خبر کو چھپا کر رکھنا ہے؟"

بیگ نے سر ہلایا۔ "جب تک راجا صاحب کی اولاد یہاں نہیں آجاتی ہے۔ وہی فیصلہ کریں گے کہ انہیں اپنے باپ کو بتانا چاہیے یا نہیں۔"

"اگر آپ چھپانا چاہتے ہیں تو آپ نے مجھے کیوں بتایا ہے؟"

"تاکہ آپ راجا صاحب کی خواہش پر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے جان لیں۔" بیگ کا لہجہ حسب معمول سپاٹ ہو گیا تھا۔

میں چونکا۔ "کیسی خواہش اور اس پر کیسا فیصلہ؟"

"شہباز صاحب آپ جانتے ہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔ راجا صاحب اپنی عمر اور بیماری سے قطع نظر اب بھی اس وادی کی طرف جانے کی خواہش رکھتے ہیں اور وہ آپ کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ درحقیقت آپ کو ساتھ چلنے پر آمادہ کرنا ہی اصل مسئلہ ہے ورنہ میں ممکن ہے اب تک راجا صاحب اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنا چکے ہوتے۔ اگر آپ انکار کرتے ہیں تو ان کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔"

"یہ انکار میں نے انڈیا میں بھی کیا تھا اس کے باوجود راجا صاحب چلے گئے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"اس وقت ان کے ذہن میں ہوگا کہ شاید آپ کے بغیر بھی وادی میں داخل ہو سکتے ہیں لیکن اس تجربے نے ثابت کر دیا کہ برف والے بوڑھے کی بات درست تھی اور وہ آپ کے بغیر گئے اور وادی کے کنارے پہنچ کر بھی اس میں داخل نہیں ہو سکے تھے۔ اب انہیں معلوم ہے کہ آپ کے بغیر یہ کام ناممکن ہے اور اگر آپ نے انکار کیا تو پھر ان کا ارادہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

میں بیگ کی باتوں کو تول رہا تھا اور مجھے ان میں سچائی محسوس ہو رہی تھی۔ "بیگ صاحب سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود اس وادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور دوسرے میں ایسے مسائل میں الجھا ہوا ہوں جن کے بارے میں آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں کسی صورت ان کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ مجھے مرشد سے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دفاع کرنا ہے۔"

بیگ نے گویا سکون کا سانس لیا تھا۔ "اس کا مطلب ہے اگر راجا صاحب نے آپ سے ساتھ چلنے کو کہا تو آپ کا جواب انکار میں ہوگا۔"

"اگرچہ مجھے شرم آئے گی کیونکہ راجا صاحب کے مجھ پر بہت احسانات ہیں لیکن میں ان کی اور اپنی خاطر انکار کر دوں گا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" بیگ نے کہا۔ "راجا صاحب کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور ان کو یہ وقت سکون سے اپنے گھر میں گزارنا چاہیے۔"

دیکھنے میں تو سیکرٹری بیگ بھی جیسے کچھ پل کا مہمان نظر آتا تھا لیکن اس کے استخوانی جسم میں بہت پھرتی اور طاقت تھی۔ میں نے اسے ہمیشہ چاق و چوبند پایا تھا۔ اس کے مقابلے میں صحت مند اور توانا نظر آنے والا راجا عمر دراز ایک ایسی موذی بیماری کا شکار ہو گیا تھا جس کا علاج بھی ممکن نہیں تھا اور ڈاکٹرز نے اسے ایک سال کا وقت دے دیا تھا۔ بیگ اپنے مطلب کی بات کر کے رخصت ہو گیا تھا اور اس کے جانے کے چند منٹ بعد وہی نو عمر اور حسین خادمہ اندر آئی۔ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

"کھانا.... لگ گیا.... آپ کو بلاتا۔"

"چلو۔" میں نے کہا اور اس کی رہنمائی میں محل کے ڈائننگ ہال پہنچا۔ یہ کافی بڑا ہال تھا۔ اس بہت بڑے کمرے میں تین میزیں لگی تھیں۔ ایک میز کے گرد کم سے کم پچاس لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ دوسری میز چھوٹی تھی لیکن اس پر بھی بیس پچیس افراد آرام سے آسکتے تھے۔ تیسری میز نارمل سی تھی

اس پر ایک درجن افراد بھی کھانا کھا سکتے تھے اور ہمارے لیے اسی پر کھانا لگایا گیا تھا۔ بس دو افراد تھے۔ راجا عمر دراز صدر کرسی پر تھا اور مجھے اس کے دائیں طرف پہلی کرسی ملی تھی۔ آداب کے مطابق یہ کرسی قریبی عزیز کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ مہمان عام طور سے مخالف سمت میں دوسری واحد کرسی پر بیٹھتا ہے۔ میرے بیٹھتے ہی گھنٹی بجی اور ملازمین کھانے کی قابیں لانے لگے۔ سب سے پہلے راجا عمر دراز کے سامنے ایک پیالہ رکھا گیا جس میں سوپ نما چیز تھی اور اس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ پھر قابیں میز پر سجائی جانے لگیں۔ یہ نصف درجن قابیں اور ڈشز تھیں۔ پھر ان پر سے ڈھکن ہٹائے گئے تاکہ میں اپنی پسند کی چیز لے سکوں۔ راجا عمر دراز نے کھانے کے آغاز سے پہلے کہا۔

"افسوس کہ میں اس میں سے کوئی چیز نہیں کھا سکتا... فی الحال حکیم قاؤس نے مجھے صرف یہ سوپ پینے کو کہا ہے۔"

"یہ پرہیزی غذا ہے۔"

"تم چاہو تو یہ بھی کہہ سکتے ہو۔ یہ خاص طاقت ور جڑی بوٹیوں سے بنا سوپ ہے جو بہ قول اس کے مجھے اندر سے اتنا توانا کر دے گا کہ میں اپنی بیماری سے لڑ کر اسے شکست دے سکوں گا۔"

"اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔ راجا عمر دراز کے ساتھ میں نے بھی کھانے کا آغاز کر دیا۔ تمام کھانے اعلیٰ معیار کے اور نہایت لذیذ تھے۔ خاص بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی میں خاصا کھا گیا تھا جبکہ راجا عمر دراز نے اپنا سوپ کا پیالہ بڑی مشکل سے ختم کیا تھا۔ شاید بیماری نے اس کی بھوک بھی ختم کر دی تھی۔ وہ بے دلی سے سوپ پی رہا تھا۔ پیالہ ختم کر کے اس نے نیپکن سے منہ صاف کیا۔

جب میں نے کھانا ختم کیا تو اس نے بے تابی سے کہا۔

"میرے ساتھ چلو کیونکہ میرے سونے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ حکیم آ جائے گا دوا دینے، میں سونے سے پہلے تمہیں اپنے سفر کی روداد سنانا چاہتا ہوں۔"

ہم ایک بار پھر راجا عمر دراز کی خواب گاہ میں آ گئے تھے۔ جب ہم کھانے والے کمرے سے نکلے تو بیگ نے نظروں میں مجھے یاد دلایا کہ میں نے اس سے کیا وعدہ کیا ہے۔ میں نے اسے نظروں سے تسلی دی کہ وہ فکر نہ کرے۔ راجا عمر دراز نے کافی منگوائی تھی۔ اس نے کہا۔ "اگرچہ مجھے کافی اب منع ہے لیکن آج تمہارے ساتھ بدپرہیزی کر لیتا ہوں۔"

"راجا صاحب میرا خیال ہے آپ آرام کریں۔ آپ کی داستان میں بعد میں بھی سن سکتا ہوں۔"

"نہیں میں نے تمہیں خاص طور سے اسی لیے بلایا ہے۔ کل صبح تم چلے جاؤ گے اور پتا نہیں پھر حالات کب تمہیں آنے کی اجازت دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے ایک وعدہ کر کے جاؤ۔"

"راجا صاحب میں اس وقت کسی وعدے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں نے اپنے ماں باپ سے وعدہ کیا تھا کہ بھائی کی بیوہ سے عدت پوری ہوتے ہی نکاح کر لوں گا لیکن میں وہ وعدہ بھی پورا نہیں کر سکا ہوں۔"

"میرے بیٹے میں تم سے ایسا کوئی وعدہ نہیں لوں گا جو تم پورا نہ کر سکو۔" راجا عمر دراز نے سنجیدگی سے کہا۔ "ایک بار تم میری بات سن لو اس کے بعد تم جو چاہے فیصلہ کرو۔"

راجا عمر دراز مجھے گھیر گھار کر نجانے کس طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ میں اس سے بچنا چاہتا تھا۔ بادلِ ناخواستہ میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے راجا صاحب میں آپ کی بات سننے کے لیے تیار ہوں۔"

اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا اور اس نے کہنا شروع کیا۔ "صرف راناوہ یاس اور اس کے چند قریبی ساتھی جانتے تھے کہ میں کہاں جا رہا تھا۔ یہی بات ہے مجھے راناوہ یاس نے بھی روکنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھ پر ایک جنون سوار ہو گیا تھا۔ ایک چھوٹے طیارے نے مجھے اور میرے چار ملازموں کو اس متروک رن وے پر اتار دیا جو دوسری جنگ عظیم میں بنایا گیا تھا اور جہاں ایک وقت میرا اور ولیم شا کا طیارہ اترا تھا۔ یہ رن وے اب بھی اچھی حالت میں تھا۔ یہاں سے ہم پیدل آگے بڑھے۔

سرما کی وجہ سے موسم نہایت خراب تھا۔ رن وے تک برف سے ڈھک گیا تھا کیونکہ یہ بھی کوئی سات ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ شمال کی طرف سے برفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ راناوہ یاس نے جن آدمیوں کو میرے ساتھ کیا تھا ان کو شمال کی طرف سفر اور پہاڑوں پر چڑھنے کا تجربہ تھا۔ ہم سامان لے جانے کے لیے سلیجز لائے تھے جن کے نیچے برف پر پھسلنے والی اسکیز ہوتے ہیں۔ یہ سلیجز اس وقت تک ہمارے کام آتیں جب تک پہاڑوں کا مرحلہ نہ شروع ہو جاتا۔ دو دن کے بعد وہ مرحلہ آ گیا جب ہمیں سلیجز چھوڑنا پڑیں اور تمام سامان اپنی پشت پر لاد کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ سامان ان چاروں نے اٹھایا تھا اور مجھے صرف خود کو آگے لے جانا تھا۔ مگر خالی ہاتھ آگے بڑھنا بھی نہایت مشکل ثابت ہوا تھا۔ اگر میں ایک جذبے کے ساتھ نہ نکلا ہوتا تو شاید پہاڑوں تک پہنچنے سے

پہلے واپس چلا جاتا۔ تین دن تک ہم پہاڑ سر کرتے رہے تھے۔ چھٹے دن ہم اس علاقے میں داخل ہو گئے جہاں وادی موجود تھی۔"

اس دوران میں ملازمہ کافی لے آئی تھی اور ہمیں سرو کرنے لگی اس لیے راجا عمر دراز خاموش ہو گیا۔ ملازمہ کے جانے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ "ڈیوڈ شا سے آپ کا ٹکراؤ کہاں ہوا؟"

"اسی جگہ ہوا تھا۔ جب ہم پہاڑوں سے نیچے اترے، وہ اور اس کے آدمی پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ دونوں پارٹیوں کے پاس اسلحہ تھا اور اس سے پہلے میں یا ڈیوڈ شا اپنے آدمیوں کو روکتے کسی غلط فہمی کے نتیجے میں انہوں نے ایک دوسرے پر ہتھیار تان لیے تھے اور پھر کسی نے گولی بھی چلا دی تھی۔ میں نے ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر اپنی جان بچائی تھی کیونکہ وہاں اندھا دھند گولیاں چل رہی تھیں۔ گولیوں کے شور کے ساتھ مارے جانے والوں کی چیخوں کا شور بھی تھا۔ پھر کسی کی چلائی گولی ہمارے سامان میں موجود ڈائنا مائٹ سے جا لگی۔ یہ ڈائنا مائٹ ہم راستہ بنانے کے لیے لائے تھے۔ دھماکے نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور جہاں موجود سب ہی لوگ مارے گئے اور سامان مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ بچے ہوئے سامان کو آگ چاٹ رہی تھی۔ ان دھماکوں اور آگ لگنے میں ڈیوڈ شا کا سامان بھی برباد ہو گیا تھا اور جب خاموشی ہونے پر ہم اپنی کمین گاہوں سے باہر آئے تو کچھ نہیں بچا تھا۔"

"ایک دشمن کو اس ویرانے میں سامنے پا کر آپ نے کیا محسوس کیا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں... حالانکہ ڈیوڈ شا مسلح تھا اور میں خالی ہاتھ تھا اس کے باوجود مجھے اس سے ڈر محسوس نہیں ہوا تھا۔ البتہ جب ہمیں پتا چلا کہ ہماری ساری خوراک بھی تباہ ہو گئی ہے اور وہ سامان بھی جس کی مدد سے ہم وادی میں اتر سکتے تھے تو ہم دونوں ہی ڈر گئے تھے۔ ان سب چیزوں کے بغیر اس ویرانے میں سسک سسک کر سردی اور بھوک سے مرنا ہمارا مقدر بن گیا تھا۔ اس چیز نے ہمیں عارضی طور پر اتحادی بنا دیا تھا اور ہم زندگی کے لیے مشترکہ طور پر جدوجہد کرنے لگے تھے۔ سب سے پہلے ہم نے کھانے کی بچی کھچی اشیا تلاش کیں۔ لیکن یہ اتنی کم مقدار میں تھیں کہ ایک دن کے لیے بھی کافی نہیں تھیں۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ مجھے کوئی ہتھیار بھی مل جائے تاکہ میں ڈیوڈ شا کے مقابلے میں نہتا نہ رہوں۔ مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ کھانے کی چیزیں ایک دن چل سکیں اور اب ضروری ہو گیا تھا کہ ہم کسی طرح بھی وادی میں اترنے کا راستہ تلاش کریں۔ میں اور ڈیوڈ شا وادی کے کنارے کے ساتھ ساتھ بھٹکنے لگے تھے۔"

"ڈیوڈ شا نے بتایا تھا کہ آپ نے راستہ بھی تلاش کر لیا تھا لیکن جب نیچے جانے کی کوشش کی تو اسے بند پایا تھا۔"

"یہ درست ہے میں قسم کھا کر کہنے کو تیار ہوں کہ یہ وہی راستہ تھا جس سے وادی سے نکلتے ہوئے ہم اوپر آئے تھے لیکن جب میں اور ڈیوڈ شا ذرا نیچے گئے تو راستہ یوں غائب ہو گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔"

"ممکن ہے موسمی حالات کا شکار ہو کر دیوار کا یہ حصہ نیچے گر گیا ہو۔ یہاں زلزلے بھی تو آتے ہوں گے۔"

راجا عمر دراز مسکرایا۔ "ایسا نہیں تھا اور یہیں سے کہانی کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جو میں تمہیں سنانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے ڈیوڈ شا نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی ہوگی۔"

"اس نے مجھے بس اتنا ہی بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "کچھ عرصے پہلے میری ایمن شا سے بات ہوئی تھی اور اس نے بتایا کہ ڈیوڈ شا انڈیا سے واپسی پر گوشہ نشین ہو گیا ہے کیونکہ اس کا ایک ہاتھ آبلوں سے بھر گیا ہے۔ مگر جب وہ مجھے یہاں ملا تو اس کا ہاتھ بالکل ٹھیک تھا۔"

"یہ اسے سزا ملی تھی۔" راجا عمر دراز نے کہا۔ "جب نیچے اترنے کا راستہ نہیں ملا تو ڈیوڈ شا پر جنون طاری ہو گیا تھا اور اس نے مجھ پر پستول نکال لیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں نے نیچے جانے والا درست راستہ نہیں بتایا تو وہ مجھے شوٹ کر دے گا۔ مجھے لگا کہ وہ ایسا ہی کرے گا اور میں مرنے کے لیے تیار بھی ہو گیا تھا۔ میں خالی ہاتھ تھا اور کسی صورت اس سے بچ نہیں سکتا تھا۔ لیکن پھر اچانک ہی ڈیوڈ شا کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے پستول نیچے کیا اور پھر اسے وادی میں پھینک دیا اور خود بچوں کی طرح منہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگا تھا۔ میں حیران ہوا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"پلیز راجا مجھے معاف کر دو۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا میں سچ مچ تمہیں گولی مارنے والا تھا۔"

اس کی گولی مارنے والی بات پر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی لیکن اس نے اچانک مجھے کیوں معاف کر دیا تھا اور پستول نیچے وادی میں پھینک دیا تھا یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ بہرحال مجھے کچھ نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے ڈیوڈ شا کو معاف کر دیا۔ اس رات جب ہم اپنے سلیپنگ بیگز میں گھس کر سونے کی کوشش کر رہے تھے تو ہمیں کوئی چیز کھانے

ختم ہونے سے زیادہ گزر گئے تھے۔ اچانک مجھے لگا جیسے میرے سلیپنگ بیگ کے نیچے کوئی چیز ہے جو مجھے مسلسل چبھ رہی تھی میں نے ہاتھ باہر نکال کر برف میں اسے ٹٹولا تو میرے ہاتھ میں پستول کا میگزین آ گیا اور تب مجھے پتا چلا کہ ڈیوڈ شا نے وہ مکاری کیوں دکھائی تھی۔ اس کی بے خبری میں پستول کا میگزین کہیں گر گیا تھا اور عین موقع پر یہ انکشاف ہوا تو اس نے پینترا بدلا اور مجھے معاف کرنے کا ڈراما کرتے ہوئے پستول وادی میں پھینک دیا۔ ایک تو پستول خالی ہو چکا تھا اور جلد مجھے اس کا پتا چل جاتا دوسرے اسے خوف تھا کہ میگزین مجھے مل گیا اور میں نے کسی طرح اس سے پستول حاصل کر لیا تو الٹا اس کی عافیت خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"وہ واقعی بہت شاطر آدمی ہے۔"

"میں نے میگزین اپنے پاس رکھ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن بھوک سے جیسے آنتوں میں بل پڑ رہے تھے اور ذہن پر بار بار اندھیرا چھا رہا تھا۔ نہ جانے یہ رات کیسے گزری اور جب دن نکلا تو مجھ میں سلیپنگ بیگ سے باہر نکلنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ ڈیوڈ شا البتہ باہر نکل آیا تھا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر سگار پی رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"بس خاتمہ لگ رہا ہے لیکن تم ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے ہو؟"

"میں ایسا ہی آدمی ہوں اپنی آخری توانائیوں تک ایسے ہی رہوں گا اور پھر اچانک مر جاؤں گا۔"

میں اس کی لاف گزاف پر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا وہ خود کو کوئی مافوق الفطرت انسان بنا کر پیش کرتا ہے لیکن یہ وہ بھی ایک عام فانی انسان۔ کچھ دیر بعد میں بھی ہمت کر کے باہر نکل آیا اور ہم نے ایک بار پھر اس جگہ کا رخ کیا جہاں ہمارا سامان تباہ ہوا تھا لیکن کئی کلومیٹرز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انکشاف ہوا کہ تازہ برفانی طوفان نے ہر چیز پر برف کی موٹی تہ جما دی تھی۔ ہم ناکام و نامراد لوٹ آئے تھے۔ ایک دن اور گزرنے والا تھا اور آنے والی رات یقیناً ہماری آخری رات ہوتی۔ ہم وادی کے کنارے اپنے پڑاؤ میں سلیپنگ بیگز میں گھس کر لیٹ گئے اور موت کا انتظار کرنے لگے۔ دن ڈھل گیا اور رات سر پر آ گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنا وقت گزر گیا تھا لیکن جب کسی نے میرے سلیپنگ بیگ کو ہاتھ لگایا تو میں ہوشیار ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ڈیوڈ شا ہوگا لیکن جب میں نے سر باہر نکالا تو ایک مشعل بردار بوڑھے کو دیکھ کر حیران رہ گیا اس نے اس قیامت خیز سردی میں بھی ایک معمولی سا کرتا اور پاجامہ نما لباس پہن رکھا تھا۔ پھر مجھے یاد آ گیا وہ برف والا تھا۔ میں اسے نصف صدی بعد دیکھ رہا تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا۔ "عمر دراز اٹھ جاؤ۔"

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھ میں ذرا بھی سکت نہیں تھی لیکن جب اس نے کہا کہ میں اٹھوں تو میں حیرت انگیز طور پر اٹھ گیا۔ مجھے ذرا بھی کمزوری محسوس ہوئی اور نہ چکر آئے۔ اس سے زیادہ حیرت مجھے ڈیوڈ شا کو کھڑے دیکھ کر ہوئی۔ وہ بالکل ساکت کھڑا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "آپ برف والے بابا ہیں؟"

"میرے ساتھ چلو۔" اس نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا اور خود ایک طرف چل پڑا۔ میں اور ڈیوڈ شا روبوٹ کی طرح اس کے پیچھے چل پڑے جیسے اس کے حکم کے غلام ہوں۔ وہ اسی راستے تک پہنچا جہاں سے ہم نے نیچے جانے کی کوشش کی تھی اور راستہ غائب پایا تھا۔ لیکن جب برف والے کے ساتھ نیچے اترنے لگے تو راستے کو اپنی جگہ پا کر میں خود کو پاگل محسوس کرنے لگا تھا۔ پہلے یہاں صرف خلا تھا اور اب واضح راستہ نظر آ رہا تھا کیا یہ راستہ ابھی بنا تھا یا پہلے بھی موجود تھا مگر ہمیں نظر نہیں آیا تھا۔ ہمیں سنبھل کر اترنا پڑ رہا تھا لیکن برف والا یوں آرام سے چلا جا رہا تھا جیسے ہم اپنے گھر میں چلتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اوپر کیسے آیا اور ہمیں کیسے تلاش کر لیا اور یہ راستہ کہاں سے پیدا ہو گیا۔ سب سے بڑھ کر ہمارے اندر اتنی توانائی کہاں سے آ گئی کہ ہم اتنے دشوار راستے پر چلے جا رہے تھے جب کہ رات ہم میں ذرا بھی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔"

"ایک منٹ۔" میں نے بات کاٹی۔ "قطع کلامی کی معافی لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہی برف والا آدمی تھا جو نصف صدی پہلے آپ سے ملا تھا؟ کیونکہ اس وقت بھی اس کی عمر آپ کے مطابق کوئی سو سال سے زیادہ تھی یعنی اب وہ ڈیڑھ سو سال سے اوپر کا ہو چکا ہوگا؟"

"تو وہ اور کون ہو سکتا تھا؟" راجا عمر دراز نے الٹا سوال کیا۔ "پھر اس نے بعض باتیں ایسی کیں جن سے لگتا تھا کہ وہ وہی برف والا تھا۔"

"یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔"

"ہاں لیکن یہاں تو کوئی بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔" راجا عمر دراز نے کہا۔ "کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ عین ہمالیہ کے وسط میں ایسی چھوٹی وادی ہے اور انسان بھی آباد ہیں جو تہذیب یافتہ بھی ہیں اور ان کے پاس بجلی

ساری چیزیں ایسی ہیں جو آج کے ترقی یافتہ انسان کو حیران کرنے کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔" راجا عمر دراز کسی قدر جوش میں آ گیا تھا اسے خود بھی احساس ہو گیا تھا اس لیے وہ رک کر خود پر قابو پانے لگا پھر اس نے گہری سانس لی۔ "معاف کرنا برخوردار میں جذباتی ہو گیا تھا۔ اس وادی کے معاملے میں میں جذباتی ہو جاتا ہوں۔ بہرحال میں داستان مکمل کرتا ہوں۔ برف والا ہمیں کوئی تین ہزار فٹ نیچے لے کر آیا۔ تم سوچ سکتے ہو ہماری جو حالت ہو رہی تھی ہم اس میں ایک پہلے سے پہاڑی راستے پر کوئی ایک کلومیٹر نیچے آئے ہوں گے۔ اصل میں تو ہم نے تین کلومیٹرز سے زیادہ کا فاصلہ طے کیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک خواب کی کیفیت میں بغیر کسی کوشش کے سفر کر رہا ہوں اور یقیناً ڈیوڈ شا کی حالت بھی مجھ سے الگ نہیں تھی۔"

برف والا ہمیں اپنے ان مخصوص غاروں میں لایا۔ میں پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ [illegible] نے بھی اس جگہ کی سیر کی تھی۔ وہاں آگ جل رہی تھی اور درجہ حرارت خوش گوار تھا۔ برف والے نے ہمیں صاف ستھرے بستروں پر لیٹنے کا حکم دیا اور جب ہم لیٹ گئے تو وہ کہیں چلا گیا۔ ہم جاگ رہے تھے اور اپنے اندر توانائی بھی محسوس کر رہے تھے لیکن ہم چاہنے کے باوجود ان بستروں سے نہیں اٹھ پا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈیوڈ شا نے بھرائی آواز میں کہا۔ "راجا کیا ہم خواب دیکھ رہے ہیں؟"

"ایک خواب دو آدمی بیک وقت کیسے دیکھ سکتے ہیں؟"

"یہ شخص کون ہے؟"

"یہ برف والا ہے وادی کا نگراں۔" میں نے بتایا۔ "اس کی اجازت کے بغیر نہ کوئی نیچے جا سکتا ہے اور نہ کوئی نیچے سے اوپر آ سکتا ہے۔"

"یہ مدقوق سا بوڑھا۔" ڈیوڈ شا کو یقین نہیں آیا تھا۔

"یہی مدقوق بوڑھا ہمیں اوپر سے نیچے لایا ہے جبکہ ہم میں چلنے کی سکت بھی نہیں تھی۔"

"یہ کیسے لایا ہے ہم خود آئے ہیں اپنے پیروں پر چل کر۔" اس نے میری بات کو جھٹلایا۔

"اگر ایسی بات ہے تو اس بستر سے اٹھ کر دکھاؤ۔"

ڈیوڈ شا کچھ دیر ساکت پڑا رہا پھر اس نے بھرائی آواز میں کہا۔ "میں نہیں اٹھ پا رہا ہوں۔"

"کیونکہ وہ ہمیں منع کر گیا ہے اور جب تک وہ نہیں کہے گا ہم اس بستر سے نہیں اٹھ سکتے۔"

ڈیوڈ شا حیران ہوا تھا۔ "کیا یہ عمل تنویم کا اثر ہے؟"

"میں نہیں جانتا لیکن جہاں تک اس بوڑھے کے بارے میں جانتا ہوں کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔"

"اس میں ایسی کیا بات ہے یہ صرف ایک بوڑھا آدمی ہے۔" ڈیوڈ شا کا لہجہ تمسخرانہ ہو گیا تھا۔ "مجھے یقین ہے یہ میرا ایک ہاتھ بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔"

ڈیوڈ شا اپنی قومی عادت سے مجبور تھا اور لاف گزاف پر اتر آیا تھا۔ مجھے اس سے غرض نہیں تھا کہ اس کا کیا حشر ہوتا ہے لیکن میں نے پھر بھی اسے خبردار کر دیا۔ "ڈیوڈ شا اس

دلخراش منظر

[illegible]

بوڑھے کے بارے میں بات کرتے ہوئے محتاط رہو ایسا نہ ہو تمہیں کسی ناخوشگوار نتیجے سے گزرنا پڑے۔"

"تم مجھے اس بوڑھے سے ڈرا رہے ہو؟" ڈیوڈ شا کا لہجہ حقارت آمیز ہوگیا۔

"میں تمہیں صرف خبردار کررہا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ چپ ہوا لیکن زیادہ دیر چپ نہیں رہا۔ "یہ ہمیں چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے؟"

"میں بھی تمہاری طرح بےخبر ہوں۔"

"کہیں ہمیں نقصان نہ پہنچائے۔"

"اسے نقصان پہنچانا ہوتا تو ہمیں یہاں لانے کی زحمت نہ کرتا بلکہ صبح ہماری اکڑی لاشیں دیکھ کر خوش ہوتا۔" ڈیوڈ شا مطمئن ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ "ممکن ہے یہاں لاکر ہمارے ساتھ کچھ کرے۔"

"ڈیوڈ شا تمہارے جیسے آدمی کو اتنی بےچینی زیب نہیں دیتی.....ذرا صبر سے انتظار کرو، ابھی سب تمہارے سامنے آجائے گا۔"

ہم گرم لباس میں تھے اور باہر جیسی سردی بھی نہیں تھی اس لیے ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی بلکہ میں اتنا سکون محسوس کر رہا تھا کہ سو گیا۔ پھر مجھے بوڑھے نے اٹھایا۔ "اٹھ جاؤ نوجوان۔"

میں بےاختیار اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک بڑا سا پیالہ میرے سامنے رکھ دیا جس میں سوپ نما کوئی چیز تھی۔ اس میں سبز اور گلابی رنگ کی سبزیاں تیر رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ جب ماما وہاں کو برفانی عورت نے مرنے کے قریب پہنچا دیا تھا تو برف والے نے اسے ایسی قسم کا کوئی سوپ دیا تھا جس سے اس کی توانائی بحال ہوگئی تھی۔ برف والے نے ایسا ہی ایک پیالہ ڈیوڈ شا کے سامنے رکھا تھا لیکن وہ ساکت بیٹھا تھا۔ میں نے لکڑی کے چمچ سے سوپ پینا شروع کر دیا۔ بوڑھے نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔ "تم بھی پیو۔" اور ڈیوڈ شا نے سوپ پینا شروع کردیا۔

"ایک سوال ہے۔" میں نے پھر مداخلت کی۔ "بوڑھا آدمی آپ سے اور ڈیوڈ شا سے کس زبان میں بات کرتا تھا۔"

"میں نے بعد میں اس پر غور کیا تھا کیونکہ میں اس سے بےاختیار اردو میں بات کرتا تھا اور مجھے لگتا ہے کہ وہ جواب بھی اردو میں دیتا تھا جب کہ ڈیوڈ شا اس سے انگریزی میں بات کرتا تھا۔"

"آپ کو لگتا ہے۔ یعنی آپ کو یاد نہیں ہے کہ وہ آپ سے کس زبان میں بات کرتا تھا۔"

"سچ کہوں تو مجھے بالکل یاد نہیں ہے بس اتنا احساس ہے کہ وہ ہماری بات سمجھ لیتا تھا اور ہمیں اپنی بات سمجھا دیتا تھا۔" راجا عمر دراز نے کہا۔ "شاید یہ ٹیلی پیتھی کی کوئی قسم تھی۔ بہرحال وہ ہمیں جو سمجھانا چاہتا تھا وہ ہماری سمجھ میں آجاتا تھا۔ اس کے حکم پر سوپ پی کر ہم سو گئے تھے۔ جب ہم جاگے تو وہ دوبارہ ہمارے لیے سوپ لے آیا تھا اور اس بار بھی سوپ پی کر ہم سو گئے تھے۔ تیسری بار جب اس نے ہمیں جگا کر سوپ دیا تو میں نے اس سے کہا۔ "تم ہمیں سوپ دے کر سلا کیوں دیتے ہو؟"

"اس سے تمہاری توانائی جلد بحال ہو جائے گی کیونکہ تمہیں ابھی بہت طویل سفر کرنا ہے اور اس میں تمہیں توانائی کی بہت ضرورت پڑے گی۔"

"میں ابھی بھی خود کو توانا محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے اصرار کیا۔

"تم ابھی کمزور ہو۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "اپنے حواس پر زیادہ بھروسا مت کیا کرو یہ تم کو تمہارے بارے میں دھوکا دیتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" میں اس سے بحث پر آمادہ ہوگیا تھا۔

"اوپر جب تم لوگ خود کو کمزور محسوس کر رہے تھے۔ تب تمہارے حواس دھوکا دے رہے تھے درحقیقت تمہارے اندر اتنی توانائی تھی کہ تم میرے ساتھ چل کر اتنے دشوار راستے سے نیچے آگئے۔"

"تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا جو ہم اتنی دور چل کر آگئے۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا صرف تمہارے ذہن کو حکم دیا کہ وہ اپنی اضافی اور چھپی ہوئی طاقت استعمال کرے اور یوں تم نیچے آگئے۔"

"ہم اسی راستے سے نیچے آئے تھے لیکن کچھ نیچے آکر راستہ بالکل غائب ہوگیا تھا۔"

"تمہیں یاد ہے جب تم اور ولیم شا یہاں سے جا رہے تھے تو میں نے کہا تھا اگلی بار ہاتھ والے کو ساتھ لاؤ گے تب تمہیں وادی میں اترنے کی اجازت ملے گی۔"

"میں نے کوشش کی تھی لیکن وہ آنے کے لیے تیار نہیں ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "خدا کے لیے مجھے وادی میں جانے دو۔ صرف ایک بار جانے دو۔"

"ممکن نہیں ہے۔" وہ بدستور نرمی سے کہہ رہا تھا۔ "میں تمہیں اجازت دے سکتا ہوں لیکن مجھے تمہیں

اجازت دینے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کس کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔"

"میں نہیں بتا سکتا۔ تمہارے لیے صرف ایک صورت میں اجازت ہے کہ تم ہاتھ والے کو ساتھ لاؤ۔"

"اور اگر میں اسے نہیں لا سکا تو؟"

"تو تم وادی میں نہیں جا سکو گے لیکن وہ آئے گا اور تمہارے ساتھ آئے گا۔" بوڑھے نے اتنے یقین سے کہا کہ مجھے بھی یقین آگیا۔ پھر اس نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ "وادی میں اترنے کی اجازت صرف اسی کو ملے گی جو ہاتھ والے کو لے کر آئے گا۔"

ڈیوڈ شا غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ میں اور بوڑھا اردو میں بات کر رہے تھے لیکن اردو اسے آتی تھی۔ وہ ہماری گفتگو سمجھ رہا تھا۔ بوڑھے کی بات پر اس نے کہا۔ "اگر میں ہاتھ والے کو لے آؤں تو؟"

"تو تم بھی وادی میں جا سکو گے۔" بوڑھے نے کہا اور وہاں سے چلا گیا کیونکہ اس بار اس نے ہمیں سونے کا حکم نہیں دیا تھا اس لیے ہم جاگتے رہے۔ ورنہ وہ جب کہتا سو جاؤ تو ہم فرمانبردار بچوں کی طرح اس کے حکم پر سو جاتے تھے۔ میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔

"تم نے اس کی باتیں سنیں؟"

"ہاں اور سمجھ بھی رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "قدرت نے ہمارے جسم میں توانائی کے پوشیدہ ذخائر رکھے ہیں جو ہنگامی حالات میں کام آتے ہیں۔ ایک بار یہ ذخائر خرچ ہو جائیں تو دوبارہ بڑی مشکل سے بنتے ہیں۔ یوں سمجھو لوگ یہ ہمارے اندر کی بیٹری ہے اور ہم جو روزانہ کھاتے پیتے ہیں وہ روزانہ کا پلگ ہے جو ہمیں توانائی دیتا ہے لیکن کبھی اچانک پلگ نکل جائے یا پاور بند ہو جائے تو ہم بیٹری سے چلتے ہیں۔ بیٹری دیر سے چارج ہوتی ہے۔ اس وقت یہ ہمیں طاقت ور غذا دے کر ہماری اندر کی بیٹری چارج کر رہا ہے کیونکہ وہ اوپر سے نیچے آتے آتے خرچ ہو چکی ہے۔ ہم جتنا سوئیں گے اور آرام کریں گے ہماری بیٹری اتنی جلدی چارج ہو جائے گی۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔ "اس کا کہنا ہے ہمیں ابھی طویل سفر کرنا ہے۔"

ڈیوڈ شا مسکرایا۔ "کیا تمہیں یقین ہے ہم وادی کے اتنے قریب آکر دوبارہ واپس چلے جائیں گے؟"

"تب تم بتاؤ ہمارے پاس اور کون سا راستہ ہے؟ جو شخص صرف حکم دے کر ہمیں میلوں دشوار راستوں پر چلائے جبکہ اس سے پہلے ہم میں چلنے کی سکت بھی نہ ہو اور پھر ایک

ایک شخص کسی کام کے سلسلے میں کسی فلسفی کے پاس گیا۔ وہاں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا فلسفی سے ملنا آج ہی کیوں ضروری ہے۔ کل مل لیا جائے گا۔
یہ سوچ کر وہ واپس آنے لگا تو فلسفی نے اسے اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ "تم واپس کیوں جارہے تھے؟"
اس شخص نے جواب دیا۔ "آپ کے پاس ہجوم دیکھ کر واپس جارہا تھا کل پھر حاضری دیتا۔"
فلسفی نے کہا۔ "تم ایک قابل انسان ہو لیکن زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ کوئی شخص آج کا کام کل پر چھوڑے اور کل کا انتظار کرے۔"

یار کہے اور ہم سو جائیں تو اس کے حکم کی سرتابی ہم کس طرح کر سکتے ہیں۔"

"یہ صرف ایک انسان ہے اور ہمیں کسی عمل سے اپنے قابو میں کر لیتا ہے۔ کیا ہم اس کا توڑ نہیں کر سکتے؟"

"کیسے کر سکتے ہیں؟"

"ہر چیز کا اثر اس کے وجود کے ساتھ ہوتا ہے اگر اس کا وجود ہی نہ رہے تو اثر کیسے باقی رہے گا؟" ڈیوڈ شا کا لہجہ یہ کہتے کہتے معنی خیز ہوگیا تھا۔

میں نے اسے شک سے دیکھا۔ "ڈیوڈ شا تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"دیکھو راجا ہم اتنی دور سے اور اتنی کوشش کر کے یہاں اس لیے نہیں آئے ہیں کہ ایک ناتواں بوڑھے کے کہنے پر واپس چلے جائیں۔"

"وہ بوڑھا ضرور ہے لیکن ناتواں نہیں ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "وہ اتنا طاقت ور ہے کہ ہمیں اپنے حکم پر چلا رہا ہے۔"

"وہ کتنا ہی طاقت ور صحیح لیکن ہے تو ایک انسان۔" ڈیوڈ شا نے اصرار کیا۔ "اور ہر انسان کی طرح اسے بھی موت آئے گی۔ اگر وہ نہ رہے تو اس کا حکم یا وادی میں اترنے کے اجازت نامے کی کیا حیثیت رہ جائے گی؟"

میں کانپ گیا تھا۔ ڈیوڈ شا برف والے بوڑھے کی زندگی کے خاتمے کی بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "ڈیوڈ شا ایسا سوچنا بھی مت.....وہ بوڑھا ہمارا محسن بھی ہے اور اگر وہ ہمیں یہاں نہ لاتا تو اب تک ہم مر چکے ہوتے۔"

"وہ اپنی غرض سے ہمیں یہاں لایا ہے۔ اسے ہاتھ والے یعنی شہباز کی ضرورت ہے۔"

"اگر وہ غرض سے بھی لایا ہے تب بھی ہمارا محسن ہے۔" میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں اچھی طرح جان گیا ہوں تم خود غرض انسان ہو جو اپنی خواہش پر کسی انسان کو قربان کرسکتے ہو۔"

"ہاں میں ایسا کرسکتا ہوں کیونکہ آج کی دنیا کا اصول یہی ہے جو تمہاری راہ میں رکاوٹ بنے اسے ہٹا دو۔" اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

"ڈیوڈ شا اگر تم اپنے ذہن میں کوئی الٹا سیدھا خیال لا رہے ہو تو بہتر ہے اسے نکال دو۔ یہ بوڑھا تمہارے اندازوں سے بہت آگے کی چیز ہے، میرا خیال ہے تم صرف نقصان اٹھاؤ گے اس سے ٹکرانے کی صورت میں۔"

وہ مسکرانے لگا۔ "تم تو سنجیدہ ہوگئے، میں مذاق کر رہا تھا۔ میں مانتا ہوں یہ ہمارا محسن ہے۔"

اگرچہ ڈیوڈ شا نے اچانک پٹری تبدیل کی تھی لیکن مجھے اس پر اعتماد نہیں تھا وہ کوئی ایسی حرکت کرسکتا تھا جس سے ہم دونوں ہی مشکل میں پڑ جاتے۔ اس بار ہم جاگتے رہے تھے لیکن بستر سے نہیں اٹھے تھے۔ میں نے اٹھنے کا سوچا لیکن اٹھا ہی نہیں گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ بوڑھے کی طرف سے ہمیں اجازت نہیں ہے۔ بے بسی سے بستر پر پڑے رہنا اور اپنی مرضی سے ہل نہ پانا کتنا بڑا عذاب ہے یہ میں نے اس دن جانا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ بوڑھا ہمیں پہلے کی طرح سلا جاتا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ ہم اسے آواز بھی نہیں دے سکتے تھے ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ہم تقریباً سات آٹھ گھنٹے اسی حالت میں پڑے رہے۔ ڈیوڈ شا اب خاموش تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ اس کا شاطر ذہن کچھ سوچنے میں مصروف ہے۔

پھر بوڑھا آیا اور پہلے ہمیں غار کے ایک اندرونی حصے میں لے گیا جہاں ایک نالا بہہ رہا تھا۔ یہ جگہ رفع حاجت کے لیے مخصوص تھی۔ ہم فارغ ہو کر آئے تو اس نے پھر سوپ پلایا اور سونے کا حکم دیا اور ہم سو گئے۔ تین بار ایسا ہی ہوا تھا۔ یعنی ہم نے اس کا تیار کردہ سوپ سات بار پیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق ہر آٹھ گھنٹے بعد پیا تھا یعنی ہمیں وہاں آئے ہوئے دو دن گزر چکے تھے۔ اس بار بوڑھے نے ہمیں سوپ نہیں دیا بلکہ سوکھا گوشت کھانے کو دیا۔ یہ مزے کا تھا میں نے سوچا ہی نہیں کہ یہ حلال ہے یا حرام لیکن اسے کھاتے ہوئے نہ تو مجھے کراہت ہوئی اور نہ خیال آیا کہ جانور ذبح بھی ہے یا نہیں۔ پھر بوڑھے نے ہمیں وہ تھیلے دیے تھے۔ "یہ تم دونوں کے سفر کے لیے ہے اور تم اس کی مدد سے دس دن آرام سے گزار سکتے ہو۔"

"کیا ہمیں واپس جانا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔ وادی کے اتنے نزدیک آ کر واپس جانے کے خیال سے میرا دل ڈوب رہا تھا۔ یہیں وہ ہستی تھی جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھی۔ میں اس سے ایک بار ملنے اور ایک بار دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ بوڑھے نے جان لیا تھا اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"تم فکر مت کرو تم واپس آؤ گے اور اس سے ملو گے۔ یہ اوپر والے نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے اور پھر تم یہیں رہ جاؤ گے۔"

"لیکن ہاتھ والا..." میں نے کہنا چاہا تو اس نے روک دیا۔

"اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرو اور اب چلنے کی تیاری کرو۔" اس نے تحکمانہ انداز میں کہا جس کے بعد چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ مجبوراً میں نے گوشت کا تھیلا اپنے شانے پر لادا۔ ڈیوڈ شا نے اپنا تھیلا اٹھا لیا تھا۔ ہم بوڑھے کے ساتھ اس کے غار سے باہر آئے اور اوپر چڑھنے لگے۔ یہی راستہ اب میری نظروں کے سامنے نیچے جا رہا تھا لیکن میں نیچے نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے اوپر جانا تھا اور واپس جانا تھا۔ بوڑھا ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کے پیچھے ڈیوڈ شا تھا اور سب سے پیچھے میں تھا۔ اترنے کے مقابلے میں چڑھائی زیادہ دشوار ہوتی ہے لیکن مجھے اوپر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ یہ شاید بوڑھے کی دی ہوئی خوراک کا کمال تھا کہ اتنی سال کی عمر میں بھی میں جوانوں کی طرح ایک دشوار ترین پہاڑی دیوار پر چڑھ رہا تھا۔

اس جگہ جب معمولی دھند تھی لیکن یہ راستہ دیکھنے میں رکاوٹ پیدا نہیں کر رہی تھی۔ بوڑھے کے ہاتھ میں موجود مشعل کی روشنی سے راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دھند کا مطلب تھا کہ دن کا آغاز ہوگیا ہے۔ ابھی ہم کچھ اوپر گئے ہوں گے کہ میں نے ڈیوڈ شا کی رفتار تیز ہوتے دیکھی۔ وہ بوڑھے کے پاس جا رہا تھا۔ اگر میرا ذہن رنج میں نہ ڈوبا ہوتا تو مجھے احساس ہو جاتا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ اچانک ہی میں نے ڈیوڈ شا کو بوڑھے کے قریب جاتے اور اسے ہاتھ سے دھکا دیتے دیکھا۔ یہ موڑ تھا اور بوڑھا آگے خلا میں گیا تھا جس کے بعد ہزاروں فٹ تک صرف خلا ہی تھا۔ میں دم بخود رہ گیا تھا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(سید احمد چاند، کراچی کا جواب)

ناہید نگین..........فیصل آباد

نقد دل و جان اس کی خاطر چاہیے رنگین جام کرو
میر کے بادۂ غم خوردہ کو سے خواروں میں عام کرو

عرفان منور بٹ..........اوسلو، ناروے

نکل کے خلد سے بھی آدمی نہ پچھتایا
زمیں پہ بھی چمن آرائی گماں نہ گئی

(تحسین عباس، سرگودھا کا جواب)

سید احمد چاند..........کراچی

اڑتے ہوئے پنچھیوں کو کوئی قید نہیں کرسکتا
جو اپنے ہوتے ہیں وہ خود ہی لوٹ آتے ہیں

مہوش رضا..........حب، بلوچستان

اچھا نہیں ہے لفظ تمہاری زبان پر
لفظ وفا کی تم نہ دہائی دیا کرو

ناہید جوکھیو..........ڈیرہ مراد جمالی

اب اپنی جوانی کے قصے لاتے ہیں رقم کرنے کے لیے
اے عمر رواں آہستہ چل کہیں سانس نہ پھول کے رہ جائے

(ضیا یاسین، حیدرآباد کا جواب)

نوشین ناز..........کراچی

ابھی پایا بھی نہیں تھا کہ اسے کھو بھی دیا
اپنی عادت ہے ہر کام میں عجلت کرنا

سید سبط حسن گردیزی..........ملتان

اس کی نفرت کا بھی معیار جدا ہے سب سے
وہ الگ اپنا ایک انداز نظر رکھتا ہے

افسر بخاری..........شاہ پور

انگلیاں برق زدہ رہتی تھیں جیسے اس نے
اپنے رخساروں کو چھونے کی اجازت دی ہے

سنبل..........سکھر

آشناؤں کی سونی دنیا میں
سوگئی یہ ساتیں ہوتی ہیں

فیصل بخاری..........شاہدرہ

ایک ہی جیسے لوگ تھے سارے ایک ہی جیسے چہرے تھے
دھندلی کر دیں سب تحریریں بارش کے ان قطروں نے

(انجم جہاں، روزی کا جواب)

راجا ثاقب نواز..........رتی ٹبی ساہیوال

بڑی انوکھی عید کی خریداری ہے میرے شہر قائد میں
لوگ رو رو کے کفن خرید رہے ہیں اپنے جانشینوں کے لیے

(میاں سجاد جمیل زرگر، ماہڑہ کا جواب)

نوازش عمر..........علی پور، چٹھہ

نہ چلا کام محبت کا محبت کے چلائے
چاہوں کس طرح تجھے تو ہی بتا آج مجھے

(محمد سعید قاسمی، ڈلوال کا جواب)

افشاں غزل..........کراچی

حیات و موت سے اب اور کتنا سوچو گے
زمیں سے لوٹ کے جانا کہیں تو جانا ہے

نواز وفا..........دینہ، جہلم

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

(روحی اکرام، کراچی کا جواب)

محمد سعید قاسمی..........ڈلوال

ہم سے آوارہ پھرا کرتے ہیں گلیوں میں کہیں
شام ہوتے ہی وہی لوگ تو گھر جاتے ہیں

(ظلِ جان سرہندی، میرپور خاص کا جواب)

نوشین اشرف..........حیدرآباد

اتنا تسلسل تو میری سانسوں میں بھی نہیں فراز
جس روانی سے وہ شخص مجھے یاد آتا ہے

غازی خان..........لاہور

اس کے انکار پہ بھی پھول کھلے رہتے تھے
اس کے انفاس سے بھی شمع جل جاتی ہے

شاہ بتول..........سرگودھا

آواز دیے جاتا تھا دل دور سے اس کو
گو اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا بھی نہیں تھا

علی رضا خان..........ساہیوال

اڑ کے اب کوئی پرندہ شاخ پر آتا نہیں
جیسے ہر شاخ شجر سے ان کا پر کٹنے لگا

(فائزہ شہزاد، پچے ور کا جواب)

نسیم اعوان......چنیوٹ

یوں تو پتھر کی بھی تقدیر بدل سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ اسے دل سے تراشا جائے

بیگم افسر جہاں وائیں......لاہور

یہاں پھول ہوں گے یہاں خواب ہوں گے
یہاں خار بھی فصلِ گل میں پلیں گے

ناصر حسن......پتوکی

یہ کیسی تاج پوشی ہے یہ کیسی جامہ زیبی ہے
کہ پوشاک سے بھی تن کی عریانی نہیں جاتی

حبیب شاعر......پنڈی بھٹیاں

یہاں یہ ہوتے ہیں ہر روز بم دھماکے ہی
ہے کیوں نہیں بھلا یہ میری سرزمیں محفوظ

(نازیہ آرزو، نیلم آزاد کشمیر کا جواب)

عقیل الرحمن......کھاریاں

بے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

(حسنین عباس بلوچ، سرگودھا کا جواب)

نزہت شان حسین......جہلم

نفس کی کرتا حفاظت اے مولا خاتم کی
ابھی تلک تری بندگی کا ہے یقیناً محفوظ

ملک جاوید محمد خان سرکانی......جھنگ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

(نوشین ناز، کراچی کا جواب)

سبیکہ محسن......شادی پور

ابھی صورت بھی تصویر بدل دیتا ہے
وقت جاتے ہوئے تقدیر بدل دیتا ہے

(سبط حسن گردیزی، ملتان کا جواب)

علی زیب......لاہور

دیدار گردشِ تقدیر کا عالم دیکھا
گیسوئے یار کی ہے ناصری الجھن کی طرح

زوہا حسن......کراچی

بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا
صد شکر کہ ہے کاتبِ تقدیر کوئی اور

اشرف خان......کراچی

بچھڑ جانا جن سے ناممکن سمجھتا تھا میں کل تک
مجھے اُن سے بچھڑے اب تو زمانے گزر گئے

(مومل، بھکر کا جواب)

نصرت حسن......بھکر

اپنی تقدیر کو بیٹھے جو پریشاں ہے کوئی
آپ کے بس میں علاجِ غمِ دوراں ہے کوئی

فیضیہ یسین......سیالکوٹ

آگہی فہم و فراست، عقلِ کل
سب حادثی جبل کا ہیجان ہے

ایدا ربیعہ......سیالکوٹ

آپ ہمارے دل میں کہیں تھے برسوں پہلے صدیوں پہلے
یوں لگتا ہے جیسے کہیں تھے برسوں پہلے صدیوں پہلے

نزہت امین......حیدرآباد

اندھے بہرے گونگے لفظ اب سوچ رہے ہیں مستقبل
پتھریلے ہاتھوں میں خنجر ہے جیسے مقدر کاغذ کا

نعمان بشیر......پشاور

ابھی ہیں سیکڑوں حرف و ضمیر کے تاجر
چلے گا جامِ سیاست کا کاروبار ابھی

(نجمہ علی زئی، کراچی کا جواب)

نواب حسن نواب......کراچی

یہ ایک کیوں یہ تمنائے خودکشی کیسی
نوید فتح ہے قلبِ عوام کی دھڑکن

جاوید آرائیں......حیدرآباد

شامِ غم کی سیاہی یہ زندگی کا جمود
قمر میں دیکھتا ہوں صبح کے بھی آثار

نصرت شاہین......لاہور

یاد آئی تری ستانے لگی آج مجھے
لے اڑی صاف یہ متوالی ہوا آج مجھے

☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر حذف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش 74

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک گمی سرگزشت" کے عنوان سے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اکتوبر 2011 تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

652 ہجری میں مومن آباد پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ والد سلطان التتمش کے دربار سے منسوب تھے۔ ابتدا میں سلطانی تخلص کیا اور فارسی میں شعر گوئی کی پھر ایک بلند مرتبہ صوفی نے زندگی کا رخ بدل دیا اور وہ بیعت کے بعد اسی در کے گدا بن گئے۔ انہی دنوں مقامی زبان میں شعر کہنے لگے گویا اس زبان کے پہلے شاعر کہلائے۔ نظم و نثر کی ننانوے کتب تصنیف کیں۔ 8 شوال 725 ہجری کو راہی ملک عدم ہوئے۔

علمی آزمائش 72 کا جواب

1861ء میں رابندر ناتھ ٹیگور بنگال کے شہر کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ادب سے خصوصی لگاؤ تھا۔ عمر کے ساتھ شوق پروان چڑھتا رہا۔ کہانیاں لکھیں، ڈھیروں ڈھیر لکھیں۔ شاعری بھی کی اور خوب کی۔ شاعری میں انقلاب بپا کر دیا۔ لائے کہ اس کی موسیقیت کو بہت زیادہ اجاگر کیا۔ خاندانی جاگیر سے خاصی آمدنی تھی۔ فکر معاش نہ تھی پھر بھی پڑھنے کے لیے انگلینڈ بھیج دیا گیا۔ صرف تین مہینے تعلیم حاصل کی مگر انسانی صحبت نے تجربے کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ 1919ء میں سر کا خطاب ملا جو جلیانوالا باغ کے ظلم پر انہوں نے واپس کر دیا۔ 1913ء میں انہیں ادب پر دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ ملا۔ 1941ء میں موت سے جا ملے۔

انعام یافتگان

1- عفت سحر، جہلم 2- نادر خان حسن زئی، کوئٹہ 3- سلیم اللہ خان، لاہور
4- نایاب حیدر، کراچی 5- صنوبر بخاری، ملتان

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے: سید احترام حسین رضوی، سید عزیز الدین، سمعیہ عارف، احمد دین، محسن اختر بلوچ، سعید احمد چاند، بابر توفیق، نہال قیوم، راجا رشید، طارق حبیب، آفتاب منصور، سنجیدہ احمد، زبیر ملک، محمد نیفان، عامر اسلام محمود، امیر الاسلام، عامر زبیر چوہدری، ثانیہ احسن، حسن عباس، طارق علی خان، فرمودہ فاطمہ، اختر عباس، نوید حسن، امیر الدین، نوید احسن، جمیل عثمانی، بابر توفیق، پروین کنول، نوید الحسن، مرزا بیگ، شوکت علی قادری، اقبال حسن، نعمت مرزا، حسن خان ابچزئی۔ لاہور سے: انجم معراج، کوکب جمیل، شوکت ملک، چوہدری اشفاق، احسان الحسن، مہوش خان، کوکب بلقیس، بہادر خان ابچزئی، احتشام لاہوری، کلیم ولی، شاہینہ بتول، شاہنواز شاہ، ثناء اللہ بخاری، نوشین اختر، شازیہ اکرام، شوکت ملک، حبیب بخش، منظر علی خان، افتخار احمد تارڑ، حافظ عمران۔ ملتان سے: دلاور خان، سبط حسن گردیزی، نعمت خان، دلنواز خان، انجم جہاں، شہباز تسلیم، انصار حسین، درویش شاہ، اکرم شیخ، کلثوم ترین، زینب انصاری، امام بخش ملک، امام بخش، محسن عباس بھٹی۔ رحیم یار خان سے: عماد اللہ دانش، کاشان لاشاری۔ اسلام آباد سے: زیب النساء، بیگم زیدی، کائنات مرزا، ایمن غزل، ممتاز عرفان، اکبر حیات خان، شہزادہ زیب حسن خان، ثناء اللہ بخاری، غزالہ تبسم، اکبر خان، ثمینہ عزیز، انور یوسف زئی، شمین جاوید۔ راولپنڈی سے: بے بی اسلام شیخ، سید لطافت حسین، یاسمین اختر، نازیہ کنول۔ فیصل آباد سے: مرتضیٰ پاشا، منیر اختر، نعمان اشرف، ریحان اشرف، احمد علی شاہ، عامر نصیر، صدیق افضل، محمد فیض، عمران لاشاری، عباس طاہری، گلشن، منیب الحسن۔ مظفر گڑھ سے: فہد شاہین، قادر خان، سمعیہ ڈولو، نصیب الاسلام۔ بھکھر سے: ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی۔ ساہیوال سے: نصرت فتح خان، اسد خان، چوہدری اشفاق اللہ، عباس سید۔ میرپور خاص سے: مرزا طاہر الدین بیگ، منور یزدانی اختر، محمد طلحہ جان سرہندی، شہلا انیس، شازیہ انیس، ملکہ نوشین۔ میرپور، آزاد کشمیر سے: طلحہ جان، نصیر بھٹ۔ گلگت سے: محمود الحسن شاہ، جان شاہ، حب علی، دلدار حسن۔ حیدرآباد سے: آصف کریم، نسرین یاسمین، ملک نوروز، فتح محمد، نعمان قریشی، مرزا اسد بیگ، ابرار شیخ، فیض اللہ انصاری، صالح الدین، نعیم انصاری، نصرت جہاں۔ بہاولنگر سے: سلیم کامریڈ (کھاناں) ضیغم علی۔ ڈگری سے: نعیم شاہ، فرحال ٹھوکر، شازیہ حسن۔ بہاولپور سے: آمنہ ملک، زرولی خان، اشرف حسین۔ چنیوٹ سے: مصطفی حسن زیدی۔ بگرام سے: آصف خان ابچزئی۔ دیپال پور سے: امیر الدین نظامی۔ گوجرہ سے: انجم تاثیر، نوید حسن۔ گھوٹکی سے: مہوش حسن، پروین فرحت۔ منڈی بہاؤالدین سے: فیصل خان، فہمیدہ ارشد۔ ہارون آباد سے: غزالہ فرحت۔ گجرات سے: سید اظہار الحسین جعفری۔ حویلی لکھا سے: دلنواز خان حسن زئی۔ ڈی جی خان سے: محبوب حسین نادر۔ پاک پتن سے: کاشان حسین۔ ڈی آئی خان سے: شازیہ ارم۔ بنوں سے: منظم طارق۔ میاں چنوں سے: نعیم حسن، خالق کریم کریمی۔ بھیرہ سے: محمد طفیل۔ حاصل پور سے: محمد ناصر۔ فاضل پور سے: شاہدہ آفریدی۔ جہلم سے: محمد طفیل چوہدری (دینہ) شیر محمد، شبیر دائمی، نوشین انصر۔ نوشہرہ سے: فضل محمد، نعمت اللہ۔ سیالکوٹ سے: نوید شہزاد خواجہ، عباس لاثانی۔ سرگودھا سے: طارق سلطان قریشی، عارف شاہ، نوید اکبر۔ واہ کینٹ سے: نور افضل خان خٹک، ماریہ عرفان، فیض جوکھیو۔ گوجرانوالہ سے: ندیم شوکت، نعمان اشرف۔ پشاور سے: فائزہ شہزادہ، جویریہ شیر نواز، شمشیر سنگھ خالصہ۔ جام شورو سے: منصور احمد، ابرار بھٹو، نواز علی لاشاری، محمد شاہد خان۔ حافظ آباد سے: محمد ابراہیم، محمد صدیق مستری۔ ننکانہ صاحب سے: فرانسس تھو۔ جھنگ سے: امجد علی انجم (احمد پور سیال) اٹک سے: مرغوبہ اقبال (شادی خان)

ممالک غیر سے: اشفاق اللہ خان (شارجہ، یو اے ای)، نعیمہ اسعد (مانچسٹر، یو کے)، زینب فاخر، تہذیب الحسن، عباس فاضلانی (ٹورنٹو، کینیڈا)

وہ ایک لمحہ

محترم مدیر اعلیٰ!
سلام مسنون
اس ایک لمحے نے کیا سے کیا کر دیا جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا مگر یہ سب ہوا کیسے؟ وہ لڑکا جو انجینئرنگ میں ٹاپ کر رہا تھا، قاتل کیسے اور کیوں بنا یہ تمام واقعات میں نے لکھ دیے ہیں۔ کچھ بھی چھپایا نہیں ہے۔ اپنی آپ بیتی سب کو دکھ بھری لگتی ہے۔ اب پتا نہیں قارئین کو میری آپ بیتی کیسی لگے گی!

سعید الرحمن
(کراچی)

میں اس دن بھی اسکول جانے کے بجائے اپنے ہی جیسے بچوں کے ساتھ کھیلنے نکل گیا تھا۔ ابا نے زبردستی مجھے اسکول میں داخل تو کرا دیا تھا لیکن پڑھائی میں میرا دل بالکل نہیں لگتا تھا۔ جب تک چھوٹا تھا، مارے باندھے پڑھتا رہا اور کسی نہ کسی طرح رو دھو کر میں نے پانچویں کلاس پاس کر لی۔

ابا نے مجھے سیکنڈری اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ اسکول بھی سرکاری تھا۔ اس میں اور پرانے اسکول میں فرق یہ تھا کہ یہاں بیٹھنے کے لیے پھٹی پرانی بوسیدہ دری کے بجائے ٹوٹی پھوٹی بنچیں تھیں۔ دوسرے سرکاری اسکولوں کی طرح یہاں بھی ایک طرح کی ویرانی و وحشت تھی۔ دیواروں کا پلاسٹر اکھڑا ہوا تھا، کمروں کے دروازے یا تو بالکل غائب تھے یا پھر کسی کی چوکھٹ میں دروازے کا ایک پٹ جھول رہا تھا۔

ٹیچر کے بیٹھنے کے لیے جو کرسی تھی، وہ بھی نہ جانے کیسے چار ٹانگوں پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے آگے بدرنگ سی ایک میز تھی جو ہاتھ لگاتے ہی چوں چوں بولتی تھی۔

اب آپ ہی بتائیے، ایسے ماحول میں کوئی کیسے پڑھ سکتا ہے۔

ابا کی چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی۔ اس دکان سے اتنی ہی آمدنی ہوتی تھی کہ وہ کھینچ تان کر گھر کا خرچ چلا سکیں۔

ہم فیڈرل بی ایریا میں ایک سو بیس گز کے ایک پورشن میں رہتے تھے۔ مکان کا آدھا حصہ تایا کے پاس تھا۔ ساٹھ گز میں ابا، میں، اماں اور مجھ سے چھوٹی بہن شہلا رہتی تھی۔ مکان میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے، چھوٹا سا ایک برآمدہ تھا اور برائے نام صحن تھا۔ ان دو کمروں میں سے ایک کو اماں نے دو چار کرسیاں اور ایک پرانا سا تخت ڈال کر بیٹھک بنا دیا تھا جسے وہ ڈرائنگ روم کہتی تھیں۔ ہاں، اچھے سلیقے سے انہوں نے اس ڈرائنگ روم کو بھی خوب چمکا کر رکھا تھا۔ کرسیوں پر کور چڑھا دیے تھے اور ان پر اپنے ہاتھ سے بنا کر کشن رکھ دیے تھے۔ تخت پر بھی دری اور چاندنی بچھانے کے بعد اماں نے قالین کا ایک ٹکڑا ڈال دیا تھا جو وہ اتوار بازار سے خرید کر لائی تھیں۔

یہ تھی ہمارے گھر کی کائنات!

ابا خود تو پڑھ نہیں سکے تھے لیکن مجھے اور شہلا کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ مجھ سے انہیں بہت امیدیں تھیں کہ میں پڑھ لکھ کر گھر کے تمام دلدر دور کر دوں گا۔ اب میرے سادہ لوح ابا کو کون سمجھاتا کہ پیلے اسکولوں میں پڑھنے والے بچے لاکھ قابل اور ذہین ہوں، ان کے مقدر میں کلرکی یا اسی قسم کی چھوٹی موٹی ملازمتیں ہوتی ہیں۔

ایسے موقعوں پر لوگ ڈاکٹر عبدالسلام، ڈاکٹر قدیر خان اور ڈاکٹر عطیم الزماں صدیقی کی مثالیں دیتے ہیں۔

وہ جس زمانے میں اسکول میں پڑھتے تھے۔ اس دور میں صرف اسکول ہوا کرتے تھے۔ یہ ٹیلے اور پیلے کی اصطلاحات تو بعد میں وجود میں آئی ہیں۔

میں بات کر رہا تھا اپنے اسکول کی اور کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔
ابا کا خیال تھا کہ پڑھ لکھ کر مجھے گورنمنٹ نہیں تو پرائیویٹ نوکری ضرور مل جائے گی۔
تایا ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش حال تھے۔ وہ منڈی میں پیاز اور آلو وغیرہ کی آڑھت کرتے تھے۔ اب تو ان کے دو بیٹے بھی جوان ہو گئے تھے اور کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان کا بزنس خوب ترقی پر تھا۔ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے حصے کے مکان کی تین منزلیں بنالیں۔
ہمارا مکان اسی حالت میں تھا جس حالت میں دادا جان نے چھوڑا تھا۔
ابا کو مجھ سے اتنی امیدیں تھیں اور میرا یہ حال تھا کہ اسکول جانے کے نام ہی سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ یوں بھی اسکول میں پڑھائی وغیرہ تو کچھ ہوتی نہیں تھی۔ ٹیچرز سارا وقت کلاس روم میں بیٹھی گپ شپ لگاتی رہتی تھیں اور ایک دوسرے کی غیبتیں کرتی رہتی تھیں۔ اس سے وقت ملتا تو وہ کلاس میں آنے کا تکلف بھی کر لیتیں۔ وہ بھی پڑھانے کے لیے نہیں بلکہ بچوں کی پٹائی کے لیے۔ لگتا تھا وہ گھروں سے اپنے شوہروں سے لڑ جھگڑ کر آتی ہیں۔
اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اسکول سے بھاگنے لگا۔ میرے ساتھ تین چار لڑکے اور بھی ہوتے تھے۔ ہم لوگ اسکول سے بھاگ کر کسی پارک میں جا بیٹھتے یا سڑکوں پر آوارہ گردی کر کے وقت گزارتے۔
ایک دن ابا کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ میرے اسکول جا پہنچے وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ سعید تو پچھلے پندرہ دن سے اسکول نہیں آ رہا ہے۔
ابا خاموشی سے واپس آ گئے۔ انہوں نے اس دن دکان بھی جلدی بند کر دی اور گھر پر بیٹھ کر میرا انتظار کرنے لگے۔
میں آوارہ گردی کرنے اور اسکول کا وقت گزارنے کے بعد ابا کی دکان کا ایک چکر ضرور لگایا کرتا تھا۔ ابا مجھے اس وقت ایک دو روپے دیتے تھے۔
اس دن بھی میں روپے کے لالچ میں دکان پر پہنچا لیکن دکان بند تھی۔ میں نے برابر کی دکان والے چاچا شفیق سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آج تمہارے ابا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ دکان بند کر کے گھر چلے گئے۔
میں نے گھر میں داخل ہو کر بستہ ایک طرف پھینکا اور اماں سے کھانا مانگا۔

اسی وقت ابا کمرے سے نکلے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بید تھا۔ ان کے چہرے پر ایسا تاثر تھا کہ میں کانپ کر رہ گیا۔
”کہاں سے آ رہے ہو؟“ ابا نے گرج کر پوچھا۔
”اسکول سے آ رہا ہے اور کہاں سے آئے گا؟“ اماں نے جلدی سے کہا۔
”تم چپ رہو۔“ ابا چیخ کر بولے، پھر مجھ سے مخاطب ہوئے ”کہاں سے آ رہے ہو؟“
”اسکول سے۔“ میں نے کہا۔
سڑاک سے بید میرے جسم پر لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں انگارے سے بھر گئے ہوں۔ ابا نے کبھی آج تک مجھے ہلکا سا ایک تھپڑ بھی نہیں مارا تھا۔
”جھوٹ بولے گا تو کھال ادھیڑ دوں گا۔“ ابا نے دانت پیس کر کہا ”کہاں سے آ رہا ہے؟“
”میں اسکول گیا تھا ابا۔“ میں نے کہا۔
اس مرتبہ ابا نے مجھے بری طرح دھنک کر رکھ دیا۔ میری پیٹھ، کمر، شانوں اور ہاتھوں پر انہوں نے بیدوں کی بارش کر دی۔ اماں بیچ میں آئیں تو ایک دو بید اُن بے چاری کو بھی لگ گئے۔
ابا کی آنکھوں میں گویا خون اترا ہوا تھا۔ میں مار کھا کے گر گیا تو وہ مجھے لاتیں اور گھونسے مارنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آج وہ مجھے جان سے مار کے ہی دم لیں گے۔
اماں نے پھر بیچ میں آنا چاہا لیکن ابا نے پھر انہیں زوردار دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ بے چاری دیوار سے ٹکرا گئیں۔
میں نے سوچا کہ بولنے میں عافیت ہی ہے ورنہ آج ابا میری جان لے لیں گے۔
”اسکول گیا تھا آج؟“ ابا نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں ابا نہیں میں... آج اسکول... نہیں گیا تھا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔
ابا نے ہاتھ روک لیا اور مجھ سے کہا ”کھڑا ہو جا۔“
میں کراہتے ہوئے بہ مشکل تمام کھڑا ہو گیا۔
”کب سے نہیں گیا ہے اسکول؟“ ابا نے درشتی سے پوچھا۔
”بہت... دن... ہو گئے ابا!“ میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔ مجھے خوف تھا کہ یہ سنتے ہی ابا ایک مرتبہ پھر مجھ پر پل پڑیں گے۔
”کیوں؟“ ابا نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”نہیں ابا... پڑھائی میں... میرا دل... نہیں لگتا... میں۔“
بید ابا کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ وہ چند لمحے تک سکتے کی سی کیفیت میں مجھے دیکھتے رہے۔ ان کی حالت اس جواری کی سی ہو رہی تھی جو اپنی آخری پونجی بھی داؤ پر لگانے کے بعد ہار گیا ہو۔ پھر وہ بوجھل قدموں سے کمرے کی طرف بڑھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اچانک وہ بوڑھے ہو گئے ہوں۔
میں اپنی چوٹیں بھول کر حیرت سے ابا کو دیکھ رہا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس لمحے ان پر بہت ترس آیا تھا۔
وہ اپنے بستر پر گر گئے اور زار و قطار رونے لگے۔ وہ اس بری طرح رو رہے تھے کہ میرا دل کٹا جا رہا تھا۔ ابا کو دیکھ کر شہلا بھی بلک بلک کر رونے لگی اور اماں بھی۔ مجھ سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور میں بھی بری طرح رونے لگا۔
پھر میں روتا ہوا اٹھ گیا اور ابا کے پیر پکڑ کر رونے لگا۔
ابا روتے ہوئے بولے ”میں نے اس کے لیے کیا کیا خواب دیکھے تھے، اس نے میرے سارے خواب مٹی میں ملا دیے۔ میں اسی آس میں تو زندہ تھا کہ کل میرے بچے پڑھ لکھ کر معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کریں گے اور لوگ مجھے وحید پرچون والا کہنے کے بجائے وحید صاحب کہہ کر بلائیں گے لیکن...“ اتنا کہہ کر ابا پھر رونے لگے۔
”مجھے... معاف کر دیں ابا! مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ میں آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔
ابا نے مجھے سینے سے لگا لیا اور سسکتے ہوئے بولے ”سعید بیٹا! غریب کے پاس تعلیم ہی واحد ہتھیار ہوتا ہے جس سے وہ حالات کا باعزت طور پر مقابلہ کر سکتا ہے، میں اس ہتھیار سے محروم ہوں اس لیے معاشرے میں میری کوئی عزت نہیں ہے۔ اگر میں بھی پڑھا لکھا ہوتا تو یہ صورتِ حال نہ ہوتی۔“
”ابا! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“
”سعید بیٹا! اب میری امیدوں کا مرکز تم اور شہلا ہی ہو۔ اب میں اس قسم کا صدمہ برداشت بھی نہیں کر سکوں گا۔“
اس دن مجھے اپنے وجود سے نفرت سی محسوس ہوئی۔ ابا بے چارے نہ جانے کیسے کیسے ہم دونوں کے تعلیمی اخراجات پورے کر رہے تھے اور مجھے اس کی پروا ہی نہیں تھی۔ میں نے اس وقت یہ عہد کیا کہ اب میں صرف اور صرف تعلیم حاصل کروں گا اور ابا کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

تسلیم و رضا

ایک مرتبہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ نے ایک غلام خریدا۔ گھر پہنچ کر اس غلام سے پوچھا: ”کیا کھاؤ گے؟“
غلام نے جواب دیا: ”جو کھلاؤ گے۔“
پوچھا: ”کیا پہنو گے؟“
جواب دیا: ”جو پہناؤ گے۔“
پوچھا: ”کیا نام ہے؟“
جواب دیا: ”جس نام سے بلاؤ گے۔“
پوچھا: ”کیا کام کرو گے؟“
جواب دیا: ”جو کام کراؤ گے۔“
پوچھا: ”کوئی درخواست!“
جواب دیا: ”غلام کو درخواست سے کیا کام!“
یہ سن کر حضرت ابراہیم بن ادھم نے اپنا گریبان چیر لیا اور اپنے آپ سے بولے: ”اے عاجز و مسکین بندے! عمر بھر تو بھی اپنے مالک رب رحیم و کریم سے اسی طرح پیش آیا کر جس طرح یہ غلام کہتا ہے۔“

مرسلہ: مسنون افضل، کراچی

اس دن ابا مجھے اور شہلا کو گھمانے لے گئے۔ میرے وعدہ کرنے سے جیسے ابا پھر سے جی اٹھے تھے۔
اس دن کے بعد سے واقعی میں پابندی سے اسکول جانے لگا۔
کلاس میں ٹیچرز تو کبھی کبھار ہی آتی تھیں۔ دوسرے بچے شور شرابا کرتے رہتے لیکن میں ایک طرف اپنی کتاب لیے بیٹھا رہتا۔
میری کلاس میں امجد بھی تھا۔ اسے بھی کھیل کود سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ جب اس نے مجھے سنجیدگی سے پڑھتے دیکھا تو وہ میرے پاس بیٹھنے لگا اور ہم دونوں میں دوستی کا آغاز ہو گیا۔ وہ پڑھنے میں بھی میری مدد کر دیا کرتا تھا۔

تھا۔ وہ اگر کبھی امجد کے لیے کوئی تحفہ لاتی تھیں تو میرے لیے بھی ضرور لاتی تھیں۔ میں بھی انہیں چھوٹے موٹے تحفے دیتا رہتا تھا۔ کبھی چوڑیاں، کبھی مہندی، کبھی دوپٹا۔ وہ کہتی تھیں کہ میرا ایک نہیں، دو بھائی ہیں۔

امجد کے ابو اور امی بھی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور اس کے ابو اکثر کہتے۔ ''سعید بیٹا! جتنی محنت تم پڑھائی میں خود کرتے ہو، اتنی ہی محنت امجد سے کیوں نہیں کراتے؟''

میں ہنس کر خاموش ہو جاتا تھا۔ انہیں کیا بتاتا کہ میں تو بہت کوشش کرتا ہوں لیکن امجد میری بات نہیں مانتا۔

سعدیہ باجی کا خیال آیا تو مجھے اس گفٹ کا خیال آیا جو سعدیہ باجی میرے لیے لائی تھیں۔ میرے اور امجد کے لاکھ پوچھنے پر بھی انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ گفٹ ہے کیا؟ وہ مجھے سرپرائز دینا چاہتی تھیں۔ انہیں میرے اچھے نمبروں سے پاس ہونے کا اتنا یقین تھا کہ وہ نتیجہ آنے سے پہلے ہی میرے لیے تحفہ خرید لائی تھیں۔

ابا کی دکان سے کچھ فاصلے پر شدن مٹھائی والے کی دکان تھی۔ اس نے بھی اخبار والے کو اخبار کا ضمیمہ بیچتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کا لڑکا دو دفعہ ابا کے پاس آ چکا تھا کہ ابا پوچھ رہے ہیں، کتنی مٹھائی تول دوں؟ شدن بھی جانتا تھا کہ میرے پاس ہونے پر ابا پورے بازار میں مٹھائی تقسیم کرتے تھے۔

''ابھی میں خود دکان پر آ کر شدن میاں کو بتاتا ہوں۔''

ابا نے اسے ٹال دیا۔

دکان پر میرا دل نہیں لگ رہا تھا اور ہر آنے جانے والا ابا سے رزلٹ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ابا نے جوش میں آ کر میرے اعلیٰ نمبروں سے پاس ہونے کی اتنی تشہیر کی تھی کہ اب انہیں جواب دیتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے ابا سے کہا ''ابا! میں گھر جا رہا ہوں۔'' میں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''چل بیٹا! میں بھی چل رہا ہوں۔'' ابا نے کہا ''آج دن بھر لوگ امتحان کے نتیجے کے بارے میں پوچھتے رہیں گے اور مٹھائی مانگتے رہیں گے۔''

میں نے جلدی جلدی دکان کے باہر رکھا ہوا سامان دکان کے اندر رکھا اور ابا نے دکان کا شٹر گرا دیا۔

ابا تالا ڈال ہی رہے تھے کہ امجد کو دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا۔

اس نے مسکرا کر کہا ''چچا جان! سعید کے پاس ہونے کی خوشی میں دکان بند کر رہے ہیں؟''

ابا نے کوئی جواب نہ دیا، وہ نہ جانے کیا سوچ رہے تھے؟

''اوہ تو اتنا بے مروت ہے۔ تو نے اپنے پاس ہونے کی اطلاع ہمیں بھی نہیں دی۔ سعدیہ باجی ایک گھنٹے سے تیرا انتظار کر رہی ہیں۔''

''تو مجھ پر طنز کر رہا ہے یا میرا مذاق اڑا رہا ہے؟'' میں بپھر کر بولا ''تجھے نہیں پتا میرے رزلٹ کا؟ میرا رول نمبر تو تیرے پاس بھی ہے اور باجی کے پاس بھی!''

''او بھائی! خوشی کے اس موقعے پر ناراض کیوں ہو رہا ہے۔'' امجد نے کہا ''سعدیہ باجی نے تو رزلٹ دیکھ لیا ہے لیکن وہ تیری زبان سے سننا چاہتی ہیں۔''

''میری زبان سے کیا سننا چاہتی ہیں؟'' میں نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

''ارے یار! تو کسی سے لڑ کر بیٹھا ہے یا پھر چچا جان نے تیری پٹائی کی ہے لیکن موڈ تو خراب مت کر۔ چل گھر چل، مٹھائی کھا۔ سعدیہ باجی نے مٹھائی منگوائی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے تیرا منہ میٹھا کرنا چاہتی ہیں۔''

''میرا مزید مذاق مت اڑا امجد!'' میں نے تلخی سے کہا ''تو اے گریڈ میں پاس ہوا ہے۔ تو جا کر خوشیاں منا۔'' میں نے امجد کا رول نمبر اے گریڈ میں دیکھ لیا تھا۔

ابا دکان بند کر چکے تھے، وہ مجھ سے بولے ''اب کیا یہیں کھڑے رہو گے؟'' پھر وہ امجد سے بولے ''بیٹا! بہت بہت مبارک ہو۔ چلو گھر چلو، تمہیں وہیں مٹھائی کھلاؤں گا۔''

''آپ کو بھی بہت بہت مبارک ہو چچا جان!'' امجد نے کہا ''سعید نے تو فرسٹ پوزیشن لی ہے۔''

امجد کی بات سن کر میں لمحے بھر کو سکتے میں رہ گیا ''کیا... کیا... کیا کہہ رہا ہے تو؟''

''اب جھوٹ مت بول یار!'' امجد نے کہا ''بہت اداکار ہو گیا ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے، ہمیں معلوم نہیں ہوگا؟''

''لیکن امجد! میرا رول نمبر تو اخبار میں ہے ہی نہیں۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''اخبار میں نہیں ہے۔'' امجد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اپنی جیب سے تہ کیا ہوا اخبار کا ضمیمہ نکالا اور بولا ''غور سے دیکھ! اگر نظر نہیں آ رہا ہے تو چچا جان کا چشمہ لگا لے۔ سب سے اوپر تیرا ہی نمبر ہے اور اتنا نمایاں ہے کہ اندھا بھی پڑھ لے۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے اخبار جھپٹ لیا۔ حالانکہ اخبار تو میرے پاس بھی موجود تھا۔ واقعی سب سے اوپر میرا نام اور رول نمبر نمایاں جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اس

ساتھ خبر بھی تھی کہ سعید الحق نے پورے کراچی بورڈ میں اول پوزیشن حاصل کی ہے۔

میری آنکھوں میں ایک دفعہ پھر آنسو آ گئے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ میں بے اختیار پہلے امجد سے لپٹا، پھر ابا سے لپٹ گیا۔

اسی وقت شدن حلوائی کا بیٹا پھر آ گیا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ابا نے کہا ''دس کلو مٹھائی تول دو۔ ہاں، دو کلو کس مٹھائی، دو کلو کی والی الگ سے تولنا، میں ابھی آتا ہوں۔'' پھر ابا خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں مجھ سے بولے ''سعید بیٹا! تم گھر جا کر اپنی ماں اور بہن کو یہ خوش خبری سناؤ، میں مٹھائی لے کر ابھی آتا ہوں۔''

وہ دن میرے لیے گویا عید کا دن تھا۔ مجھے دوگنی خوشی تھی۔ میں تو اپنے خیال میں فیل ہی ہو چکا تھا۔ امجد نے اچانک ہی آ کر مجھے خوش خبری سنائی تھی۔

سعدیہ باجی بھی بہت خوش تھیں۔ وہ مسکرا کر بولیں۔ ''میرے ایک بھائی نے تو کی، دوسرے بھائی نے تو پہلی پوزیشن حاصل کر لی۔'' پھر وہ جلتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے ہاتھ میں خوبصورت سا ایک پیکٹ تھا۔ ''یہ تمہارا گفٹ ہے۔'' سعدیہ باجی نے پیکٹ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

وہ چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر باجی سے پوچھا ''سعدیہ باجی! اس میں آخر ہے کیا؟''

''خود ہی کھول کر دیکھ لو۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔

''میرا خیال ہے کہ گھڑی ہے۔'' امجد نے کہا ''باجی نے مجھے بھی گھڑی ہی دی ہے۔''

میں نے وہ پیکٹ کھولا تو اس میں سے شیفر پین کا انتہائی قیمتی سیٹ اور ایک گھڑی نکلی۔ اہم بات یہ تھی کہ پین پر سنہرے حروف میں میرا نام بھی لکھا ہوا تھا۔

سعدیہ باجی نے اپنے ہاتھوں سے مجھے مٹھائی کھلائی، پھر بولیں ''ہاں سعید! تم نے اخباروں کے لیے کوئی اچھی سی تصویر بھی کھنچوائی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں اخبار والے تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔''

''باجی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا ''اخبار والے آئیں گے تو ان کے ساتھ فوٹو گرافر بھی ہوں گے۔ مجھے بھلا تصویر کھنچوانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''کئی ٹی وی چینل بھی تم سے رابطہ کریں گے۔'' امجد نے کہا ''تم ابھی سے سوچ لو کہ تمہیں کیا کہنا ہے۔''

''او بھائی! اس نے میٹرک کیا ہے، الیکشن میں ایم این اے کی سیٹ نہیں جیتی ہے یا مجھے کوئی وزارت نہیں ملی ہے کہ اخبارات اور ٹی وی چینل والے میرے پیچھے دوڑیں۔''

سعدیہ باجی نے اس دن خاص طور پر میرے لیے چکن کڑاہی اور شاہی ٹکڑے بنائے تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ دونوں چیزیں مجھے بہت پسند ہیں۔

پھر کئی دن خوشی مناتے گزر گئے۔ امجد کی امی اور ابو نے مجھے تھری پیس سوٹ سلوا کر دیا تھا۔ تایا ابو نے مجھے بہترین قسم کی بائیسکل انعام میں دی تھی۔ ابو نے بھی دل کھول کر خوشی منائی تھی اور انہوں نے پورے خاندان کی دعوت کی تھی۔

پہلے کے مقابلے میں ابو کا کاروبار بھی بہت اچھا چل رہا تھا۔ انہوں نے برابر والی دکان لے کر کراکری کا سامان بھی رکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس میں جنرل اسٹور کا سامان بھی تھا۔ اب ہمارے گھر میں بھی اچھی خاصی خوش حالی آ گئی تھی۔

شہلا ان دنوں ساتویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ پڑھائی کے معاملے میں وہ بھی جنونی تھی یا پھر مجھے دیکھ کر ہو گئی تھی۔ وہ بھی ہر کلاس میں پوزیشن لے رہی تھی۔

مجھے نہ صرف شہر کے بہترین کالج سے داخلے کی پیشکش ہوئی بلکہ حکومت کی طرف سے مجھے تعلیم کے لیے انعام بھی دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تعلیمی این جی او نے میری تعلیم کے تمام اخراجات ادا کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

ان دنوں خوشیاں گویا چاروں طرف سے برس رہی تھیں۔ میں نے اپنے گھر میں اتنی خوشیاں کبھی نہیں دیکھی تھیں اس لیے کبھی کبھی تو مجھے خوف محسوس ہوتا تھا کہ کہیں ہماری ان خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

تایا ابو بھی میری تعلیم میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ ہر ماہ مجھے جیب خرچ کے لیے ایک معقول رقم دیا کرتے تھے۔

اماں اور ابا دونوں کو حیرت تھی کہ تایا ابو تو کبھی بھولے بھٹکے ہمارے گھر آ جاتے تھے، اب اچانک مجھ پر اتنے مہربان کیسے ہو گئے؟

''سعید بھی آخر ان کا خون ہے۔'' ابا نے ان کی طرف داری کی ''پھر پڑھنے والے ذہین بچوں کو سبھی پسند کرتے ہیں۔''

''جی نہیں ابا! بات یہ نہیں ہے۔'' شہلا نے آنکھیں نچا کر کہا۔

''پھر کیا بات ہے بڑی اماں!'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"تایا ابو نزہت باجی کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔"

"نزہت کے لیے؟" اماں نے حیرت سے کہا "تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔"

"میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے اماں!" شہلا نے منہ بنا کر کہا۔ "میں نے اس دن تایا ابو کو خود یہ کہتے سنا ہے کہ بھئی اگر میں سعید پر چار پیسے خرچ بھی کر رہا ہوں تو کچھ سوچ کر ہی کر رہا ہوں۔ اپنی نزہت کو اس سے اچھا لڑکا اور کہاں ملے گا۔"

"تو کہاں تھی؟" اماں نے اسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھا "کیا وہ یہ باتیں تیرے سامنے کر رہے تھے؟"

"میں تو اتفاق سے چلی گئی تھی۔" شہلا نے کہا "تایا ابو کا کمرا زینے کے بالکل ساتھ ہی تو ہے۔ وہاں سے ان کی آواز آ رہی تھی۔"

اماں چند لمحے کو سناٹے میں آ گئیں۔ ابا نے البتہ کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

نزہت تقریباً شہلا ہی کی ہم عمر تھی۔ اس سے سال چھ مہینے بڑی ہوگی۔ وہ اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔ گھنے سیاہ بال، بڑی بڑی آنکھیں اور گھنی پلکیں، سرخ و سفید رنگ جو اسے تائی امی سے ورثے میں ملا تھا۔ وہ مجھے بھی اچھی لگتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اماں کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

میں وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تو اماں نے مجھ سے کہا۔ "سعید! کان کھول کر سن لے، اب اگر تو نے اپنے تایا ابو سے ایک پیسا بھی لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"کلثوم بیگم! تم بھی کمال کرتی ہو۔" ابا نے جھلا کر کہا۔ "اب اگر وہ سعید کو پڑھا دیں گے تو کیا یہ منع کر دے گا؟ یہ تو سراسر بے ادبی ہوگی۔ اور اب تک وہ جو کچھ کرتے آئے ہیں، وہ سب بھی واپس کر دو گی کیا؟"

"آپ آخر سمجھتے کیوں نہیں؟" اماں جھنجلا کر بولیں۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔" ابا نے کہا "تم اپنی بہن کی بیٹی لانا چاہتی ہو، یہی بات ہے نا؟"

"آپ لوگ اس بات پر جھگڑا نہ کریں۔" میں نے کہا۔ "شادی تو مجھے کرنا ہے، جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ ابھی سے اس بات پر کیوں بحث کر رہے ہیں۔ ابھی تو مجھے اپنا مستقبل بنانا ہے، پھر شہلا کی شادی کرنا ہے، مکان بنانا ہے۔ مجھے تو ابھی بہت کام کرنا ہیں ابا!"

"بیٹا! تمہارے منصوبے تو بہت طویل ہیں۔ اس وقت تک میں اور تمہاری اماں زندہ رہے تو تمہاری خوشی میں خوش ہو جائیں گے۔"

"ارے مریں میرے دشمن!" اماں نے کہا "میں تو اپنے پوتوں، نواسوں کو گود میں کھلائے بغیر مرنے والی نہیں ہوں۔"

کالج میں کلاسیں شروع ہوئیں تو میں ایک دفعہ پھر جنونیوں کی طرح پڑھائی میں لگ گیا۔ اس دوران میں سوائے امجد کے میری کسی سے بھی دوستی نہیں ہوئی۔ امجد نے بھی وہی مضامین لیے تھے جو میں نے لیے تھے اس لیے ہمیشہ کی طرح ہم دونوں کمبائنڈ اسٹڈی کرتے تھے۔ کبھی امجد میرے گھر آ جاتا تھا، کبھی میں امجد کے گھر چلا جاتا تھا۔

سعدیہ باجی تو مجھے بھائیوں کی طرح چاہتی ہی تھیں۔ امجد کے والدین بھی مجھے اپنا دوسرا بیٹا سمجھتے تھے۔ امجد کے والد انکل ساجد اب تو مجھ سے اپنے انتہائی اہم معاملات میں مشورے بھی لینے لگے تھے۔

ایک دن میں امجد کے ساتھ بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ اچانک انکل ساجد وہاں آ گئے۔

"آئیے انکل!" میں ہنس کر بولا "آپ شاید یہ دیکھنے آئے ہیں کہ ہم لوگ واقعی پڑھ رہے ہیں یا گپیں ہانک رہے ہیں۔"

"مجھے تم دونوں سے انتہائی ضروری بات کرنی ہے۔" انکل اس وقت بہت سنجیدہ تھے۔

میں نے کتاب بند کر دی اور بولا "جی انکل فرمایئے۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے "بیٹا! سعدیہ کے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا فیصلہ کروں؟"

"کون لوگ ہیں ابو؟" امجد نے پوچھا۔

"اور لڑکا کیا کرتا ہے؟" میں نے کہا۔

"لوگ تو بیٹا بہت اچھے اور خاندانی ہیں۔ لڑکے کے باپ کا اپنا بزنس ہے۔"

"کس چیز کا بزنس ہے ابو؟" امجد نے پوچھا۔

"بیٹا، وہ بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ پاکستان کی مشہور موٹر بائیک [illegible] بنا رہے ہیں۔"

میں چونک اٹھا "آپ کہیں ابرار شاہانی کی بات تو نہیں کر رہے ہیں؟"

"ہاں، وہی۔" انکل جلدی سے بولے "کیا تم انہیں جانتے ہو؟"

"میں نے ان کا صرف نام سنا ہے۔" میں نے کہا "لیکن میں ان کے بیٹے آفتاب شاہانی کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا "یونیورسٹی میں پڑھتا ہے لیکن وہاں وہ پڑھنے نہیں جاتا بلکہ ہلا گلا کرنے، وقت گزارنے اور لڑکیوں کے چکر میں جاتا ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"سعید بیٹا! سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔" انہوں نے ناگواری سے کہا۔

"یہ سنی سنائی باتیں نہیں ہیں انکل!" میں نے کہا "میں نے اور امجد نے کئی دفعہ اسے چھچھوری حرکتیں کرتے دیکھا ہے۔ ہم دونوں نوٹس بنانے کے لیے کافی دن تک یونیورسٹی کی لائبریری جاتے رہے ہیں۔ آفتاب انتہائی چھچھورا لڑکا ہے، مار پیٹ، دنگا فساد اور لڑکیوں پر آوازے کسنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔"

"ابو، اگر آپ کو ہماری باتوں پر یقین نہیں ہے تو آپ اپنے طور پر بھی معلومات کر سکتے ہیں۔" امجد نے کہا "آفتاب پوری یونیورسٹی میں شیطان کی طرح مشہور ہے۔"

"اور آپ کو معلومات کرنے کے لیے زیادہ تردد بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ سعدیہ باجی بھی تو یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ آپ ان ہی سے اس کے بارے میں معلوم کر لیں۔"

"مجھے تم دونوں کی باتوں کا یقین ہے۔" انکل نے کہا۔

"لیکن......؟"

"لیکن کیا ابو؟" امجد نے کہا۔

"یہ رشتہ ہمارے ڈپارٹمنٹ کے ایڈیشنل سیکریٹری کے ذریعے آیا ہے۔ آفتاب شاہانی سے ان کی بہت دوستی ہے۔"

"تو پھر؟" امجد نے کہا "مجھے تو اس میں ایسی کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ لڑکیوں کے رشتے تو آتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتا۔"

"بیٹا! تم اکرام صاحب کو نہیں جانتے وہ"

"کون اکرام صاحب ابو!" امجد نے پوچھا۔

"میرے ایڈیشنل سیکریٹری!" انکل نے کہا "وہ انتہائی گھٹیا اور کینہ پرور شخص ہے۔ وہ اس ڈپارٹمنٹ میں میرا جینا دوبھر کر دے گا۔ ممکن ہے مجھے اپنی ملازمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائیں۔"

"اپنی ملازمت بچانے کے لیے آپ سعدیہ باجی کو عمر بھر کے عذاب میں جھونک دیں گے؟" امجد کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہا تھا۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" انکل بے بسی سے بولے۔

"آپ انکار کر دیں، کہہ دیں کہ میری بیٹی کی منگنی ہو چکی ہے۔"

"اکرام بہت گھاگ آدمی ہے۔" انکل نے کہا "اس نے پہلے ہی مجھ سے معلوم کر لیا تھا کہ سعدیہ کی کہیں منگنی نہیں ہوئی ہے۔"

"اللہ مالک ہے ابو! آپ کچھ زیادہ ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ لڑکیوں کے رشتے آتے ہی ہیں اور والدین انکار بھی کرتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔"

انکل کچھ دیر خاموشی سے کچھ سوچتے رہے پھر اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے امجد سے کہا "یہ آفتاب ایک نمبر کا اوباش آدمی ہے۔ انکل کے سامنے میں کھل کر بول بھی نہیں سکا تھا۔ اب تک نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگیاں برباد کر چکا ہے۔ اس میں ہر عیب موجود ہے۔ شراب وہ پانی کی طرح پیتا ہے، میں نے سنا ہے کہ جوا بھی کھیلتا ہے اور یونیورسٹی میں ہر وقت اس کے ساتھ ایک نئی لڑکی ہوتی ہے۔"

میں نے نفرت سے کہا "ایک اور کمینگی ہے کہ اس کے ساتھ نظر آنے والی بیشتر لڑکیاں یونیورسٹی کی نہیں ہوتیں۔"

"یار، ابو تو فضول میں پریشان ہو رہے ہیں۔ وہ اکرام زیادہ سے زیادہ کیا کر لے گا؟ ان کا ٹرانسفر کرا دے گا۔"

ہم دونوں اس دن پڑھائی کے بجائے اسی موضوع پر بات کرتے رہے۔ اس صورتِ حال میں پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دوسرے دن کالج سے واپسی پر میں نے الٹا سیدھا کھانا کھایا اور امجد کے گھر روانہ ہو گیا۔

اس وقت امجد بھی موجود نہیں تھا۔ آنٹی نے اسے کسی کام سے بھیجا تھا۔ انکل بھی اس وقت تک آفس سے نہیں لوٹے تھے۔

میں نے آنٹی کو سلام کیا اور ان سے امجد کے بارے میں پوچھا۔

"بیٹا! میں نے اسے ایک ضروری کام سے ناظم آباد بھیجا ہے، بس اب آنے ہی والا ہوگا۔"

میں سیدھا سعدیہ باجی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر افسردگی کے تاثرات تھے، میں سمجھا کہ وہ سو رہی ہیں۔

میں واپس جانے کے ارادے سے مڑا تو انہوں نے مجھے آواز دی "سعید!" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں "کیا تم بھی مجھ سے ناراض ہو؟" انہوں نے شکستہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں باجی! میں آپ سے ناراض کیوں ہونے

ہو گا؟" میں نے کہا" اور "تم بھی" کا کیا مطلب ہے؟ کیا کوئی اور بھی ناراض ہے؟"

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔" وہ جلدی سے بولیں۔ "تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟ تمہارے امتحانات بھی تو ہونے والے ہیں، فرسٹ ایئر میں جتنے زیادہ نمبر ہوں گے، اتنا ہی فائدہ ہو گا۔ میں تو...."

"باجی!" میں نے سنجیدگی سے کہا "موضوع بدلنے کی کوشش مت کریں۔" پھر میں نے اچانک پوچھا "آپ آفتاب شاہانی کو جانتی ہیں؟"

"اس منحوس اور اوباش شخص کو یونیورسٹی میں کون نہیں جانتا؟" باجی نے نفرت انگیز لہجے میں کہا "تم یہی پوچھنا چاہتے ہو نا کہ میں آفتاب سے شادی کرنے پر راضی ہوں یا نہیں؟" ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں یہ پوچھنے نہیں آیا ہوں باجی!" میں نے کہا "میں تو آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ آپ اس رشتے پر کسی بھی قیمت پر رضامندی ظاہر مت کیجیے گا۔ رات کو انکل نے مجھ سے اور امجد سے بھی اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ ہم دونوں نے سختی سے انکار کر دیا کہ وہ لفنگا اس قابل نہیں ہے کہ کوئی بھی معقول لڑکی اس سے شادی کرے۔" پھر میں چونک کر بولا "لیکن آپ کو کیا پریشانی ہے؟"

"ابو صبح میرے پاس آئے تھے۔" سعدیہ باجی نے کہا۔ "وہ مجھ سے آفتاب کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے انہیں آفتاب کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔"

"پھر....؟" میں نے پوچھا "وہ کیا بولے؟"

"وہ بولے تو کچھ نہیں لیکن ان کے انداز سے یہ لگ رہا تھا کہ انہیں میرا فیصلہ پسند نہیں آیا۔"

"آپ فکر مت کریں سعدیہ باجی! آپ نے مجھے بھائی کہا ہے نا؟ جب تک میں زندہ ہوں، کوئی آپ کو مجبور نہیں کر سکے گا۔" پھر میں ہنس کر بولا "بس اب آنسو پونچھ لیں اور مجھے ذرا اچھی سی چائے پلا دیں۔ کافی دن سے آپ کے ہاتھ کی چائے نہیں پی۔"

سعدیہ باجی نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولیں "کل رات جو تم لوگوں نے دو دفعہ چائے پی تھی، وہ کس کے ہاتھ کی تھی؟"

"ارے وہ تو کل کی بات ہے۔ رات گئی بات گئی۔" میں نے ہنس کر کہا "چلیں جلدی سے ایک کپ گرما گرم چائے!"

"دو کپ!" باہر سے امجد کی آواز آئی۔ وہ کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔

"یک نہ شد، دو شد!" سعدیہ باجی نے کہا "تم لوگ چلو، میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

ہمارے امتحانات سر پر تھے اس لیے ساری فکروں اور پریشانیوں کو ذہن سے جھٹک کر پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔

میری کوشش تھی کہ فرسٹ ایئر میں مجھے زیادہ سے زیادہ نمبر ملیں تاکہ انٹر میں میرے نمبر اتنے تو ہو جائیں کہ اے ون گریڈ ہو جائے۔

امتحانات کے زمانے میں مجھے نہ کھانے کا ہوش رہتا تھا نہ پینے کا۔

امتحان کا نتیجہ میری توقعات کے عین مطابق رہا۔ امجد کے نمبر اس مرتبہ بھی کم تھے لیکن اتنے کم بھی نہیں تھے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس سے زیادہ سعدیہ باجی خوش تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں اسی گھر کا ایک فرد ہوں۔ اپنے گھر میں تو میرا وقت بہت کم گزرتا تھا۔

اماں اکثر کہتی بھی تھیں کہ ایسی بھی کیا پڑھائی کہ انسان اپنے گھر والوں سے ملنا بھی چھوڑ دے۔

میں اسکول کے بعد صرف ایک دفعہ گھر جاتا تھا۔ کبھی موڈ ہوتا تھا تو کھانا کھا لیتا تھا ورنہ کچھ دیر شہلا سے ہنسی مذاق کر کے اور کپڑے بدل کر امجد کے گھر چلا جاتا تھا۔ وہاں امجد کا کمرا اب گویا میرا کمرا تھا۔

میں انجینئرنگ کرنا چاہتا تھا اس لیے مجھے کچھ زیادہ ہی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ انجینئرنگ میں ایڈمیشن کے لیے زیادہ نمبروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ امجد کے پاس بھی سائنس کے مضامین تھے لیکن وہ پری میڈیکل پڑھ رہا تھا۔

کراچی یونیورسٹی میں سعدیہ باجی کا آخری سال تھا۔ انکل نے پھر ان کے پاس اکرام سے ان کے رشتے کے سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں کی تھی۔ سعدیہ باجی کے ساتھ ساتھ ہم نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔

مجھے گزشتہ دو مہینے سے آفتاب بھی نظر نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں دبئی میں ہے۔ اس کے والد دبئی میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل کھول رہے تھے۔

وقت کا پہیا تیزی سے گردش میں تھا۔ میں ان دنوں انٹر کے امتحانات کی تیاری کر رہا تھا۔ اب بھی میرا وہی معمول تھا۔ میں امجد کے ساتھ رات رات بھر جاگ کر پڑھائی کرتا، پھر ہم کچھ دیر کے لیے سو جاتے اور صبح میں وہیں سے کالج چلا جاتا تھا۔ ہم رات کو پڑھتے تھے تو سعدیہ باجی وقفے وقفے سے ہمارے لیے چائے بنا کر لے آتی تھیں۔ میں انہیں منع

بھی کرتا تھا لیکن وہ ہنس کر کہتیں "میں چاہتی ہوں، تم لوگوں کو تازہ دم رکھوں تاکہ تم زیادہ محنت سے پڑھو۔"

اس دن میں کالج سے گھر پہنچا تو شہلا میری الماری الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ میں نے درشت لہجے میں کہا "شہلا!"

وہ بری طرح اچھل پڑی اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو میں اچھل پڑا۔ وہ شہلا نہیں تھی بلکہ نزہت تھی۔

اس کا حسین چہرہ اور سراپا دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ دبلی پتلی سی نزہت نے دو تین برس میں وہ رنگ روپ نکالا تھا کہ میں اسے دیکھ کر سکتے میں رہ گیا تھا۔ گھنے سیاہ بالوں کی چوٹی اس کی کمر سے نیچے تک جھول رہی تھی۔ رنگت پہلے سفید تھی لیکن اب اس میں گلابی رنگ بھی جھلک رہا تھا۔ جسم پر خاصا ماڈرن لباس تھا جس میں اس کا قیامت خیز جسم مزید قیامت ڈھا رہا تھا۔

وہ ہکلا کر بولی "وہ.... شہلا نے.... میری...."

"تم میری الماری میں کیا کر رہی ہو؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں وہی تو.... آپ کو.... بتا رہی ہوں.... کہ...."

"تمہیں معلوم ہے کہ کسی کے کمرے میں یوں بغیر اجازت گھسنا انتہائی بداخلاقی ہے اور الماری میں گھسنا تو چوری ہے۔"

"ہم.... میں.... نے.... کچھ بھی.... نہیں چرایا ہے۔" وہ سہم کر بولی۔ اس انداز میں وہ مجھے مزید اچھی لگی۔ "آپ.... میری.... تلاشی.... لے سکتے ہیں۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"میں تمہاری تلاشی کیسے لے سکتا ہوں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

وہ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کمرے میں اچانک اندھیرا ہو گیا ہو۔

اچانک شہلا کمرے میں داخل ہوئی اور بولی "بھیا!" میں بری طرح چونک اٹھا "کیا بات ہے؟" میں نے سنبھل کر کہا "کیوں میرے کان پر چیخ رہی ہو؟"

"ابھی نزہت یہاں سے بہت گھبرائی ہوئی نکلی ہے۔" اس نے ہنس کر کہا "آپ نے اس سے کچھ کہہ تو نہیں دیا؟"

"میں نے اس سے صرف اتنا ہی پوچھا تھا کہ تم میری الماری میں کیا کر رہی ہو؟"

"اب میں سمجھی۔" شہلا نے کہا "وہ کئی دن سے میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ اپنے بھیا کی کوئی اچھی سی تصویر مجھے لا دو۔"

"میری تصویر کا کیا کرے گی وہ؟"

"ارے بھیا! آپ بھی بالکل بدھو ہیں۔ لڑکیاں کسی لڑکے کی تصویر اپنے پاس کیوں رکھتی ہیں؟"

"اچھا، تو یہ بات ہے؟" میں نے کہا "مجھے تایا ابو سے بات کرنا پڑے گی۔"

"ان کی فکر آپ مت کریں۔ وہ ابا سے پہلے ہی بات کر چکے ہیں۔ آپ کے امتحانات کے بعد نزہت سے باقاعدہ آپ کی منگنی ہو جائے گی۔"

میں امجد کے گھر پہنچا تب بھی نزہت ہی کے حسین پیکر میں الجھا ہوا تھا۔

امتحانات سر پر سوار تھے۔ ہم لوگ راتوں کو جاگ جاگ کر امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔

اس دن میں امجد کے گھر پہنچا تو آنٹی بہت پریشان اور افسردہ تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ روتی رہی ہوں۔

"کیا بات ہے آنٹی!" میں نے پوچھا "آپ خیریت سے تو ہیں؟"

"بیٹا، کہاں کی خیریت اور کیسی خیریت!" آنٹی نے روتے ہوئے کہا "میری ایک ہی بہن تھی، وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی!"

"کب؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے بھانجے کا فون آیا ہے۔ تو شاید رات کو ابھی بھلی چنگی تھی، پھر وہ ایسی سوئی کہ ہمیشہ کے لیے سو گئی۔" آنٹی پھر رونے لگیں۔

"صبر کریں آنٹی!" میں نے روایتی جملہ ادا کیا جسے ادا کرتے وقت مجھے خود بھی بہت الجھن ہوتی تھی "آپ وہاں چلی جائیں، اس وقت ان کے بچوں کو آپ کی ضرورت ہو گی۔"

"ارے بیٹا! کیسے چلی جاؤں۔ تمہارے انکل آ گئیں تو ان کے ساتھ جاؤں گی۔ وہ میرپور خاص میں رہتی تھی۔"

"آنٹی، آپ کہیں تو میں چلوں آپ کے ساتھ؟" میں نے کہا۔

"نہیں بیٹا! میں نے تمہارے انکل کو فون کر دیا ہے۔ وہ آ رہے ہیں۔ ویسے بھی تمہارے امتحانات ہونے والے ہیں۔ تم...."

ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ انکل حیران پریشان گھر میں داخل ہوئے۔ آنٹی انہیں دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگیں۔ انکل کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ پھر سعدیہ باجی اور امجد بھی

آ گئے۔ وہ دونوں بھی رونے لگے۔ میں نے بہت مشکل سے انہیں تسلی دے کر خاموش کرایا۔ ایسے موقعے پر کسی کو تسلی دینا اور دکھ بھرے بول ادا کرنا مجھے دنیا کا مشکل ترین کام لگتا ہے۔

"میں نے ایک بیگ میں آپ کا ضروری سامان رکھ لیا ہے۔" آنٹی نے کہا "ابھی نکلیں گے تو شام تک میرپور خاص پہنچ جائیں گے۔"

"میرا جانا تو بہت مشکل ہے۔" انکل نے کہا "کل چیف سیکریٹری اور منسٹر صاحب دفتر کے معائنے کے لیے آرہے ہیں۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔ تم امجد اور سعدیہ کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"سعدیہ کے بھی سمسٹر کے پرچے ہورہے ہیں۔" آنٹی نے کہا۔

"امی! انکل میرا آخری پرچہ ہے، میں بھی ابو کے ساتھ آ جاؤں گی۔" سعدیہ باجی نے کہا۔

امجد اسی وقت آنٹی کے ساتھ میرپور خاص کے لیے نکل گیا۔ میں بھی اپنے گھر آ گیا۔

شام کو میں بے خیالی میں امجد کے گھر جا پہنچا۔ انکل ابھی وقت آفس سے آئے تھے۔

وہاں پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ امجد تو ہے ہی نہیں۔ میں اکیلا تو اپنے گھر میں بھی پڑھ لوں گا۔

میں جانے لگا تو سعدیہ باجی نے کہا "امجد اور امی کے نہ ہونے سے گھر میں کتنا سناٹا ہے۔ اب تم بھی جارہے ہو۔ تم کیا امجد کے بغیر نہیں پڑھ سکتے؟"

"پڑھ تو سکتا ہوں لیکن..."

"بیٹا! تم رک جاؤ۔" انکل نے کہا "سعدیہ کا دل بھی بہل جائے گا۔ یہ اپنی خالہ کو بہت چاہتی تھی، صبح سے رو رہی ہے۔"

انکل کے کہنے پر میں رک گیا۔ میں اکثر رات کا کھانا بھی امجد کے گھر کھا لیا کرتا تھا۔

کھانے کے بعد میں پڑھنے بیٹھ گیا۔ مجھے بھی امجد کی کمی شدت سے محسوس ہورہی تھی۔

ساڑھے بارہ بجے کے قریب سعدیہ باجی نے مجھے چائے لا کر دی اور بولیں "اب ذرا پڑھائی میں وقفہ کرلو۔"

میں نے ہنستے ہوئے چائے کا کپ ان کے ہاتھ سے لے لیا پھر ان کی افسردگی دیکھ کر میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"تو جناب کیا اس دفعہ بھی فرسٹ پوزیشن لانے کا ارادہ ہے؟" سعدیہ باجی نے پوچھا۔

"کوشش تو میری یہی ہے۔" میں نے کہا "آگے اللہ کی مرضی۔"

"فرسٹ ایئر میں بھی تو تمہارے نمبر نوے فی صد تھے۔" سعدیہ باجی نے کہا۔

"نوے اعشاریہ آٹھ پانچ۔" میں نے ہنس کر کہا "میری پوری کوشش یہی ہے کہ اس دفعہ اس سے بھی زیادہ نمبر آئیں۔ دیکھیے اگر امتحانات میں گڑبڑ نہیں ہوئی تو انشاء اللہ اس مرتبہ بھی میری پوزیشن آئے گی۔"

"انشاء اللہ!" سعدیہ باجی نے خلوص سے کہا۔

میں اس دوران میں اپنی چائے ختم کرچکا تھا۔ سعدیہ باجی کپ اٹھاتے ہوئے بولیں "کل میرا بھی پیپر ہے۔ میں جاگ رہی ہوں۔ ابھی ایک دفعہ مزید تمہیں چائے دے سکتی ہوں۔"

"سعدیہ باجی! آپ اپنے پیپر کی تیاری کریں۔ چائے کی ابھی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔"

وہ چائے کا کپ لے کر چلی گئیں۔

میں پھر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

اس وقت تقریباً تین بجے کے تین بج رہے تھے جب سعدیہ باجی دوبارہ چائے لے آئیں۔

میں نے ان سے کچھ کہنا فضول سمجھا۔ وہ میری کوئی بات نہیں سنتیں۔ میں نے خاموشی سے چائے کا کپ لے لیا۔

وہ میرے سامنے بیٹھ گئیں۔

چائے پیتے پیتے میں نے غور سے سعدیہ باجی کو دیکھا۔ ان کی متورم آنکھوں میں نیند کے خمار سے ڈورے پڑ گئے تھے۔ بالوں کی ایک لٹ بار بار ان کے چہرے پر آ جاتی تھی جسے وہ بہت ادا سے سر جھٹک کر پیچھے کی طرف کر دیتی تھیں۔

وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں ایسی تپش تھی کہ میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس دن سردی بھی بہت شدید تھی اس کے باوجود میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

سعدیہ باجی نے اچانک پوچھا "سعید! میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟" وہ براہ راست میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

میں بوکھلا گیا "آ... آپ... مجھے... بہت اچھی... لگتی ہیں... میں..."

میری حالت پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں "میں نے اتنا مشکل سوال تو نہیں کیا تھا کہ تم اتنے بوکھلا گئے۔"

"بہنیں تو بھائیوں کو اچھی لگتی ہی ہیں۔" میں نے سنبھل کر کہا "آپ کا سوال ہی فضول تھا۔"

"میں تمہاری بہن تو نہیں ہوں۔" انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہاں ظاہر ہے، آپ امجد کی بہن ہیں۔" میں دل گرفتہ ہو گیا "منہ بولے رشتوں کی بھی کوئی اہمیت ہوتی ہے بھلا؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "میں آج تک اسی خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ میں..."

"بدھو ہو تم؟" سعدیہ باجی نے کہا "تم میری بات سمجھ ہی نہیں رہے ہو۔" ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔

میں ایک لمحے میں ان کی بات کی تہ تک پہنچ گیا "سعدیہ باجی! آپ کا مطلب ہے کہ..."

"مجھے صرف سعدیہ کہو سعید!" سعدیہ باجی نے والہانہ انداز میں کہا۔

"آپ ہوش میں تو ہیں؟" میں نے تیز آواز میں کہا۔

"آہستہ بولو... ورنہ ابو جاگ جائیں گے۔ میں تو کب سے تمہیں اپنا حال دل سنانے کو بے قرار تھی۔"

"آپ کو شرم نہیں آتی؟" میں نے درشت لہجے میں کہا "میں تو آپ کی بہت عزت اور احترام کرتا ہوں اور آپ..."

سعدیہ باجی بے ساختہ ہنسنے لگیں۔ ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر وہ ہنسی روک کر بولیں "مجھے معاف کردینا میرے بھائی، میں اصل میں تمہیں آزما رہی تھی۔"

"آپ کو اب بھی مجھے آزمانے کی ضرورت تھی؟" میں نے اپنے جسم کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میری دوست فرزانہ کا خیال تھا کہ دنیا میں صرف خون کے رشتے ہی قابل احترام ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی آپ سے کتنا ہی مخلص ہو آخر میں صرف ایک ہی رشتہ رہ جاتا ہے، مرد اور عورت کا رشتہ!"

"اور آپ کو آزمانے کے لیے میں ہی ملا تھا۔ سعدیہ باجی، اگر اس صدمے سے میری حرکت قلب بند ہو جاتی تو؟"

"سوری بھیا!" سعدیہ باجی نے کہا "میں بھی فضول میں فرزانہ کی باتوں میں آ گئی تھی۔ میں نے ایک دفعہ یوں ہی تمہارا تذکرہ کردیا تھا۔ بس اسے کرید لگ گئی کہ سعید کیسا ہے، اس کی عادتیں کیسی ہیں، وغیرہ۔ جب میں نے اسے یہ بتایا کہ سعید مجھے اپنی بہن سمجھتا ہے تو وہ طنزیہ انداز میں ہنس کر بولی کہ کوئی لڑکا کسی غیر لڑکی کو بہن نہیں سمجھتا۔ وہ زبان سے لاکھ تمہیں بہن کہتا رہے لیکن موقع ملنے پر وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولیں "مجھے معاف کردینا بھائی! میں نے تمہیں صدمہ پہنچایا۔"

"ویسے آپ اداکارہ بہت اچھی ہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ آپ نے فوراً ہی مجھے حقیقت بتا دی ورنہ شاید میں کبھی ادھر کا رخ بھی نہ کرتا۔ نہ آپ کی شکل دیکھنا گوارا کرتا۔"

سعدیہ باجی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے چلی گئیں۔

پھر مجھ سے پڑھائی نہ ہوسکی، اس صورت حال میں پڑھائی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

دوسرے دن شام کو سعدیہ باجی اور انکل بھی میرپور خاص چلے گئے۔

میں نے بھی اپنے کمرے میں ڈیرا جما لیا لیکن دل جمعی سے پڑھائی مجھ سے یہاں بھی نہیں ہو سکی۔ یہاں میری آزمائش کے لیے نزہت موجود تھی۔ وہ بہانے بہانے سے میرے کمرے میں آ جاتی تھی۔ یہ تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گیا کہ ابا نے اوپر کی منزل پر مجھے ایک کمرا بنوا دیا تھا۔ تایا ابو کے کہنے پر اس کمرے کا ایک دروازہ ان کے مکان میں بھی کھلتا تھا۔

مجھ سے یہاں پڑھائی تو نہ ہوسکی لیکن نزہت نے مجھے محبت کا سبق بہت اچھی طرح پڑھا دیا۔

ایک ہفتے بعد امجد وغیرہ میرپور خاص سے آ گئے۔ آنٹی البتہ وہیں رک گئی تھیں۔

میرے پھر وہی شب و روز شروع ہو گئے۔

ایک دن میں اور امجد پڑھنے میں مصروف تھے۔ اچانک سعدیہ باجی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر گھبراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو!

"کیا ہوا باجی؟" امجد نے پوچھا۔

سعدیہ باجی خاموشی سے آنسو بہاتی رہیں۔

"سعدیہ باجی! پلیز بتائیے، ہوا کیا ہے؟"

"وہ... آف... تاب..."

"آفتاب کون؟" امجد نے بپھر کر پوچھا "آفتاب شاہانی!"

سعدیہ باجی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن وہ تو جیل میں تھا؟" میں نے کہا "کیا کیا ہے اس نے؟"

"اس نے یونیورسٹی سے یہاں تک میرا پیچھا کیا اور جب میں بس سے اتر کر..." وہ پھر رونے لگیں۔

"سعدیہ باجی! مجھے بتائیے، کیا، کیا ہے اس صورت

حرام ہے؟" میں نے بپھر کر پوچھا۔

"اس۔۔۔۔۔۔ نے۔۔۔۔۔۔ لوگوں کے سامنے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگی۔ وہاں محلے کے کئی لڑکے بھی تھے۔ وہ جھپٹ کر بیچ میں آ گئے۔ انھوں نے آفتاب کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔"

میں بپھر کر کھڑا ہو گیا "یہ آفتاب رہتا کہاں ہے؟"

"نہیں سعید!" سعدیہ باجی جلدی سے بولیں "تم کچھ نہیں کرو گے۔"

"میں تو اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی امجد بھی چیخ کر بولا "اس حرام زادے نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے، ہم خاموشی سے تماشا دیکھتے رہیں۔"

پھر سعدیہ باجی کے روکنے کے باوجود ہم دونوں گھر سے باہر نکل گئے۔

اسی وقت امجد کو اپنا ایک پڑوسی کاشف نظر آیا۔ وہ موٹر سائیکل پر کہیں سے آیا تھا۔ امجد نے اس سے کچھ دیر کے لیے موٹر سائیکل لے لی۔

ہم لوگ سب سے پہلے یونیورسٹی پہنچے۔ میں جانتا تھا کہ آفتاب اب یونیورسٹی کا طالب علم نہیں ہے لیکن وہ یہاں ہوسٹل میں آتا جاتا رہتا تھا۔

وہاں اس کے ساتھی موجود تھے۔ ان میں اس کا ایک دوست اشرف بھی تھا۔ امجد نے اس سے پوچھا "یہ آفتاب اس وقت کہاں ملے گا؟"

"ان سے کیا کام پڑ گیا آپ کو؟"

"ایک آدمی کی نوکری کے سلسلے میں بات کرنا تھی۔"

"آفتاب بھائی اس وقت منیر کے فلیٹ پر ہوں گے۔"

"یار ذرا وہاں کا ایڈریس بھی بتا دو۔" امجد نے کہا۔

اس نے ایک کاغذ پر نہ صرف منیر کا پتا لکھ دیا بلکہ آفتاب کا سیل نمبر بھی لکھ دیا۔

منیر گلشن کے علاقے میں ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔

ہم وہاں پہنچے تو منیر وہاں موجود تھا۔ اس فلیٹ کو اندر سے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ فلیٹ عیاشی کا اڈا ہے۔ دیواروں پر فلمی اداکاروں اور ماڈلز کے نیم برہنہ اور برہنہ پوسٹرز لگے ہوئے تھے۔ وہاں ایک صوفہ سیٹ اور کچھ کرسیاں پڑی تھیں۔ صوفے کے سامنے والی میز پر شراب کی بوتل اور دو گلاس بھی رکھے تھے۔ ایک گلاس خالی تھا، دوسرا آدھے سے کچھ کم تھا۔

"جی فرمائیے؟" منیر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو اس کے منہ سے بدبو کا بھپکا آیا۔

"آفتاب کہاں ہے؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"آفتاب بھائی کو آنا تو تھا لیکن وہ ابھی تک آئے نہیں۔ بس وہ آنے ہی والے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے، ہم ان کا انتظار کرلیں گے۔" امجد نے کہا۔

ہم لوگ صوفے پر بیٹھے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"شاید آفتاب بھائی آ گئے۔" منیر نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اور امجد اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ دروازہ کھلا اور آفتاب اندر آ گیا۔ وہ ہم دونوں کو دیکھ کر چونک اٹھا اور بولا "کون ہو تم لوگ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اچانک اس کا گریبان پکڑ کر زوردار گھونسا اس کے منہ پر مارا۔ امجد بھی اس پر پل پڑا۔ منیر بیچ میں آیا تو میں نے اسے بھی ایک طرف دھکیل دیا۔

آفتاب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اچانک ریوالور نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، امجد نے اس کے سر پر شراب کی بوتل دے ماری۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ چکرا کر فرش پر گرا۔ اس کے سر سے بری طرح خون بہہ رہا تھا۔ میں نے امجد کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ امجد نے اس کے سر پر اتنی زوردار ضرب لگائی تھی کہ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ مر جائے گا۔ منیر بھی اس وقت دیوار سے ٹکرانے کے بعد بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

ہم دونوں وہاں سے نکل گئے۔

گھر آنے کے بعد ہم اس انتظار میں رہے کہ ابھی پولیس مجھے اور امجد کو پوچھتی ہوئی آئے گی لیکن کافی دن گزرنے کے بعد بھی کوئی نہیں آیا تو ہم مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

سعدیہ باجی بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ تم لوگوں نے آفتاب کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا دیا؟ اس نے تم میں سے کسی کو پہچان تو نہیں لیا؟

ہم نے یہی کہا کہ آفتاب ہمیں ملا ہی نہیں۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ آفتاب کو شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ وہ اس وقت آئی سی یو میں ہے اور زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

ہم دونوں ایک مرتبہ پھر پریشان ہو گئے کہ آفتاب یا

منیر میں سے کوئی ضرور ہمارے بارے میں پولیس کو بتا دے گا۔

اس کے بعد ہمارا پورا دن شدید ذہنی اذیت میں گزرا۔

دو دن بعد آفتاب کو ہوش آ گیا۔ اس نے بھی بیان دیا کہ اسے دو نامعلوم آدمیوں نے زدوکوب کرنے کے بعد لوٹ لیا۔

"یار امجد!" میں نے اس سے کہا "یہ آفتاب جان بوجھ کر جھوٹ کیوں بول رہا ہے؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں یار!" امجد نے کہا "اس نے یقینی طور پر ہم لوگوں کو پہچان لیا ہے۔ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

پھر آفتاب اسپتال سے گھر آ گیا۔

اس دوران میں ہمارے امتحانات ہو چکے تھے اور رزلٹ آنے والا تھا۔

رزلٹ آیا تو حسب معمول میں نے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ مزید خوشی کی بات یہ تھی کہ امجد کا بھی اے ون گریڈ آیا تھا اور اس کے نمبر اتنے اچھے تھے کہ اسے میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکتا تھا۔

پھر اخبارات میں میری تصویریں لگیں، ٹی وی چینلز پر میرے انٹرویوز آئے اور انجینئرنگ یونیورسٹی سے میرے پاس خط آ گیا کہ اگر آپ ہماری یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیں گے تو ہمیں خوشی ہوگی۔

ابا، اماں، شہلا اور امجد کے گھر والوں نے جی بھر کے خوشیاں منائیں۔

خوشیاں منانے والوں میں اس دفعہ تایا ابو بھی پیش پیش تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جا کر نئی ہنڈا ون ففٹی موٹر سائیکل دلائی اور بولے کہ "اگر تم نے اسی محنت سے انجینئرنگ کا امتحان بھی پاس کر لیا تو میں تمھیں نئی گاڑی لے کر دوں گا۔ ہاں، تمہاری تعلیم کے تمام اخراجات بھی میں ہی پورے کروں گا۔"

"تایا ابو!" میں نے کہا "مجھے حکومت کی طرف سے وظیفہ ملے گا۔ تعلیم کے اخراجات تو اسی سے پورے ہو جائیں گے۔ البتہ مجھے مزید ضرورت پڑی تو آپ سے لے لوں گا۔"

اب میرے پاس نئی موٹر سائیکل تھی۔ میں اور امجد اس پر پوری کراچی میں گھومتے پھرتے تھے۔ کئی دفعہ سعدیہ باجی میرے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھومنے گئیں۔

اب میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی منزل بہت قریب نظر آ رہی تھی۔ ابا تو گویا پھر سے جوان ہو گئے تھے۔ ان کا کاروبار بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

اب وہ صرف پرچون کی اس چھوٹی سی دکان کے مالک نہیں تھے بلکہ ایک خاصے بڑے جنرل اسٹور، کراکری کی ایک دکان اور جیولری کی اچھی بڑی دکان کے مالک تھے۔ مارکیٹ میں ان کی ایک عزت تھی۔ وہ بھی بہت فخر سے سینہ تان کر کہتے تھے کہ میرا بیٹا انجینئر بن رہا ہے۔ لوگ اخبارات اور ٹی وی چینلز پر مجھے دیکھ کر یوں بھی خاصے مرعوب تھے۔ ہمارے محلے والے تو اپنے بچوں کو میری مثال دیا کرتے تھے۔

کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اگر ابا اس دن میرے اسکول نہ جانے پر اتنا شدید ردعمل ظاہر نہ کرتے تو آج شاید میں ابا کی پرچون کی دکان پر بیٹھا ہوتا یا آوارہ لڑکوں کی صحبت میں پڑ کر کئی دفعہ جیل کی ہوا کھا چکا ہوتا۔ بعض اوقات ایک لمحہ کسی بھی انسان کی زندگی میں کتنا اہم اور انقلاب آفریں ہوتا ہے۔ میں آج جس مقام پر بھی تھا، ابا ہی کی وجہ سے تھا۔

اس دن میں گھر واپس آیا تو شام کے سات بج رہے تھے۔ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا۔ اسکرین پر امجد کا نام دیکھ کر میں نے فوراً کال ریسیو کرلی "ہاں امجد؟"

"یار سعید!" امجد بھرائی ہوئی آواز میں بولا "سعدیہ باجی صبح ایک کمپنی میں انٹرویو دینے گئی تھیں، وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹی ہیں۔"

"ابھی تک واپس نہیں آئیں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "اچھا تم پریشان مت ہو۔ میں آ رہا ہوں۔"

شہلا میرے لیے چائے لے کر آئی تو میں نے کہا۔ "چائے میں واپسی پر پیوں گا۔ ابھی مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" میں نے موٹر سائیکل کی چابی اٹھائی اور گھر سے باہر نکل گیا۔

مجھے امجد کے گھر پہنچنے میں چھ منٹ لگے۔ حالانکہ یہی فاصلہ میں بائیک پر پندرہ منٹ میں طے کیا کرتا تھا۔

آنٹی کی حالت بہت خراب تھی۔ امجد بھی اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ انکل پولیس میں رپورٹ درج کرانے جا رہے تھے۔

"اتنی جلدی مت کریں انکل!" میں نے کہا "پولیس میں رپورٹ درج کرانے سے ہماری ہی بدنامی ہوگی۔ پولیس والے ایسے ایسے سوال کریں گے کہ آپ برداشت

تھیں کر نہیں گے۔ وہ پوچھتے بھی کیسے کہ جوان لڑکی ہے، اپنے کسی شناسا کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔"

"کیا بکواس کررہے ہو؟" انکل بپھر کر بولے۔

"سوری انکل!" میں نے کہا "میں وہ سوالات بتا رہا ہوں جو پولیس والے کرتے ہیں۔ دو سال پہلے ہمارے محلے کے صابر صاحب کی بیٹی اغوا ہوگئی تھی۔ پولیس والوں نے ان سے بھی اسی طرح کے شرمناک سوالات کیے تھے۔"

"سعید ٹھیک کہہ رہا ہے۔" امجد کی والدہ نے کہا "پہلے ہمیں اپنے طور پر تلاش کرنا چاہیے۔"

"ان کا انٹرویو تھا کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"یار، صبح جب تو آیا تھا تو وہ تجھے بتا تو رہی تھیں۔" امجد نے کہا۔

میں نے صبح کی بات چیت یاد کرنے کی کوشش کی۔ میں روزانہ صبح امجد کو لینے ان کے گھر آجاتا تھا۔ پھر سعدیہ باجی نے مجھ سے چائے پینے کو کہا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ کے اینڈ ایس ٹریڈنگ کارپوریشن کی طرف سے مجھے انٹرویو کال آئی ہے۔ ان کا آفس ڈیفنس فیز فائیو میں ہے، فیز فائیو کا بھی دوسری کنارہ!"

"میں آپ کو بائیک پر ڈراپ کردوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھئی، میں ٹیکسی میں جاؤں گی۔ بائیک پر تو انسان کا حلیہ ہی خراب ہوجاتا ہے۔" پھر وہ چونک کر بولیں۔ "سعید! تمہارے پاس وہ پین ہے جو میں نے تمہیں گفٹ کیا تھا؟"

"وہ تو ہروقت میرے پاس رہتا ہے باجی!"

"اپنا وہ لکی پین کچھ دیر کے لیے مجھے دے دو۔ میرے پاس پین تو ہے لیکن میں وہاں جو کچھ بھی لکھوں گی، تمہارے اس لکی پین سے لکھوں گی۔"

میں نے خاموشی سے پین ان کے حوالے کردیا۔ اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ کوئی پین، انگوٹھی یا نگینہ لکی نہیں ہوتا۔

"ہاں، وہ کے اینڈ ایس ٹریڈنگ کارپوریشن کے آفس گئی تھیں۔" میں نے کہا "اس کمپنی کا آفس ڈیفنس کے فیز فائیو میں ہے۔" میں نے سیل فون نکالا اور انکوائری سے کے اینڈ ایس کا نمبر معلوم کیا۔

میں نے اس نمبر پر فون کیا تو دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔

"میں وہاں جاکر دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا سعدیہ اب تک وہیں بیٹھی ہوگی؟" انکل نے کہا۔

میں ان کی بات سنے بغیر باہر نکل گیا۔ میرے ساتھ امجد بھی تھا۔

ہم ...... کے اینڈ ایس ٹریڈنگ کارپوریشن کے دفتر پہنچے تو وہاں سوائے ایک سیکیورٹی گارڈ کے کوئی نہیں تھا۔

"خان صاحب! یہ دفتر کتنے بجے بند ہوتا ہے؟" امجد نے اس سے پوچھا۔

"دفتر کا چھٹی تو پانچ بجے ہوجاتا ہے لیکن صاحب لوگ سات بجے تک گھر جاتا ہے۔"

"صاحب لوگ کون؟" امجد نے پوچھا۔

"اس دفتر کا مالک، منیجر اور دو تین دوسرے افسر!" گارڈ نے جواب دیا "آپ کو کوئی کام ہے تو صبح آجاؤ۔ صبح نو بجے تک آفس کھل جاتا ہے۔"

"آج یہاں ملازمت کے لیے انٹرویو تھے؟" امجد نے پوچھا۔

"ہاں، انٹرویو تو آج ہوگیا۔"

اس سے مزید کچھ معلوم ہونے کی امید فضول تھی۔

اب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سعدیہ باجی کو کہاں تلاش کروں؟

اس کے باوجود ہم لوگ مختلف اسپتالوں میں دیکھتے رہے کہ ممکن ہے، سعدیہ باجی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہو۔

ہم لوگ ناکام گھر پہنچے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

انکل نے کہا "اب تو پولیس میں رپورٹ کرنی ہی چاہیے۔"

اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔

میں اور امجد بھی انکل کے ساتھ پولیس اسٹیشن جانے کے لیے تیار ہوگئے۔

"تم لوگ تھکے ہارے آئے ہو۔" آنٹی نے کہا "منہ ہاتھ دھوکر ایک کپ چائے پی لو۔ ممکن ہے اس وقت تک سعدیہ خود ہی آجائے۔"

مجھے ان کی حالت پر ترس آگیا۔

ہم دونوں ہاتھ منہ دھوکر تازہ دم ہوئے، پھر آنٹی نے ہمیں چائے دے دی۔

ابھی ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

ہم بھی چونک اٹھے۔ آنٹی جلدی سے بولیں "سعدیہ آگئی۔"

"سعدیہ اتنی غیر مہذب نہیں ہے کہ دروازے پر دستک دینے کے بجائے اسے توڑنے کی کوشش کرے۔" انکل نے

کہا "تم لوگ بیٹھو، میں دیکھتا ہوں۔"

انکل نے دروازے کے پاس جاکر پوچھا "کون ہے؟"

"پولیس!" باہر سے ایک کرخت آواز آئی۔

"پولیس؟" میں نے حیرت سے دوہرایا اور چائے کا کپ رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ امجد مجھ سے پہلے ہی کھڑا ہوچکا تھا۔

اس دوران میں انکل دروازہ کھول کر باہر نکل چکے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے میں اور امجد بھی باہر نکل آئے۔ وہاں ایک سب انسپکٹر اور ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔

"ساجد علی آپ ہی ہیں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں، فرمایئے۔" انکل نے کہا۔

"آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا پڑے گا۔"

"تھانے ...... کس سلسلے میں؟" امجد نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"آپ ......؟"

"یہ میرا بیٹا ہے امجد!" انکل نے جلدی سے کہا۔

"سعدیہ علی آپ ہی کی بیٹی ہے؟" انسپکٹر نے اچانک پوچھا۔

"جی ہاں، سعدیہ ...... میری بیٹی ہے ...... وہ خیریت سے تو ہے نا؟"

"آپ میرے ساتھ تھانے چلیں۔ اس کے بعد میں کچھ بتا سکوں گا۔"

"چلیے۔" انکل فوراً تیار ہوگئے۔

کچھ فاصلے پر پولیس موبائل کھڑی تھی۔ انکل انسپکٹر کے ساتھ پولیس کی وین میں بیٹھ گئے۔ میں اور امجد موٹر سائیکل پر تھانے کی طرف روانہ ہوگئے۔

پولیس اسٹیشن کے در و دیوار سے نحوست برس رہی تھی۔

پولیس انسپکٹر ہمیں وہاں سے کچھ فاصلے پر واقع ایک اور عمارت میں لے گیا۔

میں نے گھبراہٹ میں عمارت کے نام پر غور نہیں کیا۔

سب انسپکٹر نے وہاں موجود سنتری کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک بھاری بھرکم دروازہ کھول دیا۔

وہ مردہ خانہ تھا۔ وہاں موت کی وحشت ناک بو بسی ہوئی تھی۔

سنتری نے ایک لاش کے چہرے سے کپڑا اٹھایا تو مجھے بے اختیار چکر آگیا۔ وہ لاش سعدیہ باجی کی تھی۔ ان کے چہرے پر صدمے اور دہشت کے تاثرات منجمد ہوکر رہ گئے تھے۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

میں اگر فوراً ہی دیوار کا سہارا نہ لے لیتا تو اوندھے منہ گر پڑتا۔ مجھے اپنی دائیں طرف سے دھم کی آواز سنائی دی، میں نے مڑ کر دیکھا تو امجد فرش پر گرا ہوا تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر رو دوں لیکن اس وقت تو امجد اور انکل کو سنبھالنا ہی ایک مسئلہ تھا۔

میں نے امجد کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور انکل کا ہاتھ پکڑ کر انہیں موت کی اس بو سے باہر نکال لیا۔

امجد کو میں نے باہر لان میں لٹا دیا اور خود پانی کی تلاش میں نکل گیا۔

میں وہاں سے کچھ فاصلے پر واقع ایک دکان سے منرل واٹر کی بوتل لے آیا۔

امجد ہوش میں آچکا تھا۔ انکل بھی نڈھال نڈھال سے ایک طرف بیٹھے تھے۔ پانی پی کر ان دونوں کی جان میں جان آئی۔

سب انسپکٹر دوبارہ وہاں آیا اور انکل سے بولا "بزرگو! آپ نے ڈیڈ باڈی کو شناخت کرلیا؟"

"جی ہاں، انسپکٹر صاحب! وہ میری بیٹی سعدیہ ہی ہے۔ آپ ضروری کارروائی کرنے کے بعد اس بدنصیب کی لاش ...... میرے ...... حوالے کردیں۔" انکل ضبط کھو بیٹھے اور بلک بلک کر رونے لگے۔

"صبر کریں بزرگو!" سب انسپکٹر نے کہا۔

میں نے پہلا پولیس والا دیکھا تھا جو انکل سے نہ صرف نرم لہجے میں بات کررہا تھا بلکہ انہیں تسلی بھی دے رہا تھا۔

"آپ لوگ پڑھے لکھے ہیں سر جی!" سب انسپکٹر نے کہا "آپ کی بیٹی کو قتل کیا گیا ہے۔ ہم پوسٹ مارٹم کے بغیر ڈیڈ باڈی کیسے دے سکتے ہیں۔"

پھر میں نے اور انکل نے بہت مشکل سے امجد کو سمجھایا۔ وہ پوسٹ مارٹم کرانے پر راضی نہیں ہورہا تھا۔

میں نے تھانے ہی سے ابا کو فون کردیا۔

وہ اماں اور شہلا کو لے کر امجد کے گھر پہنچ گئے۔

موت کے گھر سے مجھے ہمیشہ سے دہشت ہوتی ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ ابا نے انکل اور امجد کو سنبھال لیا تھا۔

اماں اور شہلا بھی آنٹی کی دل جوئی میں لگی ہوئی تھیں۔

میں اس دہشت زدہ ماحول سے گھبرا کر باہر نکل آیا اور مکان کے سامنے بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھ گیا۔

مجھے سعدیہ باجی کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ ان کی کھنکتی ہوئی ہنسی کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ آج صبح ہی تو ہنستی بولتی گھر سے گئی تھیں۔ موت سے کس کو رستگاری ہے؟

لیکن اس ناگہانی موت پر تو پورا محلہ اشک بار تھا۔

میرا دل بھی بھر آیا اور میں بھی بلک بلک کر رونے لگا۔ مجھے اس وقت سے لے کر اب تک رونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

میں اتنا رویا کہ نڈھال ہو کر اس چبوترے پر گر گیا۔

اچانک کسی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ ابا تھے اور شاید مجھے ڈھونڈتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔

''بس کر بیٹا!'' ابا نے کہا ''تو بھی دل چھوڑ بیٹھے گا تو ان لوگوں کو کون سنبھالے گا؟''

دوسرے دن بھی انکل کے دوست احباب اور دور نزدیک کے تمام رشتے دار آ گئے تھے۔

اس دن تایا ابو اپنے ساتھ نزہت کو بھی لے آئے تھے۔

میں سیپارہ پڑھنے میں مصروف تھا۔

اچانک وہی سب انسپکٹر پھر آ گیا جو سعدیہ باجی کی موت کی اطلاع لے کر آیا تھا۔

''سعید الحق کون ہے؟'' اس مرتبہ اس کا لہجہ روایتی پولیس والوں کی طرح درشت تھا۔

''جی، میں ہوں سعید!'' میں نے کہا ''فرمایئے!''

''مقتولہ سے تیرا کیا رشتہ تھا؟'' اس نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

''وہ بہن تھی میری۔'' میں نے کہا۔

''سگی؟'' سب انسپکٹر نے پوچھا۔

''وہ تو میرے لیے سگی بہنوں سے بھی بڑھ کر تھیں آفیسر! بعض رشتے خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں، وہ......''

''اوئے، میں نے تجھے تقریر کرنے کو نہیں کہا تھا۔'' وہ بدتمیزی سے بولا۔

ابا اور تایا سمیت ہر شخص کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

''نہیں، وہ میری سگی بہن نہیں تھیں۔''

''چل میرے ساتھ ذرا تھانے چل!'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔

مجھے بھی اچانک غصہ آ گیا۔ ''عجیب آدمی ہیں آپ؟'' میں چیخ کر بولا ''ہمارا پورا گھر صدمے میں مبتلا ہے اور آپ کو اپنی ہی پڑی ہے۔ جائیے۔ میں کچھ دیر بعد خود ہی پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤں گا۔''

''شٹ اپ!'' سب انسپکٹر حلق کے بل دہاڑا ''سیدھی طرح چل رہا ہے یا تجھے ہتھکڑی لگا کر لے جاؤں؟''

''وہاٹ نان سینس...... ہتھکڑی لگا کے لے جاؤں گا؟'' میں چیخ کر بولا ''اب تم جا سکتے ہو۔''

سب انسپکٹر نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے میرے چہرے پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ اس کی آواز دور تک سنائی دی ہوگی۔ اس تھپڑ سے زیادہ مجھے اپنی توہین کا صدمہ تھا۔ سب انسپکٹر نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مجھے بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے پولیس وین تک لے گیا۔

اپنی ذلت اور توہین کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کچھ دیر پہلے تک جو لوگ مجھ پر رشک کرتے تھے، میری عزت کرتے تھے، ان کے چہروں پر عجیب سے تاثرات تھے۔

ابا، تایا، انکل اور امجد ہمارے پیچھے پیچھے وین تک آئے۔ انہوں نے سب انسپکٹر سے اس سلوک کا سبب جاننے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے انتہائی رعونت سے جواب دیا کہ تھانے جا کر آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔

سب انسپکٹر نے تھانے لے جا کر مجھے حوالات میں بند کر دیا۔

مجھ سے ملنے جو لوگ آئے تھے، انہیں ملنے نہیں دیا گیا۔

رات گئے سب انسپکٹر میرے پاس آیا اور مجھے ایک پین دکھا کر بولا ''اس قلم کو پہچانتے ہو؟''

''ہاں، یہ میرا قلم ہے۔ اس پر میرا نام بھی لکھا ہوا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ قلم پولیس کو مقتولہ سعدیہ کی لاش کے پاس سے ملا ہے۔''

''ضرور ملا ہوگا۔'' میں نے کہا ''سعدیہ باجی نے اسی دن مجھ سے یہ قلم مانگا تھا۔''

وہ رات میں نے تھانے کی حوالات میں گزاری۔ وہ میرے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھی۔

دوسرے دن پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ گئی۔ سعدیہ باجی کو بے آبرو کرنے کے بعد انہیں گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ گلا گھونٹنے کے لیے قاتل نے رسی یا سعدیہ باجی کے دوپٹے ہی کا استعمال کیا تھا۔

میرے خلاف دوسری شہادت یہ تھی کہ ان کی لاش کے پاس میرا اسکارف بھی ملا تھا۔ وہ اسکارف میں نے خود خریدا تھا۔ میں نے اسے استعمال بھی کیا تھا اور کئی لوگ اسے میرے اسکارف کی حیثیت سے جانتے بھی تھے۔ اسی طرح کا اسکارف امجد کے پاس بھی تھا۔ میں نے سعدیہ باجی کو وہ

اسکارف اس لیے دیا تھا کہ وہ اس کے کسی کونے پر میرے نام کا پہلا حرف ''S'' کاڑھ دیں۔ انہوں نے اس پر بہت خوبصورتی سے میرا نام تو کاڑھ دیا لیکن اسے خود استعمال کرنے لگیں۔ کہتی تھیں کہ اس میں سے مجھے تمہاری خوشبو آتی ہے۔

پولیس نے باقاعدہ میرے خلاف ایف آئی آر درج کر کے میرا سات دن کا ریمانڈ لے لیا۔

وہ سات دن گویا میرے لیے سات صدیاں تھے۔ ان سات دنوں میں مجھے معلوم ہوا کہ پولیس مجبوروں پر کس کس انداز میں تشدد کرتی ہے۔ پھر مجھے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔

تایا ابو نے میرے لیے شہر کے ایک بہت معروف بیرسٹر سلطان نوازکا بندوبست کیا تھا۔

وہ واقعی بہت اچھے وکیل تھے۔ ان کی کوششوں سے دو مہینے کے اندر اندر میری ضمانت ہو گئی۔

میں گھر پہنچا تو کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں تھا۔

گھر والوں نے تو میری بات پر یقین کر لیا تھا لیکن میں دوسرے لوگوں کو کیسے یقین دلاتا کہ میں بے گناہ ہوں۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ شہلا نے بھاری سا ایک لفافہ مجھے لا کر دیا اور بولی ''آپ کی گرفتاری والے دن یہ کوریئر سے موصول ہوا تھا۔''

میں نے الٹ پلٹ کر لفافہ دیکھا۔ میرا نام اور پتا جس تحریر میں تھا، وہ مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی۔

شہلا کے جانے کے بعد میں نے وہ لفافہ کھول لیا۔ اس میں سے بہت سے کرنسی نوٹ نکل کر بستر پر گر گئے۔ وہ ہزار ہزار اور پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی شکل میں تقریباً دو لاکھ روپے تھے۔ کچھ تصویریں تھیں جن میں سعدیہ باجی میرے ساتھ کھڑی تھیں۔ بہت سے کاغذات تھے۔

میں نے ان کاغذات کو پڑھنا شروع کیا۔ وہ دراصل میں ایک طویل خط تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

''پیارے سعید! ہمیشہ خوش رہو، ہنستے مسکراتے رہو اور اسی طرح کامیابی کی منزلیں طے کرتے رہو۔ جب تمہیں یہ خط ملے گا تو میں اس دنیا کو چھوڑ کر جا چکی ہوں گی اس لیے دل کی بات کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

میں عمر میں تم سے چار پانچ سال بڑی ہوں اس کے باوجود تمہیں چاہتی ہوں اور اس وقت سے چاہتی ہوں جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں نے تم سے اظہار کی کوشش کی لیکن تمہارا شدید ردعمل دیکھ کر ڈر گئی اور یہ بہانہ کر دیا کہ میں تمہیں آزما رہی تھی۔

میں دراصل اپنے جذبوں کو، اپنی محبت کو آزما رہی تھی۔ تم تو اس آزمائش میں سرخ رو ہو لیکن میں خود اپنی ہی نظروں میں گر گئی۔

پھر میرے ساتھ ایک ایسا سانحہ ہو گیا کہ میں تمہارے قابل ہی نہیں رہی۔ آفتاب نے اس دن صرف میرا ہاتھ ہی نہیں پکڑا تھا بلکہ وہ مجھے زبردستی گاڑی میں بٹھا کر اپنے ایک دوست کے فلیٹ پر لے گیا تھا۔ وہاں اس نے مجھے بے آبرو کر دیا۔ مجھے اس بات کی سزا دی تھی کہ میں نے اس کا رشتہ کیوں ٹھکرایا۔

میں شاید اسی دن اپنی جان دے دیتی لیکن مجھے آفتاب سے انتقام لینا تھا۔

اس دن انٹرویو کے بعد میں نے ہی اسے بلایا ہے کہ وہ مجھے گھر ڈراپ کر دے۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے اپنے اسی دوست کے فلیٹ پر لے جائے گا۔

میں نے زہر کا انتظام کر لیا ہے اور میں آفتاب کو زہر دے کر مارنا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے تمہارے نام یہ خط لکھ کر کوریئر کر دوں گی۔ اس میں چند یادگار فوٹو ہیں۔ تمہارے لیے تو شاید ان کی اہمیت ہی نہ ہو لیکن میرے لیے یہ بہت قیمتی ہیں کہ تم ان تصویروں میں میرے ساتھ ہو۔

میں نے گزشتہ دس سال میں کچھ رقم جمع کی ہے۔ میں وہی تمہیں بھیج رہی ہوں۔ آج میں آفتاب کو زہر دینے جا رہی ہوں۔ یا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب رہوں گی یا پھر ناکام ہو جاؤں گی۔ ہر صورت میں آج میں اپنی جان دے دوں گی۔ میں نے زہر کی کچھ مقدار اپنے لیے بھی بچا رکھی ہے۔ اگر تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ میں تو آخری سانس تک تمہیں چاہتی رہوں گی کہ دل پر کسی کو کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ تمہیں نزہت کے ساتھ ہمیشہ سکھی رکھے، بہت پیاری بچی ہے۔

سعدیہ جو کبھی تمہاری نہ ہو سکی۔''

خط پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سعدیہ باجی مجھے اتنے جنونی انداز میں چاہتی تھیں۔

پھر مجھے خیال آیا کہ وہ تو آفتاب کو زہر دینے گئی تھیں، پھر ان کے ساتھ کیا ہوا؟ اس سوال کا جواب آفتاب دے سکتا تھا یا نصیر۔

کئی مہینے جیل میں رہ کر میری دوستی ایسے لوگوں سے بھی ہو گئی تھی جن کی زندگی کا مقصد مارنا اور مرنا تھا۔

شوکا بھی ایسا ہی آدمی تھا۔ وہ مجھ سے دو دن پہلے جیل سے رہا ہوا تھا۔

میں سیدھا اس کے پاس پہنچ گیا اور اسے بتایا کہ ایک آدمی کی زبان کھلوانی ہے۔

"سعید بابو! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

پھر دوسرے دن اس نے منیر کو اٹھوا لیا۔ منیر بنیادی طور پر ایک بزدل آدمی تھا۔

وہ شوکے کے دو تھپڑ بھی نہ سہہ سکا اور سب کچھ اگل دیا۔ پھر خوشامد بھرے انداز میں بولا "شوکا بھائی! اب تو میں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے، اب مجھے جانے دو۔ میری ماں اور بہن میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"تم نے کچھ بھی سچ نہیں بولا ہے منیرا!" شوکا نے اسے گھورتے ہوئے کہا "اب اگر تم جھوٹ بولے تو تمہاری ماں اور بہن بھی تمہیں نہیں ملیں گی۔ تمہاری ماں کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دوں گا اور تمہاری بہن......"

"نہیں نہیں۔" منیر خوف زدہ ہو کر بولا "میں سب کچھ سچ سچ بتائے دیتا ہوں۔"

اس نے بتایا کہ آفتاب اپنے ساتھ خوبصورت سی ایک لڑکی کو لایا تھا۔ وہ دونوں کافی دیر باتیں کرتے رہے پھر اچانک مجھے آفتاب کے چیخنے کی آواز آئی۔ "تو مجھے الو کا پٹھا سمجھتی ہے۔ تو کیا سمجھی کہ مجھے مارنا اتنا آسان ہے۔ ہاں، اب میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

آفتاب نے اس کے گلے میں اس کا سکارف کا پھندا لگایا اور عالم جنون میں اس کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ لاش کو کسی ویرانے میں پھینک آؤ۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ یہ کام مجھ اکیلے کا نہیں ہے۔ آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔

ہم نے اندھیرا ہونے کا انتظار کیا، پھر اس لڑکی سعدیہ کی لاش لے کر ایک ویرانے میں چلے گئے۔ آفتاب نے سعدیہ کی لاش کے پاس اس کے پرس کے ساتھ ساتھ ایک قلم اور اسکارف بھی ڈال دیا اور ہنس کر بولا کہ اب اس قتل کے جرم میں کوئی اور پھنسے گا۔ وہ حرام زادہ خود کو بہت ہوشیار سمجھتی تھی۔ میری شراب میں زہر ملا دیا تھا اس نے۔ اگر میں تھوڑا سا چوک جاتا تو اس وقت اس کے بجائے میری لاش پڑی ہوتی۔"

"تمہیں یہ سب کچھ عدالت میں بھی کہنا ہے۔" شوکا نے کہا "اماں اور بہن سے تمہاری ملاقات اسی وقت ہوگی جب تم یہ بیان دے دو گے۔ چلو اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

اس کے جانے کے بعد بھی شوکا نے مجھے روک لیا اور بولا "سعید بابو! ہمارے ساتھ چائے ہی پی لو۔"

میں گھر پہنچا تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

میں نے یونہی ٹی وی کھولا تو خبریں آ رہی تھیں۔

اچانک ایک خبر سن کر میں چونک اٹھا۔ "شیریں جناح کالونی کے رہنے والے ایک شخص کو گولیاں مار کے ہلاک کر دیا گیا۔ پولیس کے خیال میں یہ ٹارگٹ کلنگ ہے۔ مقتول کی شناخت منیر کے نام سے ہوئی ہے۔ اس کی ماں اور بہن بھی غائب ہیں۔"

خبر سن کر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

یہ بھی مجھے آفتاب ہی کی کارروائی لگ رہی تھی۔

صبح میں شوکا کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ مجھے ایک ریوالور چاہیے۔

"تو ایک چھوڑ دو ریوالور لے لے لیکن ریوالور کا کرے گا کیا؟"

"شوکے بھائی! ہتھیار تو آج کل بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

شوکے نے مجھے ایک امپورٹڈ قیمتی جرمن لیوگر دے دیا۔

میں وہ پستول لے کر سیدھا آفتاب کے گھر پہنچا۔ وہ اس وقت ناشتا کر رہا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کی ماں اور بہن بھی موجود تھیں اور والد بھی۔

"کون ہو تم؟" آفتاب اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے سکیورٹی گارڈز کو بلاتا یا پولیس کو اطلاع دیتا، میں نے یکے بعد دیگرے تین گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔

کوئی ایک لمحہ ہوتا ہے جو کسی کی زندگی میں انقلاب لے آتا ہے، میری زندگی میں وہ لمحہ دوسری بار آیا تھا۔

☆☆☆

اب میں جیل میں ہوں اور مجھے یہ بھی ملال نہیں ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے سعدیہ باجی کے قاتل کو قتل کیا ہے۔

اس نے بھی تو میرے مستقبل کو، میرے باپ کے ارمانوں کو، میری بہن کی تمناؤں کو قتل کیا تھا۔

بس میں ڈرتا ہوں کہ وہ لمحہ اب کبھی میری زندگی میں آئے۔

آئینہ

جناب ایڈیٹر صاحب!

السلام علیکم

میں یہ خود بیتی آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ کہاں تک کامیاب رہا ہوں اس کا فیصلہ آپ اور قارئین کریں گے۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ انسان جو بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔ میں نے نادانستگی میں ایک جرم کیا تھا۔ اس کا پھل کیسا ملا، آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ضمیر بٹ
(آلہ پورا)

"پاپا۔" میری بیٹی آئینہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھیں میری گڑیا...... بھائی نے خراب کر دی ہے۔"

اس کی گڑیا کے بال کھنچے ہوئے تھے۔ لیے جس سے اس کی سجاوٹ متاثر ہوئی تھی۔ میں نے گڑیا لے کر اس کے بال ٹھیک کر دیے۔ "اب ٹھیک ہے۔"

آئینہ مسکرانے لگی۔ "ہاں اب ٹھیک ہے پاپا۔"

یہ کہہ کر وہ اچھلتی کودتی کمرے سے چلی گئی۔ عائشہ میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ آئینہ کے جانے کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ "ضمیر ہماری بچی کا کیا ہوگا؟"

اس سوال پر میرا دل بھی ڈوب گیا تھا۔ کیونکہ میں بھی اکثر یہی سوچتا تھا کہ آئینہ کا کیا ہوگا۔ وہ بہت پیاری سی تھی۔ گلابی رنگت اور اس پر بہت پیارے سے نقوش، سیاہ آنکھیں اور سیاہ بال تھے۔ چند سالوں میں اس نے اچھا خاصا قد نکال لیا تھا۔ وہ سترہ سال کی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کا ذہن بچکانہ تھا۔ وہ پانچ سال کی بچی جتنا ذہن رکھتی تھی بلکہ پانچ سال کی بچی بھی اس کے مقابلے میں زیادہ ذہین ہوتی ہے۔

آئینہ ہماری سب سے بڑی بیٹی ہے اس کے بعد دو بیٹے ہیں۔ حمید بارہ سال کا ہے اور زید نو سال کا۔ جب آئینہ پیدا ہوئی تو بہ ظاہر نارمل بچی تھی، اس کی دماغی نشوونما میں کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ ہنستی روتی اور دوسرے نارمل بچوں کی طرح ردعمل ظاہر کرتی تھی۔ اسے چند مہینے کی عمر میں شکلیں بنانا اور دوسروں کو متوجہ کرنا بھی آ گیا تھا۔ اس وجہ سے بھی ہم نے توجہ نہیں دی۔ ہاں جب وہ دو سال کی ہوئی۔ اس کی جسمانی نشوونما ٹھیک تھی اور وہ دو سال سے بڑی نظر آتی تھی لیکن اس نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ عام الفاظ جیسے ماما پاپا بھی نہیں بول پاتی تھی تب مجھے اور عائشہ کو تشویش ہوئی اور ہم نے اسے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے مشورہ دیا کہ ہم اسے بچوں کے ماہر کو دکھائیں۔ بچوں کے ماہر نے اسے بچوں کے دماغی ماہر کی طرف ریفر کر دیا اور دماغی ماہر نے اس کے کئی پیچیدہ ٹیسٹ بتا دیے۔

میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔ تنخواہ اچھی ہے اور ساتھ میں میڈیکل بھی ملا ہوا ہے اس لیے میں نے یہ مہنگے ٹیسٹ کرا لیے۔ اگر میں عام آدمی ہوتا اچھی جاب بھی نہ کر رہا ہوتا تب بھی یہ ٹیسٹ نہیں کرا سکتا تھا۔ کیونکہ پندرہ سال پہلے یہ ٹیسٹ کوئی تیس ہزار روپے کے ہوئے تھے، اس میں دماغ کا ایک خاص اسکین بھی تھا۔ جب ہم یہ ٹیسٹ کرا رہے تھے تب ہی مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ ہمیں آئینہ کے بارے میں کوئی اچھی خبر سننے کو نہیں ملے گی۔ ٹیسٹ ہوئے اور جب رپورٹس لے کر دماغی امراض کے ماہر کے پاس گئے تو اس نے بتایا۔

”مجھے افسوس ہے لیکن آپ کی بچی کا دماغ ٹھیک طرح سے نشوونما نہیں پا سکا ہے اور اس کے دماغ کا وہ حصہ درست طریقے سے بنا ہی نہیں ہے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دیتا ہے اور انسان کی شخصیت بناتا ہے۔“

میں اور عائشہ سن کر پریشان ہو گئے۔ ”کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر۔“ عائشہ تڑپ کر بولی۔ ”کیا میری بچی ٹھیک نہیں ہو گی؟“

”ڈاکٹر صاحب اس کا علاج تو ہوگا؟“ میں نے بھی امید سے پوچھا۔

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے جو نقصان ہونا تھا وہ ہو گیا اور اس کی تلافی بھی ممکن نہیں ہے لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ کچھ تھراپیز اور دواؤں کی مدد سے ہم اس کی کنڈیشن کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا ممکن نہیں ہے۔“

میرا دل ڈوبنے لگا۔ ”آپ کا مطلب ہے اب یہ باقی عمر ایب نارمل گزارے گی۔“

”ہاں آپ چاہیں تو ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ سب کہتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے لیکن میں اپنے کلائنٹس کو حقائق سے آگاہ کرنا بہتر سمجھتا ہوں بہ نسبت ان کو تاریکی میں رکھنے کے۔“

مجھے اور عائشہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہماری اتنی پیاری اور بہ ظاہر پوری طرح صحت مند نظر آنے والی بچی دماغی طور پر کمزور ہے اور یہ کمزوری بھی ایسی ہے کہ وہ ساری عمر ایب نارمل شخصیت بن کر رہے گی۔ یعنی وہ معاشرتی زندگی میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکے گی۔ وہ تعلیم حاصل کرے گی اور نہ ہم اس کی شادی کر سکیں گے۔ ظاہر ہے ایب نارمل لڑکی سے کون شادی کرے گا اور اگر کوئی ہمدردی میں آ کر کر بھی لے تو آئینہ نارمل زندگی کیسے گزار سکے گی؟ شادی کے بعد عورت ماں بنتی ہے اور بچوں کی پرورش کرتی ہے، آئینہ یہ سب کیسے کرے گی؟

ڈاکٹر نے آئینہ کے لیے کچھ دوائیں اور تھراپیز تجویز کیں۔ ان میں جسمانی کنٹرول کے لیے ایکسرسائز اور اسپیچ تھراپی تھیں۔ ساتھ ہی اس کی دماغی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے ایسے بچوں کے لیے بنائے پزل اور گیمز بھی تجویز کیے۔ اس نے ہم سے کہا۔ ”فی الحال تو آپ گھر پر یہ سب کر لیں یہ بچی ہے اور آپ سے مانوس ہے اس لیے تیزی سے سیکھے گی۔ لیکن دس سال کی عمر تک اسے کسی ایب نارمل بچوں کے ادارے میں لازمی داخل کرائیں تاکہ وہ اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو بہتر بنا سکیں۔“

ابھی تو آئینہ دو سال کی تھی اور دس سال میں بہت وقت تھا۔ ہمیں خیال آیا کہ ممکن ہے دنیا میں کہیں اس مرض کا کوئی علاج ہو۔ میں نے کوشش کی۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی کلینکس تھے وہاں آئینہ کی رپورٹس بھیجیں۔ جرمنی اور جاپان بھی اس کی رپورٹس گئیں لیکن سب جگہ ایک جیسا ردعمل آیا تھا۔ اس کو لاحق مسئلے کا دنیا میں کوئی علاج نہیں تھا۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر حکیموں اور ہومیو پیتھک ڈاکٹرز کے پاس گئے۔ کئی سال تک ان سے علاج کراتے رہے لیکن آئینہ کی ذہنی حالت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

وہ جسمانی طور پر ٹھیک تھی اور اس کی نشوونما بھی درست رفتار سے جاری تھی۔ اس کا اپنے جسم پر قابو بھی تھا۔ ہاں کبھی کبھی کوئی کام تیزی سے کرنے کی کوشش کرتی تو یہ قابو ختم بھی ہو جاتا تھا۔ کئی بار وہ اسی وجہ سے بری طرح گری اور اسے چوٹ آئی تھی۔ ایک بار وہ منہ کے بل گری تو اس کا نچلا

ہونٹ ایک گوشے سے ذرا سا کٹ گیا تھا۔ بعد میں زخم تو ٹھیک ہو گیا تھا لیکن اس کا یہ نشان برقرار رہا تھا۔ اس کے چہرے پر یہ نشان بھی اچھا لگتا تھا۔ ذہنی طور پر اس نے بہت دیر سے ردعمل دینا شروع کیا۔ اسپیچ تھراپی سے اس نے کوئی چھ سال کی عمر میں جا کر بولنا شروع کیا اور اس میں بھی اسے مخصوص الفاظ آتے تھے۔ کوئی بات اسے بتانے کے لیے بار بار سمجھانا پڑتا تھا۔ بچے جو مسائل اس عمر میں خود سے حل کر لیتے ہیں ان کے لیے وہ ماں باپ کی محتاج تھی۔ بڑی مشکل سے عائشہ نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ پوٹی اور پیشی کے لیے اسے بتایا کرے کپڑوں میں نہ کیا کرے۔

آئینہ کے بعد دو بیٹے ہوئے۔ جب وہ چھوٹے تھے تب ہی ہم نے حفظ ماتقدم کے طور پر ان کا معائنہ کرا لیا تھا لیکن اللہ کے کرم سے دونوں بالکل ٹھیک تھے۔ ذہنی طور پر ان میں کوئی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے سال بھر کی عمر میں بولنا اور ذہانت کے دوسرے مظاہرے شروع کر دیے تھے صرف آئینہ میں یہ مسئلہ آیا تھا۔ شروع میں ہم میاں بیوی کو یہ غم تو تھا کہ وہ ایب نارمل ہے لیکن جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی ہمیں دوسری فکریں زیادہ ستانے لگی تھیں کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا۔ کبھی کبھی عائشہ رو پڑتی تھی۔ ایک دن اس نے کہا۔

”منیر اس کا کیا ہوگا؟“

میں نے سرد آہ بھری تھی۔ ”اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اسی نے اسے پیدا کیا ہے۔ ہم تو صرف اسے دنیا میں لانے کے ذمے دار ہیں اس کا اصل خالق و مالک وہی ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ دنیا بہت ظالم ہے یہاں انسان میں ذرا سی کمی ہو تو لوگ اسے کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر ہول آتا ہے کہ ہمارے بعد اس کا کیا ہوگا؟“

”تم اتنی پریشان مت ہو۔“ میں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ ”ابھی ہم ہیں اور اللہ نے چاہا تو جب تک زندہ ہیں اس کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔“

”لیکن ہمارے بعد؟“

”ہمارے بعد اس کا اللہ وارث ہوگا۔“

ابھی اس میں بہت وقت تھا لیکن یہ سچ ہے ابھی، سات آٹھ برس کی عمر تھی لیکن اس کے بارے میں سوچ سوچ کر ہماری نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ ابھی تک ہم اسے گھر میں تھراپی کراتے اور سکھانے کی کوشش کرتے تھے لیکن اب اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ ہمارے لیے اسے تھراپی کرانا مشکل ہو

چاہ رہا تھا مگر بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ابنارمل بچوں کی دیکھ بھال کے ماہرین ہی جانتے ہیں اس لیے میں اور عائشہ اسے اسکول میں داخل کرانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ میں نے ایسے کئی اسکولوں کے بارے میں معلوم کیا جنہیں مختلف این جی اوز چلا رہی تھیں۔ لیکن اکثر نے یہ اسکول صرف کمانے کے لیے کھول رکھے تھے اور وہ ابنارمل بچوں کی تصویریں گھر گھر جا کر چندے کے نام پر بھیک مانگتے ہیں۔ ہم آئینہ کو کسی ایسے اسکول میں داخل نہیں کرانا چاہتے تھے۔ جب مجھے کوئی معقول اسکول نہیں ملا تو میں نے عائشہ سے کہا۔

"سنو ایسا کرتے ہیں ہم اسے صرف فزیوتھراپی کے لیے کسی سینٹر لے جاتے ہیں جہاں تک پڑھانے یا کچھ سکھانے کا تعلق ہے تو وہ کسی بھی ٹیچر سے بہتر ہم گھر میں سکھا اور پڑھا سکتے ہیں۔"

عائشہ کو یہ خیال اچھا لگا تھا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے ہم خود اسے لے جائیں گے اور تھراپی کرا کے اپنے ساتھ ہی واپس لے آئیں گے۔"

بعد میں عائشہ نے بتایا کہ اسے ایک خدشہ اور بھی تھا۔ آئینہ عام ابنارمل بچوں کے مقابلے میں چہرے سے بہت پیاری لگتی تھی مگر بہت صحت مند بھی تھی۔ ذہنی طور پر وہ دو سال کے بچے جتنی ذہانت بھی نہیں رکھتی تھی۔ اگر ایسے میں کوئی اسے کسی قسم کا نقصان پہنچانا چاہتا تو اس میں اتنی سمجھ نہیں تھی کہ اسے روک سکتی۔ عائشہ نے کہا۔ "آج کل ایسے واقعات ہو رہے ہیں جن میں درندہ صفت لوگ کمسن بچیوں سے زیادتی کر جاتے ہیں اور ان کو ذرا بھی خدا کا خوف محسوس نہیں ہوتا۔ آئینہ جیسی بچی کو پتا نہیں ہے کہ یہ اپنی حفاظت کر سکے ہم کس طرح کسی پر اعتبار کر کے اسے کہیں باہر بھیج سکتے ہیں۔ اس لیے میرا تو اسے اسکول بھیجنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔"

شاید ایسی ہی کوئی سوچ میرے ذہن میں بھی تھی اور اسی لیے میں نے آئینہ کو اسکول میں داخل نہیں کرایا تھا۔ ایک اچھے فزیوتھراپی سینٹر میں اس کے نام کا اندراج کرا دیا۔ یہ ہمارے گھر کے پاس ہی تھا اس لیے عائشہ آرام سے اسے لاتی اور لے جاتی تھی۔ اگر میں گھر پر ہوتا تو میں اسے لے جاتا تھا۔ اس فزیوتھراپی سینٹر جانے سے آئینہ کو بہت فائدہ ہوا تھا۔ اس کا اپنے جسم پر قابو بڑھ گیا تھا اور اسپیچ تھراپی ہونے سے وہ پہلے سے بہتر انداز میں بولنے لگی تھی۔ دو سال میں اس میں بہت بہتری آئی تھی۔ اگر وہ چپ چاپ ...... کہیں بیٹھی ہوتی تھی تو دیکھنے والا کوئی شخص اسے ابنارمل نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ بولتی یا بچوں کے انداز میں حرکت کرتی تو پتا چل جاتا تھا۔ جو لوگ ہمارے ہاں پہلی بار آتے وہ آئینہ کو دیکھ کر سمجھتے تھے کہ وہ شرارت میں ایسا کر رہی ہے۔

آئینہ اب بارہ سال کی ہو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ عائشہ ان دنوں بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ ایک رات جب ہم سونے کے لیے لیٹے تو میں نے اس سے پوچھ لیا۔ "کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو ان دنوں؟"

"ہاں آپ نے کیسے جانا؟"

"تم میری بیوی ہو اور میاں بیوی ایک دوسرے کی پریشانی بھی نہ محسوس کر سکیں تو ان کا رشتہ بے معنی ہو جاتا ہے۔"

اس نے گہری سانس لی۔ "ہاں میں ان دنوں واقعی پریشان ہوں۔"

"کیوں؟"

"آئینہ کی وجہ سے۔"

"وہ تو ہماری پریشانی کا ایک مستقل حصہ ہے تمہیں عادی ہو جانا چاہیے۔"

"نہیں ایک نئی پریشانی ہے۔ آپ جانتے ہیں وہ بارہ سال کی ہو چکی ہے۔"

"ہاں تو پھر؟" میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

"اوہو اب وہ بڑی ہو رہی ہے جوانی کی طرف جا رہی ہے۔"

عائشہ کی پریشانی ذرا دیر سے میری سمجھ میں آئی تھی اور جب آئی تو میں بھی فکر مند ہو گیا۔ "یہ تو واقعی بہت پریشانی کی بات ہے۔"

"وہ بالکل نا سمجھ ہے عام لڑکی ہوتی تو میں اسے سمجھا بھی سکتی تھی لیکن آئینہ کے لیے میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اسے کیسے سمجھاؤں؟"

یہ واقعی ہمارے لیے ایک بڑا امتحان تھا۔ ایک عام جوان ہوتی لڑکی کو سمجھایا جا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا مسئلے ہو سکتے ہیں اور اسے ان سے کس طرح نمٹنا ہوگا۔ لیکن آئینہ میں سمجھداری سرے سے نہیں تھی اور نہ ہی اسے کسی قسم کا شعور تھا۔ میں نے عائشہ سے کہا۔ "تم اسے نہیں سمجھا سکتی ہو۔ تمہیں اس کا خود خیال رکھنا ہوگا۔"

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن وہ کھلنڈری فطرت کی ہے، بھائیوں کے ساتھ باہر چلی جاتی ہے۔ اسے آپ [illegible]

خیال بھی نہیں رہتا ہے۔"

معاملہ بچی کا تھا اس لیے عائشہ میرے سامنے بہت سنبھل کر اور اشارے کنایوں میں بات کر رہی تھی لیکن میں اس کی بات سمجھ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔ "عائشہ بہت سارے دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے سے بھی ہمیں نمٹنا ہوگا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس لیے پریشان ہونے کے بجائے خدا کا نام لو جب مسئلہ سامنے آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ ابھی سے اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

عائشہ بھی یہ بات سمجھتی تھی لیکن ماں تھی پریشان تو ہونا تھا۔ میں مرد تھا دفتر چلا جاتا تھا اور نصف دن وہیں گزر جاتا تھا۔ گھر آتا تو کچھ دیر بچوں کے ساتھ رہ کر اور دوسرے معمولات نمٹا کر سونے چلا جاتا تھا لیکن اسے تو سارا دن گھر میں رہنا ہوتا تھا۔ آئینہ اس کے سامنے ہوتی تھی اور یوں اس کے مسائل چوبیس گھنٹے عائشہ کے سامنے رہتے تھے۔ بہر حال ماں کو خدا نے بچوں کے مسائل سے نمٹنے کی ایسی صلاحیت دی ہے جو دس مردوں کے پاس بھی نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے وہ آئینہ کو سنبھال لیتی تھی۔ اگر میں آئینہ کو کوئی بات سمجھانے کی کوشش کرتا تھا تو اکثر مجھے ناکامی ہوتی تھی لیکن وہی بات اسے عائشہ سمجھاتی تو وہ سمجھ جاتی تھی۔

پھر آئینہ کو مسئلہ شروع ہو گیا جس کا عائشہ نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ اس نے اس کا حل یہ نکالا کہ آئینہ کو گھر سے باہر نہیں آنے دیتی تھی۔ وہ بے چاری سمجھ نہیں پاتی تھی کہ ماں نے اچانک اس پر پابندی کیوں لگا دی ہے۔ نہ جانے عائشہ نے کس طرح اسے سمجھا بجھا کر گھر سے باہر آنے سے روک دیا تھا۔ عائشہ نے کبھی مجھ سے اس بارے میں بات نہیں کی لیکن ان دنوں میں وہ ہلکان ہو جاتی تھی۔ اس کا سونا جاگنا تک آئینہ کے لیے مخصوص ہو جاتا تھا۔ اب تک آئینہ اور اس کے بھائیوں کا کمرا ایک ہی تھا لیکن اب اس کا کمرا الگ کر دیا گیا تھا۔ شروع میں وہ بہت ڈری ڈری رہی تھی اور عائشہ کو اس کے ساتھ ہی سونا پڑتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ عادی ہوتی چلی گئی۔ خدا کا شکر ہے اس کی وجہ سے ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا کریڈٹ عائشہ کو جاتا تھا جس نے اس کے پیچھے خود کو مٹا لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتنی تھکی ہوئی نظر آتی تھی کہ مجھے اس پر ترس آتا تھا۔ میں اسے سمجھاتا۔

"تم اپنی ہمت سے بڑھ کر خود پر بوجھ مت ڈالو۔"

"آپ جانتے ہیں اسے میں ہی سنبھال سکتی ہوں۔" اس نے تھکے لہجے میں کہا۔ "خاص طور سے مخصوص دنوں میں اسے میں ہی دیکھ سکتی ہوں۔ باقی دنوں میں مجھے اتنی فکر نہیں ہوتی ہے۔"

میں نے بتایا تھا کہ آئینہ کی جسمانی نشوونما تیز تھی اور پھر فزیوتھراپی کرنے سے اس میں مزید بہتری آئی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ اپنی عمر سے بڑی اور جوان نظر آنے لگی تھی۔ اب اسے ہماری مزید دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ عائشہ نے اس پر باہر جانے کی پابندی لگا دی تھی اور اس نے بڑی مشکل سے یہ پابندی قبول کی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ جب اس سے چھوٹے بھائیوں کو باہر جانے کی اجازت تھی تو اسے کیوں نہیں تھی؟ وہ ان کے ساتھ باہر جا کر کھیلنا چاہتی تھی۔

وہ اپنی عمر سے کم بچوں کے ساتھ کھیلتی عجیب لگتی تھی۔ پھر لوگ اسے بچی نہیں سمجھتے بلکہ وہ اسے ایک جوان لڑکی کی طرح دیکھتے۔ یہی سوچ کر عائشہ نے اس کے باہر جانے پر پابندی لگائی تھی۔ اس پابندی پر وہ کتنے ہی دن مچل مچل کر روتی رہی اور میں جب دفتر سے آتا تو وہ مجھے پکڑ کر بیٹھ جاتی اور ماں کی شکایت لگاتی۔ اس کا ذہن اتنا کمزور تھا کہ وہ بھول جاتی کہ گزشتہ روز بھی وہ مجھے یہی سب شکایتیں کر چکی ہے۔ میں اسے تسلی دیتا اور پیار سے سمجھاتا کہ اس کی ماما نے کسی وجہ سے یہ پابندی لگائی ہوگی۔ وہ ضد کرتی کہ اسے باہر جا کر کھیلنے کی اجازت دی جائے۔ روز یہی ہوتا اور اسے بڑی مشکل سے صبر آیا تھا۔ اس لیے اب وہ کھیلنے تو باہر نہیں جاتی تھی لیکن جہاں عائشہ کی نظر چوکتی وہ گیٹ سے باہر نکل جاتی۔ عائشہ نے عبید اور زید کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ اس پر نظر رکھیں اور اگر وہ باہر جائے تو فوراً اسے بتائیں۔ صبح جب میں دفتر اور بچے اسکول کے لیے چلے جاتے تو عائشہ گیٹ پر تالا لگا دیتی تھی کیونکہ اسے گھر کے کام کرنے ہوتے تھے اور وہ ہر لمحے آئینہ پر نظر نہیں رکھ سکتی تھی۔

میرا دفتر شاہراہ فیصل پر ہے اور رہائش گلشن اقبال میں۔ ایک دن میں دفتر پہنچا اور اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ موبائل پر عائشہ کی کال آئی۔ وہ بدحواس تھی۔ "سمیر... فوراً...... جلدی گھر آ جائیں۔"

"خیریت کیا ہوا؟" اس کے انداز پر میں بھی گھبرا گیا تھا۔

"آئینہ گھر میں نہیں ہے۔" عائشہ نے روتے ہوئے کہا۔ "میں تالا لگانا بھول گئی تھی۔ وہ باہر نکل گئی اور گلی میں کہیں نظر نہیں آ رہی ہے میں اسے ہی تلاش کر رہی ہوں۔"

"اسے تلاش کرو میں ابھی آ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور عجلت میں دفتر سے نکلا۔ اس روز میں نے اتنی تیز

ذرا سی تکنیک کی کہ جو راستہ نارمل میں پچیس تیس منٹ میں طے ہوتا تھا وہ اس روز میں نے صرف پندرہ منٹ میں طے کر لیا اور اتفاق دیکھیں جب میں نے کار اپنے بلاک کی طرف موڑی تو سامنے ہی سڑک پر آئینہ مجھے ایک بندر والے کے پیچھے چلتی دکھائی دی۔ میں نے درمیان سڑک کا خیال کیے بغیر پوری قوت سے بریک لگائے اور گاڑی سے اتر کر بھاگا۔ میں نے چلا کر آئینہ کو آواز دی تو بندر والا یک دم بھاگا۔ میں آئینہ کے پاس پہنچا تو بندر والا گلیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ آئینہ کھڑی معصومیت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر سخت لہجے میں کہا۔

"آئینہ تم باہر کیسے نکلیں اور یہاں کیا کر رہی ہو؟"

میرے لہجے کی سختی پر وہ سہم گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، اس نے روہانسے بچکانہ انداز میں کہا۔ "پاپا میں بندر والے انکل کے ساتھ جا رہی تھی، انہوں نے مجھے بہت سارے بندر دکھانے تھے۔"

میں نے گہری سانس لی اور نرمی سے کہا۔ "آپ نے اچھا نہیں کیا، وہ آپ کی ماما آپ کو باہر تلاش کر رہی ہیں۔ میں دفتر سے آ رہا ہوں آپ کو تلاش کرنے۔"

وہ ڈر گئی۔ "ماما مجھے تلاش کر رہی ہیں، وہ مجھے ڈانٹیں گی۔"

"ہاں۔" میں اسے گاڑی تک لایا اور اسے لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ عائشہ مجھے روتی ہوئی دروازے پر مل گئی۔ اس کے ساتھ کچھ محلے والیاں بھی تھیں۔ آئینہ کو دیکھ کر اس کی حالت بری ہو گئی اور وہ اسے خود سے لپٹا کر دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔ آئینہ پہلے تو سہمی رہی پھر ماں کو چپ کرانے لگی۔ ماں بیٹی کی محبت دیکھ کر وہاں موجود خواتین کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کو بتایا۔ "آئینہ سڑک کی طرف نکل گئی تھی اور خوش قسمتی سے مجھے مل گئی۔"

یہ کہہ کر میں عائشہ اور آئینہ کو اندر لے آیا۔ میں نے پہلے عائشہ کو ایک طرف لے جا کر بتایا کہ میں آئینہ کو کہاں سے لایا ہوں اور وہ کس کے ساتھ جا رہی تھی۔ وہ زرد پڑ گئی تھی۔ "اگر وہ ذلیل شخص میری بچی کو لے جاتا۔"

"عائشہ اللہ نے بچا لیا لیکن اب بہت محتاط رہنا۔ دروازہ کسی صورت کھلا مت چھوڑو بلکہ جب بچے دوپہر میں اسکول سے آجائیں تو شام تک گیٹ کو اندر سے لاک رکھو۔ ہم آئینہ کے معاملے میں ذرا سا بھی رسک نہیں لے سکتے۔"

"آپ فکر نہ کریں اب میں اس کا پورا خیال رکھوں گی۔" اس نے چہرہ صاف کیا۔ "جب بچے جا رہے تھے تو ایک منٹ کے لیے باتھ روم گئی تھی بس اسی دوران میں یہ نکل گئی۔"

"اب اسے کچھ مت کہنا بس پیار سے سمجھاؤ کہ باہر بہت خوفناک چیزیں ہیں، اسے ڈرا کر ہی گھر میں رکھا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا اور دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ میرا رُواں رُواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا جس نے ہمارے گھر کو ایک بڑے سانحے سے بچا لیا۔ اس بندر والے کی نیت یقیناً خراب تھی اور وہ برے ارادوں سے آئینہ کو لے جا رہا تھا بھی جب میں نے آئینہ کو آواز دی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ پھنس سکتا ہے تو وہ فوراً بھاگ نکلا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو ہم آئینہ کی عزت اور جان دونوں سے ہاتھ دھو لیتے۔ اس کے بعد عائشہ سچ مچ اس کی بہت زیادہ نگرانی کرنے لگی تھی۔ ہمارے گھر کا گیٹ زیادہ بلند نہیں تھا اسی طرح چھت پر پڑوس سے ملی دیواریں بھی زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ میں نے گیٹ اور یہ دیواریں اونچی کرائیں تاکہ آئینہ ان کو پھلانگ کر بھی کہیں نہ جا سکے۔ اگرچہ اس کا امکان بہت کم تھا لیکن ہم کوئی چانس نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ایک ذہنی طور پر معذور اور بہت خوب صورت جوان لڑکی کے ماں باپ ہونا کتنا بڑا عذاب ہے یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو اس عذاب سے گزر رہے ہوں۔ ہمیں ہر لمحے اس کا خیال رہتا تھا اور اس کی فکریں ذہن پر سوار رہتی تھیں۔

عائشہ فزیو تھراپی کے لیے ہفتے میں تین بار آئینہ کو سینٹر لے کر جاتی تھی اور اسے تھراپی کرا کے خود واپس لے آتی تھی۔ اگرچہ سینٹر کا ماحول بہت اچھا تھا اور وہاں لڑکیوں اور خواتین کی تھراپی کے لیے خواتین تھراپسٹ تھیں اس کے باوجود عائشہ تھراپی کے دوران خود وہاں موجود رہا کرتی تھی۔ اس روز کے واقعے سے وہ اتنا ڈر گئی تھی کہ اب گھر سے باہر اسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیتی تھی۔ وہ فزیو تھراپی کے لیے عام طور سے شام کو جاتی تھی۔ اگر کبھی میں دفتر سے جلدی اٹھ جاتا تو کال کر کے عائشہ سے پوچھ لیتا تھا اور ان دونوں کو واپسی میں گھر لے آتا۔ اس دن بھی میں ان کو لانے سینٹر پہنچا۔ عائشہ اور آئینہ آئے تو آئینہ چہک رہی تھی اور اس نے مجھے بتایا کہ آج اس نے اچھی ایکسر سائز کی کہ اس کی فزیو نے اسے گال پر ستارہ دیا...... یہ ستارا اس کے گال پر بنا ہوا تھا۔ اس کے برعکس عائشہ چپ اور پریشان تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔
"کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے آئینہ کی طرف دیکھا۔ "بعد میں بتاؤں گی۔"
"میں سمجھ گیا کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے۔"
"اس کا کوئی مسئلہ ہے؟" میں نے آنکھ سے پیچھے بیٹھی آئینہ کی طرف اشارہ کیا۔
"نہیں لیکن اس سے متعلق ہی ہے۔"
رات کو سونے کے لیے بیڈ روم میں آئے تو عائشہ نے کہا۔ "آج سینٹر میں ایسی بات سنی ہے کہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔" اس کا لہجہ روہانسا ہو رہا تھا۔
"کیا سنا ہے؟"
وہ بتانے لگی۔ "فزیو کرانے والی ایک خاتون سے میری اچھی بات چیت ہے وہ آئینہ کو بھی دیکھتی ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے۔ سینٹر میں ایک لڑکی آتی تھی۔ آئینہ سے ذرا سی بڑی ہے اور اسے بھی اسی قسم کی ایب نارملٹی ہے۔ دو مہینے پہلے وہ آخری بار سینٹر آئی تھی۔ تھراپی کے دوران اس کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی اور سینٹر کی لیڈی ڈاکٹر نے اسے چیک کیا تو وہ پریگنینٹ نکلی۔"
"میرے خدا۔" میں اٹھ بیٹھا تھا۔
"سینٹر والوں نے اس کے گھر کال کر کے اس کے ماں باپ کو بلایا کیونکہ وہ کسی وین میں آتی تھی اور جب ان کے سامنے یہ بات آئی تو ان کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ شریف لوگ تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی بچی کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ بہرحال وہ اسے لے گئے اور اس کے بعد وہ دوبارہ سینٹر نہیں آئی۔"
عائشہ یہ بتا کر چپ ہوگئی۔ خود میں بھی گم صم تھا اور ہم دونوں کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ خدانخواستہ ایسا آئینہ کے ساتھ ہوا تو ہمارا کیا حال ہوگا؟ کچھ دیر بعد اس نے بھیگے لہجے میں کہا۔ "ضمیر میں اس طرح مر کر نہیں جی سکتی۔"
میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ "تو تم بتاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں؟"
عائشہ نے اپنے آنسو صاف کیے۔ "ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ حادثے کو آدمی کہاں تک روک سکتا ہے۔ ہمارے دو بچے بھی ہیں اللہ نہ کرے اگر ایسی کوئی بات ہمارے یہاں ہوئی تو ان کی زندگی بھی برباد ہو جائے گی؟"
"خدا نا کرے۔" میں نے دہل کر کہا۔ "لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟"
عائشہ نے کہا۔ "میں کسی لیڈی ڈاکٹر سے معلوم کرتی ہوں۔ ضمیر آپ نہیں جانتے اس کے مخصوص دنوں کا مسئلہ میرے لیے کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں اس کا کوئی مستقل حل نکل آئے۔"
"ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "تم کسی لیڈی ڈاکٹر سے بات کرو اور اگر وہ کوئی حل تجویز کرتی ہے تو اس کے بارے میں سوچیں گے۔"
"میں کل ہی معلوم کرتی ہوں۔ بلکہ سینٹر میں جو لیڈی ڈاکٹر بیٹھتی ہے اس سے پوچھتی ہوں۔ اسے زیادہ بہتر پتا ہو گا۔"
اگلے دن عائشہ خاص طور پر فزیوتھراپی سینٹر اسی کام کے لیے گئی اور اس نے لیڈی ڈاکٹر سے بات کی۔ میں واپس آیا تو وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ ابھی رات ہونے میں وقت تھا اور اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا اس لیے وہ مجھے بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے آئی۔ اس نے دروازہ بند کرتے ہی سرگوشی میں کہا۔ "میں نے لیڈی ڈاکٹر سے بات کی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اس مسئلے کا حل بالکل ہے، بس آئینہ کا ایک چھوٹا سا آپریشن ہوگا۔"
"آپریشن؟" میں چونکا۔ "کیسا آپریشن؟"
"بس ہوتا ہے نا۔" اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ "لیکن اس نے کہا ہے کہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔"
"عائشہ تمہیں یقین ہے کہ اس سے آئینہ کو کوئی خطرہ نہیں ہے؟"
"نہیں اس کی جان یا صحت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔" اس نے مجھ سے نظریں چرائیں۔ "لیکن اس کا مخصوص دنوں کا اور پھر پریگنینسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔"
اس نے مجھے ذرا واضح انداز میں بتایا کہ ڈاکٹر کیا کرے گی تو میں لرز گیا تھا۔ "کیا یہ ظلم نہیں ہے انسان کو اس کی فطرت سے محروم کر دینا۔"
عائشہ نے گہری سانس لی۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ظلم تو ہے لیکن ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ اب جن ماں باپ کی ایسی ایب نارمل بیٹیاں ہیں۔ وہ ان کے یہ مخصوص آپریشن کراتے ہیں۔"
وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ آئینہ کی ہم شادی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ذہنی طور پر اس کی اہل نہیں تھی۔ وہ نہ گھر سنبھال سکتی تھی نہ بچوں کی پرورش کر سکتی تھی۔ اس کے حق میں یہی بہتر تھا۔ اس کے باوجود میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ عائشہ اصرار کر رہی تھی اس نے اس بارے میں مزید کئی لیڈی ڈاکٹرز سے

مشورے کیے اور اس کے بعد اس کے اصرار میں شدت آ گئی تھی۔ میں نے ابھی تک ہاں نہیں کی تھی۔ لیکن میں اندر سے قائل ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر میں نے ہتھیار ڈال دیے اور آئینہ کا آپریشن کرانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہم نے ایک تجربے کار لیڈی سرجن سے بات کی جسے اس قسم کے آپریشن کا تجربہ تھا۔ اس کا اپنا اسپتال تھا۔
آپریشن سے ایک دن پہلے عائشہ آئینہ کو لے کر اسپتال چلی گئی تھی کیونکہ آئینہ کے کچھ ٹیسٹ ہونا تھے۔ وہ جاتے ہوئے خوش تھی اسے احساس ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ رات عائشہ نے مجھے بتایا کہ آپریشن کل شام کے وقت ہوگا اور اس کے بعد آئینہ کو ایک ہفتہ اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ اسے نارمل ہونے میں تقریباً چھ مہینے کا وقت لگے گا اور اس دوران میں اس کا علاج دواؤں اور مخصوص ایکسر سائزز سے ہوگا۔ میں اگلے دن چھٹی لے کر دو بجے اسپتال پہنچ گیا۔ اس وقت آئینہ کو آپریشن روم میں لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اب وہ کچھ خوف زدہ لگ رہی تھی اس نے مجھ سے کہا۔
"پاپا میں بیمار نہیں ہوں پھر مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟"
"میرا بیٹا بیمار نہیں ہے۔" میں نے اس کا سر سہلایا۔ "آپ کو چیک اپ کے لیے یہاں لائے ہیں۔"
عائشہ نے کہا۔ "تمہیں یاد نہیں ہے ایک بار تمہارے پیٹ میں درد ہوا تھا اس میں ایک گولا گھس گیا تھا آج ڈاکٹر اسے نکالے گی۔"
"میرے پیٹ میں گولا ہے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا تو ہم میاں بیوی کے لیے اپنے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ عائشہ کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد نرس آ گئی اور اس نے مجھ سے کہا۔
"پلیز آپ باہر جائیں انہیں چینج کرانا ہے۔"
نرس آئینہ کو آپریشن کا لباس پہنانے آئی تھی۔ میں نے باہر جا کر عائشہ کو اندر بھیجا کیونکہ آئینہ کسی اور کو قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ کچھ دیر میں اسے اسٹریچر پر لٹا کر آپریشن روم میں لے گئے۔ جب ہم باہر رہ گئے اور دروازہ بند ہو گیا تو آئینہ کے چلانے کی آواز آنے لگی؟ وہ تڑپ کر ہمیں پکار رہی تھی۔ کچھ دیر اس کی چیخیں سنائی دیتی رہیں پھر سناٹا چھا گیا۔ عائشہ رونے لگی تھی میں اسے لے کر وہیں بنچ پر بیٹھ گیا۔ چار بجے آپریشن کا آغاز ہوا تھا ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آپریشن روم میں کیا ہو رہا ہے کچھ دیر بعد عائشہ نے بھرائے لہجے میں کہا۔
"ضمیر یہ کیا ہو رہا ہے ہم خدا ہمیں کس گناہ کی سزا دے رہا ہے؟"
تب میرے ضمیر نے مجھے بہت عرصے بعد آئینہ دکھایا تھا۔

☆☆☆

جب ابو سعودی عرب گئے تو ہمارے دن بھی بدلے تھے۔ جب تک ابو پاکستان میں تھے۔ صبح سے شام تک محنت کرنے کے بعد بس اتنا کماتے تھے جس میں ہمارا چھوٹا سا گھرانہ متوسط زندگی گزار سکتا۔ ہمارے گھر میں آسائشیں نہیں تھیں۔ نہ فریج تھا، نہ واشنگ مشین تھی اور نہ کوئی اور سہولت بس ایک چھوٹا سا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی جس پر ہم پی ٹی وی بہت شوق اور بے تابی سے دیکھتے تھے۔ ابو الیکٹریشن تھے اور ایک دکان پر کام کرتے تھے۔ دکان کسی اور کی تھی ابو اس کے ساتھ شراکت میں کام کرتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا گھر تھا اور وہ بھی کرائے کا۔
امی صبر و قناعت والی عورت تھیں اور انہوں نے ابو سے کبھی مطالبہ نہیں کیا کہ انہیں وہ آسائشیں دیں جو محلے کے دوسرے گھروں میں تھیں۔ مگر ابو کو فکر لگی رہتی تھی۔ انہوں نے کسی طرح سعودیہ جانے کا بندوبست کر لیا اور جب ان کا ویزا آیا تب انہوں نے امی کو بتایا لیکن امی نے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ "آپ جو یہاں کما رہے ہیں وہ ہمارے لیے بہت ہیں مجھے مزید کی ہوس نہیں ہے۔"
"یہاں میں کام نہیں بیگار کر رہا ہوں۔" ابو نے تنگی سے کہا۔ "باہر میں اتنا کام کر کے اس سے دس گنا زیادہ کما سکتا ہوں۔"
"لیکن میں اور ضمیر آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔" امی رونے لگی تھیں۔
"بس چند سال کی بات ہے۔" ابو نے انہیں سمجھایا۔ "میں اتنا کما لوں گا کہ یہاں اپنا کوئی کاروبار کر سکوں گا۔ ہم اپنا گھر بنا لیں گے۔"
اس بات نے امی کو بھی مجبور کر دیا۔ ہر عورت کی طرح ان کی خواہش اپنا گھر تھا۔ ہم کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ یوں ابو باہر چلے گئے۔ اس وقت میں دس سال کا تھا۔ ابو ایک سال تک واپس نہیں آئے۔ لیکن اس دوران میں ان کی طرف سے ڈرافٹ آتے رہتے تھے۔ یہ ڈرافٹ ابو کی اس آمدنی سے تین گنا زیادہ تھے جو وہ یہاں کام کر کے امی کے ہاتھ پر رکھتے تھے۔ دو مہینے بعد امی نے ایک بہتر مکان کرائے پر لے لیا۔ ابو نے امی کو خط لکھا تھا کہ ضرورت کی ہر

مجھے لے لیں لیکن امی نے صرف ایک فریج اور ایک واشنگ مشین لی تھی۔ میں نے ٹی وی کی ضد کی تھی لیکن امی نے انکار کردیا کہ جو ہے بس وہی استعمال کرو۔ ایک سال بعد ابو آئے تو بڑا رنگین ٹی وی اور وی سی آر لے آئے تے یوں میری خواہش پوری ہوگئی۔

دو سال بعد ابو نے آکر ایک فلیٹ لے لیا۔ یہ چھوٹا دو کمروں کا فلیٹ تھا اور ہماری ضرورت کے لیے کافی تھا۔ امی نے اصرار کیا کہ اب ابو واپس آجائیں لیکن ابو نے بتایا کہ ان کو ایک بہتر ملازمت مل رہی ہے اور اب وہ مزید تین سال لگا کر آئیں گے۔ مزید دو سال بعد ابو نے آکر یہ فلیٹ بیچ دیا اور ایک اچھی جگہ پر بڑا فلیٹ لے لیا اس میں دو بیڈ روم اور لاؤنج کے ساتھ بڑا سا ڈرائنگ روم بھی تھا۔ بڑا سا کچن تھا۔ میں خوش تھا کیونکہ مجھے یہاں اپنا الگ کمرا مل گیا تھا۔ اس کے ساتھ بڑی سی بالکونی بھی تھی۔ لیکن یہ بالکونی فلیٹوں میں دوسرے بلڈنگ کے بالکل سامنے تھی اور یہاں سے دور تک کا نظارا ممکن نہیں تھا۔ بالکونیاں بھی اس طرح سے بنی ہوئی تھی کہ اس سے صرف سامنے والی بالکونی کا منظر ہی دکھائی دیتا تھا اور بالکل دیوار کے پاس جائے بغیر اوپر نیچے کی بالکونیاں بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ یہ فلیٹ پانچ منزلہ تھے اور ہمارا فلیٹ چوتھے فلور پر تھا۔

اُن دنوں میں میٹرک میں تھا اور امتحانات کی تیاری کی وجہ سے مجھے باہر جانے کا موقع کم ملتا تھا اس لیے جب بھی پڑھتے ہوئے بور ہوتا تھا تو وی سی آر پر فلم لگا لیتا تھا۔ امی فلمیں دیکھنے پر روک ٹوک کرتی تھیں لیکن بہت زیادہ نہیں۔ دوسرے میں پڑھنے میں تیز تھا اور ہر کلاس میں میرا اے ون گریڈ آیا تھا اس لیے بھی امی زیادہ منع نہیں کرتی تھیں۔ مجھے باہر جانے اور دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کا شوق نہیں تھا۔ امی کو یہ بھی غنیمت لگتا تھا کیونکہ ابو سر پر نہیں تھے اور امی کو ڈر تھا کہ کہیں میں باہر آوارہ لڑکوں کی صحبت میں بگڑ نہ جاؤں اس لیے میں باہر نکلنے سے گریز کرتا تھا تو وہ خوش رہتی تھیں۔ اس لیے وہ مجھے فلم دیکھنے کی اجازت دینے کو بھی تیار ہو جاتی تھیں۔

میں نے میٹرک کا امتحان بھی بہت اچھے نمبروں سے پاس کرلیا تھا اور ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں ابو کے واپس آنے کا پروگرام بن رہا تھا لیکن پھر ان کی کمپنی نے ان کی تنخواہ بڑھادی اور ابو مزید چند سال کے لیے وہاں رکنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ دو سال لگا کر ڈی ایچ اے میں خریدے گئے پلاٹ پر مکان بنا سکتے ہیں۔ دو سو چالیس گز کا یہ پلاٹ ابو نے حال ہی میں خریدا تھا۔

میٹرک میں لڑکا خود کو بچہ محسوس نہیں کرتا ہے لیکن کالج میں آتے ہی اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جوان ہو گیا ہے۔ اس کے دل و دماغ کی دنیا بدل جاتی ہے۔ اسے ہر منظر رنگین اور ہر چہرہ حسین لگتا ہے۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ پھر فلموں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔ اس زمانے میں بھارتی موویز کا ایک کریز تھا۔ وہ تو اب بھی ہے لیکن اس وقت لوگ دیکھتے بہت شوق سے تھے اور اس کے لیے بڑے اہتمام سے فلم کرائے پر لاتے تھے۔ میں شوقین تھا اور تصوروں میں جو دیکھتا تھا اس کا اثر لازمی تھا۔ خوابوں میں بھی لڑکیاں نظر آتی تھیں لیکن عملی طور پر ایک لڑکی بھی ایسی نہیں تھی جس سے مجھے اچھی لگی ہیں۔ فلیٹوں میں آس پاس سب نارمل قسم کی لڑکیاں تھیں کوئی اچھا چہرہ نہیں تھا۔

میں نے تعلیم میں اپنا ریکارڈ قائم رکھا تھا۔ ایف ایس سی کا امتحان دیا اور اب نتیجے کا انتظار تھا۔ میرا ارادہ بی ایس سی میں داخلہ لینے کا تھا۔ لیکن رزلٹ میں دیر تھی اور اس وقت تک میں فارغ تھا۔ اسی کی وجہ سے میں زیادہ تر گھر میں رہتا تھا کیونکہ امی کو اکیلے رہتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے ٹی وی یا فلم دیکھتا تھا یا پھر کبھی بالکونی میں آکر کھڑا ہو جاتا۔ سامنے والی بلڈنگ ان ہی فلیٹوں کی تھی اس لیے ساخت ایک جیسی تھی۔ جب ہم یہاں آئے تو سامنے والے فلیٹ میں ایک جوڑا رہتا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر اندر ہی رہتے تھے اور بہت کم بالکونی میں نظر آتے تھے۔ پھر وہ چلے گئے اور فلیٹ بند پڑا رہا۔ جن دنوں میں ایف ایس سی کا امتحان دے رہا تھا فلیٹ پھر آباد ہو گیا اس کا اندازہ بالکونی میں صفائی ستھرائی سے ہوا تھا۔ وہاں پودوں کے گملے لاکر رکھے گئے تھے۔

ایک دن میں وقت گزاری کے لیے بالکونی میں کرسی رکھے بیٹھا تھا کہ سامنے والی بالکونی کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی باہر آئی۔ اسے دیکھ کر ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی کیونکہ وہ ویسی ہی تھی جیسی لڑکیوں کے بارے میں سوچتا تھا یا میں نے اپنے ذہن میں جو خیالی پیکر بنا رکھا تھا۔ کسی قدر لمبا قد، چھریرا بدن، لمبے گھنے بال، گلابی رنگت اور بہت خوب صورت نقوش۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور ان میں ایسی کشش تھی کہ آدمی اسے نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے پرنٹ لان کا سوٹ پہن رکھا تھا اور دوپٹا غائب تھا۔ شاید نہا کر آئی تھی کیونکہ اس کے بال گیلے تھے۔ میں دم بخود سا اسے دیکھ رہا تھا اور اسے شاید پتا بھی نہیں تھا۔ میں بیٹھا تھا اور پھر بالکونی میں گملوں میں پودے بھی لگے تھے۔ وہ بالکونی کی دیوار سے ٹک کر نیچے جھانکنے لگی۔ کچھ دیر بعد شاید اندر سے اسے آواز آئی تھی اور وہ جلدی سے اندر چلی گئی۔ دونوں بالکونیوں میں مشکل سے تیس فٹ کا فاصلہ تھا اس لیے میں نے اسے بہت وضاحت سے دیکھا۔ میں بےقراری سے اس کی واپسی کا انتظار کررہا تھا لیکن جب وہ واپس نہیں آئی تو میں مایوس ہو کر اندر آگیا۔

شام کو اس طرف دھوپ آتی تھی اس کے باوجود میں شام کو بالکونی میں موجود تھا صرف اس امید پر کہ لڑکی دوبارہ بالکونی میں آئے۔ اس روز میری توقع پوری نہیں ہوسکی تھی لیکن اگلی شام لڑکی آگئی تھی۔ آج اس نے بال چوٹی کی صورت میں باندھ رکھے تھے اور بے فکرے انداز میں بالکونی سے باہر آس پاس دیکھ رہی تھی۔ آج اس نے مجھے دیکھ لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شرما جائے گی یا گھبرا جائے گی اور واپس چلی جائے گی لیکن وہ نہ تو شرمائی اور نہ گھبرائی اور نہ ہی واپس گئی۔ بلکہ اس نے مجھے دلچسپی سے دیکھا تھا۔ اس سے حوصلہ پاکر میں مسکرایا تو وہ بھی مسکرانے لگی تھی۔ میں خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا تو اس نے بھی ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا پھر کھلکھلا کر ہنس دی تھی اور اسی لمحے اندر سے آواز آئی۔ مجھے واضح سنائی نہیں دیا لیکن اسے اندر سے بلایا جارہا تھا۔ وہ جلدی سے اندر چلی گئی۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ میں انتظار کرتا رہا اور وہ نہیں آئی۔ اس کی جگہ ایک ادھیڑ عمر عورت باہر آئی تھی جو نقوش سے لڑکی کی ماں لگ رہی تھی۔ میرے دل میں چور تھا اس لیے اسے دیکھتے ہی میں بالکونی میں دیوار سے نیچے ہو گیا۔ شاید وہ دیکھنے آئی تھی کہ لڑکی کیوں ہنسی تھی؟

اس کے بعد کئی دن تک لڑکی نظر نہیں آئی۔ شاید اس کی ماں نے اس پر سختی کردی تھی اور وہ بالکونی میں نہیں آسکتی تھی۔ میں بےتاب ہو گیا۔ دل ہی دل میں اس عورت کو برا بھلا کہتا رہا۔ میں روز صبح سے رات تک درجنوں بار بالکونی کا چکر لگاتا تھا اس امید پر کہ لڑکی نظر آجائے۔ اگلے چار دن تک میری امید پوری نہیں ہوئی تھی۔ بالآخر میں پانچویں دن صبح کے وقت بالکونی میں آیا تو لڑکی نظر آئی تھی اور وہ بھی شاید میرا انتظار کر رہی تھی کیونکہ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر کھل جانے والی مسکراہٹ نظر آئی تھی۔ اس بار اس نے سلام میں پہل کی۔ میں نے جواب دیا تو وہ ہنس دی لیکن آج اس کی ہنسی بے آواز تھی۔ اسے خوف تھا کہ آواز ماں تک پہنچی تو اسے بلا لے گی۔

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے اشارہ کیا کہ میں اسے دن سے اس کا انتظار کررہا تھا۔ اس نے بھی جواباً سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ وہ بھی منتظر تھی پھر پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ ماں کی وجہ سے مجبور تھی آنہیں سکتی تھی۔ میں نے اسے اپنا نام بتانے کی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر میں نے اس کا نام پوچھا تب بھی وہ کچھ نہیں سمجھ سکی تھی معصومیت سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اشاروں کی زبان میں اس سے بات جاری رکھی۔ آواز دینے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس کی ماں سن لیتی اور یہاں میں بولتا تو امی تک آواز چلی جاتی۔ اس لیے اشاروں کنایوں سے کام چلا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسا اشارہ میں کرتا تھا ویسا ہی وہ بھی کرتی تھی ہم اشاروں کی زبان کے ماہر نہیں تھے اس لیے میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور اس کی بات میرے سر سے گزر جاتی تھی۔

لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کا رد عمل بتارہا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ ہم دو افراد یہاں رہتے ہیں۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ وہ تین لوگ ہیں۔ ایک وہ اور دوسری اس کی ماں تھی۔ تیسرا فرد شاید لڑکی کا باپ تھا۔ لیکن اتنے عرصے میں مجھے کوئی مرد نظر نہیں آیا تھا۔ اس بار اس کی ماں تو نہیں آئی تھی لیکن میری امی کی آواز آئی وہ کمرے کا دروازہ بجا رہی تھیں۔

”تنمیر اٹھ گئے ہو تم؟“

میں نے اشارے سے لڑکی کو کہا کہ میں اندر جا رہا ہوں اور کمرے میں آکر بالکونی والا دروازہ بند کرلیا۔ امی ناشتا بنا رہی تھیں میں نے یوں ظاہر کیا جیسے بستر سے اٹھ کر آرہا ہوں۔ امی کچن کی طرف گئیں تو میں جلدی سے بالکونی میں آیا لیکن لڑکی جاچکی تھی۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ وہ صبح سویرے بالکونی میں آجاتی تھی۔ اس وقت اس کی ماں شاید سو رہی ہوتی تھیں اور اسے فکر نہیں ہوتی تھی۔ میری امی بھی سو رہی ہوتی تھیں اس لیے میں دل جمعی سے اس سے اشاروں میں بات کرتا اور اسے دل بھر کر دیکھتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا وہ کسی اجنبی لڑکے سے اس طرح بے تکلف ہو سکتی ہے۔

ایک دن میں نے جرأت کرکے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر پیار کرنے کا اشارہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شرما جائے گی یا پھر ناراض ہو جائے گی لیکن اس نے بنا کسی ردعمل کے اسی طرح کیا اور پھر مسکرانے لگی تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں کی معصومیت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس وقت معاشرے میں

لڑکے لڑکیوں کے آزادانہ ملنے کا کوئی تصور نہیں تھا اور اگر پتا چلتا کہ فلاں لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے میں دلچسپی لے رہے ہیں تو دونوں گھروں میں قیامت آجاتی تھی۔ لیکن وہ بچی کسی خوف یا شرم کے بغیر میرے سامنے موجود تھی۔ جیسا میں کرتا ویسا ہی وہ بھی کر کے دکھاتی تھی۔

اس صبح ابھی سورج بھی نکلا نہیں تھا کہ میں بالکونی میں نکل آیا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ موجود تھی۔ میں نے اشارے سے سلام کیا اس نے جواب دیا۔ میں نے پیار کا اشارہ کیا اس نے اس کا جواب دیا۔ وہ شاید شرارت کے موڈ میں تھی۔ کیونکہ میں نے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس نے بھی سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے انگڑائی لی تو اس نے بھی انگڑائی لی۔ میں نے سر کھجایا تو اس نے بھی سر کھجایا۔ میں جو حرکت کرتا وہ اس کی ویسی ہی نقل اتارتی تھی اور پھر مسکرا کر دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو کہ تم جو کرو گے میں وہی کر کے دکھاؤں گی۔ اس وقت نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا۔ شاید تاؤ آگیا تھا یا اندر سے شیطان نے اکسایا تھا۔ میں نے وہ حرکت کی کہ میں آج بھی سوچتا ہوں تو خود سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہتا۔ میں نے اپنی شرٹ اتار دی اور چیلنج کرنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

میں سچ کہتا ہوں میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ میں صرف اسے شکست دینا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہار مان لے گی۔ لیکن اس نے جو کیا میں نے اس کا سوچا نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی قمیص کا دامن پکڑ کر اسے اوپر کیا اور پھر اوپر کرتی چلی گئی۔ میں دم بہ خود اور سحر زدہ سا رہ گیا۔ اس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ خوب صورت ہے لیکن اندر سے اتنی خوب صورت ہوگی میں نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پھر میں چونکا اور بوکھلا گیا۔ وہ میرے سامنے بغیر قمیص کے کھڑی تھی اور اس نے نیچے کچھ نہیں پہنا تھا۔ میں یہ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا کہ اس نے ایسا کس طرح کر لیا۔ اسی لمحے...... بالکونی والا دروازہ کھلنے لگا اور میں نہایت تیزی سے پیچھے ہو گیا۔ اسی لمحے میں نے لڑکی کی ماں کی تیز آواز سنی۔

''آئینہ یہ کیا..... پاگل ہے تو۔''

عورت اسے فوراً ہی اندر لے گئی تھی۔ میں نے بتایا کہ بالکونی میں کسی اور طرف سے دیکھے جانے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے اسے سوائے میرے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ چند لمحے پہلے کے اشتیاق پر اب خوف غالب آگیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ عورت حقیقت جان کر ابھی گھر آکر امی سے شکایت کرے گی اور میں امی ابو کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ ایک طرف میرا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ میں نے کیا حرکت کی تھی اور دوسری طرف وہ منظر یاد آرہا تھا۔ میں کمرے میں آگیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ سارا دن میری ہمت نہیں ہوئی کہ دروازہ کھولتا۔

شام کو میں کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ امی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''ضمیر اٹھو میں جا رہی ہوں ذرا دروازہ بند کر لو۔''

میں اٹھ کر باہر آیا۔ ''کہاں جا رہی ہیں امی۔''

''برابر والی بلڈنگ میں کسی لڑکی نے اوپر سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی ہے۔ سنا ہے ذہنی توازن ٹھیک نہیں تھا اس کے گھر جا رہی ہوں۔''

میرا دل رک گیا تھا۔ ''برابر والی بلڈنگ سے...... کس نے..... کون ہے؟''

''ہمارے سامنے والے فلیٹ میں رہتی تھی۔ پڑوسن نے بتایا ہے بچپن سے ایب نارمل تھی چار پانچ سال کے بچے جیسا ذہن تھا۔ پتا نہیں کیوں چھلانگ لگا دی اس نے۔ اچھا میں جا رہی ہوں۔''

امی چلی گئیں اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ تو وہ ایب نارمل تھی اور میں اسے نارمل لڑکی سمجھ کر اس سے محبت جتا رہا تھا۔ اب پتا چلا کہ وہ میرے ساتھ اتنی آسانی سے بے تکلف کیسے ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے خودکشی کیوں کی؟ اس سوال کا جواب امی نے واپس آکر دیا تھا۔ انہوں نے بتایا۔ ''بڑی پیاری سی لڑکی تھی۔ اس کی ماں رو رو کر کہہ رہی تھی کہ اس نے اپنی معصوم بچی کو کیوں ڈانٹا کہ اس نے اپنی جان لے لی۔ پتا ہے اس نے کیوں بچی کو ڈانٹا تھا؟''

میں جانتا تھا کہ آئینہ کی ماں نے اسے کیوں ڈانٹا۔ کئی دن میں اس صدمے میں رہا۔ جب اکیلا ہوتا تو رو بھی لیتا تھا لیکن رفتہ رفتہ نارمل ہوتا چلا گیا۔ سترہ سال کی عمر ایسی ہوتی ہے۔ اس میں آدمی خوشی اور غم دونوں جلد بھول جاتا ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ میں بھول گیا تھا لیکن میرا ضمیر نہیں بھولا تھا۔ جب میری شادی ہوئی اور پہلی بچی نے جنم لیا۔ تب میں نے لاشعوری طور پر اس کا نام آئینہ رکھا تھا۔ یعنی میرے لاشعور نے آئینہ کو یاد رکھا تھا اور قدرت نے اسے یوں یاد رکھا کہ میری آئینہ کو ویسا ہی بیگانہ ذہن دے دیا۔ آج ہم آپریشن روم کے باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ عائشہ نے ہمارے گناہ کی بات کی تو ضمیر نے مجھے آئینہ دکھا دیا تھا۔ عائشہ معصوم تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ سزا میرے کس گناہ کی ہے

میں چونکہ خود اس کہانی کا ایک کردار ہوں اس لیے ایک پرانا واقعہ اپنی پوری جزئیات کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ٹی وی پر میرا ایک شو چل رہا تھا۔ اس شو میں زندگی کے مختلف شعبوں کے مشہور لوگوں کو بلوایا جاتا اور ان سے دلچسپ باتیں کی جاتیں۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ شہر کے ایک ہال میں ہوتی تھی۔

ایک بار ہم نے ایک بہت ہی مشہور اور خوبصورت گلوکارہ کو پروگرام میں مدعو کیا۔ وہ ایک انتہائی مہذب اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ میں اس کا نام لینا نہیں چاہتا۔ اب اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔

لوگوں میں اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کا جنون تھا۔ بہرحال پروگرام کے آغاز سے پہلے وہ میرے پاس آئی اور اس نے مجھ سے کہا۔ ''منظر صاحب خدا کے لیے میری جان بچائیں مجھے بہت خوف محسوس ہو رہا ہے۔''

''خیریت تو ہے کس بات کا خوف؟''

''اس ہال میں ایک لڑکی آئی ہوئی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''گزشتہ کئی مہینوں سے وہ مجھے فون کر رہی ہے

سچا راستہ

محترم معراج رسول صاحب!
السلام علیکم
یہ شوبز کی دنیا، یہ گلیمر کی دنیا، فلم اور ٹی وی کی دنیا اپنے دامن میں کیسی کیسی کہانیاں چھپائے ہوئے ہے، اس کا ادراک ہر ایک کو ہے۔ میں نے وعدے کے مطابق ایک اور کہانی ذہن کے دریچے سے قرطاس پر منتقل کردی ہے۔ ایک جنونی لڑکی کی کہانی، وہ آج اپنے گھر میں خوش ہے۔ اگر میں مداخلت نہ کرتا تو شاید اس کہانی کا اختتام کچھ اور ہوتا

منظر امام
(کراچی)

کہ میں اس سے دوستی کرلوں۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر میں نے اس سے دوستی نہیں کی تو وہ اپنی جان دے دے گی۔ اس کے پرس میں ہر وقت ایک چاقو رہتا ہے اور اس وقت بھی وہ ہال میں موجود ہے۔''

''اوہو یہ سب لفظی باتیں ہیں۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا۔ ''اس قسم کی جنونی لڑکیاں صرف دھمکیاں دیتی رہتی ہیں۔''

''نہیں منظر صاحب۔ ایک بار اس نے میرے سامنے اپنے بازو میں چاقو گھونپ لیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ تو ہم لوگوں کی پوزیشن جانتے ہیں اگر اس کے ساتھ واقعی کچھ ہوگیا تو یہ اسکینڈل مجھے برباد کرکے رکھ دے گا۔''

میں نے بھی جب اس پہلو سے غور کیا تو اس کی پریشانی جائز معلوم ہونے لگی۔ اخبار والوں کو تو اس قسم کی خبریں چاہئیں۔ وہ اس ایشو کو نہ جانے کیا سے کیا بنا دیتے اور خوامخواہ کا ہنگامہ کھڑا ہوجاتا۔

''منظر صاحب پلیز کچھ کریں۔'' اس نے کہا۔

میں یہاں اس کا فرضی نام عندلیب لکھ رہا ہوں۔

''وہ لڑکی اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اُس وقت ہم اسٹیج پر تھے۔ جس پر پروگرام ہونا تھا۔ ابھی شو شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ عندلیب میرا ہاتھ تھام کر مجھے پردے کے ایک کونے میں لے آئی۔ اس نے ذرا سا پردہ اٹھا کر باہر ہال کی طرف دیکھا اور اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''وہ دیکھیں، وہ دوسری رو میں پہلی کرسی پر بیٹھی ہے۔''

میں نے بھی اس لڑکی کو دیکھ لیا۔ ''ٹھیک ہے نام کیا ہے اس کا؟'' میں نے پوچھا۔

''شبنم۔'' عندلیب نے بتایا۔

''تم اطمینان سے اندر روم میں جا کر بیٹھو میں اس سے بات کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ہنگامہ ہوجائے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''تم اب اس لڑکی کو بھول جاؤ۔''

میں اسٹیج سے اتر کر اس لڑکی کے پاس آگیا۔ وہ ایک دبلی پتلی خوبصورت سی لڑکی تھی اور شاید اکیلی ہی آئی ہوئی تھی۔ خدا جانے اس نے پاس کہاں سے حاصل کیا ہوگا۔ بہرحال میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا اور اسے مخاطب کیا۔ ''تمہارا نام شبنم ہے نا؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''جی ہاں میں شبنم ہوں اور آپ؟''

''منظر نام ہے میرا۔'' میں نے بتایا۔ ''اور یہ پروگرام میں ہی لکھ رہا ہوں۔''

''جی ہاں، جی ہاں۔'' وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ ''میں نے آپ کا نام سن رکھا ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ سے ملاقات ہوگئی لیکن آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟''

''عندلیب نے اشارہ کرکے بتایا تھا کہ تمہارا نام شبنم ہے اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ تم اس کی دوست ہو۔''

''کیا واقعی عندلیب نے ایسی بات کی تھی؟'' وہ خوش ہوگئی۔

''ظاہر ہے ورنہ مجھے تمہارا نام کیسے معلوم ہوتا۔ کیا تمہارے پاس دس منٹ ہیں مجھ سے بات کرنے کے لیے؟''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں مجھے تو یہ پروگرام بھی نہیں دیکھنا ہے۔ میں تو صرف عندلیب کی خاطر آئی تھی۔''

''تو پھر آؤ باہر چل کر بات کرتے ہیں۔''

میں اسے ہال سے باہر لے آیا۔ اسی ہال کے احاطے میں ایک صاف ستھری کینٹین بنی ہوئی تھی۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''شبنم تم واقعی بہت اچھی لڑکی ہو۔''

''عندلیب کا مقابلہ تو نہیں کرسکتی نا۔'' اس نے کہا۔ ''میں کوئی پاگل تو نہیں ہوں نا جو اس کی خاطر جان دینے کو تیار ہوں۔''

''وہ خود بھی تمہاری محبت محسوس کرنے لگی ہے۔'' میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم بچوں جیسی حرکتیں کررہی ہو۔ اب تم اس کے سامنے اپنے آپ کو چاقو ماروگی یا مرنے کی دھمکیاں دو گی تو اس کو پریشان تو ہونا ہی ہے۔ وہ یہ کہہ رہی تھی کہ میں خود شبنم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں لیکن شبنم کی ایسی حرکتیں مجھے بدنام کرکے رکھ دیں گی۔ اسی لیے اس نے مجھے بھیجا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں۔''

''اس سے کہیے گا کہ شبنم جان تو دے سکتی ہے لیکن اس کی بدنامی برداشت نہیں کرے گی۔''

''میں کیسے کہوں جب تک مجھے یقین نہ آجائے۔''

''تو آپ کو کیسے یقین دلایا جائے؟''

''تم یہ بتاؤ کیا اس وقت بھی تمہارے پرس میں چاقو موجود ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... ہے تو۔''

''پھر تو یہ دوستی نہیں ہوئی نا یہ تو زبردستی والی بات ہوئی۔'' میں نے کہا۔ ''دوستی تو یہ ہوگی کہ تم یہ چاقو پھینک دو اور ایسے ارادوں سے باز آ کر اس کے سامنے جاؤ اور اس سے کہو کہ اب تم خالی ہاتھ ہو اور سچی دوست بن کر اس کے سامنے آئی ہو۔ اس کے بعد وہ تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

''آپ وعدہ کررہے ہیں تو...... یہ لیں یہ چاقو رکھ لیں۔''

اس نے اپنے پرس سے کمانی دار چاقو نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ جسے میں نے فوری طور پر اپنے قبضے میں لے لیا۔ میں اس جنونی لڑکی کو اپنی باتوں سے یہاں تک تو لے آیا تھا اب اس پر تھوڑی سی محنت اور کرنی تھی لیکن بہت آہستہ آہستہ۔

میں نے اس سے کہا کہ وہ ہال میں جا کر بیٹھے۔ پورا شو دیکھے۔ شو کے بعد میں عندلیب سے اس کی ملاقات کروادوں گا۔ وہ ہال کی طرف چلی گئی اور میں اسٹیج کے پیچھے آگیا۔ اب شو شروع ہونے والا تھا۔ عندلیب بہت بے چینی سے میرا انتظار کررہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ سب ٹھیک ہوچکا ہے۔ بس شو کے بعد اسے ذرا سی دیر کے لیے اس جنونی لڑکی سے ملاقات کرنی ہوگی۔

''آپ میرے ساتھ رہیے گا۔'' عندلیب نے کہا۔

''ہاں، ہاں میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔'' میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ''تم جاؤ اور اطمینان سے شو میں حصہ لو۔''

وہ شو ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہی شبنم میرے پاس آگئی۔ عندلیب اس وقت کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا اور اس سے کہا۔ ''عندلیب یہ شبنم تمہاری بہت اچھی دوست ہے اس سے ہاتھ ملاؤ۔''

''کیوں نہیں۔'' عندلیب نے میرے کہنے پر اس سے ہاتھ ملالیا۔

اسی وقت عندلیب کے ساتھ آئے ہوئے انتظامیہ کے لوگ اسے ہال سے باہر لے گئے۔ شبنم اس وقت بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ''اب یہ آپ کی ذمے داری ہے کہ آپ عندلیب سے میری ملاقات کرواتے رہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیوں نہیں، تم مجھے اپنا مکمل پتا اور فون نمبر لکھوا دو۔''

اس نے اپنا فون نمبر اور مکمل پتا مجھے لکھوا دیا تھا۔

یہاں تک کا مرحلہ بخیر و خوبی طے پاگیا لیکن اس لڑکی کو آئندہ کے لیے باز رکھنا بہت ضروری تھا۔ ورنہ وہ آگے چل کر عندلیب کے لیے کچھ بھی کرسکتی تھی۔

دو چار دن کے بعد میں نے اسے فون کیا۔ میری آواز سن کر وہ چہک اٹھی۔ ''ارے کہاں ہیں آپ، میں آپ کے فون ہی کا انتظار کررہی تھی۔''

''میں نے سوچا کہ عندلیب سے مل کر پھر تم سے ملوں گا۔'' میں نے کہا۔

''آپ ملے تھے اس سے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ملا تھا۔ اب تم یہ بتاؤ کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''آپ

جب کہیں۔''

''تو آج شام تم فلاں ریسٹورنٹ میں آجاؤ۔'' میں نے ایک ریسٹورنٹ کا نام بتا دیا۔ ''بلکہ ایسا کرو کہ وی اسٹیشن آجاؤ۔ یہاں کسی کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں ہوجائیں گی۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ میں آرہی ہوں۔''

اور وہ مقررہ وقت پر ٹی وی اسٹیشن پہنچ گئی۔ میں نے اس کے لیے گیٹ پاس بھجوا دیا تھا۔ وہ عندلیب سے ملنے کی خاطر بہت بن سنور کر آئی تھی اور اچھی بھی لگ رہی تھی۔

ہم کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کی گفتگو کا محور عندلیب کی ذات تھی پھر میں نے موضوع... بدل کر اس سے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ کہ عندلیب تمہیں اتنی اچھی کیوں لگتی ہے کہ تم اس کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہو؟''

''اس لیے کہ اس میں ایسی کشش ہے جس نے مجھے تباہ کر دیا ہے۔'' اس نے بے باکی سے بتایا۔ ''میرے لیے اس کی اہمیت پوری دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ میں اس کی عاشق ہوں۔ آپ بھی میرے کمرے میں آکر دیکھیں۔ میں نے اپنے پورے کمرے کو اس کی تصویروں سے سجا رکھا ہے۔ اس کا ہر گانا میرے پاس موجود ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کسی کی آواز اچھی ہی نہیں لگتی۔''

''یہ بہت اچھا جذبہ ہے۔'' میں نے اسے سراہا۔

''کیا......!'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ آپ میرا مذاق اڑائیں گے یا مجھے برا سمجھیں گے کہ میں لڑکی ہو کر لڑکی سے محبت کر رہی ہوں۔''

''نہیں تو......اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم عشق کر رہی ہو اور عشق کے لیے کسی خاص آبجیکٹ کی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اس جذبے کی ضرورت ہوتی ہے جو تمہارے دل میں ہے اور تمہارے پاس پیار کرنے والا دل ہے۔ اس کے لیے تم مبارک باد کی مستحق ہو۔''

''آپ پہلے آدمی ہیں جو ایسی بات کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''لیکن...... ایک بات اور ہے۔'' میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے یہ جان لیا ہے کہ تمہارا جذبہ بالکل پاکیزہ ہے۔ تمہارے دل میں عندلیب کے لیے سوائے محبت کے اور کچھ بھی نہیں ہے لیکن...... ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں نا یہاں لوگوں کی ذہنیت بہت خراب ہے۔ وہ ہر بات کو غلط عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ کوئی بھی تمہارے اس جذبے کی پاکیزگی اور سچائی کو نہیں سمجھے گا بلکہ سب تم پر غلط الزامات لگائیں گے۔''

''ہاں یہ تو ہو رہا ہے۔'' اس نے اپنی گردن ہلا دی۔

''اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ہوگا کہ تم جس سے بے پناہ پیار کر رہی ہو۔ جس کے لیے تمہارے دل میں جذبے بھرے ہوئے ہیں وہ بدنام ہو کر رہ جائے گی!'' میں نے کہا۔ ''اور کیا تم یہ برداشت کر لو گی کہ دنیا تمہارے محبوب کا مذاق اڑائے؟''

''نہیں میں برداشت نہیں کروں گی۔''

''اسی لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم ذرا تنہائی میں جا کر سوچنا اور غور کرنا اس پر۔ عندلیب سے دوستی میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اس دوستی کو جنون اور طوفانی رنگ مت دو بلکہ خود بھی کنٹرول میں رہو اور اس دوستی کو بھی کنٹرول میں رکھو۔''

''آپ کی باتیں سمجھ میں آرہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''بس تو اس وقت گھر جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''حالانکہ تم عندلیب سے ملنے ہی آئی ہو لیکن میں جان بوجھ کر تمہیں اس کے پاس نہیں لے جا رہا ہوں کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ پہلے تم خود پر قابو پانے کا ہنر سیکھو۔ اس کے بعد بالکل نارمل ہو کر اس سے ملاقات کرو۔'' اس نے اس بات کا وعدہ کر لیا۔ مجھے خوشی تھی کہ وہ میری باتیں ماننے لگی تھی۔

میرے ذہن میں اس کے لیے کوئی اور بات تھی اور میں آہستہ آہستہ اس منصوبے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں دو دن بعد اسے فون کر کے بلا لوں گا۔

دو دن بعد جب میں اس سے ملا تو اسے ڈنر کے لیے ایک اچھے ہوٹل میں لے گیا۔ ''جانتی ہو میں تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟'' میں نے دریافت کیا۔

''نہیں آپ ہی بتا دیں۔'' اس نے کہا۔

''اس لیے کہ آج میری برتھ ڈے ہے۔'' میں

نے اس سے جھوٹ بول دیا۔
"کیا......!" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "یہ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم اس بات سے اپنی اہمیت کا اندازہ لگاؤ کہ میں نے اپنی اس خوشی میں صرف تمہیں شریک کیا ہے۔" میں نے کہا۔
"اوہ، بہت بہت شکریہ۔" وہ مسکرا دی۔
میں کھانے کے دوران اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے ماضی اور بچپن کے حوالے سے باتیں کیں اور یہ بھی کمال ہی تھا کہ اس پوری ملاقات کے دوران اس نے ایک بار بھی عندلیب کا نام نہیں لیا اور یہ میری سب سے بڑی کامیابی تھی۔
دوسری شام اس نے خود فون کر کے مجھے بلا لیا۔ میں جب اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا تو وہ وہاں پہلے سے کھڑی ہوئی تھی۔ آج اس نے اپنے بناؤ سنگھار میں بہت اہتمام کیا تھا۔ میں اس سے ملا تو اس نے ایک خوبصورت سا کیس میری طرف بڑھا دیا۔ "میری طرف سے آپ کی سالگرہ کا تحفہ۔"
"کیا ہے اس میں؟"
"آپ خود دیکھ لیں۔"
اس کے اندر ایک بہت خوبصورت قلم تھا۔ "شبنم اس کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے کہا۔
"آپ مصنف ہیں نا اور ایک مصنف کے لیے اس سے اچھا تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔"
"تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایک مصنف کے لیے اس سے اچھا تحفہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔"
اس شام وہ بہت خوش تھی۔ ہم بہت دیر تک ایک پارک میں واک کرتے رہے پھر ایک ہوٹل میں کھانا کھانے چلے گئے۔ کھانے کے دوران میں نے اس سے پوچھا۔ "شبنم اب بتاؤ عندلیب سے ملاقات کب کر رہی ہو؟"
"مل لوں گی، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" اس نے بہت سرسری انداز میں جواب دیا۔
میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ یہ کتنی بڑی تبدیلی آ گئی تھی اس میں۔ بہرحال میری اس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس دوران میں مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ عندلیب کو بھول ہی گئی ہو۔ اس کا نام بھی نہیں لیتی تھی اور میں بھی خاموش ہو گیا تھا۔

ایک دن میں نے شبنم کے بارے میں اپنے ایک دوست سے بات کی تو وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ "خدا کے بندے یہ تم اس کے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہے ہو۔"
"یار میرا مقصد یہ تھا کہ میں اسے فطری محبت کی طرف لے آؤں۔" میں نے کہا۔ "اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا۔"
"لیکن یہ تو سوچو کہ جب اسے پتا چلے گا کہ تم نے یہ سب ایک منصوبے کے تحت کیا تھا۔ اس وقت اس کی کیا کیفیت ہو گی۔ کیا وہ پھر جنونی نہیں ہو جائے گی......؟"
"یار اسی لیے تو میں الجھ گیا ہوں۔"
"اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔" دوست نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ تم اس کے لیے سنجیدہ نہیں ہو۔"
"وہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"
"کیا تم اسے اپنا سکتے ہو؟"
"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میری بیوی ہے، چھوٹا بچہ ہے۔ میں اس سے شادی کس طرح کر سکتا ہوں۔"
"تو کیا ہوا۔ اگر تم اس کو بچانا چاہتے ہو تو اس سے شادی کر لو۔ اسے تو معلوم ہی ہو گا کہ تم بیوی اور بچے والے ہو پھر دوسری شادی میں کیا قباحت ہے۔"
"قباحت تو کوئی نہیں ہے لیکن یہ کام ذرا مشکل ہے۔"
"کوئی مشکل نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ کسی کی زندگی برباد کرنے کا تمہیں کوئی اختیار نہیں ہے۔" دوست نے کہا۔ "تم اس سے بات کر کے دیکھ لو۔" میرے دوست نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ واقعی اگر میں شبنم سے یہ کہہ دیتا کہ میں نے صرف عندلیب کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے اس سے محبت بھری باتیں کی تھیں۔ تو وہ واقعی ٹوٹ کر رہ جاتی۔ ویسے بھی وہ جنونی تھی اور خدا جانے اپنی ناکامی کے عالم میں وہ کیا کر گزرتی۔
میں کئی دنوں تک سوچتا رہا۔ دوست کے مشورے پر عمل کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں اسے اپنا کر آئندہ کے مسائل سے بچا سکتا تھا۔ اسے اپنا لینا جہاد سے کم نہیں تھا کم از کم میرے لیے۔
میں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ مجھے شبنم کو اپنا ہی لینا چاہیے۔ میں نے اسے فون کیا کہ وہ مجھ سے آ کر

ملے۔ اس نے فون پر ہی کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب آپ سے ملنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔"
"کیوں......؟" میں اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔ "خیریت تو ہے نا؟"
"ہاں خیریت ہی ہے اور شاید ایسی خیریت زندگی میں کبھی نصیب نہیں ہوئی ہو گی نہ ہی اتنا سکون ملا ہو گا۔"
"شبنم تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔"
"بس اتنا سمجھ لیں کہ مجھے محبوب مل گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور وہ ایسا ہے کہ جس کی مثال نہیں ہو سکتی۔"
اس کی یہ بات سن کر مجھے ہلکا سا شاک بھی لگا تھا۔
"چلو بہت بہت مبارک ہو لیکن وہ ہے کون......؟"
"کیا ملنا چاہتے ہو اس سے؟"
"ہاں اسے مبارک باد دوں گا کہ اس نے بالکل صحیح انتخاب کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ یہ محبوب تمہیں کس طرح ملا؟"
"لوگوں سے مایوس ہو کر۔" اس نے بتایا۔ "بہرحال باقی باتیں ملاقات ہونے پر بتاؤں گی۔ آپ مجھ سے ملیں تو سہی۔"
یہ ملاقات اسی ہوٹل میں ہوئی تھی جہاں ہم ملا کرتے تھے۔ شبنم اس دن بہت سلیقے کے لباس میں تھی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔
"اب میں آپ کو بتاتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "ایک وقت تھا کہ میں عندلیب کی محبت میں گرفتار تھی۔ جس کے گواہ آپ بھی ہیں۔ میری کیفیت بالکل جنونی ہو رہی تھی۔ میرے لیے اس پوری دنیا میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بھی نہیں تھا۔ میں بالکل آندھی طوفان کی طرح اس کی طرف بڑھ رہی تھی پھر مجھے آپ مل گئے اور آپ نے احساس دلایا کہ میری یہ محبت غیر فطری ہے۔ محبت اس طرح نہیں ہوتی۔ یہ ایک پاگل پن ہے، کیوں یہی بات ہے نا......؟"
"بالکل۔" میں نے گہری سانس لی۔ "تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ اسی لیے میں نے تمہیں اس غیر فطری راہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔"
"اور ایک منصوبے کے تحت میری طرف آتے رہے۔" اس نے کہا۔ "آپ کا منصوبہ یہ تھا کہ میں خودسر لڑکی ہوں۔ اسی لیے کسی دوسری لڑکی کی محبت میں

مبتلا نہ ہو جاؤں بلکہ فطری طور پر کسی مرد سے محبت کروں کیونکہ یہی نیچرل ہے۔''

''تم بتاؤ کیا میں نے غلط سوچا تھا؟''

''نہیں بالکل درست تھا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہو کہ جس دن پہلی بار میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اسی دن یہ جان لیا تھا کہ آپ کے ذہن میں کیا ہے۔ آپ کیوں میری طرف اتنا دھیان دے رہے ہیں۔''

''میری نیت بالکل ٹھیک تھی شبنم۔'' میں نے کہا۔ ''اور ابھی بھی ٹھیک ہے کیونکہ اب میں نے تمہارے لیے کچھ اور فیصلہ کرلیا ہے۔''

''جانتی ہوں میں کہ آپ کے ذہن میں کیا ہے؟'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''شاید آپ نے سوچا ہوگا کہ آپ کو میرے ساتھ ایسا نا تک نہیں کرنا چاہیے۔ اسی لیے دو باتیں ہو سکتی ہیں... یا تو شرمندہ ہو کر آپ معذرت کرنا چاہتے ہوں گے یا پھر آپ نے مجھے اپنانے کا فیصلہ کرلیا ہوگا تاکہ میں بھٹکنے سے محفوظ رہوں۔''

''ہاں تمہارا یہ اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے تمہیں اپنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔''

''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں اب پوری طرح کسی اور کی ہو چکی ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''کیونکہ آپ بھی جو کچھ کر رہے تھے۔ وہ بھی غیر فطری تھا۔ محبت اگر منصوبہ بندی سے کی جائے تو وہ فطری نہیں ہوتی...... جعلی اور مصنوعی ہوتی ہے۔ آپ کی ابتدا بھی اسی انداز سے ہوئی تھی یہ اور بات ہے کہ بعد میں آپ نے کچھ اور سوچ لیا ہو۔''

''شبنم مجھے اپنی اس غلطی کا احساس ہے۔''

''نہیں آپ کی غلطی نے میری زندگی سنوار دی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اگر آپ کی طرف سے مجھے اتنی مایوسی نہیں ہوتی تو بھی اس محبوب کو تلاش نہیں کرپاتی۔ جس کی محبت میں ذرا بھی کھوٹ نہیں ہے نہ اس قسم کی انتہا پسندی کی منصوبہ بندی کا کوئی تصور ہے۔ آپ نے تو مجھ پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ایسا احسان جس کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔''

''مجھے واقعی بہت خوشی ہو رہی ہے شبنم۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تمہارا محبوب واقعی ایسا ہی ہے تو پھر تم اس کے ساتھ زندگی بھر خوش رہو گی۔''

''زندگی بھر نہیں بلکہ اس کے بعد بھی ابد در ابد تک...... کیونکہ میرا محبوب کوئی اور نہیں میرا اللہ ہے۔''

''کیا......!'' اس کی اس بات نے مجھے چونکا دیا۔

''جی ہاں، عندلیب سے محبت کے غیر فطری ہونے کے احساس نے مجھے آپ سے قریب کر دیا اور جب آپ سے ملنے جلنے لگی تو پھر احساس ہوا کہ ارے یہ لگاؤ بھی تو غیر فطری ہے۔ یہ تو عارضی لگاؤ ہے۔ محبت کے لیے تو ایسا محبوب چاہیے جو زندگی بھر اور اس کے بعد بھی ساتھ رہتا ہے۔ جس کے خزانے میں سوائے محبت اور کرم کے اور کچھ نہ ہو۔ جو ہزار لاکھ خطائیں درگزر کر دیتا ہو اور جب وہ حاصل ہو جائے تو پوری کائنات حاصل ہو جاتی ہے۔ بس یہ سوچ کر میں نے اس کی طرف اپنا دھیان لگا لیا۔ شروع شروع میں تو بہت دشواری ہوئی۔ وحشت سی ہونے لگی تھی پھر آہستہ آہستہ اس کی رحمتوں کے دروازے وا ہوتے چلے گئے اور اب اس کے علاوہ میرا کوئی نہیں ہے۔''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ تم جس سے محبت کر رہی ہو۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ تم دنیا چھوڑ کر رہبانیت اختیار کرلو بلکہ وہ تو یہ حکم دیتا ہے کہ اپنا گھر بناؤ۔ شادی کرو، زندگی کو زندگی کی طرح گزارو لیکن شبنم کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھی۔

وہ ایک جنونی لڑکی تھی اور جس بات کا ارادہ کر لیتی۔ اس کے لیے اپنی جان لڑا دیتی۔ عندلیب سے اس کی محبت کا جنون میں دیکھ چکا تھا اور اب میں نے اس کے جنون کا ایک اور روپ دیکھ لیا تھا۔

اس واقعے کو کئی برس گزر چکے ہیں۔ عندلیب بھی کینسر میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے چلی گئی ہے اور شبنم سے بھی میری ملاقات نہیں ہوئی لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ اگر اپنے جنون پر قائم رہی ہوگی تو معرفت کی راہوں میں بہت آگے نکل چکی ہوگی۔ اس نے محبت کا ایسا فطری راستہ تلاش کر لیا تھا جس کی تلاش بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ وہ جہاں بھی ہو خدا اسے خوش رکھے۔

فرشتہ

مکرم و محترم مدیر اعلیٰ!
السلام علیکم!
میں آج ایک بڑی فرم میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں لیکن کبھی ''سڑک چھاپ'' کہلاتا تھا۔ مجھے اس مقام تک ایک فرشتے نے پہنچایا مگر کس طرح یہ آپ بھی پڑھ لیں۔
بہزاد
(لاہور)

ہم دونوں میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں اور میرا دوست راشد عام سے نوجوان تھے۔ ہم نے زندگی میں بھی کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ تعلیم کا سلسلہ بھی بس یوں ہی رہا تھا۔

چونکہ والدین زندہ تھے اس لیے دونوں کو آنے والے دنوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ گھروں سے اچھے خاصے پیسے مل جایا کرتے جو ہماری عیاشی کے لیے کافی ہوتے تھے۔

اور ہماری عیاشی کیا تھی! بس گھومنا پھرنا۔ کپڑے ہوا' فلمیں دیکھنا اور ہوٹلوں میں گپ شپ کرنا۔ یعنی ہم دونوں ہی

زندگی کے بارے میں سیریس نہیں ہو سکے تھے۔

ہمارا ایک مشترکہ دوست بھی تھا' شہاب۔ وہ ایک ذہین نوجوان تھا اور اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ اس میں آگے بڑھنے کا اسپارک ہے۔ وہ یقیناً ترقی کرے گا۔ وہ اکثر ہم دونوں کو سمجھایا کرتا "یار! تم دونوں کیوں اپنے آپ کو برباد کر رہے ہو' آگے کی کیوں نہیں سوچتے؟"

"کیا کرنا ہے سوچ کر؟"

"تو کیا زندگی اسی طرح گزارو گے؟ خود سوچو' والدین کب تک ساتھ دیتے ہیں۔ ایک نہ ایک دن انہیں جانا ہی ہے' اس کے بعد کیا ہوگا؟"

ہم دونوں بھی اس سچائی سے واقف تھے۔ اس کے باوجود ہمارے مزاج کا لاابالی پن ختم نہیں ہوتا تھا۔ پتا نہیں کیوں' ہم دونوں میں اتنی باتیں مشترک کیوں تھیں؟

مثال کے طور پر لباس کے معاملے میں دونوں ہی بے پروا تھے۔ بے ڈھنگے لباس پہنتے' جوتوں اور چپلوں کا بھی کوئی خاص سلیقہ نہیں تھا۔

ہم دوسرے نوجوانوں کو دیکھا کرتے' دفتروں کو جانے والے اسمارٹ قسم کے نوجوان۔ سلجھے ہوئے بال' ملاسب ڈریسنگ' نکٹائیاں لگی ہوئی' چمک دار جوتے۔ یا تو بائیک پر یا اپنی گاڑیوں پر۔

ہم ایسے نوجوانوں کو دیکھا تو کرتے تھے لیکن ہم نے ان سے کبھی انسپائر ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ہم خود کو اپنی جگہ لارڈ سمجھتے تھے جبکہ ہم کچھ بھی نہیں تھے۔

لڑکیوں یا محبت وغیرہ کے معاملات میں بھی ہم بہت پیچھے تھے۔ دونوں کو کسی لڑکی نے لفٹ نہیں دی تھی۔ ظاہر ہے' ایسے اول جلول نوجوانوں کو کون لفٹ دیتی' جن کی کوئی منزل ہی نہ ہو۔

لیکن پھر ایک دن ایک لڑکی میری زندگی میں آ گئی۔ اس کا نام درخشاں تھا۔ زیادہ خوبصورت تو نہیں تھی لیکن اسمارٹ ضرور تھی اور ڈریسنگ بھی بہت اچھی کیا کرتی۔ نہ جانے کس طرح اور کیوں درخشاں نے مجھے پسند کر لیا تھا اور میرے قریب ہوگئی تھی۔

درخشاں سے میری ملاقات محلے کی ایک شادی کی تقریب میں ہوئی تھی۔

یہ شادی محلے کی ایک لڑکی کی تھی جس کے گھر والوں نے قریبی ہال میں اہتمام کیا تھا۔ درخشاں کو میں نے اسی ہال میں دیکھا تھا۔

تقریب میں گیدرنگ تھی۔ اتفاق سے میرا دوست راشد اس شادی میں شریک نہیں ہو سکا تھا اس لیے میں اکیلا ہر طرف ڈولتا پھر رہا تھا کہ وہ لڑکی درخشاں مجھ سے آ ٹکرائی۔

اس وقت کھانا لگ چکا تھا اور معمول کے مطابق افراتفری اور بارود جاڑ جیسا ماحول تھا۔ جب وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک خالی پلیٹ تھی۔ "پلیز' آپ میرا ایک کام کر دیں گے۔" اس نے پوچھا۔

"جی فرمائیں؟"

"دیکھیں' میں نے کسی طرح یہ پلیٹ تو حاصل کر لی ہے لیکن کھانا حاصل نہیں کر سکی ہوں' کیا آپ میرے لیے اس پلیٹ کو بھر کر لا سکتے ہیں؟"

میرا دل چاہا کہ میں ایک نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے اس سے کہوں کہ تم کھانے کی کیا بات کرتی ہو' میں تمہارے لیے آسمان کے تارے تک توڑ کر لا سکتا ہوں۔

چونکہ میں یہ نہیں کہہ سکا تھا اس لیے میں نے اس سے خالی پلیٹ لی اور اس کے لیے مہم سر کرنے نکل گیا۔ دس منٹ کے بعد میں پلیٹ بھر کر لے آیا تھا۔ وہ میرا شکریہ ادا کرکے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی کہ میں بھی اپنی پلیٹ لے کر اس کی میز کے پاس ہی پہنچ گیا۔

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی "شاید آپ بھی اس تقریب میں اکیلے ہیں؟"

"جی ہاں' تو کیا آپ بھی......؟"

"شاہدہ میری سہیلی ہے۔" اس نے دلہن کا نام لیا "میں یہاں اس کے علاوہ کسی اور کو نہیں جانتی۔"

"اور میں اسی محلے میں رہتا ہوں جس میں لڑکی رہتی ہے۔" میں نے بتایا۔

"چلیں' حساب برابر ہو گیا۔" وہ ہنس کر بولی۔

اس وقت میں نے محسوس کیا کہ غیر ارادی طور پر میں اس سے بہت ہنس ہنس اور شگفتہ سی باتیں کرنے لگا ہوں۔ وہ بھی میری باتیں بہت دھیان سے سن رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا نام بتایا تھا "درخشاں!"

"اور میں بہزاد ہوں۔" میں نے اپنے بارے میں بتایا۔

"بہزاد صاحب' آپ یقیناً اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہوں گے؟" اس نے پوچھا۔

اس وقت شرم سی محسوس ہوئی۔ میں نے تعلیم کا سلسلہ ختم ہی کر دیا تھا۔ حالانکہ میں اور راشد دونوں ہی گریجویٹ تھے۔ اس کے بعد ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے تھے۔ اس نے جب دوبارہ یہی سوال کیا تو میں جلدی سے بولا "کیوں نہیں' ایم اے کر رہا ہوں۔"

"خوب!" اس نے اپنی گردن ہلا دی "میں ابھی بی اے میں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں' وقت آنے پر آپ بھی ایم اے کر لیں گی۔"

اسی طرح کی ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ پھر میں نے اس سے پوچھا "درخشاں' تم سے دوبارہ کب ملاقات ہوگی؟"

"کیا دوبارہ ملاقات ضروری ہے؟"

"ہاں' کیونکہ تم بہت اچھی لگی ہو۔ میرا مطلب ہے تمہاری باتوں نے بہت متاثر کیا ہے۔"

"تو پھر اگلے ہفتے ایک پارٹی ہے۔ میں اپنی طرف سے دعوت دے رہی ہوں۔"

"کیسی پارٹی؟"

"ایسی پارٹی جس کو ہم بے تکلف پارٹی کہتے ہیں۔"

"ذرا مجھے بھی سمجھاؤ۔"

"ہم دس بارہ دوست ہیں۔" اس نے بتایا "اور سب ہی کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ براڈ مائنڈڈ' تعلیم یافتہ' مہذب' گھرانا۔ ہم سب مہینے میں ایک بار کسی ایک کے گھر میں جمع ہو جاتے ہیں۔ انجوائے کرتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کو چلے جاتے ہیں۔"

"دلچسپ۔ لیکن میری گنجائش کیسے ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتی ہے' ہر ممبر اپنے ساتھ دو اور کو لا سکتا ہے۔" اس نے بتایا "اگر تم بھی کسی کو لانا چاہو تو لا سکتے ہو۔"

"میں اپنے ایک دوست کو لاؤں گا۔" مجھے راشد کا خیال آ گیا تھا۔

پھر درخشاں نے مجھے اپنا فون نمبر دیا اور ہم ایک ہفتے کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ میں نے جب راشد کو یہ بتایا کہ میں ایک لڑکی سے محبت کرنے لگا ہوں تو وہ اچھل پڑا تھا۔ "کون ہے وہ' کہاں سے ملی؟ کیسی ہے وہ؟ کہاں رہتی ہے؟"

"میرے دوست' وہ بہت زبردست لڑکی ہے۔ اتنی اسمارٹ اور خوبصورت کہ تم اسے دیکھ کر چکرا جاؤ گے۔ اب یہ سب رہنے دو کہ وہ مجھے کہاں ملی' کیسے ملی۔ تم بس اگلے ہفتے پارٹی کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

یہ ایک ہفتہ ہم دونوں نے ہی بے چینی میں گزارا تھا۔ مجھے اس سے دوبارہ ملنے کی خوشی ہو رہی تھی اور راشد اس لیے

غزل

تاکید ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی
مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی

آتے ہی تیرے وعدۂ فردا کا اعتبار
گھبرا کے مر نہ جائے تو پھر کیا کرے کوئی

وہ جلوہ بے حجاب سہی ضد کا کیا علاج
جب دل میں رہ کے آنکھ سے دیکھا کرے کوئی

کہتے ہیں حسن ہی کی امانت ہے دردِ عشق
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

خالی ہے بزمِ ذوقِ طلب اہلِ ہوش سے
اتنا نہیں کہ تیری تمنا کرے کوئی

فانیؔ دعائے مرگ کی تکرار کیا ضرور
غافل نہیں کہ ان سے تقاضا کرے کوئی

شوکت علی خان فانی بدایونی

مجھے خوشی تھی کہ کسی پارٹی میں جا رہا تھا' جو ہم لوگوں کو شاید ہی نصیب ہوئی ہو۔

درخشاں سے فون پر بات بھی ہوگئی تھی۔ اس نے ایڈریس سمجھا دیا تھا کہ ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ اس شام ہم دونوں کی تیاریاں دیکھنے کے قابل تھیں۔

کہاں تو ہم جیسے لاابالی نوجوان کہ جن کو لباس تک سلیقے سے استعمال کرنے کی تمیز نہیں تھی اور کہاں ہم ایسے ہوگئے تھے جیسے کسی ملٹی نیشنل فرم کے باس ہوں۔

سوٹ' ٹائیاں' جوتے۔ سب کچھ معیار کے مطابق تھے۔

پھر جب ہم وہاں پہنچے تو بہت خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا گیا تھا۔

اور شاید پہلی بار ہمیں احساس ہو رہا تھا کہ پارٹیز کیا ہوتی ہیں اور پڑھے لکھے مہذب لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ ہم تو اب تک محلے کے ہوٹل میں بیٹھتے آئے تھے اس لیے ہمیں یہاں بہت احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا۔

درخشاں کو دیکھ کر تو راشد سناٹے میں رہ گیا تھا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک طرف لے جا کر بولا۔ ''یار! تم اس معاملے میں واقعی خوش قسمت ہو۔ تمہاری دوست تو بہت زبردست ہے۔''

''شکریہ!'' میں خوش دلی سے مسکرا دیا۔ ''میں نے تم سے کیا کہا تھا کہ اس کو دیکھ کر تم حیران رہ جاؤ گے۔''

وہ پارٹی رات گئے تک چلتی رہی تھی۔ زیادہ تر ہمارے دوست بن گئے تھے اور ان کے سامنے ہمیں بھی اپنے آپ کو پوز کرنا پڑ رہا تھا۔

واپسی میں ہم دونوں ہی بہت سنجیدہ تھے' ''یار بہزاد! لگتا ہے ابھی تک ہم دونوں نے جانوروں والی زندگی گزاری ہے۔''

''ہاں بھئی! اب اس ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کے لیے ہمیں خود کو بدلنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''یقیناً' مجھے بھی یہ لوگ بہت پسند آئے ہیں۔''

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میری کامیابی میں بھی درخشاں کا ہاتھ تھا۔ میری اس سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ مختلف مقامات پر اور ان پارٹیز میں جو اس کے دوست آرگنائز کیا کرتے۔

اس کے بعد میں نے اپنی ادھوری تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے ایک جگہ جاب بھی شروع کر دی حالانکہ اس سے پہلے جاب مل کر نہیں دے رہی تھی لیکن درخشاں کے ملنے کے بعد جیسے جادو سے سب کچھ ٹھیک ہوتا چلا جا رہا تھا۔

پھر میری دیکھا دیکھی راشد نے بھی اپنی زندگی بنانے کے لیے محنت شروع کر دی۔

اس نے بھی اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ڈھنگ کے کپڑے پہننے لگا۔ یعنی ہم دونوں کا لاابالی پن ایک دم سے ختم ہو گیا تھا۔ اب ہم ذمے دار نوجوان تھے۔

ہمارے دوسرے دوستوں کو یہ سب دیکھ دیکھ کر حیرت ہوا کرتی۔ وہ پوچھتے رہ جاتے کہ آخر ہمیں کون سا نسخہ مل گیا ہے جس پر عمل کر کے ہم اس طرح آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔

اب انہیں کیا بتایا جاتا کہ وہ نسخہ کیا ہے؟

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک ایک دن مجھ پر پہاڑ سا گر پڑا۔ میں نے راشد اور درخشاں کو ایک ہوٹل سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ویسے تو یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہو سکتا تھا کہ دونوں کی اچانک ملاقات ہوگئی ہو لیکن یہاں معاملہ ایسا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں کے ساتھ ساتھ چلنے کا انداز بھی بہت کچھ بتا رہا تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکرانا' پیار بھری نگاہیں۔ یہ سب ظاہر کر رہے تھے کہ معاملہ اتفاقیہ ملاقات کا نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دیکھ کر میرے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ درخشاں شاید اب تک مجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔ اس نے ایک طرف راشد سے وعدے کر رکھے ہوں گے تو دوسری طرف مجھے آسرے پر رکھے ہوئے تھی۔

یہ دیکھ کر میرا اتنا دماغ خراب ہو گیا تھا کہ میں نے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک ملاقات میں درخشاں پر برس پڑا۔ میری تمام باتیں وہ بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے سنتی رہی تھی۔

پھر میرے خاموش ہو جانے کے بعد اس نے پوچھا ''بہزاد! تم مجھے ایک بات بتاؤ' کیا میں نے کبھی تم سے محبت بھری باتیں کی ہیں؟ کیا کبھی یہ کہا ہے کہ تمہارے بغیر میں مر جاؤں گی؟ یا میں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی ہوں؟ مجھے بتاؤ' کیا میں نے کبھی ایسی کوئی بات کی؟''

میرے پاس اس کے سوالوں کے جواب نہیں تھے اسی لیے صرف تلملا کر رہ گیا تھا۔

''بتاؤ بہزاد! جواب دو' کیا ہمارے درمیان کبھی ایسی

کوئی بات ہوئی ہے؟''

''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''چلو' اب تمہیں بتاتی ہوں کہ اصل صورت حال کیا ہے؟'' اس نے کہا ''تمہارے دوست راشد کو بھی مجھ سے محبت کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔''

''کیا!'' میرے لیے یہ ایک انکشاف تھا۔

''ہاں' وہ یہ چاہتا ہے کہ میں صرف اسی کی ہو کر رہ جاؤں۔''

''تو پھر تم نے کیا سلوک کیا اس کے ساتھ؟'' میں نے پوچھا۔

''تم یہ بتاؤ' میں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''تو میں نے اس کے ساتھ بھی کچھ نہیں کیا ہے۔'' اس نے بتایا' ''بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہوں۔''

''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''دیکھو بولڈ بنو اور جو کچھ سامنے ہے اسے قبول کرنے کی کوشش کرو۔'' اس نے کہا ''مجھے اس موضوع پر تم سے بات کرنی تھی لیکن راشد کے سامنے۔ تم چاہو تو فون کر کے اسے یہاں بلا سکتے ہو تاکہ صورت حال کلیئر ہو جائے۔''

''ہاں میں بلا رہا ہوں اسے۔'' میں غصے سے بولا۔

''تو پھر فوراً بلالو۔''

میں نے فون کر کے راشد کو بلا لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں کہیں اکیلا بیٹھا ہوں لیکن جب اس نے میرے ساتھ درخشاں کو بھی دیکھا تو حیران رہ گیا تھا۔

''حیران مت ہو۔'' درخشاں نے کہا ''بہزاد نے میرے کہنے پر تمہیں یہاں بلایا ہے۔''

''لیکن کیوں؟''

''تاکہ جو ٹرائی اینگل بن گیا ہے اس کا فیصلہ ہو جائے۔ کہانی وہی پرانی ہے یعنی ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ رقابت کا سلسلہ... لیکن پرابلم یہ ہے کہ لڑکی کو دونوں اچھے لگتے ہیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں اپنے غصے کو دبا کر بولا۔

''اس معاملے میں تو ایسا ہی ہے۔'' اس نے کہا ''تم دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہو لیکن میں تمہارے درمیان آ گئی ہوں۔ اب تم دونوں کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ کون مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟'' راشد نے کہا۔

''میری بات سنتے رہو۔ میں تم دونوں کو کھونا نہیں چاہتی۔ مجھے تم دونوں پسند ہو لیکن پرابلم یہ ہے کہ میں دونوں کو تو اپنا نہیں سکتی اس لیے میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔''

''کیسا فیصلہ؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت ہی پازیٹو فیصلہ ہے۔'' اس نے کہا ''اس سے پہلے کہ تم دونوں دوست میرے لیے ایک دوسرے کے دشمن بن جاؤ' میں تم دونوں سے ایک سال کے لیے الگ ہو رہی ہوں۔''

''کیا!'' ہم دونوں ہی نے پوچھا تھا۔

''ہاں' صرف ایک سال کے لیے۔ اور یہ کہہ کر الگ ہو رہی ہوں کہ مجھے ہر حال میں کامیابی پسند ہے۔ ایک سال کے بعد تم دونوں میں سے جو بھی زندگی کے ہر میدان میں زیادہ سے زیادہ کامیابیاں حاصل کرے گا' میں اسی کی ہو جاؤں گی۔''

یہ ایک حیرت انگیز فیصلہ تھا۔

اس فیصلے نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ اس نے ہمارے فون سننے چھوڑ دیے تھے۔ ہم سے ملاقات نہیں کرتی تھی۔

اب میں اور راشد ایک دوسرے سے الگ ہو کر اپنے آپ کو کامیاب بنانے میں لگ گئے تھے۔

میرا خیال ہے کہ کسی لڑکی نے ایسی شرط کم ہی سامنے رکھی ہوگی۔

وہ چاہے جیسی بھی تھی' اس نے ہم دونوں کو جدوجہد کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ میں اور راشد پاگلوں کی طرح آگے بڑھنے میں لگے ہوئے تھے۔

ہمارے درمیان ملاقاتیں تو نہیں ہوتی تھیں لیکن ایک دوسرے کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ میں نے ایم اے کا پہلا سال بہت کامیابی سے مکمل کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ سیکھتا جا رہا تھا۔

مجھے جس فرم میں جاب ملی تھی' اس فرم کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ترقی کے لیے اندرونی طور پر امتحانات وغیرہ ہوا کرتے تھے۔

میری کارکردگی بہت شاندار رہی تھی۔ اسی بنیاد پر مجھے فرم کا جنرل منیجر بنا دیا گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ درخشاں نے میری تقدیر بدل کر رکھ دی تھی۔ کمال کی لڑکی تھی۔

اس نے اپنے حصول کی جو شرط سامنے رکھی تھی۔ اس میں فائدے ہی فائدے تھے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ

واقعی ہر کامیاب شخص کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔
اس ایک سال کے دوران بہت کچھ ہوا۔ راشد نے وہ محلہ چھوڑ دیا تھا۔ سنا تھا کہ وہ ایک شاندار مکان میں رہنے لگا ہے یعنی اس نے بھی ترقی کی تھی۔
اور جب ایک سال ہونے کو آیا تو ایک دن راشد اچانک میرے دفتر آ نکلا گیا۔ میں اسے غیر متوقع طور پر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔
''تم یہاں......؟''
''ہاں۔'' وہ سامنے بیٹھتے ہوئے بولا ''مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم اس فرم میں جنرل منیجر ہو۔''
''اور تم......؟''
''میں نے تمہاری دعا سے اپنا کاروبار سیٹ کرلیا ہے۔'' اس نے بتایا ''اور یہ سب اسی درخشاں کی وجہ سے ممکن ہوسکا ہے۔ اس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور آج وہ یہاں آنے والی بھی ہے۔''
''کیا؟'' یہ انکشاف اور بھی خوش کن تھا ''کیا درخشاں یہاں آرہی ہے؟''
''ہاں اس کے پاس سے تمہارا نمبر گم ہوگیا تھا اسی لیے اس نے فون کرکے مجھے خبر دی ہے۔''
میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہی حال خود راشد کا بھی ہو۔ ایک سال مصروفیتوں کے درمیان پلک جھپکتے میں گزر گیا تھا اور ایک سال بعد اس وعدے کی تکمیل ہونے والی تھی جو ہم دونوں سے کیا گیا تھا۔
میں نے راشد کے لیے کافی منگوائی۔ کافی پینے کے دوران ہم ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہمارے لیے پرانے دن زیادہ خوبصورت تھے یا آج ہمارے لیے اچھا تھا۔
میرا خیال ہے کہ ہر لمحے کی اپنی اپنی اہمیت ہوا کرتی ہے۔
ہماری کافی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ درخشاں آگئی۔ کیا کیفیت تھی ہماری‘ ہم دونوں اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور اسمارٹ ہوگئی تھی۔
''اس سے پہلے کہ ہم اپنی باتیں شروع کریں‘ میں تم دونوں کو ایک خبر سنانا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔
''ضرور سناؤ۔'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔
''میں نے شادی کرلی ہے۔'' اس نے بتایا ''میری شادی کو چار مہینے ہوگئے ہیں۔''
مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے بلندیوں سے زمین پر پھینک دیا ہو۔ راشد کی بھی شاید یہی کیفیت ہورہی تھی۔ اس کا چہرہ ستا کر رہ گیا تھا۔
''تو پھر...... تم نے ہم سے ایسا وعدہ کیوں کیا تھا؟'' میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔
''بے وقوف ہو تم دونوں!'' اس نے کہا ''کیا میری شہ کے بغیر تم دونوں اتنی کامیابیاں حاصل کرسکتے تھے؟ اس ایک سال کے دوران تم نے کھانے کا سوا نہیں کیا تھا‘ فائدے ہی میں رہے ہو۔''
میں اور راشد ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔
''تم یہ سمجھ لو کہ میں تم دونوں کی زندگی میں صرف اسی لیے آئی تھی۔'' درخشاں نے کہا ''دوسرے الفاظ میں تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ ایک فرشتہ تمہارے پاس آیا اور تمہیں کامیابی کی راہ پر ڈال کر واپس چلا گیا۔''
''شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔'' میں نے کہا۔
''اور ہاں۔'' وہ مسکرا دی ''جہاں تک محبت وغیرہ کا تعلق ہے تو اب نہ جانے کتنی لڑکیاں تمہارے آگے پیچھے ہوا کریں گی۔''
''درخشاں! تم ایک بات بتاؤ‘ آخر کیوں...... تمہیں ہم سے آخر ایسی کون سی ہمدردی ہوگئی تھی کہ تم نے ہماری خاطر ایسا کردار ادا کیا۔''
''ہاں‘ یہ سوال کیا ہے تم نے۔'' اس نے کہا ''دراصل اس لڑکی کو جس سے تم دونوں کا بھی کوئی تعلق نہیں رہا لیکن جس نے تمہارے لیے مجھ سے یہ کردار ادا کرنے کو کہا تھا۔''
''کس لڑکی کی بات کررہی ہو؟''
''اپنی دوست شاہدہ کی۔ تم جس کی شادی میں شریک ہوئے تھے اور مجھ سے ملاقات کی تھی۔''
''لیکن شاہدہ کا مجھ سے کیا تعلق؟''
''تمہاری امی سے تو تعلق تھا اس کا۔''
پھر اس نے بتایا کہ شاہدہ کا ہمارے یہاں آنا جانا تھا۔ امی میری وجہ سے بہت پریشان رہتی تھیں۔ انہوں نے میرا اور راشد کا ذکر کیا ہوگا۔ شاہدہ نے پھر درخشاں سے بات کی اور درخشاں نے ہم دونوں کو سنوارنے کا ناٹک لے لیا۔
وہ شاہدہ کی شادی میں جان بوجھ کر مجھ سے ملی‘ دوستی کی اور ہم دونوں دوستوں کو کامیابی کے راستے پر لے آئی۔
اب ہم دونوں بیویوں اور بچوں والے ہوگئے ہیں۔ ہمارے پاس بہت کچھ ہے اور یہ بہت کچھ اسی لڑکی کی وجہ سے حاصل ہوا ہے جس نے فرشتہ بن کر ہمیں راہ دکھائی تھی۔
ہم جب تک زندہ ہیں اُسے دعائیں دیتے رہیں گے۔
●●

تعلیم نسواں

محترمہ عذرا رسول صاحبہ!
السلام علیکم
آج ہمارے اس معاشرے میں عورت کا کیا مقام ہے؟ عورت کیا صرف مردوں کی خدمت گزاری کے لیے ہوتی ہے؟ عورت کو پڑھایا یا لکھایا بھی اسی لیے جاتا ہے کہ وہ گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹائے۔ بیٹوں کو صحیح معنی پر تربیت اور ماحول سے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟
ڈاکٹر ساجدہ
السلام علیکم!

ابا میاں کی خواہش تھی کہ ہم سب بہن بھائی ڈھیر سارا پڑھیں۔ ابا میاں اور امی کی ہم پانچ اولادیں ہیں اور پانچوں ہی لڑکیاں ہیں۔ ہمارا تعلق جس خاندان سے ہے اس میں لڑکوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ دادا میاں مراد آباد سے ہجرت کرکے پاکستان آئے تھے۔ وہاں ان کی بہت بڑی حویلی اور دوسری جائیداد تھی۔ ابھی پاکستان بنے میں بہت وقت تھا تب ہی دادا میاں نے حالات بھانپ کر اپنی جائیداد اور زمین فروخت کرنا شروع کردی تھی اور اس کی جگہ وہ سندھ میں زمین خریدتے رہے تھے۔ میرپور خاص میں انہوں نے بنجر زمین لے لی جس پر بعد میں نہر کا پانی آگیا تو یہ زمین سونا اگلنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ زمین حیدرآباد اور ٹھٹھہ میں بھی لی تھی۔ رہائش کے لیے انہوں نے حیدرآباد منتخب کیا اور یہاں حویلی تعمیر کرائی جو ڈیزائن میں بالکل مراد آباد جیسی تھی۔ اس لیے وہ جب پاکستان آئے تو عام مسلمانوں کی طرح لٹ پٹ کر نہیں آئے تھے۔ انہوں نے اپنے اثاثے بچا لیے تھے اور ان میں اضافہ کرلیا تھا۔

دادا میاں کے چار بیٹے اور صرف ایک بیٹی تھی۔ کیونکہ ہمارے ہاں صرف برادری میں شادی ہوتی ہے اس لیے دادا میاں نے بچوں کے لیے بڑے چھان پھٹک کر رشتے کیے۔ پھوپی کی شادی تو ان کے ایک کزن سے ہوئی جو میرپور خاص میں آباد ہو گئے تھے اور اسکول ٹیچر تھے۔ لیکن دادا میاں نے پھوپی کے حصے کی زمین ان کو دے دی تو پھوپا نے ماسٹری کے ساتھ ساتھ زمینداری بھی شروع کر دی۔ یوں پھوپی کو کچھ عرصے تو تنگی میں رہنا پڑا تھا لیکن پھر وہ بھی آسائشوں میں کھیلنے لگیں۔ پھوپی کے تین لڑکے تھے اور وہ ان پر باقاعدہ فخر کیا کرتی تھیں۔ ایسا کرتے شاید ان کے ذہن میں نہیں آتا تھا کہ وہ خود بھی تو عورت ہیں۔

ابا میاں دادا میاں کی اولادوں میں سب سے بڑے تھے۔ اپنے بہن بھائیوں کے برعکس انہیں بچپن سے پڑھنے کا شوق تھا۔ انہوں نے یونیورسٹی سے ماسٹر کیا تھا اور پھر ایک کالج میں لیکچرار ہو گئے تھے اس لیے ان کی شادی ذرا دیر سے ہوئی تھی۔ امی ان کی دور پرے کی کزن تھیں اور دادا میاں ان کو مراد آباد (انڈیا) سے بیاہ کر لائے تھے۔ پھوپی زیب النساء ابا میاں سے ایک سال چھوٹی تھیں اور ان کے بعد تینوں چچا تھے۔ میرے دو اور چچاؤں کے لیے انہیں انڈیا سے آئی تھیں کیونکہ یہاں برادری میں ان کے لیے مناسب رشتہ موجود نہیں تھا۔ البتہ سب سے چھوٹے حسن چچا کے لیے پھوپا میاں کی بہن کو چنا گیا تھا۔ ابا میاں شادی کے بعد مزید تعلیم کے لیے کراچی چلے آئے اور یہاں انہوں نے یونیورسٹی سے ایم فل کیا تھا۔ پھر ان کو وہیں ملازمت کی پیشکش ہوئی تو انہوں نے قبول کر لی اور یونیورسٹی میں رہائش ملی تو وہ امی کو بھی یہیں لے آئے۔ اس وقت میری سب سے بڑی بہن نورین آپا ساتھ تھیں۔ ہم چار بہنیں یہیں پیدا ہوئیں، نورین آپا کے بعد نسرین آپا، پھر مہرین باجی، ان کے بعد عنبرین اور سب سے آخر میں، میں یعنی ماہ نور پیدا ہوئی۔ جب نورین آپا ہوئیں تب امی کو سسرال میں بہت باتیں سننے کو ملی تھیں۔ سب کی خواہش تھی کہ لڑکا ہو۔ مگر لڑکا یا لڑکی انسان کے اپنے اختیار میں تو نہیں ہوتا۔ میرے دوسرے چچاؤں کے گھر بھی زیادہ لڑکے ہی تھے۔ ابا میاں کے بعد محسن چچا کے تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ پھر رحیم چچا کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ حسن چچا کے گھر بھی دو لڑکے تھے۔ پھوپی کے ہاں بھی صرف لڑکے تھے۔

ایسے میں امی کی لگاتار پانچ بیٹیاں ہوئیں تو سوچا جا سکتا ہے ان کے ساتھ سسرال والوں کا رویہ کیا ہوگا؟ یہی وجہ تھی امی حیدرآباد جانے سے کتراتی تھیں اور گرمی کی چھٹیوں میں وہ مشکل سے ایک آدھ ہفتے کے لیے جاتی تھیں۔ اس ایک آدھ ہفتے میں بھی ان کو اتنا سننے کو مل جاتا کہ واپس آ کر کئی دن تک روتی تھیں۔ جب نورین آپا ذرا سمجھدار ہوئیں تو امی نے ابا میاں سے صاف کہہ دیا۔ "اب میں آپ کے گھر نہیں جاؤں گی، مجھے جو کہا جاتا ہے وہ مجھے برداشت ہے لیکن میری بچیوں کو کسی نے ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔"

"تم فکر کیوں کرتی ہو؟" ابا میاں نے انہیں تسلی دی۔ "میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔"

ہماری خوش قسمتی کہ ابا میاں بہت کھلے ذہن کے آدمی تھے اور انہوں نے ہم بیٹیوں سے بے پناہ محبت کی تھی۔ ابا میاں کی محبت نے ہمارے اندر وہ اعتماد پیدا کیا تھا کہ جب خاندان والے ہمارے بارے میں کوئی بات کرتے تھے تو ہم ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا کرتے تھے۔

جس سال میں پیدا ہوئی تھی اسی سال دادا میاں کا انتقال ہوا تھا۔ دادی جان اور حویلی کی دوسری خواتین نے مجھے منحوس قرار دے دیا۔ حتیٰ کہ یہ کیا کہ امی کے سامنے یہ بات کہہ بھی دی۔ امی پہلے ہی بھری ہوئی تھیں۔

"کیوں صرف میری بیٹی پیدا ہوئی ہے؟ حسن اور زیب النساء کے گھر بھی تو بچے ہوئے ہیں؟"

"وہ تو لڑکے ہیں۔" دادی نے جواب دیا۔

"اچھا تو گویا نحوست صرف عورت کی ذات سے منسوب ہے؟" امی نے تلخی سے کہا۔ "ہمارا مذہب اس بارے میں کیا کہتا ہے ہمارے پیارے نبی ﷺ اس بارے میں کیا کہتے ہیں وہ چلیے مذہب کو چھوڑیں آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ سب بھی تو عورتیں ہیں؟"

امی کی کھری کھری باتیں سن کر ان سب کے چہرے بگڑ گئے تھے اور حیدرآباد سے واپسی پر امی نے ابا میاں سے صاف کہہ دیا۔ "اب میں حویلی نہیں جاؤں گی۔ آپ کے ماں باپ کا گھر ہے آپ جا کر مل آئیے گا اور میری بچیاں بھی وہاں نہیں جائیں گی۔"

"مگر وہ ان کے دادا کا گھر ہے۔"

"اچھا گھر ہے جہاں انہیں منحوس قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے اچھا ہے یہ اپنے گھر میں خوش رہیں۔"

یوں میں نے ہوش سنبھالنے تک حویلی نہیں دیکھی تھی

کہ مجھے پہلی بار وہاں جانے کا اتفاق اس وقت ہوا جب دادی ان کا انتقال ہوا تھا۔ اس وقت میں دس سال کی تھی۔ یہ موقع ایسا تھا کہ امی یا ہم بہنیں جانے سے نہیں روک سکتے تھے۔ میں پہلی بار حویلی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اگرچہ یونیورسٹی میں ابا میاں کو جو گھر ملا تھا وہ بھی چھوٹا نہیں تھا لیکن یہ حویلی تو اس کے مقابلے میں بہت بڑی تھی۔ اس کے درمیانی صحن میں ہمارے جیسے چار گھر سما سکتے تھے۔ حویلی کے پانچ حصے تھے۔ ایک ایک حصہ چاروں بیٹوں کا اور ایک دادا میاں کے لیے مخصوص تھا۔ پھوپی آتیں تو اسی حصے میں ٹھہرتی تھیں۔ باورچی خانہ بھی ایک ہی تھا اور کھانا سب کا مشترک تھا۔ ابا میاں کیونکہ پڑھ لکھ کر نوکری کرنے لگے تھے اس لیے بیٹوں کی دیکھ بھال باقی تینوں بھائی کیا کرتے تھے۔ دادا میاں نگرانی کرتے تھے۔ دادا میاں کی زندگی تک تو ابا میاں کو آمدنی میں سے باقاعدہ حصہ ملتا رہا۔ یعنی دادا میاں جتنا دوسروں کو دیتے تھے اتنا ہی وہ ابا میاں کو بھی دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی حویلی سے دور ہوتے ہوئے بھی ہمیں آسائشوں کی کمی نہیں تھی اور اس وقت بھی ابا میاں کے پاس کار تھی جبکہ یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان موٹر سائیکلوں پر دفتر آتے جاتے تھے۔

ابا میاں ہماری ہر خواہش مکمل کر پوری کرتے تھے اور گھر میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ بہترین فرنیچر اور آسائش کا سارا سامان تھا۔ ہمارے گھر کے چاروں کمروں میں اے سی لگا تھا۔ اس کے باوجود ہم بہنوں کو اندازہ نہیں تھا کہ ہمارا تعلق اتنے دولت مند خاندان سے ہے۔ دادا میاں کی ملکیت میں کوئی چھ سو ایکڑ نہری زمین تھی جس پر انہوں نے فصلوں کے ساتھ باغات بھی لگا رکھے تھے۔ اس زمین پر دنیا جہاں کی چیزیں پیدا ہوتی تھیں۔ جب ابا میاں جاتے یا حیدرآباد سے کوئی آتا تو ہمارے ہاں ڈھیروں پھل، سبزیاں اور دوسری چیزیں آتی تھیں۔ پھر دادا میاں کا انتقال ہوا تو ان کی زمین چاروں بیٹوں میں بٹ گئی۔ پھوپی کو وہ اپنی زندگی میں حصہ دے چکے تھے۔

ابا میاں خود کاشت نہیں کر سکتے تھے انہوں نے نہ تو کبھی زمین پر کام کیا تھا اور نہ انہیں دلچسپی تھی۔ انہوں نے یہ کیا کہ زمینیں بھائیوں کو دے دیں کہ وہ اس پر کاشت کریں اور جو ان کا حصہ بنتا ہے وہ انہیں دے دیا کریں۔ لیکن سال بھر بعد انہوں نے بھائیوں سے حصے کی بات کی تو تینوں بھائیوں نے کہا کہ اس سال اتنی آمدنی نہیں ہوئی ہے کہ انہیں

ولی و والی

لاہور کے تاریخی مقامات میں شالامار باغ کا نام سرِفہرست ہے۔ ایک مرتبہ پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل ملک غلام محمد نے کسی غیر ملکی بادشاہ کو شالامار باغ میں دعوت دی۔ گورنر جنرل کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ دعوت کے موقع پر اپنی سواری سے باغ کے دروازے پر اتریں اور وہاں سے پیدل چلتا ہوا باغ میں داخل ہو لہٰذا انہوں نے سرکاری حکومت کو حکم جاری کیا کہ سڑک کی جانب سے باغ کی دیوار کا کچھ حصہ توڑ دیا جائے تاکہ ان کی موٹر اندر جا سکے اور سیدھی وہاں جا کر رکے جہاں ان کی اور مہمان بادشاہ کی نشست کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں ولی اللہ خان ایک بہادر آثار قدیمہ کے محکمے کا مہتمم تھا۔ اس نے گورنر جنرل کے دبدبے اور رعب کی کوئی پروا نہ کی اور کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کو حکمران اور بھی بہت مل سکتے ہیں۔ میرے جیسے ملازم بھی بہت مل جائیں گے لیکن یہ تاریخی دیوار بنانے کے لیے کوئی شاہ جہاں دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ دیوار ہمیں ہمارے ماضی سے امانت میں ملی ہے۔ اس لیے اسے ہمارے ہاتھوں نہیں گرنا چاہیے۔ شالامار باغ کے ساتھ جو کچھ ہونا تھا وہ پہلے ہی ہو چکا ہے مزید کی گنجائش نہیں۔ پاکستان کے بارعب والی کا حکم ولی اللہ نے نہیں مانا۔ اس طرح شالامار کی دیوار شگاف پڑنے سے بچ گئی۔

عبدالقادر حسن فرخ —

کوئی حصہ دیا جا سکے۔ ہاں انہوں نے اگلے سال دینے کا وعدہ کر لیا۔ بے چارے ابا میاں ان کے وعدے پر خاموش ہو گئے۔ لیکن امی نے ان سے پوچھا۔

"ابا جان کی آنکھیں بند ہوتے ہی زمین کی آمدنی میں اچانک اتنی کمی کیسے آ گئی؟"

اس پر حسن چچا نے ناگواری سے کہا۔ "بھابی جان آپ کو ان معاملات کا نہیں معلوم۔"

ابا میاں نے بھی امی کو چپ کرا دیا۔ لیکن جب اگلے سال یہی حرکت دوبارہ ہوئی تو امی کے سمجھانے پر انہوں نے ابا میاں سے بات کی اور ان کو راضی کر لیا کہ زمین بھائیوں سے لے کر کسی کو ٹھیکے پر دے دیں۔ وہ حویلی پہنچے اور انہوں نے بھائیوں سے کہہ دیا۔ "بس بہت ہو گیا اب میں زمین کسی اور کو ٹھیکے پر دوں گا۔"

یہ سن کر میرے چچاؤں کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ وہ تو اس زمین سے کما رہے تھے اس سے اتنی آسانی سے کیسے دستبردار ہو جاتے۔ اس بار انہوں نے خوشامد اور چاپلوسی کا ہتھیار استعمال کیا اور ابا میاں کو راضی کر لیا کہ وہ اب ان کو برابر کا حصہ دیں گے۔ ابا میاں پھر مان گئے تھے۔ امی کو مایوسی

ہوئی انہوں نے ابا میاں سے کہا۔ ”آپ میری بات لکھ کر رکھ لیں یہ پھر بڑی جلدی دکھا دیں گے۔“

”بہر الغرض یہ میرے بھائی ہیں۔“ ابا میاں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”مجھے ان کی بات رکھنا پڑی لیکن فکر نہ کرو یہ آخری موقع ہے۔“

میرے چچاؤں نے بھی محسوس کر لیا کہ یہ آخری موقع ہے اس لیے انہوں نے عقل مندی سے کام لیا تیسرے سال ابا میاں کو برابر کا حصہ دیا۔ اگرچہ اس سے اس نقصان کی تلافی نہیں ہوئی جو دو سال سے ہو رہا تھا اور وہ آج سے کئی سال پہلے لاکھوں میں تھا۔ پھر ابا میاں نے خود بھی زمینوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی اور جب موقع ملتا وہ زمینوں کی طرف چلے جاتے۔ اس طرح ان کو پتا چلتا رہتا کہ ان کے بھائی زمینوں پر کیا کر رہے ہیں اور حساب کتاب کیا ہے۔ اس کے بعد چچاؤں کو مجبوراً ابا میاں کو پورا نہ سہی لیکن حصہ دینا پڑتا تھا۔

میں نے آپ کو بتایا کہ ہمارے خاندان میں صرف برادری میں شادی کا رواج تھا۔ لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح جس کھونٹے سے چاہتے باندھ دیا کرتے تھے۔ اسی لیے خاندان میں لڑکیوں کو تعلیم دلانے کا رواج نہیں تھا بلکہ لڑکیاں تو چھوڑیں لڑکوں کی تعلیم پر بھی زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا۔ پھوپی کے بیٹے میٹرک پاس تھے صرف بڑے بیٹے شاہ نواز نے انٹر کیا تھا اور وہ بھی بہت رو پیٹ کر۔ حالانکہ پھوپا خود اسکول ماسٹر رہے تھے لیکن انہوں نے بھی لڑکوں کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اسی طرح چچاؤں کے لڑکوں میں سے بھی کم نے کالج کا منہ دیکھا تھا اور لڑکیوں کو تو مڈل سے آگے پڑھنے کی اجازت ہی نہیں ملی تھی۔

ایسے میں ابا میاں اور امی نے فیصلہ کیا کہ وہ ہم بہنوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ اس کے لیے انہوں نے شروع سے ہماری تعلیم پر بہت توجہ دی۔ امی خود میٹرک پاس تھیں لیکن انہوں نے اپنی کوشش سے قابلیت میں اضافہ کیا اور جب ہم چھوٹے تھے تو ہمیں امی ہی پڑھایا کرتی تھیں۔ گھر میں ماحول بھی کتابوں والا تھا اس لیے تعلیم کی طرف رجحان فطری بات تھی۔ نورین آپی ہر کلاس میں فرسٹ آتیں۔ نسرین آپی بھی اچھے نمبر لیتی تھیں۔ پھر مہرین اور نسرین اچھی اسکول میں آ گئیں تو وہ بھی کسی طرح پیچھے نہیں رہی تھیں۔ میں سب سے چھوٹی تھی اس لیے مجھ پر زیادہ توجہ دی گئی اور میں اسکول میں آئی تو پہلی ہی کلاس میں میں نے اسکول میں ریکارڈ نمبر لیے تھے۔

ابا میاں نے ہم پانچوں بہنوں کو کراچی کے ایک بہترین اسکول میں داخل کرایا تھا اور صبح خود دفتر جانے سے پہلے ہمیں اسکول چھوڑ کر آتے تھے۔ انہوں نے امی کو ڈرائیونگ سکھا دی تھی۔ چھٹی کے وقت وہ ہمیں لینے آتی تھیں۔ پھر ہم ذرا بڑے اور سمجھ دار ہوئے تو ابا میاں نے وین لگوا دی جو ہمیں لے جاتی اور لاتی تھی۔ ہم بہنوں میں صرف آٹھ سال کا فرق تھا اس لیے ایک وقت آیا کہ ہم پانچوں ساتھ ہی اسکول آتی جاتی تھیں۔ پھر نورین آپی اولیول کر کے کالج چلی گئیں۔ کالج میں بھی انہوں نے اپنی ساکھ برقرار رکھی اور گریجویشن فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ان کا کالج میں نمبر ایک تھا۔ اس وقت وہ صرف اٹھارہ برس کی تھیں۔ ان کو یونیورسٹی سے ماسٹر کا شوق تھا اور ابا میاں کی بھی یہی خواہش تھی اس لیے وہ ماسٹر کرنے لگیں۔ اس وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ پھوپی نے انہیں شاہ نواز بھائی کے لیے مانگ رکھا ہے۔ ابا میاں نے یہ بات امی کو بھی نہیں بتائی تھی۔

امی کو اس وقت پتا چلا جب نورین آپی کے ماسٹر میں داخلہ لینے پر پھوپی کا فون آ گیا۔ اتفاق سے فون امی نے ریسیو کیا اور پھوپی ان پر برس پڑی تھیں۔

”یہ میں کیا سن رہی ہوں تم نے نورین کو یونیورسٹی میں داخل کرا دیا ہے؟“

”ہاں تو اس میں کیا برائی ہے۔“

”مجھے اتنی پڑھی لکھی بہو نہیں چاہیے، اس نے گھر چلانا ہے کوئی دفتر نہیں جانا۔“

امی ششدر رہ گئی تھیں۔ ”بہو......؟“

”ہاں نورین کو میں نے اپنے شاہ نواز کے لیے مانگ رکھا ہے۔“

”لیکن مجھے تو اس بارے میں کچھ علم نہیں۔“ امی کو غصہ آ گیا۔ ”میری بیٹی ہے اور مجھے اس کی منگنی کے بارے میں پتا نہیں۔“

”تو اب معلوم ہو گیا نا، نورین کو فوراً یونیورسٹی سے اٹھا لو۔“

”یونیورسٹی سے تو نہیں اٹھا سکتی لیکن اس منگنی کے بارے میں ضرور سوچ سکتی ہوں۔“ امی نے کہا اور فون بند کر دیا۔ شام کو ابا میاں آئے تو امی نے آتے ہی یہ معاملہ ان کے سامنے اٹھایا۔ ”آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا اور مجھے بتایا تک نہیں؟“

”میں نے فیصلہ نہیں کیا۔“ ابا میاں بولے۔

”تب آپ کی بہن نے اپنے طور پر نورین کو بہو سمجھ لیا

ہے۔ میری بیٹی کے لیے کیا وہی دیہاتی رہ گیا ہے جسے بولنے تک کی تمیز نہیں۔“

ابا میاں کچھ دیر خاموش رہے پھر دھیمے لہجے میں بولے۔ ”بیگم تم جانتی ہو ہمارے ہاں برادری سے باہر رشتہ نہیں کیا جاتا ہے۔“

”میں جانتی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی بیٹی کو اندھے کنویں میں دھکا دے دیں۔ آخر کیا کمی ہے شکل صورت کی اچھی ہے، تہذیب اخلاق والی ہے، ماسٹر کر رہی ہے اس کے باوجود گھر کے سارے کام آتے ہیں۔“

”تم پریشان مت ہو میں آپا سے بات کر لوں گا۔“ ابا میاں نے شاید جھگڑا ختم کرنے کی نیت سے کہا۔ کیونکہ جب مہرین باجی نے نورین آپی کو اس بارے میں بتایا تو ان کا چہرہ اتر گیا تھا۔ انہوں نے کہا۔

”اگر ابا میاں نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تو اس کا مطلب ہے وہ رشتے کے لیے ہاں کر چکے ہیں۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ مہرین باجی نے بے یقینی سے کہا۔

”تم ابا میاں کو نہیں جانتیں۔“ نورین آپی رونے لگیں۔ ”میں مر جاؤں گی اگر ابا میاں نے میری وہاں شادی کی تو۔“

امی کو پتا چلا کہ نورین آپی رو رہی ہیں تو وہ تڑپ گئی تھیں۔ انہوں نے نورین آپی کو سینے سے لگا لیا۔ ”تم کیوں روتی ہو ابھی میں زندہ ہوں۔“

”امی ابا میاں فیصلہ کر چکے ہیں۔“ نورین آپی بولیں۔ ”آپ جانتی ہیں میں ان کے فیصلے سے انکار نہیں کر سکتی، چاہے اس کے بدلے مجھے ساری عمر آگ میں جلنا پڑے۔“

”میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“ امی نے ایک عزم سے کہا۔

امی پرعزم اور ابا میاں خاموش تھے لیکن ہوا وہ جس کا نورین آپی کو خدشہ تھا۔ نہ جانے ابا میاں نے کب پھوپی کو خاموش کرا دیا کہ وہ نورین آپی کو ماسٹر کرنے دیں اس کے بعد وہ ان کی بات پوری کریں گے۔ جس روز نورین آپی نے ماسٹر کا آخری پیپر دیا اسی رات ابا میاں نے ان سے بات کی۔ ”نورین تم جانتی ہو ہمارے ہاں برادری سے باہر شادی کا رواج نہیں اور میں تمہاری پھوپی کو زبان دے چکا ہوں۔“

نورین آپی نے بے بسی سے ابا میاں کو دیکھا۔ ”جب آپ زبان دے چکے تو مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔“

”میں تمہاری رضامندی کے ساتھ یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔“

امی تڑپ کر بولیں۔ ”یہ کیسی رضامندی ہے؟ ایک طرف آپ زبان دے چکے اور دوسری طرف اس کی رضامندی چاہ رہے ہیں، آپ بیٹی کو اپنی خواہش کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔“

”بیگم تم میری مجبوری سے اچھی طرح واقف ہو۔“

اس سے پہلے کہ امی اور ابا میاں کے درمیان جھگڑا بڑھتا نورین آپی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ابا میاں جو آپ کی مرضی وہی میری مرضی ہے۔“

ابا میاں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”خوش رہو میری بچی۔“

”خوش......“ امی نے تلخی سے کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔ اس سے پہلے امی اور ابا میاں کے درمیان بہت کم لڑائی ہوئی تھی۔ لیکن جب ابا میاں نے یہ فیصلہ کیا تو ان کے درمیان ایک خلیج سی آ گئی۔ وہ سوائے ضرورت کے ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ پھوپی ایک ہفتے بعد رسم کرنے آ گئی تھیں اور ایک سوگوار ماحول میں یہ رسم ہوئی۔ ہم سب بہنیں محسوس کر رہی تھیں کہ نورین آپی کے ساتھ بہت غلط ہو رہا ہے۔ شاہ نواز بھائی کسی صورت ان کے قابل نہیں تھے لیکن ابا میاں کے ایک فیصلے نے انہیں نورین آپی کا نصیب بنا دیا تھا۔ رسم کے دو مہینے بعد نورین آپی بیاہ کر میرپور خاص چلی گئیں۔ امی اور ہم بہنیں تڑپ کر روتی رہ گئی تھیں۔ شادی حیدرآباد والی حویلی سے ہوئی تھی۔ رسم کے مطابق نورین آپی کو شادی کے ایک ہفتے بعد ہمارے ہاں آنا تھا لیکن پھوپی نے یہ کیا کہ ابھی ہم حویلی میں تھے کہ وہ نورین آپی کو ملانے کے لیے لے آئیں اور کراچی بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اس بات سے امی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ آگے نورین آپی کے ساتھ پھوپی کا رویہ کیا ہوگا۔

اس شادی کے بعد امی اور ابا میاں کے درمیان تعلق بہت عرصے تک کشیدہ رہا۔ ہمارے گھر کا ماحول عجیب ہو گیا تھا۔ میں اس وقت اولیول میں تھی اور اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار ہو گئی تھی۔ میرے پیپرز ہونے والے تھے کہ غیر متوقع طور پر شاہ نواز بھائی اور نورین آپی کراچی آئے تھے۔ امی، ابا میاں اور ہم بہنیں خوش ہو گئے تھے۔ میں نورین آپی سے خاص طور سے اٹیچ تھی۔ کئی روز ان سے چپکی رہی۔ پھر ہمیں خوش خبری ملی کہ وہ ماں بننے والی تھیں اور سب سے اچھی بات یہ کہ شاہ نواز ان سے محبت کرتے تھے اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ پھوپی کا رویہ تھوڑا خراب تھا۔ نورین آپی نے ہمیں بتایا

کہ شاہ نواز ان کا بہت خیال رکھتے ہیں اور ان کے کہنے پر وہ گریجویشن کرنے پر تیار ہو گئے اور اسی مقصد کے لیے وہ کراچی آئے تھے۔ دو سال تک وہ کراچی میں رہے اور نورین آپی بھی ان کے ساتھ ہی یہاں رہیں۔ پھوپا کا گلشن اقبال میں ایک چھوٹا سا بنگلا تھا۔ جب وہ کراچی آتے تو وہیں ٹھہرتے۔

نورین آپی اور شاہ نواز بھائی کے آنے سے ہمارے گھر کا ماحول بھی خوشگوار ہو گیا تھا۔ شاہ نواز بھائی نے ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔ ابا میاں نے نورین آپی سے کہا کہ وہ بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر ایم اے کر لیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ ''ابا میاں میں چاہتی ہوں میرے اور شاہ نواز کے درمیان تعلیمی فاصلہ کم ہو، میں اسے بڑھانا نہیں چاہتی۔''

امی کو حیرت تھی کہ نورین آپی نے شاہ نواز بھائی کو کس طرح اس حد تک تبدیل کر دیا تھا کیونکہ ان کو تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اب وہ دل سے پڑھ رہے تھے۔ ان کے بولنے، چلنے پھرنے اور دوسرے طور طریقوں میں بھی بہت تبدیلی آگئی تھی۔ امی نے نورین آپی سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔ ''امی آپ نہیں جانتیں ان دو مہینوں میں میں نے کیا کیا سہا ہے لیکن مجھ میں اور ان میں فرق تعلیم کا ہے اگر میں اپنی بات نہیں منوا سکتی تو میرے پڑھے لکھے ہونے کا کیا فائدہ ہوتا۔ اب اللہ کا شکر ہے آپ دیکھ رہی ہیں شاہ نواز خود کو کس طرح بدل رہے ہیں۔''

نورین آپی کبھی یہیں رہتیں اور کبھی اپنی ساس کے پاس چلی جاتی تھیں۔ جب وہ سسرال جاتیں تو ابا میاں شاہ نواز بھائی کو کہہ دیا کرتے تھے تاکہ ان کو کھانے پینے کی تکلیف نہ ہو۔ سال بعد نورین آپی ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن گئیں اور سب نے سکون کا سانس لیا کیونکہ پھوپی کا مطالبہ یہی تھا۔ اگر لڑکی ہوتی تو ان کو یقیناً امی کی طرح بہت سننے کو ملتیں۔ ہم سب بہنیں یہ دیکھ رہے تھے اور اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند تھے۔ بے شک اب نورین آپی سکون سے تھیں اور ان کے شوہر بھی ان کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے لیکن یہ خوشیاں کسی باریک کچے ہوئے دھاگے کی طرح تھیں جس کے ہر وقت ٹوٹ جانے کا خدشہ ہو۔

نسرین آپی ان دنوں ماسٹر میں آگئی تھیں اور انہوں نے انٹرنیشنل ریلیشن کا انتخاب کیا تھا۔ وہ نورین آپی سے صرف ایک سال چھوٹی تھیں اس لیے خاندان میں ان کی عمر کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ محسن چچا کے بیٹے اکبر بھائی نسرین آپی سے چند مہینے چھوٹے تھے۔ امی مطمئن تھیں کہ نسرین آپی خاندان میں نہیں جائیں گی، مگر اس وقت یہ سکون غارت ہو گیا جب محسن چچا اور چچی نے نورین آپی کے بیٹے کی پیدائش کی مبارک باد دیتے ہوئے ابا میاں سے نسرین آپی کا رشتہ اکبر بھائی کے لیے مانگ لیا۔ وہ پڑھ رہے تھے اور گریجویشن کے آخری سال میں تھے۔ لیکن ان پر بھی حویلی کے ماحول کی چھاپ موجود تھی۔ امی نے سنتے ہی کہا۔

''محسن بھائی اکبر نسرین سے چھوٹا ہے۔''

''چند مہینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' محسن چچا بے پروائی سے بولے۔ ''ویسے بھی نسرین ہمیں پسند ہے۔''

انہیں نسرین پسند تھی لیکن کسی کو یہ خیال نہیں تھا کہ نسرین کسے پسند کرتی ہے۔ ان دنوں ہم حویلی میں تھے۔ رات کو سب بہنیں ایک ہی کمرے میں سوتی تھیں۔ رات کسی وقت میری آنکھ کھلی نورین اور نسرین آپی آپس میں بات کر رہی تھیں۔ نسرین آپی رو رہی تھیں۔ ''نورین میں یہاں شادی نہیں کروں گی۔''

''وہ تو میں بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔'' نورین آپی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''لیکن جب ابا میاں نے ہاں کہہ دی تو کرنا پڑی۔''

''لیکن میں ابا میاں کے کہنے پر ساری عمر اس جہنم میں جلنے کو تیار نہیں ہوں۔ تم نے اکبر کی حرکتیں دیکھی ہیں۔''

''نسرین وہ لڑکا جو میرے ساتھ پڑھ رہا تھا اس کے.....''

''وہ انگلینڈ چلا گیا ہے، ایک سال بعد واپس آئے گا۔'' نسرین آپی افسردگی سے بولیں۔

''لیکن اس کے گھر والے تو یہیں ہیں وہ رشتہ لے کر آسکتے ہیں۔''

''کیا فائدہ؟'' نسرین آپی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''تم جانتی ہو ہمارے ہاں برادری سے باہر رشتہ نہیں کیا جاتا۔''

نورین آپی کا بیٹا اٹھ گیا تھا وہ اسے دیکھنے میں لگ گئیں اور پھر ان میں بات نہیں ہوئی۔ میرے لیے یہ انکشاف تھا کہ نسرین آپی کسی کو پسند کرتی تھیں۔ لیکن بات بس اس رات تک رہی کیونکہ ایک مہینے بعد ابا میاں نے اکبر بھائی کے لیے ہاں کر دی تھی۔ ایک بار پھر ہمارے گھر میں سوگ کا سناٹا چھا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ نسرین آپی کس طرح مان گئیں کیونکہ اس رات حویلی میں وہ بغاوت پر آمادہ نظر آ رہی تھیں۔ میرا دل چاہا کہ ان سے اس موضوع پر بات کروں لیکن عمر اور رشتے کا فرق سامنے آیا۔ وہ مجھ سے خاصی بڑی تھیں اور نورین آپی کی طرح بے تکلف بھی نہیں تھیں۔ اس

لیے میں ان سے بات نہیں کر سکی تھی۔

ابا میاں نے امی کو بھی منا لیا تھا۔ لیکن ان کے درمیان پھر چپ آگئی تھی۔ بات طے ہونے کے چند مہینے بعد نسرین آپی کے فائنل کے پیپرز ہو گئے۔ اکبر بھائی نے بھی گریجویشن کر لیا تھا لیکن سب جانتے تھے انہیں پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور انہوں نے دو نمبر طریقوں سے امتحان پاس کیا تھا۔ جیسے ہی نسرین آپی کے پیپرز ختم ہوئے محسن چچا کی جانب سے رخصتی کی تاریخ کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ان کے روز فون آتے تھے۔ آخر ابا میاں نے تاریخ دے دی اور نسرین آپی بھی رخصت ہو کر حیدرآباد چلی گئیں۔ اس کے دو مہینے بعد شاہ نواز بھائی کے گریجویشن کے پیپرز ہو گئے اور وہ بھی نورین آپی اور بچے کو لے کر میرپور خاص چلے گئے اور ہمارے گھر میں اداسیاں مزید بڑھ گئیں۔ ان اداسیوں میں حیدرآباد سے آنے والی خبریں اضافہ کرتی تھیں۔ نسرین آپی وہاں مشکل میں تھیں۔ کیونکہ اکبر بھائی زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود شاہ نواز بھائی سے بالکل الگ تھے۔ انہوں نے اور چچی نے مل کر نسرین آپی کی زندگی حرام کر رکھی تھی ان کو ہر طرح سے ستاتے تھے۔ شادی کے کئی مہینے گزرنے کے بعد بھی انہوں نے نسرین آپی کو کراچی آنے نہیں دیا تھا۔ ابا میاں خود لینے گئے تو بڑی مشکل سے ایک ہفتے کی اجازت ملی اور اکبر بھائی خود نہیں آئے تھے۔ نسرین آپی کو چھوڑنے بھی ابا میاں ہی گئے تھے۔ نسرین آپی نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے اوپر گزرنے والی سنائی تو ہم دنگ رہ گئے تھے۔ اتنے بڑے خاندان میں بھی اس قسم کی جاہلیت پائی جاتی ہے۔ نسرین آپی کی تعلیم اور ان کی چار بہنیں ان کے لیے سب سے بڑا طعنہ تھیں۔ اکبر بھائی اس معاملے میں عورتوں سے بھی گئے گزرے تھے اور انہوں نے نسرین آپی سے کہہ دیا تھا کہ انہیں بیٹا چاہیے۔ نسرین آپی ابھی سے فکرمند تھیں کہ ان کے گھر بیٹا نہیں ہوا تو کیا ہوگا۔ امی ان کی حالت جان کر غصے میں آگئی تھیں اور محسن چچا سے بات کرنے جا رہی تھیں لیکن نسرین آپی نے انہیں روک دیا۔

''پلیز امی اگر آپ نے ان سے بات کی تو اس کا عتاب بھی مجھ پر آئے گا۔ بیوی کو اکیلے میں شوہر کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہاں کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔''

امی سمجھ گئیں اور انہوں نے محسن چچا سے بات نہیں کی لیکن وہ ابا میاں سے لڑی تھیں۔ ''آپ میری بیٹیوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں اس سے بہتر ہے کہ انہیں زہر دے کر ایک ہی بار مار دیں۔''

ابا میاں خاموش رہے۔ وہ گھر میں سب سے بڑے تھے لیکن ان کی فطرت اپنے بہن بھائیوں سے بالکل الگ تھی پھر دادا میاں نے انہیں بڑے بیٹے والی اہمیت نہیں دی حالانکہ وہ ان سے محبت بہت کرتے تھے لیکن اہمیت محسن چچا کی تھی بلکہ ان سے چھوٹے بیٹوں کی بھی زیادہ اہمیت تھی اس وجہ سے ابا میاں بڑے نہ بن سکے اور سب کے مقابلے میں دب گئے۔ وہ لوگ اب بھی اسی بات کا فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ مل کر ابا میاں پر زور ڈالتے تھے اور ان سے اپنی بات منوا لیا کرتے تھے۔ نسرین آپی کی حالت دیکھ کر مہرین اور عنبرین باجی نے امی سے کہہ دیا۔

''ہم اس خاندان میں شادی نہیں کریں گے۔''

''یہ بات اپنے باپ سے کہو۔'' امی نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے بہن بھائیوں کے سامنے ہاں کر دیتے ہیں اور ان کی ہاں کی قیمت تم لوگوں کو ادا کرنی پڑتی ہے۔''

مہرین اور عنبرین آئنز میں تھیں۔ نسرین آپی کی پیدائش کے دو سال بعد وہ اوپر تلے ہوئی تھیں جس طرح نسرین اور نورین آپی کا جوڑ تھا اسی طرح ان کا جوڑ تھا۔ میں عنبرین باجی کے دو سال بعد ہوئی تھی اور اکثر امی سے شکوہ کرتی تھی کہ میرا جوڑ کیوں نہیں بنایا۔ باجیاں مجھے منہ نہیں لگاتیں..... اس پر امی ہنس کر کہتیں کہ وہ میرا جوڑ ہیں۔ یہ بچپن کی بات تھی پھر بڑی ہوئی تو خود بخود عنبرین اور مہرین باجی کے ساتھ میری جگہ بن گئی۔ ویسے بھی گھر میں ہم تین تھے۔ میں دونوں کی بات سے سو فیصد متفق تھی میں نے کہا۔

''اگر ابا میاں نے اس طرح روایتی انداز میں ہماری مرضی جانے بغیر ہماری شادی کرنی تھی تو ہمیں تعلیم دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔''

مہرین آپی نے جھرجھری لی۔ ''نہیں یار! اگر یہ دور بھی نہ ملتا تو ہمارے پاس رہ ہی کیا جاتا۔ مجھے تو حویلی کی لڑکیوں پر ترس آتا ہے، بے چاری گائے بکری کی سی زندگی گزار رہی ہیں۔''

مہرین اور عنبرین آپی اس وجہ سے زیادہ خوف زدہ تھیں کہ ان کے جوڑ کے کئی لڑکے خاندان میں موجود تھے اور ہر گھر میں تھے۔ رحیم چچا کے چار بیٹے تھے۔ سب سے بڑے احمر بھائی تھے۔ وہ اکبر بھائی سے دو مہینے چھوٹے تھے کیونکہ محسن چچا اور رحیم چچا کی شادی ایک ساتھ ہوئی تھی۔ احمر بھائی ایف ایس سی کے بعد فیصل آباد یونیورسٹی چلے گئے تھے۔ حویلی میں وہ واحد لڑکے تھے جن کو پڑھنے کا شوق تھا اور انہوں نے ہر کلاس میں اچھی پوزیشن حاصل کی تھی۔ انہوں نے ایف

ایس سی میں اتنے اچھے نمبر لیے کہ انہیں ٹیکسلا انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ انہوں نے پیٹرولیم کے شعبے کا انتخاب کیا تھا۔ اکبر بھائی سے چھوٹے ہونے کے باوجود وہ پڑھنے میں ان سے کہیں آگے تھے۔ جس وقت اکبر بھائی نے رو پیٹ کر بی اے کیا تو وہ انجینئرنگ کر کے آچکے تھے۔ پہلے ان کو اٹک ریفائنری میں جاب ملی اور پھر کراچی کی ایک ریفائنری میں جاب ملی۔ یہ نسرین آپی کی شادی کے چند مہینے بعد کی بات تھی۔

ابا میاں کو پتا چلا کہ احمر بھائی اب کراچی میں رہیں گے تو انہوں نے ان پر زور دیا کہ وہ ان کے گھر آجائیں لیکن انہوں نے کزن ہونے کے باوجود پسند نہیں کیا کہ ہمارے ہاں رہیں۔ اس وقت ہم بہنیں سمجھیں کہ ان کا مخصوص حویلی والا انداز ہے۔ انہوں نے ڈیفنس میں کسی بنگلے میں پورشن لے لیا تھا۔ اس بنگلے میں ان کی طرح دوسرے شہروں سے آئے لوگ مقیم تھے جو اچھے عہدوں پر جاب کر رہے تھے۔ وہ مل جل کر کرایہ اور دوسرے اخراجات شیئر کر لیتے تھے۔ لیکن احمر بھائی چھٹی والے دن ضرور چکر لگاتے تھے۔ وہ ابا میاں کے ساتھ گپ شپ کرتے لیکن ہم ان سے دور دور رہتے تھے۔ مہرین باجی انہیں پسند نہیں کرتی تھیں کیونکہ انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ احمر بھائی انہیں پسند کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مہرین باجی نے کبھی میرے سامنے اس موضوع پر بات نہیں کی تھی لیکن ایک رات جب احمر بھائی ہمارے ہاں رک گئے تھے اور وہ میرے والے کمرے میں رکے تھے جب کہ میں ان کے کمرے میں آگئی تھی۔ رات کو وہ دونوں چپکے سے باتیں کر رہی تھیں کہ میری آنکھ کھل گئی۔ مہرین باجی کہہ رہی تھیں۔

''میں اچھی طرح سمجھتی ہوں یہ یہاں کے چکر کیوں لگا رہا ہے؟''

''ویسے احمر بھائی کی پرسنالٹی اچھی ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں۔'' مہرین باجی نے کہا۔

''بے شک ہوں۔'' مہرین باجی کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ''مجھے کسی صورت اس حویلی میں نہیں جانا۔''

کچھ دن بعد رحیم چچا کا فون آگیا۔ انہوں نے ابا میاں سے احمر بھائی کے لیے مہرین آپی کا رشتہ مانگا تھا۔ لیکن اس بار ابا میاں کا رویہ بھی کھنچا ہوا تھا وہ نسرین آپی کے ساتھ ہونے والے سلوک سے دلبرداشتہ تھے۔ انہوں نے رحیم چچا سے کہہ دیا۔ ''تم لوگوں کو میری بیٹیاں ہی نظر آتی ہیں ستم ڈھانے کے لیے۔''

''بھائی میاں اگر کسی نے آپ کی بیٹی کے ساتھ بد سلوک کیا ہے تو اس کے ذمے دار ہم تو نہیں ہیں۔ احمر آپ کے سامنے ہے اور مجھے یقین ہے مہرین اس کے ساتھ خوش رہے گی۔''

ابا میاں نے سوچ کر جواب دینے کو کہا۔ انہوں نے امی سے ذکر کیا تو وہ مجھ سے اکھڑ گئیں۔ ''اب آپ نے میری بچیوں کے لیے حویلی کی بات کی تو میرا مرا ہوا منہ دیکھیں گے۔''

''میرا خود کا ارادہ نہیں ہے۔'' ابا میاں نے کہا۔

نسرین آپی کو پتا چلا کہ ابا میاں احمر بھائی کے لیے انکار کر رہے ہیں تو انہوں نے فون کیا۔ ''امی آپ پھر غلطی کر رہی ہیں احمر بہت اچھا لڑکا ہے اور رحیم چچا اور چچی بھی اچھے ہیں۔ مہرین خوش رہے گی۔''

''نہیں میری بچی اب حویلی سے کسی فرشتے کا رشتہ آئے تب بھی میرا جواب انکار میں ہوگا۔''

''امی پھر بھی آپ مہرین سے تو پوچھ لیں ہوسکتا ہے احمر اسے اچھا لگتا ہو۔ آپ اس سے پوچھے بغیر انکار نہ کریں۔''

نسرین آپی کا خیال تھا کہ احمر بھائی ہمارے ہاں آتے تھے تو ممکن ہے مہرین باجی نے انہیں پسند کرلیا ہو۔ لیکن ان کو پتا نہیں تھا مہرین باجی کے خیالات امی سے بھی زیادہ سخت تھے۔ امی نے ان سے پوچھا تو وہ بولیں۔

''امی آپ اور ابا میاں سوائے حویلی کے جہاں چاہیں میری شادی کر دیں۔ میں اف نہیں کروں گی لیکن حویلی نہیں جاؤں گی۔''

یوں ابا میاں نے رحیم چچا کو انکار کر دیا اور رحیم چچا نے محسن چچا کی بیٹی نرگس کا رشتہ احمر بھائی کے لیے لے لیا جو صرف پانچویں تک پڑھی ہوئی تھی۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے مجھے ان معاملات میں شامل نہیں کیا گیا تھا لیکن جب مجھے پتا چلا تو مجھے بھی محسوس ہوا کہ امی، ابا میاں اور مہرین باجی نے ٹھیک نہیں کیا۔ احمر بھائی حویلی سے تعلق ضرور رکھتے تھے لیکن وہ دوسروں سے بہت مختلف تھے۔ شائستہ، پڑھے لکھے اور حساس انسان تھے۔ نرگس سے شادی ان کے ساتھ زیادتی تھی لیکن اس خاندان میں رواج ہے کہ بڑے ایک بار جو فیصلہ کریں چھوٹے اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ احمر بھائی کی شادی نرگس سے ہوگئی اور اس شادی کے موقع پر پھوپی نے اپنے دوسرے بیٹے حق نواز کے لیے مہرین باجی کو مانگ لیا۔ حق نواز صرف میٹرک پاس تھا اور

مہرین باجی آنرز کے آخری سال میں تھیں اس کے بعد ان کا ارادہ ماسٹرز مکمل کرنے کا تھا۔ پھوپی نے یہ کیا کہ نورین آپی کو سامنے کیا کہ وہ اپنے دیور کے لیے اپنی بہن کا رشتہ لائیں۔ وہ مجبوراً آگے آئیں اور امی اور ابا میاں بھی ان کی وجہ سے مجبور ہوئے پھر خاندان میں ایک بار انکار کر چکے تھے اور بار بار آئے رشتوں سے انکار کرنا بھی اچھا سمجھا نہیں جاتا تھا اس لیے حق نواز بھائی کا رشتہ قبول کرلیا گیا۔

مہرین باجی کو پتا چلا تو وہ تڑپ کر رہ گئیں لیکن کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ احمر بھائی کے رشتے سے انکار کرتے ہوئے انہوں نے خود یہ اختیار امی اور ابا میاں کو دے دیا تھا کہ وہ جہاں چاہیں ان کی شادی کر دیں۔ اب امی اور ابا میاں نے اپنا یہ اختیار استعمال کرلیا تھا۔ پہلی بار میں نے مہرین باجی کو احمر بھائی کے رشتے سے انکار پر پچھتاتے دیکھا۔ شاہ نواز بھائی تو بہت بدل گئے تھے۔ انہوں نے بعد میں پرائیویٹ پڑھ کر ماسٹرز بھی کیا تھا لیکن حق نواز بھائی نے میٹرک کر کے بھی ضائع کیا تھا وہ بالکل دیہاتی سوچ رکھنے والے آدمی تھے۔ رشتہ طے ہوتے ہی ان کی طرف سے مطالبہ سامنے آیا کہ مہرین باجی اب یونیورسٹی نہیں جائیں گی کیونکہ وہ ان کی منگ ہے اور ان کو برداشت نہیں ہے کہ ان کی منگ غیر لڑکوں کے ساتھ ایک کلاس میں بیٹھ کر پڑھے۔ بڑی مشکل سے مہرین باجی کو آنرز کے پیپرز دینے کی اجازت ملی تھی اور ماسٹرز کی اجازت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جیسے ہی مہرین باجی کے پیپرز ہوئے پھوپی شادی کی تاریخ لینے آگئی تھیں۔ شادی دو مہینے بعد طے پائی تھی اور جس دن تاریخ طے ہوئی مہرین باجی ساری رات روتی رہی تھیں اور ہم بہنیں ان کے آنسو خشک کرتی رہیں۔

مہرین باجی کی شادی نے مجھے صحیح معنوں میں سہما دیا تھا۔ اس وقت میں ایف ایس سی کے دوسرے سال میں تھی۔ میں نے میڈیکل گروپ لیا تھا اور میرا ارادہ ایم بی بی ایس کرنے کا تھا۔ مہرین باجی کی شادی کے بعد میں پیپرز دینے میں لگ گئی۔ پچھلے سال میرے بیاسی فیصد نمبرز آئے تھے اور اس سال مجھے امید تھی کہ میں مزید بہتر نمبر لاؤں گی۔ لیکن میرے پیپرز کے بعد جب ہم پہلی بار پھوپی کے گھر گئے اور وہاں میں نے مہرین باجی کو دیکھا تو سہم گئی تھی انہیں دیکھ کر مجھے پہلا خیال یہی آیا تھا کہ کیا فائدہ اچھی تعلیم حاصل کرنے کا..... کہ ہم بہنوں کو ایسے ماحول میں رہنا تھا۔ شاہ نواز بھائی کو سرکاری ملازمت مل گئی تھی اور وہ افسر بن کر شہر چلے گئے تھے۔ اب مہرین باجی یہاں بالکل اکیلی تھیں۔ ہماری پھوپی

نے اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا اس لیے ان کی سوچ کا اندازہ کیا جا سکتا تھا افسوس تو حق نواز بھائی پر تھا جنہوں نے میٹرک تو کیا تھا انہیں کے باوجود بیوی ان کے نزدیک پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

ان ہی دنوں نسرین آپی پہلی بار ماں بنیں اور ان کے ہاں بچی ہوئی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس پر حویلی میں کیا طوفان آیا ہوگا اور یہ سارا طوفان نسرین آپی نے سہا تھا۔ سسرال والوں نے جو باتیں سنائیں وہ تو سنائیں لیکن اکبر بھائی نے انہیں مارا اور دھمکی دی کہ اگر اب لڑکا نہیں ہوا تو وہ دوسری شادی کرلیں گے۔ میر پور خاص سے ہم حیدر آباد آ گئے تھے اور یہاں نسرین آپی کے ساتھ ہونے والا سلوک اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہاں سے واپس آتے ہوئے میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ جب ہم کراچی آئے تو میں نے گھر میں آتے ہی امی سے کہہ دیا۔

"اب میں آگے نہیں پڑھوں گی؟"

"کیوں؟" امی نے حیرت سے کہا۔ "کیوں نہیں پڑھو گی؟"

"کیا فائدہ پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کا۔۔۔ کہ ہمیں رہنا تو ایسے ماحول میں ہے جہاں تعلیم کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اس سے بہتر ہے آپ ہمیں وہ گر سکھائیں جو ایسے ماحول میں رہنے اور خوش رہنے کے لیے ضروری ہیں۔ میں اپنی بہنوں کی طرح گھٹ گھٹ کر نہیں رہ سکتی۔"

امی سمجھ گئی تھیں وہ مجھے سینے سے لگا کر رو دی تھیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ میں جذباتی ہو کر کہہ رہی ہوں۔ لیکن جب رزلٹ آیا اور میں نے اسے ون گریڈ کے ساتھ نوے فیصد نمبرز لیے تو ابا میاں نے مجھ سے میڈیکل کالج کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں بھی وہی جواب دیا۔ "ابا میاں میں نے آگے نہیں پڑھنا۔"

"لیکن کیوں بیٹا؟" وہ نرمی سے بولے۔

میں ابا میاں سے تو بات نہیں کرسکتی تھی مجھے شرم آتی' میں نے دبی زبان میں کہا۔ "امی نے آپ کو بتایا ہوگا۔"

ابا میاں سمجھ گئے۔ "بیٹا یہ تو جذباتی سوچ ہے تعلیم حاصل کرنا تو ہر حال میں اچھی بات ہے۔"

"نہیں ابا میاں انسان کو جس ماحول میں رہنا ہو اسی کے مطابق تیاری کرنی چاہیے۔"

ابا میاں نے گہری سانس لی۔ "آپ ان باتوں کو چھوڑیں آپ میڈیکل کالج میں داخلے کی تیاری کریں۔"

لیکن میں فیصلہ کر چکی تھی میں نے کہا۔ "ابا میاں، میں نے سوچ لیا ہے اب میں نہیں پڑھوں گی۔"

ابا میاں کو پہلی بار مجھ پر غصہ آیا تھا ورنہ عام طور سے وہ مجھ سے پیار اور محبت سے پیش آتے تھے۔ "ماہ نور تم نافرمانی کررہی ہو؟"

میں ڈر گئی تھی لیکن اس وقت نہ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ میں نے کہہ دیا۔ "نہیں ابا میاں لیکن صرف ایک بار اس کے بعد آپ جو کہیں گے میں وہ مانوں گی۔"

یہ کہہ کر میں کمرے سے نکل آئی۔ کچھ دیر بعد امی میرے پاس آئیں اور وہ مجھے سمجھانے لگیں۔ لیکن میری ہاں ہاں میں نہ بدلی۔ میں خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کے بعد امی اور بہنوں نے مجھے راضی کرنے کی پوری کوشش کی اور میں صرف خاموشی سے سنتی رہی۔ جواب میں کچھ نہیں کہا۔ عنبرین باجی حیران تھیں انہوں نے مجھ سے کہا۔

"یہ قدم تو مجھے اٹھانا چاہیے تھا، کیونکہ باری تو میری ہے۔"

"آپ کو یہ قدم دو سال پہلے اٹھا لینا چاہیے تھا اب تو دیر ہوگئی ہے، آپ آرٹس کے فائنل میں ہیں۔ لیکن میں نے بالکل درست وقت پر قدم اٹھایا ہے۔ میں انٹر ہوں گی تو مجھے آگے مشکل پیش نہیں آئے گی۔"

"لیکن تمہارے پاس کچھ تو ہے۔ اتنی سمجھ تو آج کل میٹرک کرنے والی لڑکیوں کے پاس بھی نہیں ہوتی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میں اذیت سے تو محفوظ رہوں گی، یہ سوچ سوچ کر کڑھوں گی نہیں کہ میری قابلیت اور ذہنی معیار کیا ہے اور میری شادی کہاں کردی گئی ہے؟ میری جیسی قابلیت والے کئی لڑکے خاندان میں ہیں ابا میاں آرام سے جس سے چاہیں میری شادی کر سکتے ہیں۔"

"ماہ نور مان جاؤ۔" باجی نے کہا۔ "امی اور ابا میاں بہت پریشان ہیں۔"

"اچھا ہے وہ بھی تھوڑا پریشان ہو جائیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنی بہنوں کی طرح ان کے لیے مستقل پریشانی کا باعث بنوں۔"

عنبرین باجی نے گہری سانس لی۔ "گویا تم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ آگے نہیں پڑھو گی۔"

"ہاں جب برادری اور خاندان میں ہی شادی کرنا ہے اور ابا میاں کی مرضی سے کرنی ہے تو پڑھ لکھ کر اتنا باشعور ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ اچھا تھا ہم سب بہنیں میٹرک

سے آگے نہ پڑھتیں تو اپنے گھروں میں خوش رہتیں۔ افسوس کہ مجھے خود ابھی عقل آئی ہے ورنہ میٹرک کے بعد ہی مزید پڑھنے سے انکار کردیتی۔"

نورین اور نسرین آپی کو اطلاع ملی تو ان کے فون بھی آ گئے۔ انہوں نے بھی بہت زور دیا۔ پھر مہرین آپی کا فون آیا اور انہوں نے کہا۔ "ماہ نور آگے پڑھو یہ کیا حماقت ہے؟"

"باجی حماقت ابھی تک رہی ہے۔ لیکن ایک بات بتائیں جب حق نواز بھائی آپ کو باتیں سناتے ہیں اور ہاتھ اٹھاتے ہیں تو آپ کو اپنا آپ کتنا ہلکا محسوس ہوتا ہے؟"

وہ چپ ہو گئیں پھر کچھ دیر بعد کہا۔ "اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟"

"اسی سے تو تعلق ہے باجی اگر آپ اتنی پڑھی لکھی اور باشعور ہوتیں اور نہ اس بات کو اس طرح محسوس کرتیں آپ جانتی ہیں ہمارے خاندان میں مردوں کا اپنی بیویوں سے کیا سلوک ہوتا ہے۔"

مہرین باجی بھگت رہی تھیں اس لیے وہ میری بات سمجھ گئیں۔ انہوں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو' میری تعلیم میرے لیے عذاب بن گئی ہے کاش میں نے بھی تمہاری طرح سمجھ سے کام لیا ہوتا اور آگے پڑھنے سے انکار کر دیا ہوتا۔"

میں خوش ہو گئی۔ "آپ سمجھ رہی ہیں نا ورنہ امی ابا میاں اور کوئی میری بات سمجھنے کو تیار ہی نہیں ہے۔"

"وہ نہیں سمجھیں گے کیونکہ وہ خود اس عذاب کو براہ راست محسوس نہیں کررہے ہیں۔"

"نسرین آپی تو بھگت رہی ہیں وہ بھی میری بات نہیں سمجھ رہی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن بہتر یہی ہے کہ آگے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھو۔" مہرین باجی نے مشورہ دیا۔

امی اور ابا میاں اس بات کو سمجھ نہیں رہے تھے کہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ ہرگز جذباتی فیصلہ نہیں تھا۔ وقت گزرتا گیا اور فارم جانے کی آخری تاریخ قریب آ گئی۔ امی نے ایک بار پھر مجھ سے بات کی اور میں نے ان سے کہہ دیا کہ موجودہ خاندانی رسم و رواج کے ہوتے ہوئے بہتر یہی ہے کہ لڑکیوں کو کم سے کم پڑھایا جائے بلکہ انہیں جاہل رکھا جائے تو بہتر ہے۔ کیا فائدہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بائیس سال کی خوشی رہیں اور اس کے بعد کی ساری عمر عذاب میں گزار دیں۔

"تم کیا چاہتی ہو تمہاری شادی خاندان میں نہ کی

یوم ولادت کے حوالے سے

شوکت علی خان نے 13 ستمبر 1879ء میں اسلام نگر بدایوں میں جنم لیا۔ نسلاً پٹھان تھے۔ کابل سے ان کے مورث اعلیٰ اصالت خان ہند آئے تھے۔ دربار دہلی نے انہیں خوب نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ دو سو مواضعات پر مشتمل جاگیر تھی۔ مگر انقلاب زمانہ نے سب کچھ کھا لیا۔ والد محمد شجاعت علی خان محکمہ پولیس سے وابستہ ہو گئے۔ قلیل آمدنی کے باوجود بچوں کی تعلیم سے غافل نہ رہے۔ شوکت علی خان نے 1901ء میں بریلی کالج سے بی اے کیا پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1908 میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ 1923ء تک لکھنؤ میں اور اس کے بعد 1932ء تک آگرہ میں وکالت کی۔ کچھ سال بریلی میں بھی گزارے۔ پھر نظام حیدر آباد دکن کے دیوان راجا کشن پرشاد کے بلاوے پر حیدر آباد دکن منتقل ہو گئے۔ اب وہ فانی بدایونی کے نام سے مشہور رہتے۔ فانی کو "صاحب غم" بھی کہتے ہیں کہ ان کی شاعری نے غم و الم کی مکمل عکاسی کی ہے۔ زندگی بھر انگریزوں کے خلاف تحریکوں میں پیش پیش رہے، ایام اسیری میں بھی غضب کی شاعری کی۔ 1941ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔

جانتے؟"

میں نے حیرت سے امی کی طرف دیکھا۔ "میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جب کہ مجھے معلوم ہے ابا میاں اور آپ بھی اس کے پابند ہیں کہ اپنی بیٹیوں کی شادی خاندان میں کریں۔"

لیکن امی نے اپنے طور پر کچھ سوچ لیا۔ فارم جانے سے ایک دن پہلے ابا میاں نے مجھے طلب کیا امی بھی وہاں موجود تھیں۔ امی نے کہا۔ "ماہ نور تمہیں اس پر اعتراض ہے کہ ہم تمہاری شادی خاندان میں کریں گے تو مطمئن رہو تمہاری شادی تمہاری مرضی کے بغیر خاندان میں نہیں ہوگی۔"

ابا میاں نے کہا۔ "دوسرے ہم لڑکا دیکھ بھال کر اور تعلیم کے لحاظ سے منتخب کریں گے۔"

میں بوکھلا گئی تھی۔ "امی میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"ہم جانتے ہیں بیٹے۔" ابا میاں شفقت سے بولے۔ "آپ ہماری فرماں بردار ہو اس لیے آپ کو اطمینان دلا رہے ہیں کہ آپ اور عنبرین کے معاملے میں خاندان کے دباؤ کی پروا نہیں کریں گے۔"

امی نے کہا۔ "بلکہ وہ کریں گے جو ہمیں اپنی بیٹیوں کے حق میں بہتر لگے گا۔"

"میرا خیال ہے اب تمہیں آگے پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟" ابا میاں نے کہا۔

اگرچہ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے ساتھ وہی ہوگا جو میری بہنوں کے ساتھ ہوا ہے۔ مگر امی اور ابا میاں نے اعتراض والی بات ختم کر دی تھی اس لیے میرے انکار کا جواز باقی نہیں رہا تھا۔ مجبوراً میں مان گئی اور یوں ایم بی بی ایس میں میرا داخلہ ہو گیا۔ میرے ساتھ عنبرین باجی کے لیے بھی یہی فیصلہ ہوا تھا اس لیے وہ بھی خوش ہو گئی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ بہت زیادہ پڑھیں۔ انہوں نے کیمسٹری لی تھی۔ آنرز کے بعد انہوں نے ماسٹر میں داخلہ لیا اور اس دوران میں رحیم چچا نے اپنے دوسرے بیٹے اسد بھائی کے لیے عنبرین باجی کا رشتہ مانگا۔ اسد بھائی فطرت کے اچھے تھے لیکن تعلیم یافتہ نہیں تھے انہوں نے میٹرک بھی کئی سال میں ...... پاس کیا تھا۔ اس لیے ابا میاں نے ایک بار پھر انکار کر دیا۔ اس پر رحیم چچا بگڑ گئے کیونکہ ابا میاں نے انہیں دوسری بار انکار کیا تھا۔ ابا میاں کی زمین وہی سنبھالتے تھے۔ انہوں نے ابا میاں سے کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے جب میں تمہاری بیٹیوں کو نہیں سنبھال سکتا تو زمین کیوں سنبھالوں۔"

ابا میاں پریشان ہو گئے تھے۔ کیونکہ کئی سالوں کے تجربے کے بعد انہوں نے محسن اور حسن چچا سے زمین لے کر رحیم چچا کے حوالے کی تھی وہ معاملات درست رکھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں محسن اور حسن چچا بہت کم دیتے تھے۔ ابا میاں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کے لڑکے میں کمی نہیں ہے لیکن وہ اب ان فرسودہ روایات سے تنگ آ چکے ہیں کہ لڑکی خاندان اور برادری میں ہی دی جانی ہے اس کا جوڑ ہو یا نہ ہو۔ مگر رحیم چچا ناراض ہو گئے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ انہیں بھڑکانے میں کچھ دوسرے لوگوں کا ہاتھ بھی تھا۔ اس وقت ابا میاں مشکل میں پڑ گئے تھے۔ تب انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب زمین نہیں رکھیں گے اور وہ اسے بیچ دیں گے۔ ان دنوں زمین کی قیمتیں اتنی زیادہ نہیں بڑھی تھیں

ابا میاں نے مارکیٹ میں اس کی قیمت معلوم کروائی اور پہلے بھائیوں کو پیشکش کی کہ وہ زمین لے لیں، مگر وہ تو ابا میاں کی لڑکیوں کی وجہ سے مفت میں یہ زمین حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے انہیں معاوضہ دے کر خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔ ابا میاں کی ریٹائرمنٹ قریب تھی اس لیے وہ چاہتے تھے کہ شہر میں ہی اپنا کوئی ٹھکانہ بنا لیں۔ انہوں نے یونیورسٹی کے پاس گلشن اقبال میں ایک چھ سو گز کا پلاٹ لیا تھا اس کے علاوہ بھی ابا میاں نے شہر میں کئی جگہوں پر جائیداد بنائی تھی۔ رحیم چچا نے زمین لینے سے انکار کر دیا تھا اور محسن اور حسن چچا کو ابا میاں دینا نہیں چاہ رہے تھے اس لیے انہوں نے زمین کے لیے دوسرے خریدار دیکھنا شروع کر دیے۔ لیکن عجیب بات تھی پارٹیاں تو بہت آئی تھیں لیکن سودا کوئی نہیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف زمین پر کاشت رک گئی تو اس کی آمدنی بھی آنا بند ہو گئی۔

اس کے ایک سال بعد ابا میاں کی ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا۔ انہوں نے گلشن والے پلاٹ پر بنگلہ بنوا لیا تھا ہم وہاں شفٹ ہو گئے۔ ابا میاں کو ملازمت میں ایکس ٹینشن مل رہی تھی لیکن اب وہ آرام کرنا چاہتے تھے پھر سوسائٹی میں رہتے تو دوسرے لوگوں سے تعلقات بنتے اور ہمارے لیے رشتے بھی آتے۔ یہاں منتقل ہونے کے ایک سال کے اندر عنبرین باجی کا رشتہ آ گیا۔ لڑکا آسٹریلیا میں تھا اور وہاں انجینئر تھا۔ پہلی اچھی بات تھی وہ گلشن کے اسی بلاک میں رہتے تھے۔ اگرچہ ان کا مکان چھوٹا تھا لیکن علاقے والے ان کی شرافت کے گواہ تھے۔ ان کا بیٹا قاسم ایف ایس سی کر کے آسٹریلیا چلا گیا تھا اور اس نے وہیں سے انجینئرنگ کی ڈگری لی تھی۔ وہ شکل

صورت کا بھی اچھا تھا۔ امی اور ابا میاں کو رشتہ اچھا لگا اور انہوں نے چھان پھٹک کر ہاں کر دی۔ عنبرین باجی کے امتحان میں چار مہینے تھے۔ طے ہوا کہ شادی اس کے بعد کی جائے گی۔

خاندان میں جیسے ہی اس رشتے کا علم ہوا تو ایک طوفان آ گیا تھا کیونکہ اس سے پہلے کسی نے خاندان اور برادری سے باہر شادی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس لیے اسے ہمارے کسی گناہ سے کم نہیں سمجھا گیا...... پھوپی اور چچا ابا میاں پر چڑھ دوڑے تھے۔ خاص طور پھوپی بہت خوب گرج برس رہی تھیں۔ امی نے ان سے کہا۔ "یہ ہماری بیٹیاں ہیں اور جہاں مناسب سمجھیں گے ان کی شادی کریں گے۔"

"تو پہلی تین بیٹیوں کی شادی کیوں کی؟" پھوپی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "ان کے لیے بھی کہیں باہر تلاش کر لیتیں۔"

"کرنا تو یہی چاہیے تھا۔" امی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "ان تین کے بعد تو عقل آئی ہے کاش یہ عقل پہلے آ جاتی۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" محسن چچا بولے۔ "ہمارے خاندان میں آج تک ایسا نہیں ہوا۔"

"ہر کام پہلی بار ہوتا ہے۔" ابا میاں نے کہا۔ "اور یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ اللہ نے اس کی اجازت بلکہ حکم دیا ہے۔ لیکن ہمارا خاندان وہی اسلام سے پہلے والی جاہلانہ رسموں سے چمٹا ہوا ہے۔"

"آپ ہمارے بزرگوں کو جاہل کہہ رہے ہیں۔" حسن چچا جھلا کر بولے۔

"تب انہوں نے کیوں اسلام قبول کیا تھا جب پرانی رسموں سے چمٹے رہنا تھا۔" ابا میاں بولے۔ "بہرحال میں اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر چکا ہوں۔"

"سوچ لو تمہاری تین بیٹیاں خاندان میں ہی ہیں۔" پھوپی نے دھمکی دی۔ تو امی بھڑک گئی تھیں۔

"کیا کر لیں گے آپ لوگ میری بیٹیوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ بہت اچھا ہے۔"

"اپنے شوہروں کے گھر میں تو بیٹھی ہیں عزت سے۔"

"اگر ان کی قسمت میں شوہروں کے گھر رہنا لکھا ہے تو ٹھیک ہے لیکن ان کی خاطر میں اپنی دو بیٹیوں کو بھی جہنم میں نہیں دھکیل سکتی۔"

"ٹھیک ہے بھائی میاں۔" محسن چچا نے کہا۔ "اگر آپ اپنی بیٹیوں کو کہیں اور بیاہنا چاہتے ہیں تو شوق سے بیاہیں لیکن ہمارے باپ کی زمین خاندان سے باہر نہیں جائے گی۔"

"زمین کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟" ابا میاں بولے۔ "وہ میری ملکیت ہے اور میں اس کے ساتھ جو چاہے کروں۔"

"اچھا۔" پھوپی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "تو پھر کر کے دکھاؤ۔"

"بھائی میاں زمین ہمارے پاس ہے اور اس کا کوئی خریدار نہیں آئے گا۔" حسن چچا بولے۔

ابا میاں کو غصہ آ گیا۔ "تم لوگ مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"دھمکی نہیں دے رہے آپ کو بتا رہے ہیں، اگر خاندان کی روایت پر عمل نہیں کریں گے تو خاندان کی وراثت میں آپ کا حصہ نہیں رہے گا۔"

"زمین میری ہے اور میں اسے فروخت کر دوں گا۔"

"اگر کوئی گاہک مل جائے تو ضرور کر دیجئے گا بھائی میاں۔"

وہ سب اسی وقت اٹھ کر چلے گئے تھے۔ ابا میاں کو زمین کے معاملات کا زیادہ علم نہیں تھا اور میرے چچاؤں کی آدھی عمر ہی زمین پر گزری تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ زمین کو کس طرح قبضے میں کرنا ہے۔ انہوں نے نہ جانے کیا چکر چلایا کہ کوئی گاہک ہی نہیں آتا تھا۔ ابا میاں نے ہر ممکن کوشش کر لی کہ زمین فروخت کر دیں۔ نوکری وہ چھوڑ چکے تھے اور شہر میں ان کے پاس جو تھا اسے وہ جائیداد اور مکان میں لگا چکے تھے۔ صرف پنشن سے گھر نہیں چل سکتا تھا۔ پھر عنبرین باجی کی شادی بھی کرنا تھی۔ ان دنوں میں ایم بی بی ایس کے تھرڈ ایئر میں تھی۔ ابا میاں کو ریٹائرمنٹ پر جو فنڈ ملا تھا وہ انہوں نے عنبرین باجی کی شادی کے لیے رکھ دیا تھا لیکن پھر خرچ کر دیتے تو وہ خالی ہاتھ رہ جاتے۔ عنبرین باجی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے امی سے کہا کہ وہ ان کا رشتہ یہاں سے ختم کر دیں۔

"بات صرف رشتہ ختم کرنے کی نہیں ہے۔" امی نے جواب دیا۔ "وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی باقی بیٹیاں بھی خاندان کے جہنم میں جھونک دوں اور ہم اس کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔"

"امی میں آپ لوگوں کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"عنبرین تم فکر مت کرو۔ اللہ بہتر کرنے والا ہے۔"

باجی کے سسرال والے ان کے فائنل کے فوراً بعد

تاریخ لینے کے لیے آئے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ جلد از جلد شادی کر دی جائے اور ان کا بیٹا اپنی دلہن آسٹریلیا لے جائے۔ قاسم بھائی کی خواہش تھی کہ عنبرین باجی وہاں آ کر پی ایچ ڈی کر لیں۔ کاغذات کی قبل از وقت تیاری کے لیے فون پر نکاح پڑھا لیا گیا تھا۔ پھر تین مہینے بعد قاسم بھائی آئے تو باقاعدہ رخصتی کر دی گئی۔ یوں عنبرین باجی بھی گھر سے رخصت ہو گئیں۔ جتنا جمع کیا تھا وہ ابا میاں نے ان کی شادی پر لگا دیا اور اب وہ خالی ہاتھ ہو گئے تھے۔ ایک دن کھانے کی میز پر انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"کاش میں ملازمت میں ایکس ٹینشن لے لیتا۔"

"وہ بھی اب تک ختم ہو چکی ہوتی۔" امی نے کہا۔ "ہمارا مسئلہ اس طرح حل نہیں ہو گا۔ آپ خاندان والوں سے بات کریں اور پنچایت بلائیں۔"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" ابو بولے۔ "پنچایت بھی روایتوں کی بات کرے گی اور مجھے ہی قصوروار ٹھہرایا جائے گا۔"

"تب آپ کیا کریں گے؟"

"میرے یونیورسٹی کے ایک ساتھی کے بھائی ان دنوں اسمبلی کے ممبر اور صوبائی وزیر ہیں۔ ایک بار انہوں نے کہا تھا کہ زمین سے متعلق کوئی مسئلہ ہو تو میں ان کو بتاؤں۔"

"آپ فوراً ان سے بات کریں۔" امی بولیں۔

"ہاں ورنہ ایک آدھ مہینے بعد گھر کا خرچ بھی مشکل ہو جائے گا۔"

اس سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ابا میاں کے مالی حالات اس حد تک خراب ہو چکے ہیں کیونکہ انہوں نے عنبرین باجی کی شادی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ میں پریشان ہو گئی۔ "ابا میاں مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔ میرے ایم بی بی ایس کی فیسیں تو بہت زیادہ ہیں۔"

"آپ اس کے لیے فکر نہ کریں۔" ابا میاں نے کہا۔ "میں نے پوری فیس نکال کر الگ سے بینک میں رکھ دی ہے۔"

"کیسے فکر نہیں کروں ابا میاں جب آپ گھر کے خرچ کے لیے فکرمند ہیں۔"

"اللہ بہتر کرے گا۔"

ابا میاں نے کوشش کی اور اپنے یونیورسٹی فیلو کے وزیر بھائی سے ملے۔ ان کو اپنا مسئلہ بتایا تو انہوں نے ابا میاں کو تسلی دی کہ ان کا کام ہو جائے گا۔ مگر جب وزیر صاحب نے کوشش کی تو پتا چلا کہ ایک اور صوبائی وزیر پہلے ہی اس معاملے میں ملوث ہیں اور چچاؤں کی حمایت کر رہے ہیں کیونکہ یہ معاملہ الیکشن اور ووٹوں کا تھا۔ دونوں وزیروں نے مل کر مسئلے کا یہ حل نکالا کہ ابا میاں اپنی زمین کی مارکیٹ پرائس کا نصف لے لیں اور زمین بھائیوں کے حوالے کر دیں۔ اگرچہ یہ ناانصافی تھی لیکن ابا میاں کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ اگر پورا نہ مل رہا ہو تو آدمی آدھا ہی لے لے۔ انہوں نے یہی کیا۔ حاصل ہونے والی رقم سے انہوں نے سرٹیفکیٹ لے لیے تاکہ ماہانہ رقم ملتی رہے۔ اس سے ایک مسئلہ تو حل ہو گیا تھا لیکن ابھی کئی مسائل باقی تھے۔ صرف ابا میاں کو اذیت دینے کے لیے خاندان والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب میری بہنوں کو میکے جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ ابا میاں اور امی یہ سن کر تڑپ گئے تھے۔ انہوں نے پھوپی اور چچاؤں سے بات کی۔ ابا میاں نے ان سے کہا۔

"تم لوگوں کا اصل مقصد پورا ہو گیا ہے تم نے مجھ سے زمین چھیننا تھی وہ چھین لی۔ اب میری بچیوں کے ساتھ برا سلوک کیوں کر رہے ہو؟"

"تم نے خاندان کے رسم و رواج کو توڑا ہے تمہیں اس کی سزا بھی تو ملنی چاہیے۔" پھوپی نے کہا۔

"تو سزا مجھے دو میری بچیوں کو کیوں مل رہی ہے؟"

"کیونکہ وہ تمہاری بچیاں ہیں۔ اور اصل سزا تو تمہیں یہی ہے کہ اب وہ تم سے نہیں مل سکیں گی۔"

ابا میاں نے کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا کوئی ہماری بچیوں کو ہم سے ملنے سے نہیں روک سکتا۔"

"ٹھیک ہے تب آ کر ان کو ہمیشہ کے لیے لے جاؤ یہ یا تو تم سے ملیں گی یا اپنے گھروں میں آباد رہیں گی۔"

یہ بات سن کر ابا میاں چپ ہو گئے تھے لیکن بعد میں میں نے انہیں اور امی کو روتے دیکھا تھا۔ میں خود اس غم پر کتنا روئی تھی۔ آسٹریلیا میں عنبرین باجی کو بھی بتایا تھا۔ انہوں نے وہاں یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے انرولمنٹ کرا لیا تھا اور ان دنوں اس کی تیاری کر رہی تھیں۔ اس لیے ان سے بات کرنے کا موقع کم ملتا تھا۔ میرا فائنل ایئر قریب آ گیا تھا اس لیے پڑھائی کو بہت زیادہ وقت دینا پڑ رہا تھا۔ میں صبح جاتی اور شام کے قریب واپس آتی۔ کچھ دیر امی کے ساتھ گھر کے کام نمٹا کر میں پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتی تھی۔ ان دنوں ابا میاں یہ کوٹھی فروخت کر کے کوئی چھوٹا مکان لینے کی سوچ رہے تھے کیونکہ اس کے اخراجات بہت زیادہ تھے اور سرٹیفکیٹ سے آنے والی رقم اتنی نہیں تھی۔ ابا میاں کا گلشن میں ہی ایک دو سو گز کا پلاٹ بھی تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کوٹھی

بیچ کر پلاٹ پر گھر بنا لیں اور باقی رقم وہ میری شادی کے لیے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

مسائل کم ہونے کے بجائے دن بہ دن بڑھتے جا رہے تھے۔ ابا میاں نے ادھر کوٹھی کا سودا کیا اور چھوٹے پلاٹ پر مکان بنانا شروع کیا ادھر سرکاری سرٹیفکیٹس پر منافع کی شرح گرا دی گئی اور پھر یہ آدھی رہ گئی۔ مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ زمین اور جائیداد کی قیمت بڑھنا شروع ہو گئی۔ جو کوٹھی ابا نے تیس لاکھ میں بیچی تھی ایک سال بعد اس کی قیمت ستر لاکھ ہو گئی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے یہ کیا کہ بچنے والی رقم سے اچھی سوسائٹیز میں کچھ پلاٹ لے کر ڈال دیے۔ تاکہ بعد میں فروخت کر سکیں۔ مگر گھر کے اخراجات کا مسئلہ وہیں رہا تھا۔ گھر چھوٹا ہوا تھا تو سرٹیفکیٹس کی آمدنی بھی آدھی رہ گئی تھی۔ گزارہ پھر سے مشکل ہونے لگا تھا۔ ان دنوں میں ایم بی بی ایس کے فائنل میں آ گئی۔ جب گزارہ مشکل ہو گیا تو ابا میاں نے ایک چھوٹا پلاٹ فروخت کر دیا اور اس کی انہیں کئی گنا زیادہ قیمت مل گئی۔ ابا میاں کو خیال آیا انہوں نے اخراجات کے لیے رقم نکال کر باقی رقم سے ایک نسبتاً سستی سوسائٹی میں پلاٹ لے لیا۔ چار مہینے بعد اس کی اچھی قیمت ملی تو اسے فروخت کر دیا۔

یوں ابا میاں نے آمدنی کا ایک طریقہ تلاش کر لیا۔ وہ پلاٹ فروخت کر کے آگے سستا پلاٹ خرید لیتے اور اضافی رقم گھر کے اخراجات میں آ جاتی۔ کچھ مہینوں بعد خریدے گئے پلاٹ کی قیمت بڑھ چکی ہوتی تھی تو اسے بھی فروخت کر دیتے۔ ان دنوں زمین اور جائیداد کا کام بہت اوپر جا رہا تھا۔ ابا میاں کا چند اسٹیٹ ایجنٹس سے رابطہ ہو گیا اور ابا میاں ان کی مدد سے اپنا کام چلانے لگے۔ وہ گاہک لاتے اور ابا میاں کو نئے پلاٹ اور مکانات بھی دلواتے تھے۔ جس وقت میں نے آخری سال کا امتحان دیا اس وقت تک ہماری مالی حالت بہت اچھی ہو چکی تھی۔ ابا میاں نے اپنا کام پھیلا لیا تھا۔ جیسے جیسے پیسا آ رہا تھا وہ اسے آگے رول کرتے جا رہے تھے اور پیسا پیسے کو کھینچ رہا تھا۔

میں ان دنوں ہاؤس جاب کر رہی تھی جب عنبرین باجی شادی کے بعد پہلی بار پاکستان آئیں۔ عنبرین باجی ہم سب بہنوں میں سب سے زیادہ خوب صورت اور گوری چٹی تھیں۔ میرا خیال تھا وہ باہر سے اور بھی خوب صورت ہو کر واپس آئیں گی۔ مگر جب ان کو دیکھا تو سب ہی حیران رہ گئے تھے۔ ان کا رنگ و روپ مرجھا گیا تھا اور صحت بھی گر گئی تھی۔ امی نے پوچھا تو وہ ٹال گئیں۔ "امی وہاں پڑھ رہی ہوں اور پی ایچ ڈی میں بہت زیادہ پڑھنا پڑتا ہے۔"

"تو بیٹا اتنی بھی کیا پڑھائی۔" امی نے کہا۔ "تم نے تو اپنا حلیہ خراب کر لیا ہے۔"

لیکن میں نے محسوس کیا کہ عنبرین باجی کچھ چھپا رہی ہیں۔ ان کے ساتھ قاسم بھائی نہیں آئے تھے۔ اس لیے وہ کچھ عرصے اپنے سسرال میں رہ کر ہمارے پاس آ گئی تھیں۔ وہ ایک مہینے کے لیے آئی تھیں۔ وہ وہاں سے پی ایچ ڈی کر رہی تھیں وہاں اسکالرشپ حاصل کرنے کے ساتھ لیکچررشپ بھی کر رہی تھیں۔ اس لیے انہیں صرف ایک مہینے کی چھٹی ملی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی سوتی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "باجی آپ کو کیا ہوا ہے؟"

وہ مسکرائیں۔ "گڑیا وہاں محنت بہت زیادہ کرنا پڑتی ہے۔ صبح چھ بجے اٹھ کر میں اپنا اور قاسم کا ناشتا تیار کرتی ہوں .... پھر دوسرے کام نمٹا کر میں ساڑھے سات بجے یونیورسٹی چلی جاتی ہوں۔ وہاں سے شام چھ سات بجے سے پہلے واپسی نہیں ہوتی ہے۔ پھر واپس آ کر رات کا کھانا اور اگلے دن کی تیاری کرتی ہوں۔ رات کم سے کم چار گھنٹے پڑھنا ہوتا ہے سوتے سوتے بھی ایک دو بج جاتے ہیں۔"

میں حیران ہوئی۔ "آپ تو بہت محنت کر رہی ہیں۔ قاسم بھائی آپ کی مدد نہیں کرتے؟"

"کرتے ہیں لیکن اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتے ہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔

میں نے اعتراض کیا۔ "جب آپ کو اسکالرشپ ملی ہوئی ہے تو لیکچررشپ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ قاسم بھائی انجینئر ہیں ان کی تنخواہ اچھی خاصی ہو گی۔"

"ہاں وہ تو ہے لیکن وہاں معیار زندگی اونچا ہے اسے برقرار رکھنے کے لیے سب کو کمانا پڑتا ہے۔" عنبرین باجی نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

وہ جتنے دن ہمارے ہاں رہیں ان کو مسلسل قاسم بھائی کے فون آتے رہے۔ امی اور ابا میاں نے تو نوٹ نہیں کیا تھا لیکن میں نے نوٹ کیا کہ اکثر فون صبح اس وقت آتے تھے جب آسٹریلیا میں دن ہوتا تھا اور یقیناً کام کا وقت ہوتا ہو گا۔ خود عنبرین باجی عام طور سے شام کو فون کرتی تھیں جب وہ کام سے فارغ ہو کر آتی تھیں۔ ایک رات میں نے عنبرین باجی سے پوچھ لیا۔ "یہ قاسم بھائی کام کے اوقات میں اتنے فون کیسے کر لیتے ہیں۔"

وہ بوکھلا گئیں۔ "ہاں بس کر لیتے ہیں۔"

میں نے غور سے انہیں دیکھا۔ "مجھے لگ رہا ہے آپ مجھ سے امی اور ابا میاں سے کچھ چھپا رہی ہیں۔"

تحرین باجی شاید اس بوجھ کو اکیلے اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھیں۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر انہوں نے سر ہلایا۔ ”میں نے واقعی تم لوگوں سے چھپایا ہے۔ قاسم انجینئر نہیں ہیں۔“

میں ششدر رہ گئی تھی۔ ”انجینئر نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟“

”وہ وہاں ٹیکسی چلاتے ہیں۔ انہوں نے وہاں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔“

”تب انہوں نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟“

”جن کے لڑکے باہر ہوں وہ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔“ تحرین باجی نے تلخی سے کہا۔ ”کیونکہ ہمارے ہاں سب سے اہم بات یہی ہوتی ہے کہ لڑکا ملک سے باہر ہے۔ قاسم چھپ کر آسٹریلیا پہنچے تھے پھر انہوں نے خود کو غیر قانونی امیگرینٹ ظاہر کیا اور کوشش کر کے وہاں کی شہریت حاصل کر لی مگر انہوں نے وہاں نہ تو انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی ہے اور نہ ہی کہیں جاب کرتے ہیں بلکہ ٹیکسی چلاتے ہیں یہی وجہ ہے وہ جب چاہتے ہیں مجھے کال کر لیتے ہیں۔“

”تب وہ آپ کو پی ایچ ڈی کیوں کرا رہے ہیں؟“

”تاکہ میں ملازمت کر کے ان کو مالی لحاظ سے سہارا دوں۔ آسٹریلیا میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کو بہت اچھی تنخواہ پر جاب مل جاتی ہے۔ مجھے ابھی اسکالرشپ اور لیکچرر شپ سے جو مل رہا ہے وہ قاسم کی آمدنی سے دوگنا زیادہ ہے۔“

”تب تو وہ آرام ہی کرتے ہوں گے۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”اسی لیے تو مجھے واپس بلا رہے ہیں۔“ باجی نے انکشاف کیا۔ ”کیونکہ میری غیر موجودگی میں انہیں کام کرنا پڑ رہا ہے۔“

مجھے غصہ آ گیا تھا۔ ”یہ زیادتی ہے باجی آپ امی اور ابا میاں سے کہیں وہ قاسم بھائی کے گھر والوں سے بات کریں انہوں نے ہمیں اتنا بڑا دھوکا کیسے دیا؟“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ صرف بات خراب ہو گی۔“ تحرین باجی بولیں۔ ”ابھی مجھے وہاں کی شہریت نہیں ملی۔ مجھے ایک بار شہریت مل جائے تب ہی میں قاسم سے نمٹ سکوں گی۔“

میں نہیں سمجھ سکی کہ تحرین باجی کی سوچ کیا تھی لیکن مجھے اس خبر سے صدمہ ہوا تھا میں سمجھ رہی تھی کہ میری کم سے کم ایک بہن تو اپنے گھر میں خوش تھی لیکن میری یہ خوش فہمی اب دور ہو گئی تھی۔ شاید خوشیاں ہم بہنوں کی قسمت میں نہیں تھیں۔ تحرین باجی نے مجھے قسم دے کر منع کیا کہ میں امی اور ابا میاں کو اس بارے میں نہ بتاؤں۔ ان کو صدمہ ہو گا۔ جب ان کو آسٹریلیا کی شہریت مل جائے گی تو خود ان کو بتا دیں گی۔ یوں جانتے ہوئے بھی میرے ہونٹ سل گئے تھے۔ ایک مہینے بعد تحرین باجی واپس چلی گئیں۔ امی اور ابا میاں ان کے حوالے سے خوش تھے۔

نورین آپی اب اپنے سسرال والوں سے چھپ کر ہم سے ملنے آتی تھیں کیونکہ شاہ نواز بھائی ان کے ساتھ تھے لیکن نسرین آپی اور مہرین باجی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سال میں ایک دو بار میں، امی اور ابا میاں ان سے خود مل آتے تھے۔ نورین آپی کے چار بچے تھے۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ نسرین آپی کے گھر دو بیٹیاں ہوئی تھیں۔ اکبر بھائی نے دوسری شادی تو نہیں کی لیکن انہوں نے نسرین آپی کو ہر بات پر سزا دینے میں کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی تھی۔ مار پیٹ اور تذلیل روز مرہ کا معمول تھا۔ مہرین باجی کا پہلا بیٹا ہوا تھا اس لیے پھوپی اور حق نواز بھائی ان سے خوش تھے لیکن ہم سے ملنے اور میکے آنے پر پابندی برقرار تھی۔ تحرین باجی کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے لیکن ان کے ہاں اب تک اولاد نہیں ہوئی تھی اور یہ قاسم بھائی اور باجی دونوں کی خواہش تھی۔ انہوں نے جانے سے پہلے مجھ سے کہا تھا۔

”میں ابھی اولاد نہیں چاہتی ہوں۔ ممکن ہے کل مجھے اپنے بارے میں کوئی ایسا فیصلہ کرنا پڑ جائے جس میں اولاد میرے پاؤں کی زنجیر بن جائے۔“

اس وقت مجھے لگا کہ تحرین باجی فیصلہ کر چکی تھیں صرف اس پر عمل کرنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کر رہی تھیں۔ میری ہاؤس جاب ختم ہونے کے قریب تھی اور میرا ارادہ تھا کہ اپنا کلینک کرنے کے ساتھ ساتھ کسی رفاہی اسپتال کو وقت دوں گی۔ ابا میاں نے گلشن اقبال میں ایک پلاٹ اس مقصد کے لیے لے لیا تھا جہاں میں اپنا کلینک قائم کر سکتی تھی۔ ہاؤس جاب ختم ہونے سے پہلے میں نے ایک ٹرسٹ اسپتال کی انتظامیہ سے بات کر لی تھی۔ میں وہاں روزانہ چار گھنٹے بیٹھتی۔ یہ اسپتال غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کے لیے مخصوص تھا جو مہنگا علاج برداشت نہیں کر سکتے۔

اس وقت تک ابا میاں اچھا کما رہے تھے۔ پھر اچانک زمین اور جائیداد کی قیمت بڑھنا بند ہو گئی۔ اس وقت سے پہلے ہی ابا میاں نے اس کام سے سرمایہ نکال لیا تھا۔ اس لیے انہیں نقصان تو نہیں ہوا لیکن مستقل آمدنی بھی بند ہو گئی۔ اس لیے ابا میاں نے دوبارہ سرٹیفکیٹس کی اسکیموں میں سرمایہ

کاری شروع کر دی تھی اس سے ہر مہینے لگا بندھا ملنے لگا جو ہماری ضرورت کے لیے کافی تھا لیکن اب میں اپنا کلینک نہیں بنا سکتی تھی کیونکہ اس کے لیے بہت بڑی رقم درکار تھی اور فی الحال اجازت تھی۔ اس لیے صبح کے وقت میں نے ایک نجی اسپتال میں ملازمت کر لی۔ جہاں مجھے تنخواہ تو زیادہ نہیں دے رہے تھے لیکن پک اینڈ ڈراپ کی سہولت تھی۔

ان دنوں امی میری شادی کی فکر میں تھیں اور انہوں نے رشتے کی تلاش بھی شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں اپنے گھر کی ہو جاؤں۔ ابا میاں بھی ان کے حامی تھے۔ اصل میں امی اور ابا میاں دونوں کی عمر خاصی ہو چکی تھی۔ ایک تو ابا میاں اور امی کی شادی خاصی بڑی عمر میں ہوئی تھی پھر میں سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ اس وقت ابا میاں ستر سال کے اور امی ان سے تین سال چھوٹی یعنی سرسٹھ برس کی تھیں اور ہمارے ہاں اس عمر میں آدمی عام طور سے سفر آخرت کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے اور اس دنیا سے جانے سے پہلے اپنے تمام ضروری کام نمٹا کر جانا چاہتا ہے۔ امی اور ابا میاں کے لیے اب میں ہی ایک ذمے داری باقی رہ گئی تھی۔

امی نے ایک رشتہ کرانے والی سے بات کی تھی اور وہ کچھ رشتے بھی لائی تھی مگر وہ امی کو پسند نہیں آئے۔ امی کے خیال میں وہ لوگ اچھے نہیں تھے اور ڈاکٹر لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ کما کر دے۔ امی یہ بھول رہی تھیں کہ میں نے ایک پیشہ ورانہ ڈگری لی تھی اور مجھے اس سے کمانا ہی تھا چاہے میں کسی سے بھی شادی کرتی۔ امی چاہتی تھیں میری شادی کسی بڑی فیملی میں ہو جو دولت کے لالچی نہ ہوں۔ امی نے مجھے بتا دیا تھا کہ اب وہ میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ یہ شعبہ میں نے مکمل طور پر امی اور ابا میاں کے سپرد کر رکھا تھا وہ جب اور جہاں چاہتے میری شادی کر دیتے۔

اس روز اتوار تھا اور میری آف تھی۔ رشتے کرانے والی ناشتے کے فوراً بعد آ گئی اور امی اسے لے کر ڈرائنگ روم میں چلی گئیں میں نے سنا وہ امی سے کہہ رہی تھی۔ ”بیگم صاحبہ آج تو ایسا رشتہ لائی ہوں کہ آپ......“ اس سے آگے میں سن نہیں سکی تھی۔ لیکن ظاہر ہے اس گھر میں اب میرا ہی رشتہ نکلنا تھا۔ مجھے تجسس ہوا لیکن ابا میاں گھر میں تھے اس لیے میں نوٹ نہ لے سکی تھی۔ جب رشتے کرانے والی واپس چلی گئی امی ابا میاں کو لے کر کمرے میں چلی گئیں یقیناً وہ ان کو رشتے کی تفصیل بتا رہی تھیں۔

مجھے بعد میں پتا چلا کہ ایک بڑی فیملی کا رشتہ تھا لڑکا بزنس مین تھا اور باپ اور بھائیوں کے ساتھ مل کر فیملی بزنس چلا رہا تھا۔ ایم بی اے تھا اور شکل صورت کا اچھا تھا۔ اس کے ماں باپ کی خواہش تھی کہ اس کے لیے خوش شکل اور ڈاکٹر لڑکی ہو۔ بہ قول رشتہ کرانے والی کے میں اس معیار پر پورا اترتی تھی۔ گلشن میں ان لوگوں کا ڈیڑھ ہزار گز پر بنگلا تھا۔ سائٹ میں ان کی ٹیکسٹائل مل اور دوسرے کئی کاروبار تھے۔ فیملی کے لحاظ سے اچھے تھے۔ بمبئی سے ہجرت کر کے آنے والی یہ فیملی پیچھے سے افغانی پٹھان تھی۔ امی اور ابا میاں اس رشتے کا سن کر خوش تھے لیکن ابا میاں مزید چھان بین کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک مہینے میں چھان بین کر کے رشتہ منظور کرنے کا فیصلہ کر لیا اور رشتہ کرانے والی سے کہا کہ وہ ان لوگوں کو آنے کا کہہ دے۔ میری تصویریں بھیج دی گئی تھیں اور اب انہوں نے صرف بات طے کرنے کے لیے آنا تھا۔

سمیر کے ماں باپ آئے انہوں نے امی اور ابا میاں سے بات کی اور یوں رشتہ طے ہو گیا۔ میری بہنیں بھی اس رشتے سے خوش تھیں۔ کیونکہ پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ ہمارے گھر کوئی اتنا مناسب قسم کا رشتہ آیا تھا۔ لڑکا اور اس کی فیملی ہر لحاظ سے معیاری تھی۔ سب اس رشتے پر دل و جان سے راضی تھے۔ خاندان والوں کا وہی مسئلہ تھا کہ خاندان سے باہر شادی کسی صورت جائز نہیں ہے لیکن اس بار ان کے رویے میں اتنی نرمی آئی تھی کہ انہوں نے میری بہنوں کو میری شادی میں شرکت کی اجازت دے دی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اجازت اتنی آسانی سے نہیں ملی تھی۔ ابا میاں بڑے بھائی ہوتے ہوئے بھی اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے سامنے گڑگڑائے تھے تب کہیں جا کر اجازت ملی۔ شادی سے دو ہفتے پہلے میری ساری بہنیں آ گئی تھیں۔ تحرین باجی کو گئے ہوئے ابھی سال بھی نہیں ہوا تھا پھر بھی وہ آ گئی تھیں۔ میں اور سب ہی خوش تھے۔ اتنے عرصے بعد ہمارا پورا گھر جمع ہوا تھا۔ شاہ نواز بھائی نے بھائی کی کمی پوری کی اور شادی کے تمام انتظامات انہوں نے سنبھالے تھے۔ میرا تمام فرنیچر انہوں نے گفٹ کیا تھا اسی طرح تمام بہنوں نے اچھی چیزیں دیں اور ابا میاں پر زیادہ بوجھ نہیں پڑا تھا۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے سب ہی خوش اور اداس تھے۔

سمیر بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے تھے۔ ان کے گھر والے بھی اچھے تھے۔ شادی کے شروع کے دنوں میں تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں اس لیے میرے اندر کہیں خدشہ تھا کہ کچھ عرصے بعد عام سسرال والوں کی طرح ان کے رویے بھی

تبدیل ہوں گے۔ مگر شادی کے دو مہینے بعد مجھے اپنا یہ خیال غلط محسوس ہونے لگا تھا۔ میں اور سمیر ہنی مون منا کر واپس آئے تو سب نے ہی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا تھا۔ واپسی کے بعد سمیر تو دفتر میں مصروف ہو گئے اور میں گھر میں وقت گزارنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ اب مجھے جاب نہیں کرنا پڑے گی اور میں شام کو ٹرسٹ اسپتال میں اپنی رضاکارانہ خدمات جاری رکھ سکوں گی۔ سمیر کی فیملی بہت دولت مند تھی۔ اس وسیع و عریض بنگلے میں سمیر کو اس کے دو بھائیوں کی طرح الگ سے مکمل پورشن دیا گیا تھا۔ اگرچہ کھانا مشترک تھا لیکن پورشن میں کچن اور اس کے تمام لوازمات موجود تھے۔ تین بڑے بڑے کمرے جن میں میرے جہیز کا تمام سامان آ گیا تھا۔

گھر میں کام کے لیے پانچ مستقل ملازم تھے۔ ایک کک اور اس کا مددگار، ایک صفائی ستھرائی کرنے والی خادمہ، ایک مالی اور ایک چوکیدار تھا۔ کپڑے دھونے کے لیے الگ سے خادمہ آتی تھی۔ بہوؤں سمیت کسی کو بھی کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ سمیر کی دو غیر شادی شدہ بہنیں بھی تھیں ان میں سے ایک میرے سسر کے دفتر میں بیٹھتی تھی اور دوسری سمیر کی سب سے بڑی بھابھی شائستہ کے ساتھ مل کر ایک اعلیٰ درجے کا بیوٹی پارلر چلا رہی تھی۔ دوسرے بھائی کی بیوی نائلہ بوتیک کا بزنس کرتی تھی اور طارق روڈ پر ایک شاپنگ سینٹر کا تقریباً پورا فلور اس کے بوتیک کے لیے مخصوص تھا۔ گھر میں صرف میری ساس کچھ نہیں کرتی تھیں، وہ گھر کے کاموں کی نگرانی کرتی تھیں۔ شادی کے بعد اس گھر میں صرف میں فارغ تھی۔

صبح ناشتے کی میز پر سب موجود ہوتے تھے اور آگے پیچھے ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کاموں کے لیے روانہ ہوتے تھے۔ ایک صبح میرے سسر نے ناشتے کے دوران مجھ سے پوچھا۔ ”ماہ نور تم نے اپنے پروفیشن کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”پروفیشن؟“ میں نے کہا۔ ”میں سمجھی نہیں۔“

”تم ڈاکٹر ہو اور تم نے اپنے کیریئر کے بارے میں سوچا ہی نہیں ہے۔“

”ابو میں ایک ٹرسٹ اسپتال میں کام کر رہی ہوں۔“

”ٹرسٹ اسپتال... شٹ۔“ وہ حقارت سے بولے۔ ”تم صرف وقت ضائع کر رہی ہو۔ اب تم اس گھر کی بہو ہو اور تمہیں اپنے پروفیشن سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کیوں سمیر؟“

”جی ابو۔“ سمیر بولے۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میں خود بھی ماہ نور سے یہی بات کرنے والا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ”تم دونوں آپس میں مشورہ کر لو۔ میرے پاس جو... دو پلاٹ ہیں ان میں سے جس پر چاہے ماہ نور کے لیے اسپتال بن سکتا ہے۔ یہ اپنا کام خود شروع کر سکتی ہے۔“

سسر چلے گئے اور میں ساکت رہ گئی میں نے سمیر کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد ہم اپنے بیڈ روم میں تھے۔ میں نے سمیر سے کہا۔

”یہ سب کیا ہے۔ اب میں بزنس کروں گی؟“

”اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ سمیر نرمی سے بولے۔ ”دیکھو اس گھر میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ساتھ کام کرتی ہیں۔“

”لیکن میڈیکل میرے نزدیک پروفیشن نہیں ہے۔“

”اب تمہیں اسے پروفیشن بنانا ہوگا۔“ سمیر نے لہجہ بدل دیا۔ ”پاپا نے کہہ دیا ہے اور اس گھر میں ان کی کہی بات حرف آخر ہوتی ہے۔ آخر تمہیں شادی کر کے کیوں لائے ہیں؟ تمہاری ڈگری کو دیوار پر تو نہیں لٹکانا ہے تم اس سے کما سکتی ہو۔“ سمیر نے کہا اور کمرے سے چلے گئے۔ اب میری سمجھ میں آیا تھا کہ ڈاکٹر بہو کی خواہش کیوں تھی۔ میرے خدا! اس ملک میں عورت کا کام صرف خواہشات کو پورا کرنا رہ گیا ہے۔ چاہے وہ ان پڑھ اور جاہل ہو یا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ اس کا مقدر ایک ہی ہے اسے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کی خواہشات کو پورا کرنا پڑتا ہے۔

اب میرا کراچی کے ایک پوش علاقے میں ایک بڑا سا اسپتال ہے جس کی فیس صرف امرا ہی برداشت کر سکتے ہیں اور جو اس کی فیس ادا کرنے کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اپنی حیثیت کو منواتے بھی ہیں۔ اس لیے میرے اسپتال میں وہ سب ہوتا ہے جو کسی اسپتال کے لیے ایک گھناؤنے فعل سے کم نہیں ہے۔ میں اسپتال نہیں چلا رہی ہوں ایک بزنس چلا رہی ہوں اور بزنس میں تو سب چلتا ہے۔ اب مجھے اپنی تین بہنوں پر رشک آتا ہے جو خاندان کے جبر کا شکار ہیں لیکن کوئی ان سے ان کے ضمیر کے خلاف تو کام نہیں لے رہا ہے۔ تحریم باجی بھی آسٹریلیا کی شہریت اور قاسم سے چھٹکارا حاصل کر چکی ہیں اور بہت سکون سے وہاں ہیں انہوں نے امی اور ابا میاں کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔ میری طرف سے سب مطمئن ہیں کہ میں خوش ہوں لیکن یہ تو میں ہی جانتی ہوں کہ میں کتنا خوش ہوں۔

جڑواں

محترمہ معراج رسول صاحبہ!
السلام علیکم
میری واقعات حقیقت کم اور افسانوی زیادہ لگتی ہیں۔ اب معلوم نہیں آپ پڑھ کر لگیں ایسا لگے گا جیسے کوئی مزاحیہ کہانی ہو۔ آپ یہی سمجھ کر واقعات کو میری روداد کو یہی سمجھ کر پڑھ لیں، وقت اچھا گزرے گا۔

ارسلان
(لاہور)

وہ ایک بے ڈھنگی سی لڑکی تھی۔

نہ تو اس کو صحیح ڈریسنگ آتی تھی اور نہ ہی اس کا لہجہ درست تھا اور نہ ہی اس کی صورت شکل میں کوئی ایسی خاص بات تھی۔ اس کے باوجود میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔

اسے پسند کرنے کی تین وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ میرے گلے میں پڑ رہی تھی، جب کہ تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مجھے اور کوئی مل ہی نہیں رہی تھی۔ اسی لیے اس پر

گزارہ کر رہا تھا۔

اس سے ملاقات کی کہانی بھی بہت دردناک سی ہے۔ میں ایک دن ایک ٹھیلے کے پاس کھڑا ہوا گول گپے کھا رہا تھا کہ وہ بھی وہاں آ نکلی۔ اس نے مجھے دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دی۔ یہ شناسائی کا اظہار تھا کیونکہ ہم محلے ہونے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے پھر اس نے گول گپے والے سے ایک پلیٹ گول گپے مانگے اور کھانا شروع کر دیے۔

دو پلیٹ کھا لینے کے بعد اس نے اپنے بیگ کی تلاشی لینے کے بعد میری طرف مظلوم نگاہوں سے دیکھا۔ "آپ تو میرے محلے میں رہتے ہیں نا۔"

"ہاں، نیا نیا آیا ہوں لیکن تم کو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔"

"بس تو میرا کام بن گیا۔ میں گھر سے پیسے لانا بھول گئی ہوں۔ آپ تو محلے کے ہیں نا... آپ ادا کر دیں۔ میں آپ کو بعد میں دے دوں گی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" میں نے اس کے بھی پیسے ادا کر دیے۔

یہ رشیدہ سے میری پہلی ملاقات تھی جو آخری ہرگز ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس کے بعد بھی وہ مجھ سے ملتی رہی تھی۔

اس سے میری ملاقات اچانک ہی ہو جاتی تھی۔ میں کہیں جا رہا ہوں وہ راستے میں مل گئی۔ میں رکشا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا ہوں تو وہ بھی آ کر کھڑی ہو جاتی۔

رفتہ رفتہ ہم دونوں کے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہونے لگی تھیں۔ یہ اِدھر اُدھر کی باتیں کچھ اس انداز کی ہوا کرتی تھیں۔

"آج گرمی بہت ہے۔"

"ہاں کل کا موسم بہت اچھا تھا۔"

"محلے میں گندگی ہونے لگی ہے۔"

"یہاں لوگوں کو صفائی کا شعور نہیں ہے۔ جہاں دیکھو کچرا پھینک دیتے ہیں۔"

ایک دن جب اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا۔ "ارسلان صاحب آخر ہم کب تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے سنا ہے اور پڑھا بھی ہے کہ لڑکا اور لڑکی جب ملنے لگتے ہیں تو تیسری ملاقات میں محبت کا اظہار کر دیتے ہیں جبکہ یہاں تو ہماری آٹھویں ملاقات چل رہی ہے اور ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"کیا تم محبت کرنا چاہتی ہو؟"

"ظاہر ہے میں یوں ہی تو نہیں مل رہی حالانکہ سوائے گول گپے کے آپ نے ابھی تک کچھ نہیں کھلایا ہے۔ اس کے باوجود میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

اب میں نے اسے شاید پہلی بار غور سے دیکھا۔ حالانکہ وہ ابھی خاصی بے ڈھنگی سی تھی لیکن اس وقت اس پر محبت کا نور برس رہا تھا۔

وہ یکایک اچھی لگنے لگی تھی۔ میں اسے ابھی کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ اس نے کہا۔ "اب میں آپ کو ایک بات بتاؤں میں آپ کو ہر دوسری رات خواب میں دیکھتی ہوں۔"

"کیوں ہر دوسری رات کیوں روزانہ کیوں نہیں دیکھتیں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ ایک رات نصیر میرے خواب میں آیا کرتا ہے۔"

"اور یہ نصیر کون ہے؟"

"میرا منگیتر تھا۔" اس نے ایک دکھ بھری آہ بھری۔ "اس کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"اوہ۔" میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

"بہت دردناک کہانی ہے میری ارسلان صاحب۔ نصیر کے بعد میں محبت کے لیے بھٹکتی پھر رہی ہوں، جب آپ کو دیکھا تو کسی نے مجھ سے پکار کر کہا 'رشیدہ دیکھ یہی ہے وہ آدمی جو تجھ سے پیار کرے گا اور تجھے زندگی کی خوشیاں دے گا پھر میں آپ کے پاس آ گئی' حالانکہ گول گپے کے پیسے تھے میرے پاس لیکن میں نے جان بوجھ کر بہانہ کیا تھا۔"

"رشیدہ تم نے مجھے حیران کر دیا ہے۔"

"حیران نہ ہوں، یہ بتائیں آپ خود کیا کہتے ہیں؟"

"یہ میں سوچ کر بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں جی پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ محبت ابھی کچی ہے۔ پکی محبت میں سوچا نہیں جاتا۔ چلیں آج پھر گول گپے کھلائیں۔ ہو سکتا ہے کہ گول گپے کھاتے کھاتے محبت پکی ہو جائے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ گول گپوں اور محبت کے درمیان کیا تعلق تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ جب ایک خاص ادا سے ناک سکیڑتی ہوئی گول گپے کھائے جا رہی تھی تو مجھے اس سے محبت ہوئی۔

حبیب جالب اور محمد علی کی پیار بھری لڑائیاں

جنرل ضیاء الحق نے مارچ 1981ء میں لاہور کے تقریباً ہر قابل ذکر شخص کو جیل کی چار دیواری میں بند کر دیا تھا۔ ان میں حمید اختر، شعیب ہاشمی، حبیب جالب، محمود علی قصوری، مظہر علی خان، عبداللہ ملک، رضا کاظم، اداکار حبیب، راؤ رشید، ڈاکٹر مبشر حسن، آئی اے رحمن، جج سعید ملک، رودن ملک، اداکار محمد علی اور درجنوں جمہوریت پسند وکلاء شامل تھے۔ یہ محمد علی کے عروج کا دور تھا اور وہ بڑی شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر جیل کے شب و روز اس نے بڑے حوصلے سے گزارے۔ یہ سارے سیاسی قیدی تھے اس لیے ان سے عام قیدیوں جیسا سلوک نہیں کیا جا رہا تھا۔ لاہور کے کوٹ لکھپت جیل میں ان سیاسی قیدیوں نے وقت گزاری کے لیے والی بال کی ایک ٹیم بنائی تھی۔ جس کے کپتان حمید اختر اور نائب کپتان محمد علی تھے۔ دو ٹیمیں بنائی گئی تھیں جس کے ایک دھڑے میں حمید اختر، حبیب جالب، محمد علی اور کچھ دیگر لوگ تھے۔ دوسرے دھڑے میں ایک وکیل، اداکار حبیب اور کچھ دیگر لوگ تھے۔ دونوں ٹیموں کے درمیان اکثر مقابلے ہوتے تھے اور اکثر محمد علی کے غلط کھیل کی وجہ سے حمید اختر کی ٹیم سے نکالنے کا مطالبہ کرتے۔ ایک بار ایسے ہی ایک مقابلے میں میاں محمود علی قصوری نے ٹرافی دینے کا اعلان کیا۔ محمد علی کی غلطیوں کی وجہ سے ان کی ٹیم ہار گئی اور ٹرافی دوسری ٹیم کو دے دی گئی۔ ٹرافی میچ کے دوران ٹرے میں کپڑے سے ڈھانپی ہوئی سامنے رکھی ہوئی تھی۔ جیتنے والی ٹیم کو دیتے وقت کپڑا اٹھایا گیا تو ایک ٹرے میں ایک بڑا سا تربوز رکھا ہوا تھا۔ حبیب جالب اس روز اتنے غصے میں تھے کہ انہوں نے رات کو کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

ان لڑائیوں کے باوجود محمد علی اور حبیب جالب میں دوستی اور محبت کا بڑا پختہ رشتہ تھا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی دونوں تاش لے کر بیٹھ جاتے۔ شرط میں سگریٹ کی ڈبیا رکھی جاتی۔ ایک دن حبیب جالب نے بازی میں دو ڈبیا جیتنے کے بعد دونوں اگلی بازی میں لگا دیں۔ یہ بازی بھی حبیب جالب جیت گئے تو چار ڈبیا بازی میں لگا دیں۔ یہ بازی بھی جالب کے ہاتھ رہی اور وہ آٹھ ڈبیوں کے مالک بن گئے۔ حمید اختر نے انہیں سمجھایا کہ بس اب باز آ جاؤ۔ ان آٹھ ڈبیوں سے آرام سے آٹھ دن گزارا ہو جائے گا لیکن وہ نہیں مانے اور آٹھ ڈبیاں اگلی بازی میں لگا دیں مگر یہ بازی محمد علی جیت گئے۔ محمد علی کو جب پتا چلتا کہ جالب کے پاس سگریٹ ختم ہو گئے ہیں تو وہ اکثر جان بوجھ کر ہار جاتے اور یوں جیل میں جالب کے سگریٹوں کا مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ محمد علی کا کھانا ان کے گھر سے آتا تھا جو وہ دوستوں کے ساتھ مل بیٹھ کر کھاتا تھا۔ ان کے اکثر مداح قصور سے مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے بھجواتے تھے جو وہ قیدیوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

مرسلہ: انور فرہاد۔ کراچی

اس محبت کی تین وجوہات بیان کر چکا ہوں اور سب سے آخری وجہ یہی تھی کہ اگر میں اس سے بھی محبت نہ کروں تو پھر کس سے کروں، میرے لیے تو وہ دور تک صرف سناٹا تھا۔

لہٰذا وہ جیسے ہی گول گپوں سے فارغ ہوئی میں نے اس سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ اس وقت اس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ "دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ آپ کو بھی مجھ سے محبت ہو جائے گی۔"

"تم نے ٹھیک کہا رشیدہ۔ اب شاید میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکوں گا۔"

"نہیں اتنی جلدی اس قسم کے فیصلے نہ کیا کریں۔" اس نے کہا۔ "بلکہ محبت کو آزمانے کا موقع دیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو آزما لینا چاہیے۔ اس کے بعد اس قسم کے ڈائیلاگ مناسب ہوتے ہیں۔"

"لیکن کیسے۔ بتاؤ کیسے آزمایا جائے؟"

"سب سے پہلے آپ مجھے آزمائیں۔"

"رشیدہ تم ہی بتاؤ میں تمہیں کیسے آزماؤں؟"

"آپ مجھے حکم دیں کہ رشیدہ کل میرے لیے کدو کا حلوہ بنا کر لے آؤ۔" اس نے کہا۔

"یہ کیسی آزمائش ہوئی؟"

"بھی تو بات ہے۔" وہ ہنس پڑی۔ "میں کچن سے بہت دور بھاگتی ہوں۔ اس کے قریب بھی نہیں جاتی لیکن صرف آپ کے لیے کدو کا حلوہ بناؤں گی۔ چاہے میرا جو بھی حال ہو جائے۔"

"لیکن یہ تو کوئی خاص آزمائش نہیں ہوئی۔"

"اوہو یہ تو پہلی آزمائش ہے۔ دوسری بار چکن قورمے کی فرمائش کریں۔ جان پر کھیل کر بنا کر لے آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اب جیسی محبت ہے ویسی ہی آزمائش ہو گی۔ جاؤ کل میرے لیے کدو کا حلوہ بنا کر لے آؤ۔"

اور وہ محبت کے اس پہلے امتحان میں پوری اتر گئی۔ وہ میرے لیے کدو کا حلوہ بنا کر لے آئی تھی اور حلوہ بھی ایسا کہ کھا کر دل خوش ہو گیا۔ اتنا مزیدار تھا کہ حلوہ کھا لینے کے بعد میرے دل میں اس کی محبت اچھی خاصی جاگ اٹھی

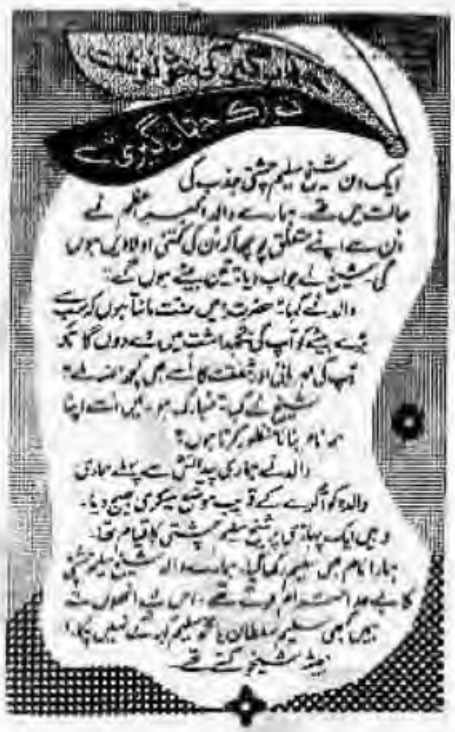

ایک دن شیخ سلیم چشتی جذب کی حالت میں تھے۔ ہمارے والد محترم اکبر اعظم نے ان سے اپنے متعلق پوچھا کہ ان کی کتنی اولادیں ہوں گی۔ شیخ نے جواب دیا: "تین بیٹے ہوں گے۔"

والد نے کہا: "حضرت! میں منت مانتا ہوں کہ سب سے بڑے بیٹے کو آپ کی نگہداشت میں دے دوں گا تاکہ آپ کی مہربانی اور شفقت کا سایہ اس پر رہے۔"

شیخ نے کہا: "مبارک ہو۔ میں اسے اپنا ہم نام بنانا منظور کرتا ہوں۔"

والد نے ہماری پیدائش سے پہلے ہماری والدہ کو آگرے کے قریب موضع سیکری بھیج دیا۔ وہیں ایک پہاڑی پر شیخ سلیم چشتی کا قیام تھا۔ ہمارا نام بھی سلیم رکھا گیا۔ ہمارے والد شیخ سلیم چشتی کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ہمیں بھی سلطان یا محمد سلیم کہہ کر نہیں پکارا بلکہ ہمیشہ شیخو کہتے تھے۔

تھی۔

کیا برائی تھی اس میں؟ کچھ بھی تو نہیں صرف دانت بڑے تھے، آنکھیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھا رہی تھیں۔ رنگ تھوڑا گہرا ہو گیا تھا۔ قد چھوٹا رہ گیا تھا۔

تو یہ سب تو ظاہری باتیں تھیں۔ اصل بات تو یہ تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس کے اندر ایک ایسی معصوم لڑکی تھی جو محبت کے لیے بھٹکتی پھر رہی تھی۔

دوسری بار وہ میرے لیے چکن قورمہ بنا کر لائی تھی پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "اب میں آپ کے لیے ہانڈی کباب بنا کر لاؤں گی۔"

"نہیں رشیدہ بس کرو۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم محبت کے امتحان میں پوری اتری ہو۔ اب تم میرا امتحان لو۔"

"نہیں جانے دیں میں آپ کا امتحان نہیں لوں گی۔"

"ایسا مت کہو تمہیں امتحان لینا ہوگا ورنہ میں تمہارے سامنے شرمندہ ہوتا رہوں گا۔"

"تو پھر ایسا کریں مجھے دس ہزار لا کر دیں۔" اس نے کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے مجھے پرسوں سیلری ملنے والی ہے۔ تم مجھ سے دس ہزار لے لینا۔"

"سوچ لیں۔"

"نہیں رشیدہ، ایسا مت کہو۔ اب تم بھی میری محبت دیکھ لینا۔"

میں نے اپنے وعدے کے مطابق دس ہزار روپے لا کر اسے دے دیے۔

روپے لینے کے بعد وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی اور بار بار مجھ سے محبت کا اظہار کیے جا رہی تھی پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "اب مجھے بھی آپ کی محبت کا یقین آ گیا ہے۔ اب آپ پرسوں یہیں ملیں میں آپ کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہوا ایک تحفہ دوں گی۔"

اور پھر اس سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔

نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ میں روزانہ گول گپے والے کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا لیکن اس کا کوئی پتا ہی نہیں تھا۔ دس ہزار لینے کے بعد وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکی تھی۔

اور ستم یہ تھا کہ وہ محلے میں بھی دکھائی نہیں دیتی تھی اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ میں اس کے گھر جا کر اس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا کیونکہ ایسی کوشش میں نقصان کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

چند دنوں کے بعد وہ آخر دکھائی دے گئی۔

وہ اسی گول گپے والے کے پاس ہی کھڑی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ "رشیدہ۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "یہ کیا حرکت ہے۔ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟"

"کون ہیں آپ؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا کہہ رہی ہو کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں۔" میں غصے سے بولا۔ "میں ارسلان ہوں۔"

"آپ ارسلان ہو سکتے ہیں لیکن میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"رشیدہ تم شاید پاگل ہو گئی ہو۔"

"اوہ اب سمجھی۔" وہ ہنس پڑی۔ "آپ شاید مجھے رشیدہ سمجھ رہے ہیں لیکن میں رشیدہ نہیں حمیدہ ہوں۔ اس کی جڑواں بہن ہوں۔"

"کیا! رشیدہ کی جڑواں بہن۔"

"ہاں ہم دونوں بالکل ایک ہی جیسے ہیں فرق صرف اس انگلی کا ہے۔" اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی بیچ کی انگلی دکھاتے ہوئے بتایا۔ "رشیدہ کی یہ انگلی تھوڑی سی لمبی ہے۔

بس اس کے علاوہ ہم دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔"

"خدا کی پناہ! پھر لوگ تمہیں پہچانتے کیسے ہیں؟ اب کسی کو اتنی فرصت ہے کہ وہ انگلی ناپتا پھرے۔"

"یہی تو پرابلم ہے۔ رشیدہ کوئی حرکت کرتی ہے تو لوگ مجھے پکڑ لیتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"اچھا چلو یہ بتاؤ، وہ رشیدہ کہاں ہے؟"

"وہ تو ماموں کے پاس اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔ لیکن بات کیا ہے کیا اس نے آپ کے ساتھ کوئی شرارت کی ہے۔ کیونکہ وہ اس قسم کی حرکتیں کرتی پھرتی ہے۔"

"اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اس نے کیا حرکت کی ہے۔ بہرحال اس کی واپسی کب تک ہوگی۔"

"وہ تین مہینوں کے بعد واپس آ جائے گی۔"

اب میں اس کی جڑواں بہن سے کیا بحث کرتا۔ رشیدہ تو مجھے دھوکا دے کر نکل گئی تھی اب اگر میں کسی کو بھی اپنے بے وقوف بننے کی کہانی سناتا تو سوائے اپنا مذاق اڑوانے کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اسی لیے میں ویسے تو خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا لیکن میرے سینے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس کم بخت نے دس ہزار روپے وصول کرنے تھے۔

"آپ بتاتے کیوں نہیں رشیدہ نے کیا حرکت کی ہے؟" حمیدہ نے پوچھا۔

میں نے اسے ساری بات بتاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کی حرکت کا کوئی غم نہیں ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ رشیدہ کو اپنا لوں اور وہ جو حرکتیں کرتی پھر رہی ہے وہ اس کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

"یہی تو ہم بھی چاہتے رہتے ہیں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "لیکن اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ آپ ایسا کریں سلیم بھائی سے مل لیں۔"

"یہ کون ہیں؟"

"ہمارے بڑے بھائی۔ ان کا گھر پر بہت رعب ہے۔ وہ رشیدہ کا دماغ درست کر دیں گے۔"

"تو کیا ان سے ملنے کے لیے تمہارے گھر آنا ہوگا۔"

"نہیں میرے گھر مت آ جائیے گا۔" حمیدہ جلدی سے بولی۔ "آپ فضلو پان والے سے پوچھ لیں وہ آپ کو بتا دے گا۔ عام طور پر وہ اس کی دکان پر ہوتے ہیں۔"

حمیدہ کے کہنے پر میں نے فضلو پان والے سے پوچھا۔ اس نے ایک بھیانک سے آدمی کی طرف اشارہ کر دیا۔ "یہ ہیں سلیم دادا۔"

دنیا کی خوشبوئیں

وہ سب کچھ خوشبوئیں جو بارودی فضاؤں میں کہیں کھو گئی ہیں دنیا کی خوشبوئیں ہیں۔ وہ سرسوں کے کھیتوں سے اٹھنے والی خوشبو، وہ آموں کے باغوں کی مہک، وہ گلابوں اور موتیے کے پھولوں کی خوشبوئیں اور وہ سب کچھ جو کبھی ہماری زندگی کا حصہ تھا۔ سرسوں کی بالیوں کی تتلیاں، بیلوں کی گھنٹیاں، کبوتروں کی غٹرغوں، گاؤں کی لڑکیوں کے گیت، اور ان سب میں بسی ہوئی وہ خوشبو جو صدیوں سے ہمارے ساتھ تھی اور آج کہیں کھو گئی ہے۔

چوہدری اقبال انصاری

سلیم دادا کو دیکھ کر دل لرز اٹھا تھا۔ وہ ایک باڈی بلڈر ٹائپ کا انسان تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں واپس لوٹ جاؤں لیکن فضلو پان والے نے اسے آواز دے کر بتا دیا۔ "سلیم دادا یہ صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

مرتا کیا نہ کرتا میں سلیم دادا کے پاس پہنچ گیا۔ "کیا بات ہے پہلوان کسی کو پھڑکانا ہے کیا؟"

"نہیں دادا آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"تو بولو۔"

"کسی جگہ بیٹھ جائیں تو پھر اطمینان سے بتاؤں گا۔"

سلیم دادا نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے برابر والے ہوٹل میں لے آیا۔ "ہاں پہلوان اب بتا کیا بات ہے؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے اسے اب تک کی ساری کہانی سنا دی۔ میرا خیال تھا وہ اٹھ کر مجھے مارنے لگے گا اس کے برعکس وہ ہنستا رہا پھر ہنستے ہوئے بولا۔ "پہلوان تو بھی کہاں پھنس گیا تھا۔ وہ رشیدہ اسی قسم کی حرکتیں کرتی ہے۔"

اب میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اسی لیے میں نے کہا۔ "سلیم دادا شاید میں اب رشیدہ سے شادی نہ کر سکوں لیکن وہ میرے دس ہزار تو واپس آ جائیں۔"

"فکر مت کرو پہلوان واپس آ جائیں گے لیکن ایک

شہر یر پہاڑی کوؤں کو قید کی سزا

لندن کے ایک اخبار کی اطلاع کے مطابق وہاں کے تاریخی مینار میں رہنے والے پہاڑی کوؤں کو ان کی شرارت پسندی پر چودہ دن کے لیے "پرندوں کے پنجرے" میں قید رہنے کی سزا دی گئی ہے۔ ان کے خلاف مینار کے باغبانوں کی شکایت تھی کہ زمین پر نئی گھاس نہیں بونے دیتے۔ گویا جیسے ہی باغبان زمین پر بیج ڈالتے ہیں اسی وقت یہ کوّے اپنے نوکیلے پنجوں سے مٹی کرید ڈالتے ہیں اور بیج نکال کر کھا جاتے ہیں ——— جہاں یہ بات بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان پرندوں کے بارے میں ایک پرانی روایت یہ بھی مشہور ہے کہ اس مینار کی چار دیواری میں ہر وقت منڈلانے والے یہ سیاہ پرندے "تاج برطانیہ کے محافظ ہیں، اور اگر یہ مینار میں نہ رہے تو شاید تاج برطانیہ بھی برقرار نہ رہ سکے۔ بہرحال تاج برطانیہ کے محافظ ہوں یا نہ ہوں انہیں تو پنجرے کی سزا ملنی ہی تھی چنانچہ مینار کے گورنر ماسٹر شیر نے انہیں ان کی شرارت پسندی پر سزا دیتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ "ان شرارت پسندوں کو چودہ دن تک پنجرے میں قید رکھا جائے۔"

شرط ہو گی۔"

"جی سلیم دادا! آپ اپنی شرط بھی بتا دیں۔"

"شرط یہ ہے کہ میں اپنا کمیشن لوں گا۔" سلیم دادا نے کہا۔

"کمیشن!" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں پہلوان، رشیدہ پہلے بھی اس قسم کی حرکتیں کر چکی ہے۔ بہت شریر ہے اور میں نے بندوں سے کمیشن لے کر ان کے پیسے واپس کیے ہیں۔"

"کتنا کمیشن لیں گے؟"

"تین ہزار۔" سلیم دادا نے بتایا۔ "تین ہزار ایڈوانس دینے ہوں گے پھر پورے دس ہزار تمہیں واپس مل جائیں گے۔ اب سوچ لو پہلوان یہ سودا برا نہیں ہے۔"

یہ سودا واقعی برا نہیں تھا۔ کم از کم سات ہزار تو واپس مل جاتے پھر میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا سلیم دادا کہ آپ ان ہی دس ہزار میں سے اپنا کمیشن کاٹ لیں۔"

"نہیں پہلوان۔" اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "اپنا یہ اصول ہی نہیں ہے۔ کمیشن پہلے۔ سودا کرنا ہو تو کر لو ورنہ جانے دو۔"

"ٹھیک ہے سلیم دادا! کل شام کو میں آپ کو تین ہزار دے دوں گا۔"

"بس تو پھر اپنے دس ہزار واپس سمجھو۔"

دوسری شام میں نے سلیم دادا کو تین ہزار لا کر دے دیے۔ وہ میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "بس پہلوان تمہارا کام ہو گیا۔ دو دنوں کے بعد لے لینا دس ہزار۔"

لیکن وہ دو دن بھی نہیں آ سکے۔ جس طرح رشیدہ غائب ہوئی تھی اسی طرح سلیم بھی غائب ہو گیا۔ خدا جانے کہاں چلا گیا تھا۔ میں روزانہ گفتلو پان والے کے کیبن تک جاتا لیکن اس کا کوئی سراغ ہی نہیں تھا۔ ایک دن میں نے گفتلو سے بھی دریافت کیا۔ اس نے بھی یہی بتایا کہ سلیم دادا کئی دنوں سے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کسی دھندے کے سلسلے میں کہیں گیا ہوا ہو۔

پھر ایک شام وہ محلے کے پارک میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوا مل گیا۔ میں سیدھا اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ "سلیم دادا تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "میں تو تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔"

"کیا بات ہے بھائی۔" اس نے عجیب انداز سے پوچھا۔ "کیا تکلیف ہے تم کو؟"

"سلیم دادا وہ دس ہزار روپے کی جو بات ہوئی ہے میں اسی کا پوچھ رہا ہوں۔"

"اوہ۔" وہ ہنس پڑا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے سلیم سے کوئی سودا کر لیا ہوگا۔ وہ اسی قسم کی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ تو سلیم کو پکڑو۔"

"سلیم کو پکڑوں تو پھر تم کون ہو؟"

"سلیم کا جڑواں بھائی کریم۔ ہم دونوں بالکل ایک جیسے ہیں۔ صرف بیچ کی انگلی کا فرق ہے۔"

اور میں وہاں سے بھاگ لیا اور اب تک بھاگتا ہی چلا جا رہا ہوں۔ کاش میں بھی کسی کا جڑواں ہوتا کاش!

● ●
● ●

حیران کرنے والا

[illegible]

جمیل اختر
(فیصل آباد)

میں یہ کئی بار بتا چکا ہوں کہ میں کرداروں کی تلاش میں رہا کرتا تھا۔

دلچسپ کردار، ایسے لوگ جن کے رویے دوسروں سے بہت الگ ہوتے تھے جو اپنی باتوں اور اپنے انداز سے حیران کر دیا کرتے۔

ایسے ہی ایک آدمی سلطان بھائی بھی تھے۔ ایک بے مثال کردار۔ میں نے سلطان بھائی جیسا مجلسی آدمی آج تک نہیں دیکھا تھا۔ کمال کی گفتگو کرتے۔ سماں باندھ کر رکھ دیتے تھے۔

میں نے پڑھا تھا کہ کسی زمانے میں قصہ گو ہوا کرتے تھے اور ایسے باکمال کہ اگر جنگ کی کہانی سنا رہے ہیں تو آنکھوں کے سامنے جنگ کے مناظر دوڑنے لگتے تھے، ایسے لوگ اب کہاں ہوتے ہیں۔

سلطان پست قد (لیکن ایسا کہ برا محسوس نہ ہو) خوبصورت آنکھوں اور شائستہ گفتگو کرنے والے انسان تھے، گالیاں بھی دیتے تو اتنی خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ کہ برا محسوس نہیں ہوتا تھا۔

خوش لباس بھی تھے۔ میں نے ہمیشہ انہیں کلف لگے ہوئے کرتے اور پاجامے کے ساتھ دیکھا۔ خوبصورت سی سلیم شاہی جوتیاں ان کے پیروں کی زینت ہوا کرتی تھیں۔

انہوں نے لوگوں کو ہمیشہ حیران کیا، اپنی باتوں سے اور اپنی حرکتوں سے بلکہ ان کا کہنا بھی یہی تھا۔ "میاں میں تو حیران کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔"

سلطان بھائی اپنے کوارٹر میں اکیلے رہا کرتے، ان کی گزر اوقات کتابت پر تھی۔ کسی اخبار میں کل وقتی کاتب تھے۔ عام طور پر رات دس کے بعد اپنی ڈیوٹی پر جایا کرتے اور واپسی صبح کو ہوا کرتی تھی۔ وہ دوپہر تک اپنے کوارٹر میں سوتے رہتے۔ اس کے بعد مجلس یاراں جما کر بیٹھ جاتے۔

ہم جیسے دو چار دوست تقریباً ہر دوسری شام کو ان کے پاس حاضر ہوتے اور ان کی دلچسپ باتیں سنتے رہتے۔ اس دوران مجال نہیں تھی کہ ہم ان سے الٹے سیدھے سوالات کریں بلکہ یہ لازم تھا کہ ان کی ہر بات کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوتے اور تواضع بھی کرتے۔ بنیادی طور پر وہ ایک سیدھے سادے انسان تھے۔

ایک شام انہوں نے ہم سے کہا۔ "بھائیو تم لوگ شام کو ہمارے پاس ضرور آنا تمہارے لیے خاص قسم کی دعوت ہے۔"

"یہ خاص قسم کی دعوت کیا ہوتی ہے سلطان بھائی۔"

"ارے بھئی میں آج کل کچھ نئی چیزیں پکانے کی کوشش کر رہا ہوں ان میں سے ایک برما کی ڈش بھنڈالو بھی ہے۔"

"یہ بھنڈالو کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گوشت کا ایک سالن۔ پہلے سے کیا بتاؤں جب کھاؤ گے تو خود ہی پتا چل جائے گا۔"

خیر تو سلطان بھائی کی دعوت پر دوسری شام ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔ ہم تین دوست تھے۔ میں اکرام اور محسن۔

ہم نے دیکھا کہ سلطان بھائی کا اوٹ پٹانگ کمرا اس وقت بہت ترتیب سے سجا ہوا تھا۔ کمرے میں فرنیچر کے بجائے دری اور سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔

سلطان بھائی نے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا تھا۔ ہم چاندنی پر بیٹھ گئے۔ معمول کے مطابق ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ سلطان بھائی نے اپنے کارنامے بیان کرنے شروع کر دیے۔ میں نے شاید یہ نہیں بتایا ہے کہ سلطان بھائی گپ بازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اس وقت سلطان بھائی اپنا وہ واقعہ سنا رہے تھے جب انہوں نے ایک جل پری پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ "بھائی میاں میں تو ایک گھنٹے تک بے ہوش پڑا رہ گیا تھا۔"

"آخر کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "کیا اس کے حسن سے مرعوب ہو گئے تھے؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو یار، کیسا حسن کہاں کا حسن۔ جب میں کیلی فورنیا والی حسینہ سے مرعوب نہیں ہوا تو یہ جل پری کیا بیچتی ہے۔"

"تو پھر کیوں بے ہوش ہوئے تھے؟"

"بھائی میاں، اس کے جسم میں کرنٹ ہوتا ہے۔ ایسا جھٹکا دیتی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو۔"

اس دوران ایک عورت کمرے میں ایک ٹرے لیے ہوئے داخل ہوئی۔ ہم نے کسی عورت کو پہلی بار سلطان بھائی کے گھر میں دیکھا تھا۔ وہ اکہرے بدن کی قبول صورت عورت تھی۔ نقش بہت تیکھے تھے۔ ہم سب حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتے رہ گئے تھے۔

اس عورت نے دو ٹرے لا کر ہمارے درمیان رکھ دی۔ اس میں ایک بڑا پیالہ تھا جس میں سالن تھا۔ ساتھ میں روٹیاں بھی تھیں۔ "لو میاں بھنڈالو حاضر ہے۔" سلطان بھائی نے کہا۔

"سلطان بھائی یہ، یہ کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میری بیگم۔"

"کیا......!" ہم سب اچھل ہی پڑے تھے۔ یہ ایسا انکشاف تھا جس نے ہمیں حیران اور پریشان کر دیا تھا۔ وہ عورت دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"کیوں بھائیو ہو گئے نا حیران۔" سلطان بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھائی میاں اپنی تو عادت ہے کہ جو کام کیا حیران کر دیا۔ چھوٹے موٹے کام میں تو ہاتھ ہی نہیں ڈالتا۔"

"لیکن آپ نے تو پہلے کبھی تذکرہ نہیں کیا۔"

"بھائی میاں، تذکرہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے سوچا کہ جب سورج چڑھے گا تو دنیا خود ہی دیکھ لے گی۔"

"بھابی آپ بیٹھ تو جائیں۔" میں نے اس عورت سے کہا۔

وہ مسکراتی ہوئی ایک طرف بیٹھ گئی۔ "چلیں اب اپنا تعارف بھی کروا دیں۔" محسن نے کہا۔

"میرا نام شگفتہ ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور مزید یہ کہ میں ان کی بیگم ہوں۔" اس نے سلطان بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن یہ شادی کب ہوئی، ہمیں تو انہوں نے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔"

"بھائی میاں، اب میں اصل کہانی بتاتا ہوں۔" سلطان بھائی کی آواز گونجی۔ "بات یہ ہے بھائی کہ یہ میری بیگم تو بہت پرانی ہیں یعنی مطلب یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس ہو گئے لیکن یہ مجھ سے ناراض ہو کر اپنے میکے میں جا کر رہنے لگی تھیں پھر بھائی میاں ایسا راستہ نکلا کہ بارہ برس کے بعد میں انہیں منا کر لے آیا ہوں۔"

"سلطان بھائی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اب آپ دونوں محبت سے اپنی زندگی گزاریے گا، لڑائی جھگڑے کی ضرورت نہیں ہے۔"

سلطان بھائی اس عورت کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے، اس نے بھی شرما کر اپنی گردن جھکالی تھی۔ وہ عورت بیس دن دنوں تک ان کے پاس دکھائی دیتی رہی۔ ہم جب جاتے ہمارے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست وہی کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ پھر اچانک غائب ہو گئی۔ ہم جاتے تو وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتی۔ خود سلطان بھائی بھی کچھ بجھے بجھے سے تھے۔

"کیا بات ہے سلطان بھائی، بھابی کہاں ہیں آج کل دکھائی نہیں دیتیں۔"

"بھائی میاں وہ وہیں چلی گئی جہاں سے آئی تھی۔"

"یعنی ناراض ہو کر پھر اپنے میکے چلی گئیں۔"

"ارے بھائی کہاں کا میکا، کیسا میکا۔ میں تو اس کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں ہوں۔"

"کیا......!" ہم سب اچھل ہی پڑے تھے۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"بھائی میاں، وہ ایک بے سہارا عورت تھی۔" سلطان بھائی نے بتایا۔

کہانی کچھ یوں تھی کہ کہیں سے وہ عورت انہیں مل گئی تھی۔ اس نے اپنے بارے میں ایک دردناک کہانی سلطان بھائی کو سنادی تھی کہ اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اولاد کوئی نہیں تھی اور نہ ہی اس کا کوئی گھر بار تھا۔ سلطان بھائی نے

المیہ

شعیب احمد ... [illegible]

کی زندگی میں اس سے بڑھ کر کوئی ... [illegible]

[illegible]

(ابن انشا ... [illegible])

از راہ ہمدردی اس کو سہارا دینے کے لیے شادی کی پیشکش کر دی جو اس نے فوراً ہی قبول کر لی تھی۔ سلطان بھائی اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ یہ تجویز خود سلطان بھائی کی تھی کہ وہ اسے اپنی بیوی ظاہر کریں گے تاکہ لوگ ان کا مذاق نہ اڑائیں کہ اس عمر میں شادی کرنے چلے ہیں پھر دو چار دنوں کے بعد وہ اس سے باقاعدہ نکاح کر لیتے لیکن اس کی نوبت آنے سے پہلے وہ کہیں چلی گئی۔

"یہ تو بہت برا ہوا سلطان بھائی، ویسے آپ کا کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔"

"میاں بس اتنا ہوا ہے کہ میں نے گھر میں دو ہزار روپے رکھے ہوئے تھے وہ ان پیسوں کو لے کر بھاگ گئی۔"

واضح ہو کہ اس زمانے کے دو ہزار بہت بڑی رقم تھی۔

ہم سبھوں نے اس حماقت پر سلطان بھائی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ وہ بس مسکراتے رہے تھے۔ "ارے جانے دو بھائی وہ کون سا میرا نصیب لے گئی ہے۔ بس دعا کرتا ہوں کہ خدا اس کو سیدھے راستے پر لے آئے اور خوش رہے۔"

تو ایسے تھے سلطان بھائی۔

ایک بار انہوں نے اپنا ایک کارنامہ بتایا تھا۔ "میاں جالوت کی وجہ سے آج کل بہت پریشان ہوں۔"

"اور یہ جالوت کون ہے سلطان بھائی؟"

"جنوں کے سردار کا بیٹا ہے۔ ہمارے حساب سے سوا سو سال کا سمجھ لو۔ ان کے حساب سے صرف گیارہ بارہ

بوس کا ہے۔"
"اس کی وجہ سے کیا پریشانی ہے۔"
"پڑھ کر نہیں دے رہا۔" سلطان بھائی نے بتایا۔ "میں اسے اردو پڑھاتا ہوں۔"
"یعنی آپ جن کے بچے کو پڑھاتے ہیں۔"
"بھائی میاں ہو گئے نا حیران۔ ایک دو نہیں درجنوں ہیں۔" انہوں نے بتایا۔ "میرا تو روزگار ہی یہی ہے۔"
یہ ٹھیک ہی تھا۔ ہم نے تو کبھی سلطان بھائی کو کوئی کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن یہ جنوں کے بچوں کو ٹیوشن والی بات ہضم نہیں ہو رہی تھی لیکن خود سلطان بھائی کہہ رہے تھے اسی لیے مان لینے میں ہی بھلائی تھی۔
بڑے مزے کے آدمی تھے۔ ایسے لوگ نا پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک دن انہوں نے ایک اور شوشہ چھوڑ دیا۔ یہ ایک حیرت انگیز اور خطرناک شوق تھا جو اُن کے لیے پریشانی پیدا کر سکتا تھا اور وہ کئی دنوں تک پریشان بھی رہے۔
ہمارے علاقے میں ایک خطرناک آدمی ہوا کرتا تھا۔ تیمور نام تھا اس کا۔ اتفاق سے اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ بھی تھی اس لیے وہ تیمور لنگ کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔
وہ آدمی ذرا ذرا سی بات پر چاقو نکال لیا کرتا۔ اس زمانے میں چاقو اور خنجر وغیرہ ہی کام آتے تھے۔ وہ کئی لوگوں کو بری طرح زخمی بھی کر چکا تھا اسی لیے لوگ اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔
ایک دن سلطان بھائی نے سوچ میں آ کر ہم لوگوں سے کہا۔ "بھائیو! تم لوگ دیکھ لینا اس سالے تیمور لنگ کی موت میرے ہی ہاتھوں ہوگی۔"
"ایسا نہ کہا کریں سلطان بھائی۔"
"کیوں نہ کہوں۔ اب دو دفعہ اس کو معاف کر چکا ہوں۔ چیتے پر سوار ہو گیا تھا میں۔ دل چاہ رہا تھا کہ کم بخت کا گلا دبا کر مار دوں لیکن اس کی بیوی روتی ہوئی آ گئی۔ اس کی وجہ سے اسے معاف کر دیا ورنہ آج تک اس کی ہڈیاں بھی نمک بن چکی ہوتیں۔"
"آخر بات کیا ہوئی تھی استاد! آپ کیوں اس سے ناراض ہو گئے تھے؟"
"میاں وہ ڈینگ ہانک رہا تھا کہ میں دس آدمیوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ ذرا سی دیر میں ڈھیر کر دیتا ہوں۔ بس مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا آ ذرا مجھے ڈھیر کر کے دکھا۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا اور میں نے اپنا خاندانی داؤ لگا کر اسے چت کر دیا پھر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔"
"لیکن سلطان بھائی ہم نے تو آج تک اس واقعے کے بارے میں نہیں سنا۔"
"میاں کیسے سنتے۔ اس نے قسم دے دی تھی کہ میں کسی سے اس کا ذکر نہ کروں ورنہ اس کی عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی۔ وہ تو بات چل نکلی ہے تو میں نے بتا دی ورنہ بھی اس راز کو ظاہر نہیں کرتا۔"
ایک دن میں نے سلطان بھائی کو تیمور سے الجھتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس وقت میں کچھ فاصلے پر تھا۔ اس لیے ان کی باتیں تو سن نہ سکا لیکن اتنا ضرور احساس ہو گیا تھا کہ سلطان بھائی کسی بات پر تیمور پر ناراض ہو رہے ہیں جب کہ تیمور ہاتھ جھٹک جھٹک کر انہیں خود سے دور رہنے کے لیے کہہ رہا تھا۔
پتا نہیں کیا معاملہ ہو گیا تھا۔ میں صورتِ حال جاننے کے لیے جب قریب پہنچا تو یہ جھگڑا ختم ہو چکا تھا۔ "کیا بات تھی سلطان بھائی۔" میں نے پوچھا۔ "کس بات پر جھگڑا ہو رہا تھا۔"
"الٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا۔" سلطان بھائی نے کہا۔ "تم خود سوچو میں کہاں برداشت کرنے والا ہوں۔"
"سچ تو یہ ہے سلطان بھائی کہ آپ نے ہر گھڑی حیران کیا ہے۔ ورنہ اس علاقے میں تیمور جیسے آدمی سے الجھنا کوئی آسان نہیں ہے۔"
"میاں تم دیکھ لینا' ایک دن اور حیران کر دوں گا۔"
اور وہ حیرانی یوں سامنے آئی کہ ایک رات تیمور کی لاش محلے کے میدان میں پڑی ہوئی ملی.... کسی نے چاقو کے ذریعے اس کا خون کر دیا تھا۔ پورے علاقے میں سنسنی پھیل گئی تھی، کون تھا اس کا قاتل کیا سلطان بھائی، نہیں وہ تو صرف باتوں کے وحشی تھے ان سے یہ کام کہاں ہو سکتا تھا۔
پھر خبر آئی کہ تیمور کے قتل کے شبے میں سلطان بھائی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ خبر ہم پر ایٹم بم بن کر گری تھی۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ تیمور کے قتل کے بعد سلطان بھائی سے ہماری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ کہیں اور چلے گئے اور جہاں گئے تھے وہاں سے پولیس نے انہیں گرفتار کیا تھا۔
ہم سب دوست سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ سلطان بھائی نے یہ کیا کر دیا تھا۔ "یار سلطان بھائی کو دوسروں کو حیران کرنے کا خبط تھا۔" اکرام نے کہا۔ "اسی پاگل پن میں انہوں نے خطرناک حرکت کر ڈالی ہے۔"
"لیکن یہ تو اپنی موت آپ مرنے والی بات ہے۔"

"اب کیا کیا جائے۔"
لیکن اس سے یہ ثابت ہوا کہ سلطان بھائی ہیں خطرناک آدمی۔ انہوں نے تیمور جیسے خطرناک بندے کی چھٹی کر دی۔"
ہم سب ابھی سوچ رہے تھے کہ ہم سلطان بھائی کی مدد کے لیے کیا کر سکتے ہیں کہ دو چار دنوں کے بعد سلطان بھائی کو چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ اصل قاتل پکڑا گیا تھا اور اس قتل سے سلطان بھائی کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔
ان کی رہائی کی خبر ملتے ہی ہم دوڑتے ہوئے سلطان بھائی کے پاس پہنچ گئے۔ وہ حسب معمول اپنے پرانے موڈ میں تھے۔ "بھائی میاں اور تو اچھا ہوا کہ اسے پہلے ہی کسی نے نپٹا دیا ورنہ وہ میرے ہاتھوں مارا جاتا۔"
"سلطان بھائی پولیس نے آپ پر کیوں شبہ کیا تھا؟"
"ارے بھائی کیا بتاؤں۔ ایک دن میں نے ہوٹل میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ میں تیمور کو نہیں چھوڑوں گا۔ بس پولیس نے اسی بات پر مجھے پکڑ لیا تھا۔"
"خدا کی پناہ! آخر آپ کو یہ سب کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"
"بس میاں' میں تو ایسا ہی آدمی ہوں۔ اسی قسم کے کارنامے کرتا ہوں۔ تم لوگ حیران ہو گئے تھے نا۔"
"ظاہر ہے ہمیں حیران تو ہونا ہی تھا۔"
ایک دن پتا چلا کہ سلطان بھائی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ یہ خبر محسن نے آ کر دی تھی۔ میں اور اکرام سلطان بھائی کے گھر پہنچ گئے۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر پڑے تڑپ رہے تھے۔
ہم ان کے منع کرنے کے باوجود انہیں زبردستی اسپتال لے آئے تھے، جہاں فوری طور پر انہیں داخل کر لیا گیا تھا پھر ڈاکٹر نے ہم تینوں کو اپنے کمرے میں بلا کر بتایا۔ "کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ ان صاحب کو کیا پرابلم ہے؟"
"نہیں ڈاکٹر صاحب ہمیں کچھ نہیں معلوم۔"
"آپ کے دوست کو آنتوں کا کینسر ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور ان کی زندگی بہت کم دنوں کی رہ گئی ہے۔"
"کیا......!" ہم تینوں سکتے میں رہ گئے تھے۔ "آنتوں کا کینسر اور اس طرح اچانک۔"
"اچانک نہیں' ان کا یہ مرض بہت پرانا ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔
ہم جب سلطان بھائی کے کمرے میں گئے تو ان کی

حسد

عمر رسیدہ سام اصمعی بہت بوڑھا ہو چکا تھا لیکن صحت و توانائی قابل رشک تھی۔ کسی نے پوچھا حضرت! آپ کی عمر کیا ہے؟

اصمعی نے جواب دیا۔ "ایک سو چھتیس سال۔"

اس شخص نے حیرت سے کہا۔ "اتنی تو ابھی تک میں نے عمر کسی کی سنی نہیں، اس پر بھی آپ کی صحت و توانائی قابل رشک ہے۔ صحت کا راز کیا ہے؟ کچھ ہمیں بھی بتائیے؟"

اصمعی نے جواب دیا۔ "اس کا کوئی راز نہیں زندگی کا بس ایک ہی بھید ہے اور وہ ہے "حسد" میں زندگی بھر اس سے دور رہا ہوں۔"

مرسلہ: جواد حسن۔ سیالکوٹ

حالت کچھ سنبھل چکی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ مسکرا دیے۔ "کیوں بھائی میاں کیا بتایا ہے ڈاکٹر نے؟ ویسے اس نے جو بتایا ہے وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں کینسر کا مریض ہوں۔"

"حد ہو گئی سلطان بھائی آپ نے یہ بات ہمیں پہلے کیوں نہیں بتائی۔"

"میاں میں نے سوچا جب یہ بات تم لوگوں کو اچانک پتا چلے گی تو تم لوگ کتنے حیران ہو جاؤ گے۔"

"حد ہو گئی سلطان بھائی۔" میں نے کہا۔ "آخر آپ کی یہ حیران کرنے والی عادت کب ختم ہو گی۔"

"میاں اب کیا ختم ہو گی۔ اب تو زندگی ختم ہونے والی ہے۔" سلطان بھائی [illegible] بولے۔

اور اس دن پہلی بار ہم نے سلطان بھائی کی آواز میں اداسی محسوس کی۔ ورنہ وہ تو ایسے انسان تھے جن کے ہونٹوں پر سوائے مسکراہٹوں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے کے عادی تھے۔

کچھ دنوں کے بعد انہیں گھر بھیج دیا گیا تھا لیکن واپس آنے کے بعد بھی ان کی وہی کیفیت تھی۔ وہی دوستوں کی محفلیں اور ان کے ایسے کارنامے جو شاید ان کے تصور سے بھی باہر تھے۔ اب تو ان کا دل رکھنے کے لیے ہم اور بھی زور و شور سے ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے تھے۔

کبھی کبھی ان کی عادتیں بچوں والی ہو جایا کرتیں انہیں ہفتے میں ایک بار چیک اپ کے لیے جانا پڑتا تھا لیکن وہ جانے سے کترایا کرتے تھے۔ "ارے نہیں میاں جب مجھے معلوم ہے کہ اس ساری بھاگ دوڑ کا نتیجہ موت ہے تو کیوں خواہ مخواہ دوسروں کو پریشان کروں۔ بس جیسا چل رہا ہے وہی ٹھیک ہے۔"

ایک دن پتا چلا کہ ان کی حالت بہت بگڑ گئی تھی۔ محلے والوں نے انہیں اسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔ ہم تینوں پھر انہیں دیکھنے پہنچ گئے۔ اس بار ان کی حالت واقعی نازک تھی۔ انہیں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا تھا، جہاں وہ تین دن رہے تھے پھر انہیں جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

ہمیں ان کی خبریں ملتی رہتی تھیں پھر ایک دن محسن کا فون آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "بھائی اسپتال آ جاؤ سلطان بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔"

میں اور اکرام فوری طور پر اسپتال پہنچ گئے۔ وہاں محسن موجود تھا۔ وہ عجیب وحشت زدہ سا ہو رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہیں اندازہ ہے کہ سلطان بھائی کی موت کس طرح ہوئی ہو گی۔"

"ظاہر ہے کینسر نے ان کی جان لے لی۔"

"کینسر نے نہیں، انہوں نے خودکشی کی ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔

"خودکشی!" میں اور اکرام اچھل پڑے۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں خدا جانے انہوں نے کہاں سے زہر حاصل کر لیا تھا۔ جسے کھا کر انہوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔"

"میرے خدا یہ انہوں نے کیا کیا؟" میں نڈھال سا ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔

"وہی جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔" اکرام نے کہا۔ "وہ حیران کر دینے کے عادی تھے اور اپنی موت کے سلسلے میں بھی ہم سب کو حیران کر گئے۔ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی موت کینسر سے ہو گی لیکن انہوں نے خودکشی کر لی۔ آخر دم تک وہ اپنی حیران کر دینے والی عادت پر قائم رہے تھے۔"

تو ایسے تھے سلطان بھائی۔ ابھی بھی جب کبھی ان کی یاد آتی ہے تو دل میں ایک ہوک سی اٹھنے لگتی ہے اور یہی مصرعہ ذہن میں آتا ہے۔ "پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ"

جناب ایڈیٹر صاحب!

تسلیمات

میں ایک ڈاکٹر ہوں، کافی عرصے تک عرب کی ایک ریاست کے ایک سرکاری اسپتال میں بھی وقت گزارا ہے۔ زیر نظر روداد اسی دور کی ہے۔ شاید قارئین اس روداد سے سبق حاصل کر لیں کہ بغض کتنی بری بلا ہے کس طرح اچھے بھلے انسان کو جہنم کا کندہ بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر مبشر حسن ملک

(گجرات)

دیدۂ عبرت

پرانی بات ہے، میں بیرون ملک ڈیپوٹیشن پر تھا۔ اسپتال میں میرے علاوہ کئی دیگر غیر ملکی بھی کام کیا کرتے تھے۔ وقت ملے تو ہم خوش گپیوں کے لیے اکٹھے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ایک عام سی صبح تھی۔ میں ایک کاؤنٹر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ نرسیں اپنے کام کاج میں مصروف تھیں۔ ڈاکٹر نے فائل مکمل کرتے ہوئے ایک خاتون کو اپنی طرف بلایا اور احترام سے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "آنٹی مبروک، آپ حاملہ ہیں۔"

یہ سننا تھا کہ مذکورہ خاتون طیش میں آ گئی اور زناٹے دار تھپڑ ڈاکٹر کے گال پر جڑ دیا۔ اسٹاف گھبرا کر اکٹھا ہو گیا۔

میرے بچپن میں ایک خاتون تھیں منظور کی اماں۔ میری اماں بتاتی تھیں کہ بیٹے جب یہ خاتون بیاہ کر آئی تھیں تو اس گھر میں اتنی غربت تھی کہ دو وقت چولہا مشکل سے جلتا تھا۔ مگر اس خاتون کے آنے کے بعد اس گھر کے حالات بدلنا شروع ہوئے اور پورے گاؤں کے لوگ حیران ہیں کہ کیا ایسی بات ہوئی جو ان کی حد سے بگڑی ہوئی معاشی اور گھریلو حالت میں اچانک اتنی تبدیلی آگئی۔ کہاں تو مشکل سے دو وقت کی روٹی نہیں ملتی تھی۔ کہاں یہ عالم ہے کہ کوئی سائل ضرورت مند اس خاتون کے گھر سے خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ نو دس سال کی عمر میں جب 1933 میں اپنے گاؤں سے بغرض تعلیم کلکتہ آیا تو میں ایک بار اس خاتون کے میاں جن کو میں نظیر چچا کہا کرتا تھا ان کی دکان پر ان سے ملنے گیا۔ بچپن سے میری یہ عادت رہی ہے کہ جب میں کسی بات کو نہیں سمجھ پاتا تو اس کی ٹوہ میں لگا رہتا ہوں۔ نظیر چچا کی دکان کلکتہ شہر کے ایک ایسے علاقہ میں تھی جو کوئی معروف حیثیت نہیں رکھتا تھا ان کی دکان کے سامنے لال دگی کھیل کا میدان تھا۔ انکے پاس ہی انکی ایک بہت چھوٹی سی ''پان بیڑی'' کی دکان تھی میں جس وقت انکی دکان پر گیا تھا وہ آدھی بیڑی بنانے میں مشغول تھے۔ اور نظیر چچا پان بنانے اور لگانے میں۔ گاؤں میں انکا گھر میرے پڑوس میں تھا۔ مل کر بہت خوش ہوئے۔ دکان میں اوپر بلا کر بیٹھا لیا۔

''شرم نہیں آتی آپ کو، میں باعزت خاتون ہوں، آٹھ سال سے بیوہ ہوں، آپ یہ مجھ پر کس بنیاد پر کر رہے ہیں؟''

ڈاکٹر ہواس باختہ کھڑا رہ گیا۔ میں بھی حیران ہو گیا۔ کچھ سمجھائی نہ دیا۔ خاتون کا تعلق بہتر فیملی سے لگتا تھا۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ بالغ نظری کے باوجود اس کا رویہ قطعی ناقابلِ فہم تھا۔ سب سے اہم بات کہ عرب غیر عرب کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ ہم کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنس جائیں یہ فکر انہیں پریشان کر رہی تھی۔

اسپتال کا منیجر فوری طور پر شعبے کی طرف آ گیا اور مریضہ سے معذرت کرنے لگا۔ پھر اس نے فریش یورین اور بلڈ سیمپل کی درخواست کی جو خاتون نے منظور کر لی۔

''بعض اوقات سیمپل تبدیل ہو جاتے ہیں۔'' منیجر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

مگر اس روز اس مد میں یہی واحد سیمپل تھا اور ڈاکٹر اپنی مہارت پر یقین بھی رکھتا تھا۔ اس نے دبے لفظوں میں منیجر سے خاتون کے رویے کی شکایت کی۔ منیجر نے اسے تسلی دی اور سیمپل اپنی نگرانی میں ریفرل اسپتال کی لیب بھجوا دیے۔

جو تفصیلات سامنے آئیں، ان کے مطابق مریضہ کا نام حسنیہ تھا۔ وہ پریشانیوں کے ادوار سے گزری تھی اور ڈپریشن کا شکار تھی۔ اس کی زندگی کا محور اور عشق چند برسوں پر محیط رہا تھا۔ ازدواجی زندگی فقط چھ برس برقرار رہی۔ وہ زمانہ اسے خواب لگتا تھا۔ واقعی اس وقت قدرت نے اسے نواز دیا تھا۔ شوہر مالدار تھا۔ پیار بھی کرتا تھا۔ وہ سب کچھ موجود تھا جس کا خواب کوئی بیوی دیکھ سکتی تھی مگر اولاد کوئی نہ تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے شوہر ابو رقیب نے کسی بچے کو گود لینے کی پیشکش کی مگر وہ راضی نہ ہوئی تو اس نے خالد نامی بچے کو گھر کے کام کاج کے لیے رکھ لیا۔ دھیرے دھیرے اس بچے کی حیثیت گھر کے فرد جیسی ہو گئی، اب لوگ اسے خالد رقیب کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

اس کے شوہر ابو رقیب میں ایک خامی بھی تھی۔ وہ گاڑی بہت تیز چلاتا تھا۔ ناقابلِ یقین حد تک ریش ہو جاتا تھا۔ اس بات پر حسنیہ، ابو رقیب سے جھگڑا کرتی تھی مگر اسے قائل نہ کر سکی۔ بالآخر اسی عادت نے ہنستے بستے کنبے کو اجاڑ دیا۔ بچے کے ساتھ حسنیہ اکیلی رہ گئی۔

ریفرل اسپتال سے جو رپورٹ آئی، اس میں حمل کی موجودگی کے علاوہ ہیروئن کے استعمال کا پہلو بھی عیاں نظر آتا تھا۔ حسنیہ کے پاؤں تلے سے زمین کھسک چکی تھی اور وہ پچھتا رہی تھی کہ کیوں اس نے ڈاکٹر کو تھپڑ مارا۔ کیوں جھگڑا مول لیا۔ اسے کیے کا نتیجہ سامنے آنے والا تھا۔ اس کی زندگی ڈاؤن لنک چکی تھی۔

عرب کے قانون کے مطابق یہ ایک بہت بڑا جرم تھا اس لیے اسپتال والوں نے رپورٹس کو کاپیاں پولیس کے حوالے کر دیں۔ ایجنسیاں حرکت میں آ گئیں۔ تحقیق شروع ہوئی تو بہت سی باتیں سامنے آ گئیں۔ خالد رقیب کو بھی تحقیق کے لیے وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے۔ ساتھ ہی وہ گروہ بھی پکڑا گیا جو نشہ آور دواؤں کا دھندا کرتا تھا۔ معاملہ آگے بڑھا تو ناقابلِ یقین کہانی نے جنم لیا، جو کبھی بھی ناقابلِ بیان بھی

یاتوں باتوں میں میں نے ان سے پوچھ لیا کہ چچا بس آپ کی یہی چھوٹی سی دکان ہے؟ بولے ہاں بیٹا اللہ اسی میں خیر و برکت دیتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا پورے گاؤں میں یہ بات سب جانتے ہیں کہ آپ کے گھر سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا اور چچی سب مانگنے والوں کو مٹھی بند کر کے ریزگاری دیتی ہیں۔ نظیر چچا نے دکان میں ایک ٹن کے ڈبہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ ڈبہ دیکھتے ہو جس دن سے یہ دکان کھولی، اللہ کا نام لے کر اس روز سے آج تک میرا یہ معمول ہے کہ روز مرہ جو کمری ہوتی ہے تو شام کو اس کا حساب کر کے ہر روپیہ پر ایک پیسہ غریبوں کے لئے نکال کر اس ڈبہ میں ڈال دیتا ہوں۔ جب ڈبہ بھر جاتا ہے تو وہ تمہاری چچی کے پاس بھجوا دیتا ہوں شروع دن سے آج تک میرا یہ روز مرہ کا معمول چلا آرہا ہے۔ ان کی زبان سے یہ سب سننے کے بعد مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ پڑوس میں۔ بڑے والی میری چچی منظور کی اماں کی خوشحالی اور سخاوت کا راز کیا تھا۔ گاؤں میں کوئی بھی مسافر اگر مسجد میں قیام کرتا، تو امام صاحب ''منظور کی اماں'' کے گھر خبر بھجوا دیتے، مسافر جتنے دنوں رہتے انکا دونوں وقت کا کھانا انکے گھر سے جاتا اگر زادِ راہ کی ضرورت پڑتی تو وہ بھی بھجوا دیتیں۔

(مرسلہ: راؤ عرفان، کراچی)

اکیلے تھی۔

حسنیہ بیوہ ہوئی تو چھبیس سال تھی۔ بہترین زندگی کی عادی ہو چکی تھی اور زندگی سے بھرپور تھی۔ حالات نے رخ بدلا تو اس کے لیے تلخ حقائق کا مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ یادیں دل دکھاتی تھیں۔ جیون بوجھ سا لگتا تھا۔ دس سال اسی طرح کٹے پھر وہ نفسیاتی مسائل کا شکار ہونے لگی۔

زندگی میں تبدیلی لانے کے لیے اس نے یورپ ٹور کا پروگرام بنایا۔ وہ پہلے ہی ذہنی پراگندگی کا شکار تھی، یہاں کے کھلے ماحول میں وہ شراب سے بہل رہی ہوتی۔ وطن واپسی پر بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حالات کی تنگی کو وہ شراب سے مٹانے کی کوشش کرتی۔ ایک غیر ملکی گروہ اسے شراب مہیا کرتا تھا۔ انہی لوگوں کے طفیل وہ ہیروئن کی طرف بھی مائل ہو گئی۔ گروہ کے لوگ اسے نشہ آور دوا بھی پہنچاتے تھے، بعد میں یہ ذمے داری خالد رقیب کی طرف منتقل ہو گئی۔ وہ ان سے دوا لے کر حسنیہ کو دیا کرتا تھا۔

وہ شعور کی طرف آ رہا تھا۔ مالکن کو نشہ کرتے دیکھتا بھی کرتا تھا، کیونکہ نشہ کرنے کے بعد حسنیہ بے سدھ ہو کر پڑی رہتی تھی۔ اپنے لباس سے بھی غافل ہو جاتی تھی۔ لمبا سا فراک بھی اس کے بدن پر ناکافی لگتا تھا۔ کئی کئی گھنٹے وہ بے حس پڑی رہتی تھی۔ خالد رقیب چھوٹا تھا تو اس کی نگاہوں میں شرم و حیا موجود تھی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جسمانی تبدیلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ نت نئے تجسس جنم لینے لگے۔ تجسس بڑھے تو شرم گھٹنے لگی۔ وہ اسی کمرے میں موجود رہنے لگا جہاں مالکن حالت نزاع میں مدہوش پڑی رہتی تھی۔ کبھی کبھی

منشیات کی یہی دوائیں بھی استعمال کر لیتا اور ان کے اثرات اپنے وجود پر محسوس کرتا۔ بعض اوقات اثر زیادہ بھی ہو جاتا تھا۔ کسی کے آنے پر یا فون پر کسی کے بلانے پر، وہ مالکن کو جھنجوڑ دیتا۔ نشہ کم ہوتا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ جاتی، تاہم بیچ میں چند ساعتیں ایسی بھی آتی تھیں، جب حسنیہ کسی صورت میں بھی حرکت نہیں کرتی تھی۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ وہ نیند کی حالت میں ابو رقیب کو پکارنے لگی۔

تحقیق جاری تھی۔ پولیس والے بال کی کھال تلاش کر رہے تھے کہ عقدہ کھلا کہ خالد خطرناک جنسی کا شکار ہو چکا ہے اور اب اس حالت میں جا چکا ہے جہاں سے واپسی کے در بند ہو چکے ہیں۔ دونوں کو جیل بھیج دیا گیا اور قانونی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔

حسنیہ اب پچھتاتی تھی۔ خالد رقیب کی طرف دیکھتی تو جیسے اس کی جان نکل جاتی۔ خالد رقیب کی عمر ہی کیا تھی، وہ جو بنا بھی سکتا تھا۔ فرمانبرداری میں حالات کا شکار ہو گیا۔ حکام بھی استار رہا۔

دنیا کے بعض خطوں میں نشہ آور ادویات کے ساتھ تعلق رکھنا ناقابلِ معافی کرایا جاتا ہے۔ ان جرائم میں رعایت کا پہلو نہیں نکلتا۔

حسنیہ اور خالد رقیب پر مقدمہ چلا۔ جرم ثابت ہو گیا۔ دونوں کو سزائے موت سنا دی گئی۔

''پہلے مجھے سزا دے دو'' یہ حسنیہ کی آخری خواہش تھی۔ ''کیونکہ میری ہی غلطی نے اس معصوم کو غلط راہوں کا راہی بنایا۔ نشہ آور دواؤں نے مجھے ورغلایا اور نشے میں اس بچے کو میں رقیب سمجھ بیٹھی۔ کاش میں نشے کا شکار نہ ہوتی۔''

●●●

برق رفتار

جناب معراج رسول صاحب!
آداب و سلام
امید ہے بخیریت ہوں گے۔ میں سرگزشت کی دلدادہ ہوں۔ کافی عرصے سے سوچ رہی تھی کہ میں اپنی سرگزشت لکھوں لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شروع کہاں سے کروں۔ کافی غور کے بعد ہمت کر لی ہے۔ اب پتا نہیں کہانی کا انداز اختیار کرسکی ہے یا نہیں؟ ویسے میری سرگزشت قارئین کو پسند ضرور آئے گی۔

ثنا
(کراچی)

اس کی انگلیاں بہت تیزی سے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔ پورے آفس میں اس کی ٹائپنگ اسپیڈ سب سے زیادہ تھی۔

فریحہ کو ملازمت کرتے ہوئے دو ہی مہینے ہوئے تھے اور ان دو مہینوں میں اس نے ایسی کارکردگی دکھائی تھی کہ آفس کے سی ای او بیگ صاحب نے اسے ڈپٹی منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی تھی۔

اس سے پہلے دفتر میں افتخار کے نام کا طوطی بولتا تھا۔ وہ جب ٹائپنگ کرتا تھا تو اس کی انگلیاں اس تیزی سے حرکت کرتی تھیں کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ وہ ٹائپ کرتے وقت نہ کمپیوٹر اسکرین پر نظر ڈالتا تھا، نہ کی بورڈ کو دیکھتا تھا، اس کی نظریں تو اس پیپر پر ہوتی تھیں جو اسے ٹائپ کرنا ہوتا تھا۔

وہ دوسری لڑکیوں کی ٹائپنگ اسپیڈ دیکھ کر بہت طنزیہ انداز میں مسکراتا تھا اور کہتا تھا "بیگ صاحب نے بھی چھانٹ چھانٹ کر سست اور کاہل لڑکیاں رکھی ہیں جو ایک گھنٹے کا کام پورے دن میں کرتی ہیں۔"

اس کا دعویٰ تھا کہ میری طرف سے سب کو چیلنج ہے۔ جو مجھ سے زیادہ تیز رفتاری سے ٹائپ کرے گا، میں نہ صرف اسے بلکہ پورے آفس کو لنچ کراؤں گا اور اس لڑکی کو انعام کے طور پر اپنے پورے مہینے کی تنخواہ بھی دوں گا۔

آفس میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مرد صرف چھ ہی تھے۔ افتخار، ارسلان، جاوید، حامد اور شعیب۔ اکاؤنٹنٹ نثار صاحب اور جی ایم عثمانی صاحب۔ نثار صاحب اور عثمانی صاحب بہت سینئر تھے۔ وہ ٹائپ بھی نہیں کرتے تھے، ان کے علاوہ بیگ صاحب تھے۔ وہ سی ای او تھے اس لیے میں نے آفس کے اسٹاف میں ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ میرے علاوہ آفس میں گیارہ لڑکیاں تھیں۔ وہ سب کمپیوٹر پر کام کرتی تھیں۔

ہماری کمپنی کا کاروبار دنیا بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ بیگ صاحب گارمنٹس، چمڑے کی مصنوعات، چاول، ڈبا بند پھل اور بہت سی چیزیں ایکسپورٹ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ دوائیں، مشینری، کاسمیٹکس وغیرہ امپورٹ کیا کرتے تھے۔ کام بہت زیادہ تھا اس لیے سوائے لنچ کے وقفے کے ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا تھا۔

افتخار کی نہ صرف ٹائپنگ اسپیڈ بہت زیادہ تھی بلکہ وہ کمپیوٹر کا کیڑا تھا۔ کسی کے سسٹم میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے،

ونڈو اڑ جائے یا انٹرنیٹ کا کوئی پرابلم ہو، افتخار اسے چٹکی بجاتے دور کر دیتا تھا۔

فریحہ پہلے دن آفس آئی تو وہ بہت خاموش خاموش سی تھی۔ عثمان صاحب نے اسے بھی ایک کمپیوٹر کے سامنے بٹھا دیا۔

وہ صبح سے شام تک خاموشی سے کام کرتی، لنچ بریک میں بھی سب سے الگ تھلگ رہتی اور اپنے گھر سے لایا ہوا کھانا ایک طرف بیٹھ کر کھا لیتی۔ دوسرے لوگ خوش گپیوں میں مصروف ہوتے لیکن وہ لنچ ختم کرتے ہی اپنی ٹیبل پر جا بیٹھتی اور کام شروع کر دیتی۔

پورے اسٹاف کی رائے اس کے بارے میں یہی تھی کہ فریحہ بہت مغرور ہے اور خود کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے۔

بلاشبہ وہ بہت حسین تھی، سرخ و سفید رنگت، گھنے سیاہ بال، متناسب جسم۔ وہ کپڑے پہننے کا سلیقہ بھی جانتی تھی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح اس نے ایک دفعہ بھی افتخار سے یا مجھ سے کسی لفظ کے معنی یا اسپیلنگ نہیں پوچھی تھی۔

فریحہ کو کام کرتے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا لیکن ہم میں سے کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا سوائے اس کے کہ اس کا نام فریحہ ہے۔

اس دن میری طبیعت کچھ خراب تھی۔ میں نے لنچ بھی نہیں کیا بلکہ صرف چائے پی کر اٹھ گئی۔ فریحہ حسب معمول لنچ کرنے کے فوراً بعد کام میں لگ گئی تھی۔ اس دن پہلی دفعہ میں نے اسے ٹائپنگ کرتے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ بالکل افتخار کے انداز میں برق رفتاری سے ٹائپ کر رہی تھی۔ وہ بھی اسکرین یا کی بورڈ کی طرف دیکھنے کے بجائے اس مینز کو دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ڈھائی تین صفحات کا وہ میٹر اس نے منٹوں میں ٹائپ کر کے اس کا پرنٹ آؤٹ نکال لیا۔

مجھے اچانک افتخار اور اس کے چیلنج کا خیال آیا۔ میں نے سوچا، فریحہ اور افتخار کا مقابلہ ہونا چاہیے۔ فریحہ نے افتخار کو شکست دے دی تو وہ بڑے بڑے دعوے کرنا بھول جائے گا۔

اب سوال یہ تھا کہ اس مقابلے کے لیے فریحہ کو کیسے

راضی کیا جائے؟ مجھ سے بھی بس واجبی طور پر بات کر لیتی تھی، زیادہ بے تکلف نہیں تھی۔

میں تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی، پھر اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی۔

مجھے دیکھ کر اس کی انگلیاں رک گئیں اور وہ بولی "جی مس ثنا! مجھ سے کوئی کام ہے؟"

"کام تو کوئی نہیں ......" میں نے مسکرا کر کہا "میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ آپ کے پاس ڈسپرین یا سر درد کی کوئی ٹیبلٹ ہو تو مجھے دے دیں۔ اس وقت منظور بھی مصروف ہے ورنہ اس سے منگا لیتی۔" منظور ہمارے آفس کا پیون تھا۔

"ارے تو آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" وہ جلدی سے بولی "میرے بیگ میں ڈسپرین پڑی ہے۔ کبھی کبھی مجھے بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ آپ بیٹھیے، میں آپ کو ابھی دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ باہر گئے ہوئے کولر سے پانی کا گلاس بھر لائی اور اپنے بیگ سے ڈسپرین کی گولیاں نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولی "یہ کھا لیں، ابھی آپ کا درد غائب ہو جائے گا۔"

میں نے گولیاں کھا کر اس سے کہا "تھینک یو فریحہ!"

وہ پہلی دفعہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بھی اس کی طرح دلکش تھی۔ "آپ میرا شکریہ اس وقت ادا کیجیے گا، جب آپ کا سر درد دور ہو جائے۔"

"آپ رہتی کہاں ہیں مس فریحہ؟" میں نے پوچھا۔

"میں ---- میں ---- نارتھ ---- کراچی میں رہتی ہوں۔"

اس کے چہرے پر پھر وہی سنجیدگی طاری ہو گئی۔ میں سمجھ گئی کہ اسے میرا سوال پسند نہیں آیا اس لیے میں بھی خاموش ہو گئی۔

میں خاموشی سے اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی اور یہی سوچتی رہی کہ فریحہ کو اس مقابلے کے لیے کیسے راضی کیا جائے؟ سوچتے سوچتے ایک ترکیب میرے ذہن میں آ ہی گئی۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھی اور عثمانی صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ عثمانی صاحب بہت باوقار اور لیے دیے رہنے والے آدمی تھے لیکن وہ اپنے اسٹاف پر بے جا سختی نہیں کرتے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ بولے "آیئے مس ثنا! کیا کوئی نیا پرابلم پیدا ہو گیا؟"

"سر، پرابلم تو نہیں، ایک چھوٹے سے معاملے میں آپ کی مدد درکار ہے۔" میں نے ہنس کر کہا، پھر انہیں فریحہ کے بارے میں بتایا کہ اس کی ٹائپنگ اسپیڈ تو افتخار صاحب سے بھی زیادہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان دونوں کا مقابلہ کروا دیا جائے۔

"بھئی، اس معاملے کا آفس سے کیا تعلق ہے؟ تم مقابلہ ضرور کراؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ اچھا ہے، افتخار صاحب کے بڑے بڑے دعوے ختم ہو جائیں گے۔"

"سر! فریحہ اس مقابلے کے لیے راضی نہیں ہو گی۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ وہ صاف انکار کر دے گی۔"

"تو آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں، میں اسے راضی کروں؟"

"سر بس آپ کہہ دیں کہ آئندہ ہفتے پورے اسٹاف کا ٹائپنگ مقابلہ ہو گا۔ جیتنے والے کو انعام دیا جائے گا۔"

"آفس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ اس بیگانا کام میں مجھے کیوں ملوث کر رہی ہیں؟ پھر جیتنے والے کو انعام کون دے گا؟"

"افتخار صاحب جیتنے والے کو اپنی پوری مہینے کی سیلری اور اسٹاف کو پرتکلف لنچ کرانے کا وعدہ کرتے رہتے ہیں۔" میں نے کہا "سر پلیز! انکار مت کیجیے گا۔"

"اچھا آپ جائیں، میں سوچوں گا۔" عثمانی صاحب نے کہا۔

میں مایوس ہو گئی۔ عثمانی صاحب کبھی نہیں کہتے تھے کہ سوچوں گا۔ وہ فوری طور پر بڑے بڑے فیصلے کرنے کے عادی تھے۔

میں خاموشی سے اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ میں مسلسل یہی سوچ رہی تھی کہ فریحہ کو اس مقابلے کے لیے کیسے راضی کیا جائے؟

مجھے سوچ میں گم دیکھ کر فریحہ میرے پاس آ گئی۔ مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ اس نے مسکرا کر پوچھا "مس ثنا! کیا ابھی تک آپ کے سر کا درد ٹھیک نہیں ہوا؟"

"نہیں، اب تو درد برائے نام ہے۔ آپ بیٹھیں نا۔" میں نے مسکرا کر کہا "میں آپ کے لیے چائے منگواتی ہوں۔"

وہ ہنس کر بولی "مس ثنا! میں کوئی مہمان نہیں ہوں اور میں چائے بہت کم پیتی ہوں۔"

"چلیے، آج ایک کپ میرے ساتھ پی لیں۔"

میں نے کچھ اس انداز میں کہا تھا کہ وہ راضی ہو گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ فریحہ اپنی سیٹ چھوڑ کر کسی کے پاس گئی تھی۔ دوسری لڑکیاں حیرت سے فریحہ کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کے آنے سے زیادہ لڑکیوں کو اس کی ہنسی پر حیرت تھی۔

میں نے کئی بار سوچا تھا کہ ثنا سے اس کی فیملی کے بارے میں معلوم کروں لیکن ہمت نہ پڑی۔

وہ چائے پی کر اٹھ کھڑی ہوئی "تھینکس مس ثنا! اب اگر درد ٹھیک نہ ہو تو ڈاکٹر کو ضرور دکھایئے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے چلی گئی۔

میں دوسرے دن آفس پہنچی تو میری طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ میں آج بھی اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ٹائپنگ کا مقابلہ کیسے کرایا جائے۔ عثمانی صاحب نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد عثمانی صاحب آ گئے۔ ہم بھی ہال کمرے میں بیٹھے تھے۔ ہر لڑکی کا رخ دیوار کی طرف تھا۔

عثمانی صاحب نے بلند آواز میں کہا "آپ لوگوں کے درمیان ٹائپنگ کا مقابلہ رکھا جا رہا ہے۔ جیتنے والے کو پچیس ہزار روپے دیے جائیں گے۔"

"یہ مقابلہ کب ہو گا سر!" راشدہ نے پوچھا۔

"یہ مقابلہ آئندہ ہفتے کسی بھی دن ہو سکتا ہے۔" عثمانی صاحب نے کہا۔

"سر! انعام افتخار صاحب کو دینا ہے تو ویسے ہی دے دیں، اس کمپٹیشن کی کیا ضرورت ہے۔" راشدہ نے کہا۔ "سب جانتے ہیں کہ یہ انعام افتخار صاحب جیت لیں گے۔"

"مقابلہ کرا کے دیکھیں مس راشدہ!" عثمانی صاحب نے کہا "یہ انعام آپ بھی جیت سکتی ہیں، مس یاسمین بھی جیت سکتی ہیں اور مسز ریاض بھی۔"

راشدہ کچھ بڑبڑا کر خاموش ہو گئی۔

افتخار نے کہا "چلو میری طرف سے تم لوگوں کو ایک رعایت ہے۔ اگر ٹائپنگ کا وقت پندرہ منٹ ہوا تو میں تم لوگوں کو تیس منٹ دے دوں گا، یعنی دگنا وقت۔"

"اس طرح تو آپ ہار جائیں گے مسٹر افتخار!" فریحہ نے پہلی دفعہ زبان کھولی "یا پھر ٹائپنگ میں غلطیاں کریں گے۔"

افتخار نے گھور کر فریحہ کو دیکھا، پھر مسکرا کر بولا "آپ اس آفس میں نئی ہیں مس فریحہ اس لیے ایسی بات کر رہی ہیں۔ میں نے ہارنا نہیں سیکھا، رہا غلطی کا سوال تو میری جو انگلی غلطی کرے، میں اسے کاٹ کر پھینک دوں۔"

"ایسی باتیں مت کریں مسٹر افتخار! جو آپ پوری نہ کر سکتے ہوں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اب تک آپ کے دونوں ہاتھ انگلیوں سے محروم ہوتے۔"

"چلیں پھر فی غلطی کوئی جرمانہ رکھ لیں۔" افتخار نے یوں کہا جیسے کسی بچے کو بہلا رہا ہو۔

قرآن پاک میں سورۃ الحجر 9 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ترجمہ "بلاشبہ ہم نے ہی قرآن پاک نازل کیا اور ہم خود ہی اسکی حفاظت کریں گے"

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن پاک کی حفاظت اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور وہی اسکا محافظ ہے۔ یہ حفاظت ایک تو اللہ تعالیٰ اپنے انتظام خاص سے کر رہے ہیں۔ دوسرے ساری دنیا میں ہزاروں کے حساب سے حافظ قرآن ہیں۔ جب تک ایک حافظ بھی زندہ ہے۔ قرآن پاک محفوظ و پائندہ ہے۔

دنیا میں غیر مسلم مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن پاک کے علاوہ تمام الہامی کتابیں اصل سے بدل چکی ہیں۔ لیکن وہ اسپر بھی متفق ہیں کہ قرآن پاک میں کوئی تحریف یا تبدیلی نہیں ہوئی۔ یورپ کے علماء اور اہل تحقیق نے بھی قرآن کے لفظی تواتر اور تحریف سے محفوظ رہنے کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ سر ولیم میور اپنی کتاب کی پہلی جلد مطبوعہ 1861 میں لکھتا ہے کہ قرآن پاک کا کوئی جزو، کوئی فقرہ، کوئی لفظ ایسا نہیں سنا گیا جس کو قرآن پاک کے جمع کرنے والوں نے چھوڑ دیا ہو اور نہ کوئی لفظ یا فقرہ ایسا پایا گیا جس سے یہ معلوم ہو کہ نیا داخل کیا گیا ہو۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگاروں نے بھی اس حقیقت کو انہی الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔

یہودی تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ تورات کے تمام نسخے دنیا سے یکسر ناپید ہو گئے۔ اسپر یہودی علماء بہت فکرمند ہوئے۔ لیکن ایک یہودی عالم حضرت عزیرؑ کو تورات زبانی یاد تھی۔ اس نے یہودی علما کو اپنا یاد کیا ہوا نسخہ از سر نو لکھوا دیا۔ اسی دوران اصل تورات کا ایک نسخہ مل گیا۔ انہوں نے اس نسخہ کا موازنہ جب حضرت عزیرؑ کے نسخے سے کیا تو وہ اصل تورات سے مل گیا۔ اسپر یہودیوں نے حضرت عزیرؑ کو "ابن اللہ" (اللہ کا بیٹا) کہنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے پاس قرآن پاک کے ہزاروں حافظ ہیں۔

قرآن پاک نے مختلف مقامات پر غیر مسلموں کو چیلنج دیے ہیں لیکن میں اختصار کی وجہ سے صرف ایک چیلنج کا ذکر کروں گا۔ حوالہ سورہ بقرہ آیت نمبر 23

ترجمہ: "ہم نے جو کچھ اپنے بندے پر اتارا ہے اس میں اگر تمہیں شک ہو اور اگر تم سچے ہو تو اس جیسی ایک سورۃ تو بنا لاؤ، اس میں تمہیں اختیار ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لاؤ"

لیکن 1400 سال گزر جانے کے بعد بھی یہ چیلنج کسی نے قبول نہیں کیا۔ غیر مسلموں کیلئے آج بھی چیلنج ہے۔

مرسلہ: عبدالرحمن: فیصل آباد

"ایک غلطی کے ایک ہزار روپے!" میں نے اچانک کہا۔

افتخار نے گھوم کر مجھے دیکھا، پھر بولا "مجھے منظور ہے لیکن کیا آپ بھی اپنی غلطی پر جرمانہ دیں گی؟"

"میں دوں گی۔" فریحہ نے کہا "میں جیتوں گی تو نہیں لیکن میری اور آپ کی غلطیاں علیحدہ سے شمار ہوں گی۔"

"اوکے، ڈن!" افتخار کے انداز میں تکبر تھا۔ وہ فریحہ سے یوں بھی خار کھاتا تھا۔ فریحہ نہ تو اس کی مردانہ وجاہت سے متاثر ہوئی تھی، نہ اس کی قابلیت سے۔ وہ فریحہ کو حقارت سے دیکھتے ہوئے چلا گیا۔

دوسرے ہفتے میں منگل کو اچانک عثمانی صاحب نے اعلان کر دیا کہ آج لنچ کے بعد آپ لوگوں کا ٹائپنگ مقابلہ ہوگا۔

لنچ کے بعد عثمانی صاحب ہال میں آ گئے۔ انہوں نے افتخار سمیت ہر لڑکی کو تقریباً پانچ صفحات کی ایک سمری دیتے ہوئے کہا "آپ سب کو یہ سمری بیس منٹ میں ٹائپ کرنی ہے۔"

"سر، میں پہلے ایک دفعہ اسے پڑھ لوں۔" افتخار نے کہا۔

"نہیں۔" عثمانی صاحب بولے "اسے آپ ٹائپ کرتے وقت ہی پڑھیے گا۔ ابھی تین بجنے میں ایک منٹ ہے۔ اس دوران میں آپ چاہیں تو اسے پڑھ لیں۔"

تین بجتے ہی عثمانی صاحب نے ٹائپنگ شروع کرنے کا اشارہ کر دیا۔

ہر آدمی مصروف ہو گیا۔ وہ سمری بہت ہی گھسے ہوئے نوٹ میں تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ پوری سمری ٹائپ کرنے میں مجھے کم سے کم پچیس منٹ لگیں گے۔ میری ٹائپنگ اسپیڈ بھی ساٹھ الفاظ فی منٹ تھی۔

افتخار اطمینان سے وہ میٹر پڑھتا رہا اور اپنی انگلیاں چٹخاتا رہا۔

اپنے کام سے زیادہ میری توجہ فریحہ پر تھی جس کی انگلیاں انتہائی برق رفتاری سے کی بورڈ پر تھرک رہی تھیں۔

پھر افتخار نے بھی ٹائپنگ شروع کر دی۔ مجھے کچھوے اور خرگوش کی روایتی کہانی یاد آ گئی۔ افتخار مجھے اس وقت خرگوش لگ رہا تھا جو اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر کبھی پانی پیتا تھا اور کبھی یونہی بیٹھ کر سستا لیتا تھا۔

ابھی تیرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ فریحہ پرنٹ آؤٹ نکالنے لگی۔ مزید دو منٹ اسے پرنٹ آؤٹ نکالنے میں لگے اور اس نے اپنے ٹائپ کیے ہوئے تمام صفحات اسٹیپل کر کے عثمانی صاحب کی طرف بڑھا دیے۔

"کیا آپ نے کام مکمل کر لیا؟" عثمانی صاحب نے حیرت سے کہا۔

"یس سر!" فریحہ نے کہا "میں نے پرنٹ آؤٹ سمیت اپنا کام پندرہ منٹ اور چالیس سیکنڈ میں مکمل کیا ہے۔"

ہال میں کی بورڈ کی ٹک ٹک اچانک رک گئی اور وہاں سناٹا چھا گیا۔ افتخار کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اس نے پرنٹ آؤٹ نکالتے ہوئے کہا "سر، ٹائپنگ میں پرنٹ آؤٹ نکالنے کا وقت شامل نہیں تھا۔"

"اس کے باوجود آپ نے اپنا کام سولہ منٹ میں مکمل کیا ہے اور مس فریحہ نے تیرہ منٹ میں۔"

"سر، ٹائپنگ میں فونٹ، پیراگراف، اسپیلنگ کی غلطیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔"

"آف کورس مسٹر افتخار!" عثمانی صاحب مسکرا کر بولے "لیکن اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔"

دوسری لڑکیوں نے معذرت کر لی کیونکہ ان لوگوں نے ابھی آدھا کام بھی مکمل نہیں کیا تھا۔ خود میں نے بھی زیادہ کوشش نہیں کی تھی۔ میں جانتی تھی کہ مقابلہ صرف فریحہ اور افتخار کے درمیان ہے۔

افتخار کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ مہینے بھر کی تنخواہ اور پورے اسٹاف کو لنچ کرانے میں اسے مالی نقصان تو ہوتا ہی، اس کی عزت بھی خاک میں مل گئی تھی۔

اب عثمانی صاحب فریحہ اور افتخار کے دیے ہوئے پرنٹ آؤٹ چیک کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی شاید طے کر لیا تھا کہ افتخار کو اچھی طرح ذلیل کر کے ہی رہیں گے۔

انہوں نے افتخار کے پرنٹ آؤٹ میں اسپیلنگ کی پانچ غلطیاں بھی نکال لیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ افتخار نے جوش میں آ کر فی غلطی ایک ہزار روپے دینے کی بات بھی کی ہے۔

میں جانتی تھی کہ فریحہ کے ٹائپ کیے ہوئے ڈرافٹ میں اسپیلنگ کی کوئی غلطی نہیں ہوگی، پھر ہوا بھی یہی۔

عثمانی صاحب نے بلند آواز میں کہا "آج کے اس مقابلے میں مس فریحہ خان فاتح قرار پائی ہیں۔ ان کی ٹائپنگ میں کوئی غلطی بھی نہیں ہے۔ مسٹر افتخار کی ٹائپنگ میں پانچ غلطیاں ہیں اور انہوں نے اپنا کام سترہ منٹ میں مکمل کیا ہے۔ مس فریحہ نے تیرہ منٹ میں کام مکمل کر کے یہ مقابلہ

جیت لیا ہے۔"

اسٹاف کا ہر شخص فریحہ کو مبارک باد دینے لگا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا "یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔"

"مس فریحہ!" جاوید نے کہا "اس خوشی میں ٹریٹ تو آپ کو دینا ہی پڑے گی۔"

"بھئی، افتخار صاحب کل پورے اسٹاف کو لنچ دیں گے نا؟" میں نے کہا "آپ ان کا چیلنج شاید بھول گئے؟"

افتخار وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ وہ آفس کے کسی بھی آدمی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

دوسرے دن افتخار آفس آیا تو کسی سے بات کیے بغیر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لنچ کے وقت منظور کے ساتھ جاوید اور حامد ایک بہترین ہوٹل سے لنچ لے آئے۔ اس وقت آفس میں خاصی گہما گہمی تھی۔

فریحہ حسب معمول ایک گوشے میں گھر سے لایا ہوا لنچ لے کر بیٹھی تو میں نے کہا "مس فریحہ! کیا آپ ہمارے ساتھ لنچ نہیں کریں گی؟ اور بھئی، آج تو افتخار صاحب نے لنچ کا خصوصی اہتمام کیا ہے، وہ بھی آپ کی وجہ سے۔"

"سوری مس ثنا!" فریحہ نے کہا "میں اتنے ہیوی اور مرغن کھانے نہیں کھاتی۔ آپ لوگ انجوائے کریں۔"

میں نے اس سے بہت کہا لیکن وہ راضی نہیں ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد افتخار خود اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے نہ جانے فریحہ سے کیا کہا کہ وہ ہمارا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔

لنچ کے بعد افتخار نے سب کی موجودگی میں جیب سے ایک چیک نکالا اور فریحہ کی طرف بڑھا دیا "مس فریحہ! یہ تیس ہزار روپے کا چیک ہے۔" اس نے کہا۔

"نہیں افتخار صاحب!" فریحہ نے کہا "یہ میں نہیں لے سکتی۔ اگر آپ شادی شدہ ہیں تو یہ چیک اپنی مسز کو دے دیں اور اگر مسز نہیں ہیں تو اپنے والدین کو دے دیں۔"

"میں اس دنیا میں بالکل اکیلا ہوں مس فریحہ!" افتخار نے افسردگی سے کہا "نہ میرے والدین ہیں، نہ کوئی بہن بھائی، نہ ہی بیوی۔"

"تو پھر یہ چیک میری طرف سے آپ رکھ لیں۔" فریحہ نے کہا۔

"لیکن مس فریحہ! یہ..."

جاوید نے کچھ کہنا چاہا لیکن فریحہ نے اس کی بات کاٹ دی "نہیں جاوید صاحب! آپ اس معاملے میں مت بولیں۔"

اچانک وہاں بیگ صاحب آ گئے۔ انہیں دیکھ کر سب لوگ بے اختیار کھڑے ہو گئے۔ لڑکیاں تو کچھ بوکھلا بھی گئی تھیں۔ بیگ صاحب بھی کبھار ہی ڈائننگ روم کا رخ کرتے تھے۔

"آپ لوگ بیٹھیے پلیز!" بیگ صاحب نے کہا پھر وہ فریحہ سے مخاطب ہوئے "مس فریحہ! میں نے سنا ہے کہ آپ کی ٹائپنگ اسپیڈ بہت زیادہ ہے؟"

"سر، بس پریکٹس سے اسپیڈ کچھ بہتر ہو گئی ہے۔" فریحہ نے نظریں جھکا کر کہا۔

"آپ کا اپائنٹمنٹ تو عثمانی صاحب نے کیا تھا؟"

"جی سر!" فریحہ نے جواب دیا۔

"میں نے ابھی آپ کی فائل دیکھی ہے۔ آپ نے نہ صرف انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کر رکھا ہے بلکہ ایم بی اے بھی کیا ہے۔"

"جی سر!" فریحہ نے آہستہ سے کہا۔

اس وقت عثمانی صاحب بھی وہاں آ گئے تھے۔ انہوں نے جلدی سے کہا "سر! مس فریحہ کو فوری طور پر جاب کی ضرورت تھی۔ ہمارے پاس اس وقت ایسی کوئی پوسٹ خالی نہیں تھی جس پر انہیں اپائنٹ کیا جاتا۔ ان کی تعلیم اور تجربہ دیکھتے ہوئے میں نے انہیں عارضی طور پر اس پوسٹ پر رکھ لیا تھا۔ میں آپ سے مشورہ کرنے کے بعد انہیں کوئی معقول پوسٹ دینا چاہتا تھا۔"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا عثمانی صاحب!" بیگ صاحب نے کہا "مس فریحہ نے گولڈن اسٹار جیسے بڑے ادارے میں اپنی منیجرل حیثیت سے جاب کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ہماری کمپنی کے لیے بھی ایک اثاثہ ثابت ہوں گی۔" پھر وہ فریحہ سے بولے "مس فریحہ! کل سے آپ عثمانی صاحب کو اسسٹ کریں گی۔ باقی باتیں ہم بعد میں کریں گے۔"

"تھینک یو سر!" فریحہ نے کہا۔

بیگ صاحب کے جانے کے بعد پورا اسٹاف فریحہ کو مبارک باد دینے لگا۔ میں نے ہنس کر کہا "مس فریحہ! مجھے اب تو آپ سے ڈر لگنے لگا ہے۔ آپ ہماری باس ہو گئی ہیں۔"

"کیا میری شکل اتنی ہی ڈراؤنی ہو گئی ہے مس ثنا؟" فریحہ نے مسکرا کر کہا "ہم سب ایک ٹیم کی طرح کام کریں گے۔ ہم میں کوئی باس واس نہیں ہے۔" فریحہ نے کہا۔

دوسرے دن سے اسے ایک شاندار آفس مل گیا۔

فریحہ اپنے کام کے ساتھ بہت مخلص تھی۔ وہ کبھی چھٹی نہیں کرتی تھی۔ پوری محنت اور دیانت داری سے کام کرتی تھی۔

کمپنی کو اس کی ذات سے فائدہ ہوا تو بیگ صاحب نے اسے بھی بہت سی مراعات دے دیں۔ اکثر وہ لنچ بھی بیگ صاحب کے ساتھ کرنے لگی۔

وہ مجھ سے خاصی بے تکلف ہو گئی تھی۔ نہ صرف مجھ سے بلکہ افتخار سے بھی۔ افتخار اکثر اس کے آفس میں چلا جاتا تھا اور وہ دونوں کافی دیر تک گپ شپ لگاتے رہتے تھے۔

میں دیکھ رہی تھی کہ کچھ دن سے فریحہ بہت پریشان پریشان لگ رہی تھی۔

ایک دن میں ایک ضروری فائل لے کر اس کے آفس میں گئی تو میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا "فریحہ! کئی دن سے آپ مجھے خاصی پریشان لگ رہی ہیں، خیریت تو ہے؟"

"ہاں، خیریت ہے ثنا!" اس نے کہا "بس میں سوچ رہی ہوں کہ یہاں سے جاب چھوڑ دوں۔"

میں اچھل پڑی "کیوں فریحہ!" میں نے پوچھا۔ "اتنی بہترین جاب ہے، آفس کا ہر فرد آپ کی عزت کرتا ہے۔ آپ کے پاس اختیارات بھی ہیں، پھر آپ جاب کیوں چھوڑیں گی؟"

"بس کچھ ذاتی وجوہ کی بنا پر۔" اس نے میری لائی ہوئی فائل پر سائن کیے اور فائل مجھے دے دی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اب تم جا سکتی ہو۔

میں فائل لے کر خاموشی سے باہر آ گئی۔

چند ہفتے مزید گزر گئے۔ فریحہ کی پریشانی کا وہی عالم تھا۔

بیگ صاحب عموماً دیر سے لنچ کرتے تھے۔ جب ہم لوگ لنچ سے فارغ ہو کر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ کر کام شروع کر دیتے تھے تب ان کا چپراسی ان کے لیے لنچ لے جاتا تھا، پھر فریحہ کو بلا لاتا۔

اس دن بھی یہی ہوا۔ بیگ صاحب کے چپراسی نے ان کے کمرے میں کھانے کی ٹرالی پہنچائی، پھر فریحہ کے کمرے میں داخل ہوا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" فریحہ نے بلند آواز میں کہا۔ "اور اب جاؤ، مجھے ڈسٹرب مت کرو۔"

چپراسی خاموشی سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد بیگ صاحب اپنے آفس سے نکل کر فریحہ کے کمرے کی طرف بڑھے۔

اس دن بھی مجھے ایک فائل پر فریحہ اور بیگ صاحب دونوں کے دستخط چاہیے تھے۔ میں نے سوچا، بیگ صاحب اور فریحہ دونوں سے یہیں دستخط لے لوں۔

میں ان کے کمرے کی طرف بڑھی تو دروازے پر ہی ٹھٹک گئی۔ اندر سے فریحہ کی تیز آواز سنائی دی "آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے بیگ صاحب! میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ تم ایسی ویسی لڑکی نہیں ہو۔ کسی ایسی ویسی لڑکی پر میں اپنا وقت اور پیسا ضائع بھی نہیں کروں گا... تم تو..."

"بیگ صاحب!" فریحہ بپھر کر بولی "اپنا ہاتھ ہٹائیں ورنہ..."

"ورنہ کیا کرو گی تم؟" بیگ صاحب تلخ لہجے میں بولے۔

اچانک افتخار دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ نہ جانے کس وقت میرے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں بھی کمرے میں داخل ہو گئی۔

بیگ صاحب ایک طرف بپھرے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے سامنے فریحہ تھی، وہ سخت طیش کے عالم میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کیا مسئلہ ہے؟" افتخار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تم لوگ بغیر دستک دیے کمرے میں آئے کیسے؟" بیگ صاحب گرج کر بولے "گیٹ لاسٹ! یہ میرا اور فریحہ کا مسئلہ ہے۔"

"میں لعنت بھیجتی ہوں آپ پر اور آپ کے ادارے پر۔" فریحہ نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم ایسے نہیں جا سکتیں۔" بیگ صاحب ڈھٹائی سے بولے۔ اس وقت تو ان کی پوری شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی اور وہ مجھے عام سے ایک گھٹیا آدمی لگ رہے تھے۔

"کیا کریں گے آپ؟" افتخار نے بپھر کر پوچھا۔

"یہ تم مجھ سے بات کس لہجے میں کر رہے ہو؟" بیگ صاحب نے گرج کر پوچھا۔

"جس لہجے میں مجھے کرنا چاہیے۔" افتخار نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"گیٹ آؤٹ!" بیگ صاحب نے چیخ کر کہا "مجھے تم جیسے بدتمیز انسان کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی جا کر اپنا حساب کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے ایسے بدقماش اور بدکردار شخص کے ساتھ کام کرنے کا۔" افتخار نے انتہائی گستاخی سے کہا "اور کچھ کہنے سے پہلے سوچ لینا کہ میں اب تمہارا ملازم نہیں ہوں، سمجھے!"

"اب تم جاتے ہو یا میں سیکیورٹی کو بلاؤں؟" بیگ صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔

ان دونوں کی چیخ و پکار سے پورا اسٹاف کمرے کے باہر جمع ہو گیا تھا لیکن ان میں سے کسی کی جرأت نہیں تھی کہ وہ کمرے میں آ جاتا۔

"سیکیورٹی والوں کے ہاتھ پیر تڑوانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، میں جا رہا ہوں۔" افتخار نے کہا، پھر فریحہ سے بولا "چلو فریحہ!"

"کہاں چلوں اور کیوں چلوں؟" فریحہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تو کیا تم اب بھی یہیں رہو گی؟"

"یہ میرا اپنا مسئلہ ہے مسٹر افتخار!" فریحہ نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں کہاں رہتی ہوں اور کیا کرتی ہوں، اس سے آپ کو کیا سروکار؟"

افتخار کے ساتھ ساتھ میری آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کی خاطر تو افتخار نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا اور اب وہی اجنبیوں کی طرح یہ پوچھ رہی تھی کہ کہاں چلوں؟

بیگ صاحب کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولے "اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

افتخار نے ایک نظر فریحہ پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں ایک حسرت تھی، وہ اتنی سرخ ہو رہی تھیں کہ لگتا تھا ابھی ان سے خون ٹپکنے لگے گا۔

وہ مڑا اور بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔

بیگ صاحب نے طویل سانس لیا، پھر مجھ سے بولے "جی مس ثنا! آپ کیسے آئی تھیں؟"

"میں بعد میں آ جاؤں گی سر!" میں نے جلدی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

کمرے کے باہر آفس کا ہر فرد موجود تھا۔ وہ سب میرے گرد اکٹھے ہو گئے اور پوچھنے لگے۔ "کیا ہوا مس ثنا؟ افتخار اور بیگ صاحب چیخ کیوں رہے تھے؟ کیا افتخار سے کوئی بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے؟"

"ہاں، افتخار سے کچھ زیادہ ہی بڑی غلطی ہو گئی ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔

مجھے رہ رہ کر فریحہ پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ پہلے تو اس نے اتنا شور مچایا، پھر جب افتخار اس کی حمایت میں بولا تو اس نے افتخار کو بھی ذلیل کر کے رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد بیگ صاحب فریحہ کے کمرے سے نکلے اور کسی طرف دیکھے بغیر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

کام میں میرا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے عثمانی صاحب سے چھٹی لی اور جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ میرا انٹرکام بج اٹھا۔

میں نے ریسیور اٹھایا "جی!"

"مس ثنا!" دوسری طرف سے فریحہ کی آواز سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی "مس ثنا! ذرا میرے کمرے میں آ جائیں۔"

دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے ٹکا سا جواب دے دوں اور کہوں کہ میں اس وقت گھر جا رہی ہوں لیکن پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے کمرے میں چلی گئی۔

وہ اجڑی اجڑی سی اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مسلسل روتی رہی ہو۔

"جی فرمائیے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بیٹھ جائیے مس ثنا!" اس نے کہا۔

میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"مس ثنا! اس آفس میں آپ ہی مجھ سے کچھ بے تکلف ہیں۔" اس نے کہا "آپ کسی حد تک مجھے سمجھتی بھی ہیں۔"

"اب تک میری رائے آپ کے بارے میں اچھی تھی لیکن اب نہیں ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"آپ بھی... مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا رہی ہیں؟" فریحہ نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا "آپ نے تو شاید بیگ صاحب کی باتیں بھی سنی ہوں گی؟"

"جی ہاں، میں نے بیگ صاحب کی باتیں بھی سنی ہیں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا "پھر میں نے ایک شریف اور مخلص آدمی کو آپ کی خاطر ذلیل ہوتے بھی دیکھا۔ آپ کی خاطر اس کی برسوں کی لگی لگائی ملازمت چلی گئی اور آپ..."

"میں نے افتخار سے نہیں کہا تھا کہ وہ..."

"نہیں کریں مس فریحہ!" میں نے کہا "کوئی بھی شریف آدمی ان حالات میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ ہاں افتخار اگر بے غیرتی اور بے حسی سے کام لیتا تو شاید وہ خاموشی سے باہر نکل

جاتا۔ میں نے بھی تو بے غیرتی سے وہ سب کچھ برداشت کیا ہے۔ مجھ میں اتنی اخلاقی جرأت ہی نہیں تھی کہ میں بیگ صاحب سے اس لہجے میں بات کر سکتی اور میں نے اچھا ہی کیا ورنہ یہی ہوتا کہ مرتے تھے جن کے لیے وہ رہے دشمن کرتے۔

"آپ مجھے برا بھلا کہہ لیں۔" فریحہ نے کہا "لیکن پلیز، کچھ وقت نکال کر میری بات سن لیں۔"

"میں سن تو رہی ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"یہاں نہیں مس ثنا! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میرے گھر چلیں۔ پلیز، مس ثنا! انکار مت کیجیے گا۔ میں آج آپ کو سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔"

میں نے چند لمحے غور کیا، پھر فریحہ کا خوشامد بھرا انداز دیکھ کر مجھے ترس آ گیا اور میں نے اس کے ساتھ چلنے کی ہامی بھر لی۔

میں فریحہ کے ساتھ ہی آفس سے نکلی۔ اسے کمپنی کی طرف سے گاڑی بھی ملی ہوئی تھی اور ڈرائیور بھی۔

ڈرائیور نے ہمیں گلشن کے ایک بنگلے پر چھوڑ دیا۔

میں وہ وسیع و عریض اور شاندار بنگلا دیکھ کر فریحہ سے مرعوب ہو گئی۔

فریحہ گیٹ کی طرف بڑھی تو باوردی گارڈ نے آہنی پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول دیا۔

وہ بنگلا اندر سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔ مرکزی دروازے سے کچھ فاصلے پر کار پورچ تھا جس میں اس وقت جدید ماڈل کی دو چمچماتی ہوئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے حیرت سے سوچا، فریحہ اتنی پیسے والی اور آسودہ حال ہے تو اسے بھلا اس معمولی سی ملازمت کی ضرورت ہی کیا ہے؟

وہ بنگلے کے اقامتی حصے کی طرف جانے کے بجائے اس کی عقبی سمت کی طرف جانے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ گھوم کر کسی عقبی راستے سے بنگلے میں داخل ہونا چاہتی ہے۔

وہ وہاں سے سیدھی بنگلے کے عقبی حصے میں پہنچی اور بنگلے کے عقب میں واقع سرونٹ کوارٹروں کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے ایک سرونٹ کوارٹر کے دروازے پر دستک دی تو ادھیڑ عمر کی ایک خاتون نے دروازہ کھولا اور بولیں "آج کچھ جلدی آ گئی فرو بیٹا! تیری طبیعت تو ..." ان کی نظر مجھ پر پڑی تو ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

"اماں! یہ میری دوست ہیں ثنا!" اس نے جلدی سے میرا تعارف کرایا "یہ بھی میرے ساتھ اسی آفس میں جاب کرتی ہیں۔"

میں نے انہیں سلام کیا تو وہ بہت شفقت سے بولیں "جیتی رہو بیٹی! آؤ، اندر آ جاؤ۔"

میں ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی کہ مجھے ایک دھچکا اور لگا۔ اچانک ایک تین چار سال کا خوبصورت سا بچہ دوڑتا ہوا آیا اور فریحہ کی ٹانگوں سے مما کہہ کر لپٹ گیا۔

فریحہ نے اسے گود میں اٹھا لیا اور مجھ سے بولی "مس ثنا! یہ میرا بیٹا ارسلان ہے۔"

"ماشاء اللہ ... بہت پیارا بچہ ہے۔" میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ان پے در پے دھچکوں سے میں چکرا کر رہ گئی تھی۔

فریحہ ارسلان کو گود میں اٹھائے ہوئے اس کمرے میں آ گئی جسے آپ چاہیں تو ڈرائنگ روم کہہ لیں۔ وہ کمرا کچھ بڑا تھا۔ اس میں ایک صوفہ سیٹ بھی تھا اور تخت بھی۔ فرش پر نیا کارپٹ تھا اور چند فلور کشن بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں ایک طرف ایک نیا ٹی وی بھی تھا اور دوسرے کونے میں کمپیوٹر ٹرالی پر کمپیوٹر بھی موجود تھا۔ اس کمرے میں ایک ریک میں ارسلان کی کتابیں، کاپیاں اور کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ کارپٹ پر ایک بستر بھی تھا جسے فریحہ کی والدہ نے فوراً لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ یعنی وہ کمرا بیک وقت نشست گاہ، ٹی وی لاؤنج، بیڈ روم اور اسٹڈی روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

"بیٹھو بیٹی!" فریحہ کی والدہ نے کہا "میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔"

"نہیں آنٹی، اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا "مجھے ابھی گھر بھی جانا ہے۔"

"آج میں آپ کو رات کے کھانے سے پہلے نہیں چھوڑوں گی۔ آپ اپنے گھر فون کر دیں کہ میں اپنی ایک دوست کے گھر ہوں۔"

"لیکن مس فریحہ ..."

"دیکھو ثنا!" فریحہ نے بے تکلفی سے کہا "اب یہ مس اور آپ جناب نہیں چلے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ..."

"کچھ لیکن ویکن نہیں۔" فریحہ نے کہا۔

وہ مزید کچھ کہنے والی تھی کہ کسی نے فریحہ کو آواز دی "فریحہ ... تو ... آ گئی بیٹا!" پکارنے والے کی زبان میں کچھ لکنت تھی۔

"جی آ رہی ہوں۔" فریحہ نے وہیں سے جواب دیا پھر

مجھ سے بولی "یہ میرے ڈیڈی ہیں۔ پانچ سال سے فالج میں مبتلا ہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"یہ سب کیا ہے فریحہ؟" میں نے پوچھا۔

ہم لوگ پُرتکلف قسم کی چائے سے فارغ ہو چکے تھے۔ فریحہ کی والدہ ارسلان کو اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئی تھیں۔ ہم دونوں اس وقت فلور کشن پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہ کہانی کوئی نئی یا انوکھی کہانی نہیں ہے ثنا!" فریحہ نے کہا پھر وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں گم ہو گئی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ میں اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں؟ پھر اس نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔

☆☆☆

میں اپنے والدین کی اکلوتی ہوں۔ ابو اس شہر کے معروف بزنس مین تھے۔ یہ جو گلوبل انٹرپرائزز ہے، یہ ہماری ہی ملکیت ہے۔ تم بھی یہ سن کر حیران رہ گئیں نا، لیکن حقیقت یہی ہے۔

ابو کا بزنس دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کا ایک منیجر تھا اشفاق بیگ، ابو اس پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ وہ بھی انتہائی محنت اور دیانت داری سے کام کرتا تھا۔ اس کے بیٹے کو پڑھنے کا شوق تھا۔ ابو نے اسے تعلیم کے لیے اپنے خرچ پر بیرون ملک بھجوا دیا۔ میری خواہش تھی کہ میں بھی امریکا یا لندن میں تعلیم حاصل کروں لیکن ابو تو مجھے ایک لمحے کو بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ بھلا میری جدائی کیسے برداشت کر لیتے۔ اماں بھی میری بیرون ملک تعلیم کی مخالف تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ لڑکی ذات ہے، وہاں اکیلی کیسے رہے گی؟ وہاں ابو کے کئی جاننے والے بھی تھے لیکن اماں کسی پر بھی اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ یوں میں پاکستان ہی میں رہ کر تعلیم حاصل کرتی رہی اور ادھر ابو کے ملازم کا بیٹا نوعمری ہی سے لندن میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔

میں نے پہلے کراچی یونیورسٹی سے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا پھر میں نے ایم بی اے میں ایڈمیشن لے لیا۔ ابو نے بھی میری حوصلہ افزائی کی کہ تمہاری یہ تعلیم ہمارے بزنس کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔

ابو نے مجھے بچپن ہی میں کمپیوٹر دلا دیا تھا۔ عام بچوں کے برعکس میں نے کمپیوٹر پر گیم کھیلنے کے بجائے ٹائپنگ اسپیڈ بڑھاتی رہی۔ بعد میں ایک ادارے سے میں نے آئی ٹی کے بہت سے کورسز بھی کر لیے۔ وہاں بھی میں اپنی ٹائپنگ اسپیڈ پر توجہ دینا نہیں بھولی۔

اس دوران میں میرے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آ گیا۔ ابو نے بتایا کہ لڑکے کا اپنا بزنس ہے۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اس کی والدہ تو اس کے بچپن ہی میں انتقال کر گئی تھیں، والد کا انتقال گزشتہ سال ہوا ہے۔

میں ان ہی دنوں تو ایم بی اے کر کے فارغ ہوئی تھی اور ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اماں نے میری ایک نہ سنی اور عدنان سے میری شادی کرا دی۔

عدنان واقعی بہت اچھے اور سلجھے ہوئے آدمی تھے اور وہ دن رات اپنے کاروبار کو وسعت دینے میں کوشاں تھے۔

ابو نے کئی مرتبہ کہا کہ اب تم میرے ساتھ بزنس کرو لیکن عدنان نے ہر بار بہت خوبصورتی سے انکار کر دیا۔

میں بھی ان دنوں بہت خوش تھی۔

میں بھی کبھار ابو کے آفس بھی چلی جاتی تھی۔ انکل بیگ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ اکثر مجھ سے شکایت کرتے تھے کہ تمہیں پابندی سے آفس آنا چاہیے۔ آخر یہ اتنا بڑا کاروبار تم ہی کو سنبھالنا ہے۔

"انکل!" میں مسکرا کر کہتی "کاروبار سنبھالنے کے لیے ابو ہیں، آپ ہیں پھر مجھے اس جھمیلے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ایک سال بعد میرے آنگن میں ارسلان گلاب بن کر مہک اٹھا، زندگی مزید حسین ہو گئی۔ اب عدنان مجھے اور ارسلان کو بھی وقت دینے لگے لیکن یہ خوشیاں بھی عارضی ثابت ہوئیں۔

ایک روز فیکٹری سے واپسی پر ان کی گاڑی پر ٹنوں وزنی ایک ٹرالر الٹ گیا۔ عدنان نے تو موقع پر ہی دم توڑ دیا اور میں بیوگی کا داغ اپنے دامن پر سجائے ابو کے گھر لوٹ آئی۔

عدنان کے مرتے ہی گویا پریشانیوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا۔ عدنان نے بینک سے کاروبار کے لیے قرض بھی لیا تھا اور اپنا بنگلا گروی رکھ دیا تھا۔ ان کے مرنے کے بعد تو کاروبار بالکل ہی تباہ ہو گیا تھا، بینک کا قرض کیسے ادا ہوتا۔ بینک نے ہمارا بنگلا نیلام کر دیا۔

ابو میری وجہ سے بہت اداس اداس سے رہتے تھے۔ میں ابو کی خاطر اپنے ہونٹوں پر جھوٹی ہنسی سجائے رکھتی تھی۔

ایک دن ابو آفس سے آئے تو بہت پریشان تھے۔ ان کا چہرہ فکر و پریشانی سے سُت کر رہ گیا تھا۔ وہ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتے، کبھی بیٹھ جاتے۔

مجھ سے ان کی پریشانی دیکھی نہ گئی۔ میں نے پوچھ ہی لیا ''ابو! کیا بات ہے، آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

''ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے فروبیٹی!'' ابو نے کہا۔

''ابو! ادھر دیکھیے میری طرف۔'' میں نے کہا ''آپ کو معلوم ہے، جب آپ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں تو مجھ سے نظریں نہیں ملاتے۔ پھر کوئی عام سی بات آپ کو اتنا پریشان اور فکر مند بھی نہیں کر سکتی۔ ابو پلیز، بتائیے کیا بات ہے؟''

''بیٹا! اب بتانے کو رہ ہی کیا گیا ہے؟'' ابو نے کہا۔ ''وہ بیگ آستین کا سانپ نکلا۔ میں نے تو اس پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے اسے آفس کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا لیکن اس نے تو مجھی کو ڈس لیا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اماں نے کہا ''اشفاق بھائی..... کیا کیا ہے انہوں نے؟''

''اشفاق بھائی!'' انہوں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''تمہارے اس اشفاق بھائی نے نہ جانے کب اور کیسے میرے اعتماد کا فائدہ اٹھا کر مجھ سے دستخط کرا لیے اور اب پورا کاروبار اور ہمارا یہ بنگلا اس کی ملکیت ہے۔''

''یہ..... یہ..... آپ..... کیا کہہ رہے ہیں؟'' امی نے بے یقینی سے کہا ''اشفاق بھائی ایسا نہیں کر سکتے۔''

''وہ ایسا کر چکا ہے۔ اس نے آج مجھے دفتر سے بے دخل کر دیا اور اب یہ بنگلا خالی کرنے کا نوٹس بھی دے دیا ہے۔''

''کیا!'' امی بوکھلا کر بولیں ''ہم یہ بنگلا بھی خالی کر دیں تو جائیں گے کہاں؟''

''ابو! آپ کورٹ میں جا سکتے ہیں۔ وہ خبیث بیگ ہمارا اتنا بڑا کاروبار آسانی سے ہضم نہیں کر سکتا۔'' میں نے کہا۔

''کورٹ میں تو میں جاؤں گا ہی۔'' ابو نے کہا ''لیکن فی الحال تو یہ بنگلا خالی کرنا ہے۔''

پھر ابو نے ایک ہفتے کے اندر اندر بنگلا خالی کر دیا اور گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔

ابو کے بینک میں جو تھوڑا بہت پیسا تھا، وہ وکیلوں اور کورٹ کے چکر میں ختم ہو گیا۔

ابو کو دن رات یہی فکر کھاتی رہتی تھی کہ اب گزارہ کیسے ہوگا؟

میں انہیں تسلی دیتی تھی کہ آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ میں آپ کی بیٹی نہیں بلکہ بیٹا ہوں۔ پھر میری یہ تعلیم کس دن کام آئے گی؟''

میں نے ملازمت کے لیے کئی جگہ اپلائی کر دیا۔ کچھ جگہ سے جواب آیا بھی لیکن وہاں تنخواہ اتنی کم تھی کہ میں نے وہاں ملازمت کرنا بہتر نہ سمجھا۔

اس دن مقدمے کی تاریخ تھی۔ وکیل نے ابو کو یقین دلایا تھا کہ اس مقدمے کا فیصلہ تو دو ہی پیشیوں کے اندر آپ کے حق میں ہو جائے گا۔ کاروباری حلقے میں بے شمار لوگ آپ کو گلوبل انٹر پرائزز کے مالک کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ پھر آپ کے اسٹاف کے بہت سے افراد بھی آپ کے حق میں گواہی دیں گے۔ ابو بھی بہت پرامید تھے۔

بیگ بھی ایک چنٹ تھا۔ اس نے دفتر کے تمام ملازمین کو فارغ کر دیا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ آفس میں اسٹاف کے لیے کئی کمرے موجود ہیں لیکن سب خالی ہیں۔

دفتر کا پورا اسٹاف سو سوا سو افراد پر مشتمل تھا۔ بیگ نے ان سب کو نکالنے کے بعد نئے لوگوں کو رکھا ہے۔ وہ اس سلسلے میں بہت محتاط تھا اس لیے بہت چھان بین کے بعد ملازم رکھتا تھا۔ تم سے بھی اس نے یہی پوچھا ہوگا کہ تم امجد علی صاحب کو جانتی ہو؟''

مجھے یاد آیا کہ انٹرویو کے وقت مجھ سے یہ سوال کیا گیا تھا۔

''لیکن — یہ تو چار سال پرانی بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، اتنی ہی پرانی ہوگی کیونکہ بیگ کو کاروبار پر قبضہ جمائے ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں۔

بیگ کے وکیل نے ایک ماہ بعد کی تاریخ لے لی۔ پھر تاریخ پہ تاریخ ملتی گئی۔

ایک سال بعد ابو نے گھبرا کر وکیل تبدیل کر دیا۔

رانا صاحب بہت سلجھے ہوئے ایڈووکیٹ تھے۔ انہوں نے ابو کو صاف صاف بتا دیا کہ اس مقدمے کا فیصلہ اتنی جلدی نہیں ہوگا۔ دیکھیے نا گزشتہ ایک سال سے تو تاریخیں پڑ رہی ہیں اور آپ کا مقدمہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ بیگ نے آپ کے پرانے اسٹاف کو ملازمت سے فارغ کر دیا ہے۔ کیا عجب کہ اس نے ان لوگوں کو منہ بند رکھنے کا معاوضہ بھی دیا ہو۔''

''پھر، مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' ابو نے پوچھا۔

''آپ کوشش کریں کہ کسی طرح مقدمے کی سماعت شروع ہو جائے۔ میں بھی کوشش کروں گا لیکن میں زیادہ پرامید نہیں ہوں۔''

ان ہی دنوں ایک اور واقعہ ہوا۔ اچانک اشفاق بیگ کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ اس کے مرنے کے بعد لندن سے اس کا بیٹا

سلطان بیگ پاکستان آ گیا۔

مجھے اسی دوران میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی جاب مل گئی تھی اور گھریلو اخراجات کسی نہ کسی طرح پورے ہو ہی جاتے تھے۔

ابو بیمار رہنے لگے تھے۔ رانا صاحب کے جواب سے انکل ابو مایوس ہو گئے تھے۔ اس مایوسی اور فکر کے باعث ان پر ایک دن فالج کا شدید حملہ ہوا۔ ان کے جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ قوت گویائی بھی متاثر ہوئی۔ پہلے تو ان کی کوئی بات میری اور امی کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی، پھر آہستہ آہستہ زبان کی لکنت کافی حد تک دور ہو گئی۔

ابو کی بیماری میں بے تحاشا خرچ ہوا۔ امی کے سارے زیور بک گئے، بینک کا ایک ایک پیسا خرچ ہو گیا اور اخراجات اتنے بڑھے کہ مجھے مکان کا کرایہ ادا کرنا بھی دوبھر ہو گیا۔

ان نامساعد حالات میں ابو کے ایک پرانے دوست اجمل چچا نے ہماری بہت مدد کی۔ وہ اسٹیل کا کاروبار کرتے ہیں۔ انہوں نے ابو کو مجبور کیا کہ میرا اتنا بڑا بنگلا ہے، تم وہاں چل کر رہو۔ صحت یاب ہونے کے بعد تم علیحدہ بندوبست کر لینا۔

ابو انتہائی مجبوری کے عالم میں اجمل چچا کے گھر منتقل تو ہو گئے لیکن ان کی غیرت نے بنگلے میں رہنا گوارا نہ کیا۔ انہوں نے ضد کر کے اجمل چچا کے سرونٹ کوارٹر میں قیام کیا۔ یوں ہم اس بنگلے میں آ گئے۔ اجمل چچا تو مجھ سے اور امی سے اب بھی کہتے ہیں کہ ہم لوگ بنگلے میں چل کر رہیں لیکن ابو کسی طور راضی نہیں ہوتے۔

اس دوران میں ایک دفعہ میری ملاقات عثمانی صاحب سے ہو گئی۔ عثمانی صاحب ابو کے دور میں ہمارے ہی آفس میں کام کرتے تھے لیکن نہ جانے کس بات پر ناراض ہو کر وہ جاب چھوڑ کر بیرون ملک چلے گئے تھے۔

جب انہیں معلوم ہوا کہ ابو کے پورے کاروبار پر بیگ نے قبضہ کر لیا ہے اور ابو مفلوج ہو کر اپنے ایک دوست کے سرونٹ کوارٹر میں پڑے ہوئے ہیں تو انہیں بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے کہا ''فریحہ بیٹی! میں نے امجد صاحب کو بہت سمجھایا کہ کسی پر بھی اتنا اندھا اعتماد نہ کریں۔ چاہے وہ آپ کا سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو لیکن انہوں نے میری باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ یہ بیگ مجھے شروع ہی سے ناپسند تھا۔ امجد صاحب کو نہ جانے اس میں کیا خوبی نظر آئی تھی۔''

''اب تو جو ہونا تھا، وہ ہو گیا انکل!'' میں نے کہا ''پرانی باتیں دہرانے سے کیا فائدہ؟''

''اتنی جلدی مایوس نہیں ہوتے بیٹا!'' انہوں نے کہا ''اب بیگ تو رہا نہیں، پورا کاروبار اس کا بیٹا سنبھالتا ہے۔ وہ نہ مجھے پہچانتا ہے، نہ تمہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کمپنی میں دوبارہ ملازمت حاصل کر لوں۔ پھر تم بھی وہیں آ جانا۔

نوبی قوم کے ایک سیاہ فام غلام تھے اور حق تعالیٰ شانہ نے ان کو حکمت و دانش سے نوازا تھا۔ بنی اسرائیل کے ایک امیر نے انہیں ساٹھ تیس مثقال کے عوض خرید لیا تھا۔ امیر کے قد و قامت کے قریب ہی ایک [illegible] اور وہ چوسر کھیلنے کا عادی تھا۔

ایک دن اس [illegible] کوئی ہار جائے گا وہ [illegible] نہر کا سارا پانی پی جائے گا۔ [illegible] حضرت لقمان کا آقا ہار گیا اور اس کا دوست جیت گیا۔ جب دوست نے مطالبہ کیا کہ [illegible] پانی پیو یا [illegible] اور مجھ کو تمہاری ملکیت [illegible] حضرت لقمان کے آقا نے کہا۔ ''مجھے آج کی رات کی مہلت دو۔'' دوست نے منظور کر لیا۔

حضرت لقمان اس وقت جنگل سے لکڑیاں کاٹنے گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو آقا کو [illegible] فکر مند [illegible] انہوں نے مالک کے پاس بیٹھ کر کہا ''کیا بات ہے، [illegible] آج آپ کو [illegible] دیکھ رہا ہوں۔'' آقا نے پہلے تو [illegible] پھر حضرت لقمان نے کہا ''مجھے اصل بات بتاؤ، ہو سکتا ہے میں تمہاری مشکل حل کر دوں۔''

آقا نے پورا قصہ سنا دیا۔

حضرت لقمان نے کہا ''فکر نہ کیجیے، میرے پاس اس کا [illegible] جب تمہارا دوست [illegible] تو اس سے پوچھنا کہ دونوں کناروں کے درمیان کا پانی پیوں یا نہر کی لمبائی کا۔ وہ کہے گا دونوں کناروں کے درمیان کا۔ پھر کہنا [illegible] پہلے [illegible] نہر کے پانی کو آنے سے روک دو [illegible] اس کی طاقت سے باہر ہے، [illegible] تم اس مصیبت سے نکل جاؤ گے۔''

اگلے روز دوست آیا اور آقا سے کہا ''اپنی شرط پوری کرو۔'' آقا نے کہا ''پورا پانی پیوں یا [illegible]'' اس نے کہا ''[illegible]'' آقا نے کہا ''لمبائی کے پانی کو روک لو۔'' اس نے کہا ''یہ تو ناممکن ہے۔''

اس طرح حضرت لقمان کی ذہانت و دانائی سے دوست ہار گیا اور آقا [illegible] گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آقا اتنا خوش ہوا کہ اس نے اسی روز حضرت لقمان کو آزاد کر دیا۔